پاکستان کی سیاسی تاریخ 9

تحریک پاکستان میں
بنگالی مسلمانوں کا نمایاں ترین کردار

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 9

تحریک پاکستان میں
بنگالی مسلمانوں کا نمایاں ترین کردار

زاہد چودھری

تکمیل وترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-33-9

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: **2014**ء

قیمت: **600/-** روپے

قیمت بیرون ملک: **$ 30/-**

فہرست

دیباچہ جلد دوم

پاکستان کے لوگوں کو بالعموم اور نئی نسل کو بالخصوص 1971ء میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد، یہ معلوم ہی نہیں کہ تحریک پاکستان میں نمایاں ترین کردار بنگال کے مسلمانوں نے ادا کیا تھا۔ یہاں مطالعہ پاکستان اور تاریخ کے نام پر جو کچھ لکھا، پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے اس میں بنگال کے کردار کا بہت کم ذکر ہوتا ہے۔ 1930ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال کے صدارتی خطبہ کے جس اقتباس سے تصور پاکستان نکالا جاتا ہے، اس میں صرف پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست (بہ معنی صوبہ) بنانے کی بات کی گئی تھی۔ اسی طرح چودھری رحمت علی کے دیئے ہوئے لفظ ''پاکستان'' میں بھی پ برائے پنجاب، ا برائے افغانیہ، ک برائے کشمیر، س برائے سندھ اور تان برائے بلوچستان ہے، بنگال اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ چودھری رحمت علی نے بنگال کی علیحدہ ریاست کے لئے ''بانگ اسلام'' کا نام دیا تھا اور بعض حلقوں میں اس کے لئے بنگستان کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان کا مقصد صرف اس پاکستان کا حصول تھا جو موجودہ پاکستان ہے۔

ہمارے ہاں تاریخ نویسی بالعموم حکمران طبقوں اور اسٹبلشمنٹ کے مفادات کی آئینہ دار ہوتی ہے اس لئے اس میں تاریخ کے وہ معروضی حقائق غائب کر دیئے جاتے ہیں جو ان طبقوں کے مفاد میں نہیں ہوتے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کو تحریک پاکستان میں ہراول دستہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان کے نمایاں ترین کردار کی پردہ پوشی اس لئے کی جاتی ہے کہ

پاکستان کے بالادست طبقوں کا تعلق پنجاب اور کراچی سے ہے۔ان کے نزدیک مشرقی پاکستان ایک کالونی کی حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے باشندوں کو رعیت کے طور پر حقیر سمجھا جاتا تھا اس لئے تحریک پاکستان میں ان کے نمایاں ترین کردار کو منہا کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔انہی بالادست طبقوں کے نظریہ سازوں کی جانب سے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کے فروغ پانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہاں کے لوگ ہندو پروفیسروں اور دانشوروں کے ورغلانے میں آ گئے تھے، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ 1947ء سے پہلے جب بنگال کے مسلم عوام تحریک پاکستان میں نمایاں ترین کردار ادا کر رہے تھے،تب وہ ہندو پروفیسروں اور دانشوروں کے ورغلانے میں کیوں نہ آئے حالانکہ تب ہندو پروفیسر اور دانشور تعداد اور طاقت میں کہیں زیادہ تھے۔

زیر نظر کتاب تحریک پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے نمایاں ترین کردار کے بارے میں لکھی گئی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ جب یہ 1996ء میں شائع ہوئی تب بھی اس کی ضرورت تھی اور اب اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اس دوران ہم مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی شدید لہر کی لپیٹ میں آ چکے ہیں جس کو ہوا دینے کے لئے تحریک پاکستان کے مقاصد کو ''نفاذ اسلام'' کے ایک مخصوص مفہوم کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ تحریک پاکستان کا سب سے بڑا مقصد برصغیر کے مسلم اکثریتی صوبوں یا جغرافیائی وحدتوں کی سیاسی، معاشی و معاشرتی خودمختاری کا حصول تھا۔فرقہ واریت،تھیوکریسی اور مذہبی کٹرپن کے غلبہ کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔اوّل ایڈیشن کے بعد اس موضوع پر کوئی اور کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔امید ہے کہ اس کتاب کا یہ تازہ ایڈیشن بہت سے تاریخی مغالطوں کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

لاہور | حسن جعفر زیدی

فروری 2014ء

دیباچہ ایڈیشن اوّل

پاکستان میں اپنے مفاد کو آگے بڑھانے کے لئے جہاں اور بہت سے نعروں کا استعمال کیا گیا وہاں ''تحریک پاکستان میں نمایاں کردار'' کا لیبل چسپاں کرنے کا بھی عام رواج رہا ہے۔ اس سلسلے میں پنجابی شاونسٹوں اور کراچی کے مہاجروں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان بنانے کا سہرا اپنے اپنے سر پر سجانے کی اس دوڑ میں ایسے ایسے لوگوں کو یہ اعزاز دے دیا گیا جو آخر وقت تک پاکستان بنانے کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ مفاد پرستی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ جو اس کارواں میں ہراول دستہ کی حیثیت رکھتے تھے، انہیں نہ صرف نظرانداز کیا جائے بلکہ انہیں سب سے پیچھے کر کے دکھایا جائے۔ یہ ظلم بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا جنھوں نے ہندو۔مسلم تضاد کا سب سے زیادہ دباؤ برداشت کیا اور جنگ پلاسی سے تقسیم بنگال اور تقسیم ہند تک برصغیر کی مسلم سیاست میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ چونکہ بنگالی مسلمان اپنی عددی اکثریت کی بدولت پاکستان کے جمہوری نظام میں، اگر وہ قائم ہوتا تو، مؤثر حیثیت کے حامل ہوتے۔ اس لئے انہیں ان کے جمہوری حقوق سے محروم کرنے کے لئے پنجابیوں اور مہاجروں نے خود کو اسلام، اردو، نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان کا چمپئن ظاہر کرنے کی کوشش کی اور بنگالیوں کے کردار کو اسلام اور تحریک پاکستان کے معاملے میں بہت کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے دوران عام پنجابی سپاہی جب بنگالیوں کی بستیوں اور دیہاتوں کو اجاڑتے تھے تو وہ وہاں کے باشندوں کو ہندو سمجھتے تھے اور ان پر ہر طرح کا ظلم ڈھانے کو جائز سمجھتے تھے۔

بنگال میں ہندو۔مسلم تضاد کی تاریخ گزشتہ آٹھ سو سال پر محیط ہے۔ اس کا آغاز تیرہویں صدی کے اوائل میں ہوا جب غزنی کے فرمانروا سلطان محمد غوری کے غلاموں نے برصغیر

میں باقاعدہ مسلمان سلطنتیں قائم کیں۔ یہ تو تمام درسی وغیر درسی کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ محمد غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے سلطنت دہلی کی بنیاد ڈالی مگر یہ عام طور پر نہیں بتایا جاتا کہ اسی وقت محمد غوری کے ایک اور غلام بختیار خلجی نے سلطنت بنگال قائم کی اور سندھ میں ایک دوسرے غلام ناصرالدین قباچہ نے اپنی الگ خودمختار ریاست قائم کی۔ بختیار خلجی نے حملہ کر کے بنگال پر برسراقتدار برہمن حکمران سین خاندان کے اقتدار کا خاتمہ کیا اور مسلم بالادستی قائم کی۔ ہندو محکوم ہو گئے اور مسلمان حاکم بن گئے۔ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر وہاں ہندو۔ بدھ تضاد بہت شدید تھا۔ خصوصاً مشرقی بنگال میں بدھ مت کے پیروکاروں کی اکثریت تھی۔ اس کے علاوہ اونچی ذات اور نیچی ذات کے ہندوؤں کا تضاد بھی کارفرما تھا۔ خصوصاً برہمن خاندان کے حکمرانی کے دور میں اس میں اضافہ ہوا تھا۔ چنانچہ جب بدھ مت کے پیروکاروں اور نیچی ذات کے ہندوؤں کو مسلم حملہ آوروں کی بدولت برہمن بالادستی سے نجات ملی تو وہ کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے اور یہ خطہ مسلم اکثریت کا خطہ بن گیا۔ یہاں مسلم صوفیا نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہندو راجاؤں سے جنگ و جدال بھی کیا اور غازی پیر بھی کہلائے۔ تاہم حکمرانی مقامی مسلمانوں کی بجائے ترکوں، افغانوں اور مغلوں کی رہی۔ مسلم بالادستی کے دور میں ہندو سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر محکوم و مغلوب ہو گئے اور یہیں سے ہندو۔ مسلم تضاد کی بنیاد پڑی۔ ہندو زمینداروں اور راجاؤں کی جانب سے وقتاً فوقتاً بغاوتیں بھی ہوتی رہیں اور مسلمان فرمانرواؤں کی جانب سے انہیں کچلا جاتا رہا اور یوں وہ زیادہ تر باجگزار یا اطاعت گزار کی حیثیت سے رہتے رہے۔ ہندوؤں کو قوت حاصل کرنے کا موقع اس وقت ملا جب یورپی تاجروں خصوصاً انگریزوں نے بنگال کو اپنی تجارت کا مرکز بنایا۔ ہندو ان کے گماشتے بن گئے اور تجارت کے ذریعے چند برس میں انہوں نے بے پناہ معاشی قوت حاصل کر لی۔ ہندو سیٹھوں کا بڑا مؤثر طبقہ پیدا ہو گیا۔ ان میں بینکار بھی بنے جو جگت سیٹھ کہلائے۔ مسلمان نواب اور مغل شہنشاہ ان کے مقروض ہو گئے۔ مسلم زوال کے اس دور میں پانسہ پلٹا اور صدیوں سے محکوم و محروم ہندو انگریزوں کے اتحادی اور گماشتے بن کر بالادست قوت بنتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کمپنی کے کارپردازوں کے ساتھ مل کر مسلم اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ کمپنی کا اقتدار قائم ہوا تو ہندو، انگریزی تعلیم اور تجارتی و معاشی قوت کے بل بوتے پر ہر شعبہ میں چھا گئے اور یوں اٹھارہویں صدی کے آخر تک مسلمان مظلوم و محکوم اور ہندو غالب اور

بالادست قوت بن گئے۔ بندوبست دوامی کے ذریعے مسلمان امرا جاگیروں سے محروم کردیئے گئے۔ محکمہ مال کے ہندو اہلکار نئے زمیندار بن گئے۔ مسلمان کسان، ہندو زمینداروں اور فارموں کے انگریز مالکوں کے دوہرے استحصال کا شکار ہوئے۔ مسلمان کسانوں نے اس ظلم کے خلاف مسلح بغاوتیں کیں۔ ان کی فرائضی تحریک اور وہابی تحریک برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کمپنی کا ظالمانہ دورِ حکومت بنگال کے مسلمانوں نے دیکھا ہے۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے مسلمانوں کو اس کے ظلم و استبداد کا اندازہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہاں انگریز بنگال پر قبضہ کے قریباً 80 سال بعد آئے اور کمپنی کا اقتدار قائم ہونے کے چند ہی سال بعد یہاں تاج برطانیہ کا راج قائم ہوگیا تھا جو اپنے ساتھ بہت سی رعایتیں اور سہولتیں لے کر آیا تھا۔ کمپنی کی ظالمانہ حکومت اور اس کے گماشتے ہندو تاجروں، ساہوکاروں اور زمینداروں کے معاشی، سیاسی اور ثقافتی استحصال کا مقابلہ بنگال کے مسلمانوں نے جنگ پلاسی (1757ء) سے جنگ آزادی (1857ء) تک قریباً ایک سو سال تک کیا۔ جب 1857ء میں تاج برطانیہ کی عملداری قائم ہوئی تو بنگال کے ہندو درمیانہ طبقہ نے انتظامیہ میں زیادہ حصہ مانگنا شروع کردیا اور ان کی جانب سے زیادہ مراعات کا مطالبہ ہونے لگا اور ادھر مسلمانوں میں گزشتہ ایک سو سال تک مار کھانے کے بعد انگریزی تعلیم کے حصول اور انگریزوں سے تعاون کے ذریعے اپنی بدحالی دور کرنے کا رجحان پیدا ہوا تو انگریزوں نے بھی مسلمانوں کی طرف توجہ کرنا شروع کی۔ بنگال کے مسلمانوں میں نواب لطیف اور سید امیر علی نے وہی کام کیا جو سرسید احمد خاں نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کیا اور مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کا کام کیا۔ ہندوؤں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور انڈین ایسوسی ایشن قائم کیں تو ان مسلم زعما نے محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ ہندو۔ مسلم تضاد نے اب ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ سیاسی حقوق اور مراعات کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں نے الگ الگ پلیٹ فارم قائم کرلئے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ 1905ء میں تقسیم بنگال عمل میں آئی۔ یہ تقسیم انگریزوں نے اپنی انتظامی سہولت کے لئے کی تھی لیکن بالواسطہ طور پر اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا تھا کیونکہ مشرقی بنگال مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور تقسیم کے نتیجے میں وہاں کے مسلمانوں کے لئے سیاسی، معاشی و ثقافتی ترقی کا دروازہ کھل گیا تھا مگر ہندو درمیانہ طبقہ نے اس تقسیم کے خاتمہ کے

لئے پر تشدد ایجی ٹیشن کیا۔ ہندو۔ مسلم تضاد کھل کر سامنے آ گیا۔ مسلمانوں نے اپنے حقوق کے لئے 1906ء میں نئے صوبہ مشرقی بنگال کے صدر مقام ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ تاہم مسلمان اپنی نرم روی اور اعتدال پسند سیاست کے ذریعہ ہندو بنگالی بابوؤں کی پر تشدد تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے اور تقسیم بنگال کو نہ بچا سکے۔ نہ ہی پنجاب اور یو۔ پی کے مسلمانوں نے بنگالی مسلمانوں کا اس طرح ساتھ دیا جیسے پورے ہندوستان کے ہندوؤں نے تقسیم بنگال کالعدم کروانے کے لئے بنگالی ہندوؤں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے، جن کے سر پر پہلی عالمی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا تھا اور جو ملک میں داخلی امن واستحکام چاہتے تھے، 1912ء میں بنگال کو دوبارہ متحد کر دیا اور ہندو بورژوا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

پہلی عالمی جنگ سے دوسری عالمی جنگ تک کا عرصہ برصغیر میں ہندو۔ مسلم کشمکش اور دونوں فرقوں کے سیاسی و معاشی حقوق و مفادات کے حصول کی جدوجہد کا دور ہے۔ اس دوران جداگانہ اور مخلوط دونوں بنیادوں پر مختلف فارمولے اور حل تجویز ہوئے۔ نہ صرف بنگالی مسلمانوں کی عددی اکثریت کا وزن مسلمانوں کے پلڑے میں سب سے مؤثر کردار ادا کرتا رہا بلکہ یہاں کے مسلم عوام اور رہنما ہر تحریک اور پلیٹ فارم پر نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خواہ 1919ء کی اصلاحات ہوں، خواہ سی۔ آر۔ داس فارمولا اور خواہ لندن کی گول میز کانفرنسیں اور 1935ء کے آل انڈیا ایکٹ کا نفاذ۔ اور پھر 37-1936ء اور 46-1945ء کے انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی یہاں کی مسلم اکثریتی وزارت مقامی طور پر بھی اور کل ہند سطح پر بھی ہندو بالادستی کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتی رہی۔ بنگالی مسلمانوں نے ہندو بالادستی کے خلاف جو پر عزم جدوجہد کی اور جس کا ثمر قیام پاکستان کی صورت میں حاصل ہوا، اس کی مثال برصغیر کے کسی اور علاقے میں کم نظر آتی ہے۔ 16 راگست 1946ء کو قائداعظم کی کال پر ڈائریکٹ ایکشن ڈے یوں تو پورے برصغیر میں منایا گیا تھا لیکن کلکتہ واحد مقام تھا جہاں تین روز تک ہندوؤں نے منظم طریقے سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی اور اس فقید المثال قتل عام میں محتاط اندازے کے مطابق پانچ ہزار مسلمان مارے گئے تھے۔ اس کے بعد نواکھلی میں کئی ماہ تک ہندو۔ مسلم فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ اور نواکھلی کے فسادات اس اعتبار سے فیصلہ کن تھے کہ ان کے بعد متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندو۔ مسلم تضاد کے حل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی

تھی، اب واحد راستہ پاکستان کو جاتا تھا۔ بہار اور پنجاب کے فسادات بعد میں ہوئے جو مذکورہ فسادات کا منطقی نتیجہ تھے۔ زیر نظر جلد میں بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد کے آغاز سے لے کر قیام پاکستان تک ہندو۔ مسلم تنازعہ کے مختلف ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں خود بخود بنگالی مسلمانوں کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندو غلبہ سے نجات کی جدوجہد میں بنگالی مسلمانوں کا کیا مقام ہے۔

گزشتہ جلدوں کی طرح اس جلد کی تیاری میں میرے عزیز ترین دوست خالد محبوب کی کاوش اور محنت مسلسل شامل حال رہی۔ لائبریریوں سے تحقیقی مواد جمع کرنے سے لے کر پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری تک یہ جلد بھی ان کی مرہون منت ہے۔ سمیع اللہ ظفر اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہماری ہمت افزائی کے لئے وقت نکالتے ہیں اور ان کے مشورے ہمارے لئے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی شفقت اور سرپرستی اس تحقیقی منصوبہ کو بدستور حاصل ہے اور ان سے رہنمائی ملتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں میاں دلاور محمود صاحب، صدیق درانی صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، صفدر قریشی صاحب، مہدی حسن صاحب، قمر عباس صاحب اور ثائر علی صاحب کی شفقت، خلوص، سرپرستی اور اخلاقی تعاون کی بدولت یہ تحقیقی منصوبہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ مصطفیٰ وحید صاحب طباعت اور اشاعت کی ذمہ داری بخیر و خوبی نبھا رہے ہیں اور ہر جلد کو پہلے سے بہتر اور پرکشش بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے برادر عزیز آصف جاوید اور معاون نعیم احسن بھی اس کام میں خلوص دل سے اپنا کردار بہ طریق احسن انجام دیتے ہیں۔ ان جلدوں کی اشاعت ہماری اس پوری ٹیم کی مجموعی کاوش کا نتیجہ ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس جلد کے مآخذ بھی زیادہ تر اوریجنل ہیں۔ قرون وسطیٰ میں مسلم بالادستی کے عہد کے لئے زیادہ تر مسلمان مؤرخین سے رجوع کیا گیا ہے جبکہ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں ہندو غلبہ کے دور کے لئے ہندو اور انگریز مؤرخین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ 1935ء کے بعد کا مواد زیادہ تر اخبارات کی فائلوں سے حاصل کیا گیا ہے جن میں انقلاب، عصر جدید، سول اینڈ ملٹری گزٹ، ایسٹرن ٹائمز اور نوائے وقت شامل ہیں۔ جن لائبریریوں میں بیٹھ کر مواد جمع کیا گیا ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، عجائب گھر لائبریری لاہور، ریسرچ

سوسائٹی لائبریری پنجاب یونیورسٹی، نوائے وقت ریکارڈ روم اور ہمدرد لائبریری کراچی (برائے عصر جدید) شامل ہیں۔ یہاں کے لائبریرین اور عملہ کے دیگر افراد نے جس خلوص اور محبت کے ساتھ تعاون کیا اس کے لئے میں اور خالد محبوب ان کے بے حد ممنون ہیں۔

گزشتہ آٹھ جلدوں نے قارئین سے جو پذیرائی حاصل کی ہے اس کے بعد نویں جلد کا انتظار یقیناً بے چینی کی صورت اختیار کر رہا ہوگا۔ تاہم یہ کاوش اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کہیں کوئی سہو یا غلطی رہ گئی ہو تو میں اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے یہ خواہش کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں مجھے ضرور آگاہ کیا جائے گا تاکہ اگلے ایڈیشن میں اسے دور کیا جا سکے۔

لاہور

اگست 1995ء　　　　حسن جعفر زیدی

باب: 1

بنگال کی خودمختاری اور ہندو۔مسلم تضاد کا تاریخی پس منظر

بنگال کی تاریخ سے اس خطے کی دو خصوصیتیں بہت نمایاں ہوکر سامنے آتی ہیں۔ایک یہ کہ یہ زیادہ تر آزاد و خودمختار رہا اور بہت کم کسی بیرونی مرکز کے زیرنگیں رہا، خواہ یہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کا دور ہو یا بعد کا...... دوسرے یہ کہ یہاں ہندو۔مسلم تضاد مسلمانوں کی آمد سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔

بنگال......تاریخی طور پر ایک آزاد و خودمختار علاقہ

برصغیر کی تاریخ میں وہ ادوار نسبتاً بہت کم مدت کے ہیں جب اس کے طول و عرض پر کسی ایک فرمانروا یا حکمران خاندان کی حکومت کا جھنڈا لہرایا۔ برصغیر زیادہ تر مختلف چھوٹی بڑی سیاسی اکائیوں یا ریاستوں میں بٹا رہا ہے۔ بالخصوص اس کے مشرق اور جنوب کے علاقوں میں عام طور پر آزاد ریاستیں یا سلطنتیں قائم رہی ہیں۔ چنانچہ بنگال میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے صرف بدھ مہاراجہ اشوک (268 ق م تا 226 ق م) کے دور میں جب ہندوستان میں افغانستان سے بنگال تک کے علاقہ پر مشتمل پہلی وسیع سلطنت قائم ہوئی تو یہ علاقہ بھی کچھ عرصہ کے لئے اس کا حصہ بنا۔ ورنہ اس سے پیشتر اور بعد میں بھی صرف بنگال میں ہی ایک سے زیادہ ریاستیں موجود ہوا کرتی تھیں۔ جب تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلمان حملہ آور یہاں پہنچے تب بھی بنگال کم و بیش تین ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ تاہم بنگال کی بڑی ریاست جو اپنی قدیم راجدھانی گوڑ کے نام سے مشہور تھی جنوب اور مغرب پر محیط تھی اس پر سین خاندان کی حکومت تھی اور اس وقت اس کی راجدھانی نادیہ تھی۔ علاوہ ازیں ایک ریاست مشرقی بنگال میں تھی جسے بانگ (وانگا) کہا

جاتا تھا اور ایک ریاست تیرہٹ تھی۔

بارہویں صدی کے اواخر میں غزنی کے فرمانروا سلطان شہاب الدین محمد غوری کی قیادت میں وسط ایشیائی ترکوں کی برصغیر پر یلغار اس قدر بھرپور تھی کہ پرتھوی راج کی قیادت میں شمالی ہند کے ہندو راجاؤں کا متحدہ محاذ ترائن کی دوسری لڑائی (1192ء) میں ہزیمت اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ سلطان محمد غوری خود تو برصغیر پر فرمانروائی نہ کر سکا لیکن اس کے ترک غلام برصغیر کے چار کونوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے واپس وسط ایشیا کا رخ نہ کیا کیونکہ وسط ایشیا منگولوں کی یلغار کی زد میں تھا، ایسے میں ہندوستان ان کے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا اور یہ یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انہوں نے تین جگہوں پر اپنی حکومتیں قائم کیں...... قطب الدین ایبک نے دہلی میں، ناصر الدین قباچہ نے سندھ میں اور محمد بختیار خلجی نے بنگال میں...... اس طرح بنگال میں جو پہلی مسلم حکومت قائم ہوئی وہ کسی دوسرے مرکز کے ماتحت نہیں تھی۔

محمد بختیار خلجی 1202ء میں گھوڑوں کے سوداگر کے بھیس میں اپنے ہمراہ اٹھارہ گھڑسوار لے کر نادیہ شہر میں داخل ہوا اور بغیر کسی مزاحمت کے محل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ راجہ لکشمن سین نے جو کسی ایسی صورت حال کے لئے تیار نہ تھا محل کے پچھلے دروازہ سے بھاگ کر جان بچائی۔ قاضی منہاج سراج لکھتا ہے کہ ”خزانہ، حرم، نوکر، چاکر، درباری اور عورتیں سب کچھ محمد بختیار کے قبضے میں آیا...... مسلمانوں کے ہاتھ اتنی دولت آئی جو تحریر میں نہیں سما سکتی۔“[1] اس کے بعد بختیار نے باقی علاقوں پر قبضہ مستحکم کیا اور پھر شمالی علاقوں کی فتح کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ شمال میں اس کے لشکر کو سیلاب نے آلیا اور اسے سخت نقصان اٹھا کر واپس لوٹنا پڑا۔ اس مہم سے واپسی پر بختیار خلجی بیمار ہو گیا اور 1206ء کے اواخر میں اپنے ایک ساتھی علی مردان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ 1206ء سے 1212ء تک خلجی امرا کے مابین خانہ جنگی ہوتی رہی۔ بختیار خلجی کے ایک اور ساتھی محمد شیران خلجی نے بختیار خلجی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے علی مردان سے جنگ کی، اسے شکست دی اور قیدی بنا کر خود حکومت سنبھال لی۔ وہ 1207ء سے 1208ء تک حکمران رہا۔ 1208ء میں ایک اور خلجی سردار حسام الدین نے دہلی کے فرمانروا قطب الدین ایبک سے مدد لے کر شیران خلجی کے خلاف لشکر کشی کی اور اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ شیران خلجی نے سنتوش (بوگرا) کے علاقے میں اپنی جاگیر میں پناہ لی مگر ایک ہندو زمیندار کے ہاتھوں مارا گیا۔

1208ء سے 1210ء تک حسام الدین خلجی نے تخت دہلی کے ماتحت حکمرانی کی۔ 1210ء میں قطب الدین ایبک نے علی مردان خلجی کو بختیار خلجی کے قتل پر معافی دے دی اور اسے بنگال کا حاکم مقرر کر دیا۔ علی مردان نے بانگ اور کامروپ کے ہندو راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کر دیا اور وہ اسے خراج ادا کرنے لگے۔[2] سلطنت میں رہنے والے ہندو زمیندار بھی اسے خراج ادا کرتے تھے۔ تاہم اس کا دوسرے خلجی امرا کے ساتھ رویہ اچھا نہ تھا، چنانچہ انہوں نے 1212ء میں اسے قتل کر دیا اور حسام الدین کو سلطان غیاث الدین عیواز خلجی کا لقب دے کر گدی پر بٹھا دیا۔ 1210ء میں دہلی کے سلطان قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا جانشین سلطان شمس الدین التمش شمال مغرب سے منگولوں کے حملوں سے خائف تھا اس لئے وہ مشرق میں بنگال کی جانب توجہ نہ دے سکا۔ اس لئے یہاں خلجی سرداروں کو اپنی آزادی وخودمختاری برقرار رکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ سلطان حسام الدین خلجی نے 1227ء تک حکومت کی۔ اسے اڑیسہ، بانگ، کامروپ اور تیرہٹ کے ہندو راجہ خراج ادا کرتے تھے۔[3]

1202ء میں لکشمن سین نے نادیہ سے فرار ہو کر وکرم پور میں آ کر جنوبی ڈیلٹا کے علاقے میں اپنی بچی کھچی ریاست، جس کی حدود ڈھاکہ، فرید پور اور باریسال تک تھیں، حکومت برقرار رکھی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کیسوسین یہاں کا راجہ بنا۔ اس وقت کے ایک شاعر ہری مسرا نے سنسکرت زبان میں لکھی اپنی ایک نظم ''کرکا'' میں لکھا کہ کیسوسین کو مسلمانوں کی جانب سے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ ''کیسو کو گاؤدا (گوڑ) سے بھاگنا پڑا...... برہمن اس علاقے میں مزید نہیں رہ سکتے تھے۔'' غیاث الدین عیواز خلجی کے لئے اس ڈیلٹائی علاقے پر فوج کشی کرنے میں دقت یہ تھی کہ یہاں سال کے چھ مہینے سیلابوں اور بارشوں کی وجہ سے گھوڑ سواروں کے لشکر کے ساتھ رہنا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے ایک جنگی بیڑا تیار کروایا اور 27-1226ء میں وکرم پور پر چڑھائی کر دی۔ جہاں اس وقت وشوا روپ سین حکومت کر رہا تھا۔ ابھی غیاث الدین نے سین راجدھانی کے گرد محاصرہ تنگ کرنا شروع کیا تھا کہ اسے خبر ملی کہ دہلی کے سلطان التمش نے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کی سرکردگی میں بنگال پر چڑھائی کر دی ہے اور گوڑ (جس کا نام اب لکھنوتی رکھ دیا گیا تھا) تک پہنچ گیا ہے۔ ان حالات میں غیاث الدین خلجی اپنی کچھ فوج سین راجدھانی کے محاصرہ پر چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ لکھنوتی کے باہر اس کی ناصر الدین محمود کے ساتھ جنگ ہوئی۔

اس لڑائی میں غیاث الدین عیواز خلجی کو شکست ہوئی اور اسے دوسرے خلجی امرا سمیت گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ یوں کچھ عرصہ کے لئے بنگال پر براہ راست سلطنت دہلی کی حکومت قائم ہوگئی۔ 1202ء سے 1227ء تک بنگال پر مسلمانوں کی پہلی حکومت خودمختار حکومت تھی۔ غیاث الدین خلجی نے اپنا الگ سکہ رائج کیا تھا۔

1227ء سے 1236ء تک بنگال سلطان التمش کے زیر نگیں رہا۔ لیکن اس دوران یہاں سے بغاوتیں ہوتی رہیں۔ 1229ء میں پہلا گورنر التمش کا بیٹا ناصر الدین محمود انتقال کر گیا تو خلجی خاندان کے اختیار الدین بالکا خلجی نے اقتدار پر قبضہ کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سلطان التمش نے 1230ء میں بنگال پر چڑھائی کر کے بالکا خلجی کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 1231ء میں ملک علاؤ الدین جانی کو گورنر مقرر کر کے التمش واپس دہلی لوٹا۔ ایک سال بعد علاؤ الدین جانی کے بغاوت کرنے کا اندیشہ پیدا ہوا تو التمش نے اسے برطرف کر کے ملک سیف الدین ایبک کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ تین سال تک گورنر رہا۔ 20/اپریل 1236ء کو سلطان التمش کا انتقال ہوا اور اسی سال سیف الدین ایبک کا بھی انتقال ہوگیا۔ بہار کے گورنر طغرل طوغان نے سیف الدین کے بعد باغیانہ طور پر قبضہ کرنے والے اوڑ خاں کو شکست دے کر بنگال کو بھی اپنی گورنری میں شامل کر لیا۔ التمش کے انتقال کے بعد سلطنت دہلی خانہ جنگی کا شکار ہوگئی۔ طغرل طوغان جو بنگال اور بہار کا صوبیدار تھا تقریباً خودمختار حاکم بن گیا۔ اس نے سلطنت دہلی سے برائے نام تعلق رکھا اور یہاں 9 سال (1236ء تا 1245ء) تک حکومت کی۔ اس نے بہت بڑا جنگی بحری بیڑہ تیار کرایا اور بانگ کے ڈیلٹائی علاقہ کے سین راجاؤں اور اڑیسہ کے راجاؤں کے ساتھ کئی لڑائیاں کیں۔ ان میں بعض میں کامیابی اور بعض میں ناکامی ہوئی۔

1247ء سے 1251ء تک ملک جلال الدین مسعود جانی گورنر رہا۔ 1251ء میں مغیث الدین ازبک گورنر بنا تو اس نے اڑیسہ کے راجہ نرسم دیو کے خلاف لڑائیاں کیں اور کھوئے ہوئے علاقے حاصل کر لئے جن میں نادیہ بھی شامل تھا۔ چونکہ اس نے یہ کامیابیاں سلطنت دہلی کے تعاون کے بغیر حاصل کی تھیں، اس لئے اس نے تخت دہلی سے بغاوت کر کے سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔ 1257ء میں وہ کامروپ کے راجہ کے خلاف لڑائی میں مارا گیا تو اس کی جگہ عزالدین ازبک نے باگ ڈور سنبھال لی۔ اس نے بھی سلطنت دہلی سے برائے نام تعلق رکھا۔ 1259ء

میں سلطنت دہلی کے صوبہ بہار کے گورنر تاج الدین ارسلان نے حملہ کر دیا۔عز الدین ازبک لڑائی میں مارا گیا تو بنگال تاج الدین ارسلان کے قبضے میں چلا گیا۔اس نے بہار و بنگال پر مشتمل وسیع علاقے پر اپنی خود مختاری قائم کر لی اور تخت دہلی کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔1265ء میں اس کا انتقال ہوا جس کے تین سال بعد تک ارسلان کا خاندان اس علاقے پر حکمران رہا۔اس کے بعد پھر ایک بار تخت دہلی کی گرفت مضبوط ہوئی جب 1268ء میں دہلی کے سلطان غیاث الدین بلبن نے غیاث الدین طغرل کو بنگال کا گورنر مقرر کر کے بھیجا اور اس نے نہ صرف ارسلان کے جانشینوں سے حاصل کردہ علاقے پر قبضہ مستحکم کیا بلکہ اس نے بانگ (مشرقی بنگال) میں واقع زوال پذیر ہندو ریاست کو کچل کر ڈھاکہ اور فرید پور کے علاقوں پر بھی مسلمانوں کی بالادستی قائم کر دی۔علاوہ ازیں جاج نگر اور کامرود کے طاقتور ہندو راجاؤں کو بھی شکست سے دو چار کیا۔منہاج سراج نے جاج نگر کی فتح کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں کا راجہ طغرل خاں کے مقابلے سے ہٹ گیا۔''اس کے اہل وعیال، نوکر چاکر، متوسلین، ساتھی، اس کی دولت اور ہاتھی سب مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔''[4] آگے چل کر کامرود کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے منہاج سراج لکھتا ہے کہ یہاں کی فتح سے ''بے شمار مال وخزانہ ہاتھ لگا۔اسے تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔راقم الحروف (یعنی منہاج سراج) لکھنوتی میں تھا تو اس شخص کی زبان سے سنا تھا، جس کی بات لائق اعتماد تھی، اس نے بتایا کہ گرشاسپ شاہ عجم چین گیا تھا، وہاں سے کامرود کے راستے ہندوستان آیا۔اس وقت سے بارہ سو خزانے سربہ مہر چلے آتے تھے۔اس مال وزر کے کسی حصے پر کسی راجہ نے ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔وہ سب خزانے لشکر اسلام کے قبضے میں آئے۔''[5] قاضی منہاج سراج کو جس لائق اعتماد شخص نے یہ روایت بیان کی وہ کس قدر قابل اعتماد تھا، اس سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ قاضی منہاج خود اس زمانے میں بنگال میں مقیم تھا چنانچہ یہ تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے کہ مذکورہ فتوحات سے مسلمانوں کو بے پناہ دولت حاصل ہوئی۔اس کامیابی کے نشے سے سرشار ہو کر طغرل نے 1280ء میں تخت دہلی کے خلاف بغاوت کر دی اور خود مختار ہو گیا۔1281ء میں دہلی کے سلطان بلبن نے اس کی بغاوت فرو کرنے کے لئے فوج کشی کی اور طغرل کو شکست دے کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔اس کے بعد بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خان کو یہاں کا گورنر مقرر کیا۔بلبن کی موت 1287ء میں ہوئی تو اس کا بیٹا بغرا خان بنگال کا خود مختار فرماں روا بن گیا۔ادھر دہلی کے امرا نے بلبن کے

پوتے اور بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو تخت دہلی پر فائز کر دیا تھا۔ جب کیقباد کو بغرا خان کی خود مختاری کی اطلاع ملی تو اس نے بنگال پر چڑھائی کر دی۔ باپ بیٹے کے لشکر ایک دوسرے کے قریب ہوئے لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی اور باپ بیٹے میں صلح ہوگئی۔ طے پایا کہ بغرا خان بنگال میں اور کیقباد دہلی میں اپنی اپنی جگہ حکمران رہیں گے۔

بغرا خان اور پھر اس کے جانشین جنہیں بلبنی خاندان بھی کہا جاتا ہے، 1324ء تک چالیس سال اس وسیع مشرقی خطے کی سلطنت پر خود مختار حکمران رہے۔ اس میں لکھنوتی، ست گاؤں، سونار گاؤں اور چٹگاؤں تک کا علاقہ شامل تھا۔ اس دوران دہلی کے خلجی سلاطین اور شروع میں تغلقوں نے بھی اس خطے کا رخ نہ کیا۔ یہ قدرے مستحکم دور تھا جس میں بغرا خان (1281ء تا 1291ء)، سلطان رکن الدین کیکاؤس (1291ء تا 1301ء) اور سلطان شمس الدین فیروز (1301ء تا1322ء) حکمران رہے۔ فیروز کے انتقال کے بعد اس کے خاندان میں اقتدار کی رسہ کشی کی وجہ سے یہ سلطنت تین حصوں میں بٹ گئی۔ 1324ء میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر فوج کشی کی اور یہ علاقہ ایک بار پھر کچھ عرصہ کے لئے سلطنت دہلی کا حصہ بن گیا۔ سلطان محمد تغلق نے لکھنوتی، ست گاؤں اور سونار گاؤں کو علیحدہ صوبے بنا کر تین الگ صوبیدار مقرر کر دیئے۔ 1338ء میں سونار گاؤں کے صوبیدار بہرام خاں کے انتقال کے بعد سات گاؤں کے صوبیدار فخر الدین نے سونار گاؤں پر قبضہ کر کے اس سارے علاقے پر اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ کچھ عرصہ بعد مغربی بنگال میں بھی خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔ چند سال تک بنگال کے مشرقی اور مغربی حصے میں دو آزاد سلطنتیں قائم رہیں۔ مشرقی بنگال پر فخر الدین مبارک شاہ اور مغربی حصے پر شمس الدین الیاس شاہ حکمران تھے۔ 1353ء میں الیاس شاہ نے مشرقی بنگال پر حملہ کر کے فخر الدین کے بیٹے اختیار الدین کو شکست دے کر سارے بنگال پر قبضہ کر لیا اور ایک بار پھر آزاد اور خود مختار سلطنت بنگال وجود میں آ گئی جو 1538ء میں شیر شاہ سوری کے قبضے تک برقرار رہی۔ اس دو سو سال کے عرصے میں اس پر مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم رہیں۔ سب سے پہلا خاندان اس سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین الیاس شاہ کے نام پر الیاس شاہی خاندان کہلایا۔ 1353ء میں دہلی کے سلطان فیروز شاہ تغلق نے بنگال پر حملہ کر دیا۔ الیاس شاہ نے کئی ماہ تک قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا مگر قلعہ بندی چھوڑ کر روپوش

ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد فیروز شاہ تغلق واپس دہلی چلا گیا۔ الیاس شاہ نے فیروز شاہ تغلق کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کر کے بنگال پر اپنا اقتدار مستحکم کرلیا۔ اس کے بعد دو سال تک دہلی کے کسی فرماں روا نے بنگال کا رخ نہ کیا۔ اس دوران جن خاندانوں نے یہاں حکومت کی ان کے نام اور ادوار یہ ہیں:

1۔ فخر الدین مبارک شاہ اور جانشین (مشرقی بنگال)	1338ءتا1345ء
2۔ علاؤالدین علی شاہ اور شمس الدین الیاس شاہ (مغربی بنگال)	1339ءتا1353ء
3۔ الیاس شاہی (پہلا دور......مکمل بنگال)	1353ءتا1414ء
4۔ راجہ گنیش/جلال الدین اور جانشین	1414ءتا1437ء
5۔ الیاس شاہی (دوسرا دور)	1437ءتا1486ء
6۔ حبشی	1486ءتا1493ء
7۔ حسین شاہی	1493ءتا1538ء

سلاطین بنگال کے اس دور میں جن حکمرانوں کا دور ترقی وخوشحالی اور امن وامان کے اعتبار سے سنہرا دور سمجھا جاتا ہے ان میں سلطان شمس الدین الیاس شاہ (58-1345ء)، سلطان سکندر شاہ (89-1358ء)، سلطان ناصر الدین محمود شاہ (59-1437ء)، سلطان رکن الدین باربک شاہ (74-1459ء)، سلطان علاؤالدین حسین شاہ (1518ء-1493ء) اور سلطان ناصر الدین نصرت شاہ (1532ء-1518ء) شامل ہیں۔

1538ء میں شیر شاہ سوری نے مغل فرماں روا ہمایوں کو شکست دے کر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد 1539ء میں بنگال پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح یہ خطہ کم وبیش دو سو سال آزاد وخود مختار رہنے کے بعد پھر سلطنت دہلی کا حصہ بن گیا۔ 1555ء میں دہلی میں سوری خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا لیکن بنگال وبہار پر افغانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ 1553ء سے 1563ء تک بنگال سوری افغان سرداروں کی باہمی خانہ جنگی کا شکار رہا۔ 1564ء میں افغانوں کا ایک اور قبیلہ قرارانی بنگال پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور یہاں اس کی آزاد وخود مختار حکومت

قائم ہوگئی۔ سلیمان قرارانی (1565-72ء) کا دور مستحکم رہا۔ اس کے جانشینوں میں پھر سے خانہ جنگی شروع ہوگئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغل شہنشاہ اکبر نے اپنی افواج بنگال پر چڑھائی کے لئے بھیج دیں۔ 1574ء سے ان مہمات کا سلسلہ شروع ہوا جن کی قیادت یکے بعد دیگرے اکبری سپہ سالاروں منعم خاں، راجہ ٹوڈرمل اور خان اعظم نے کی۔ قرارانی افغانوں نے مغل افواج کی شدید مزاحمت کی۔ 1576ء تک مغل افواج صرف مغربی بنگال تک قبضہ مستحکم کرنے میں کامیاب ہوسکیں اور یہاں مختلف مغل گورنر تعینات ہوئے۔ اکبری سپہ سالار راجہ مان سنگھ نے 1490-92ء میں اڑیسہ پر قبضہ کیا اور 1594ء میں وہ بنگال سمیت اس پورے خطہ کا گورنر مقرر ہوا۔ 1595ء میں مان سنگھ نے مشرقی بنگال کے ڈیلٹائی علاقے میں موجود افغانوں کی رہی سہی قوت کو کچل ڈالا اور کم وبیش پورا بنگال مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ مان سنگھ شہنشاہ اکبر کے انتقال (1605ء) کے ایک سال بعد تک اس خطے کا گورنر رہا اور وہاں مغل راج کو مستحکم کیا۔ 1608ء میں شہنشاہ جہانگیر نے اسلام خاں کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا اور ڈھاکہ اس صوبہ کا صدر مقام بنایا گیا۔

ترکوں اور افغانوں کے کم وبیش چار سو سالہ دور اقتدار میں بنگال زیادہ تر آزاد و خود مختار حکمرانوں کے زیرنگیں رہا۔ اس دوران دہلی کے سلاطین نے کئی بار اسے تخت دہلی کے ماتحت کرنے کی کوشش کی مگر ہر کوشش عارضی ثابت ہوئی اور تھوڑے وقفے سے زیادہ دہلی کا غلبہ یہاں قائم نہ رہ سکا۔ یہاں کے مخصوص موسمی حالات اور دہلی سے دوری یہاں کے حکمرانوں کی آزادروی میں معاون ثابت ہوئی جبکہ یہی عوامل سلاطین دہلی کی کمزوری کا باعث بن جاتے تھے۔

مسلم غالب و بالادست اور ہندو مغلوب ومحکوم......

ترک افغان دور 1202ء تا 1575ء

1202ء میں جب ترک مسلمانوں نے بختیار خلجی کی قیادت میں بنگال پر حملہ کیا اس وقت یہاں کی آبادی بیشتر داخلی تضادات کا شکار تھی جن کی بدولت ترکوں کے غلبہ کی راہ ہموار ہوئی اور ان تضادات کی کوکھ سے ایک نئے تضاد یعنی ہندو۔ مسلم تضاد نے جنم لیا جو دراصل خونریز انتقال اقتدار کے دوران بنگال کے معاشرے کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی تضادات سے جڑا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے قدیم باشندوں پر بالائی وشمالی ہندوستان سے آئے

ہوئے آریائی ہندوؤں کو غلبہ حاصل تھا جو گزشتہ ایک ڈیڑھ ہزار سال میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اور اس دوران مقامی آبادی کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ آریائی ہندوؤں نے مقامی آبادی پر سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی جبر مسلط کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں مقامی آبادی کا آریائی ہندوؤں کے ساتھ تضاد پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اس تضاد کا اظہار مذہبی حوالوں سے ہوا۔ مقامی آبادی نے برہمنی ہندومت کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ مقامی باشندے زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار تھے جو دراصل برہمن ازم کے خلاف بغاوت کی پیداوار تھے۔ یا پھر یہ لوگ مقامی مذاہب تنترک مت یا شکتی مت کے پیروکار تھے جو ذات پات کی تفریق کے خلاف تھے۔ ان کی اکثریت مشرقی بنگال میں آباد تھی۔ مغربی حصے میں آباد لوگوں کو بھی آریاؤں کی یلغار کے نتیجے میں مشرقی حصہ میں جا کر آباد ہونا پڑا تھا۔ جو مغربی حصہ میں رہ گئے انہیں آریائی ہندوؤں نے اپنے دھرم میں شامل کر کے اچھوت بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ آریائی ہندو خود کو اونچی ذات میں شمار کرتے تھے اور زیادہ تر مغربی بنگال میں آباد تھے تاہم ان کو سیاسی غلبہ پورے بنگال پر حاصل ہو چکا تھا۔ یہ مشرقی بنگال اور آسام میں آباد قدیمی باشندوں کو ملیچھ قرار دیتے تھے۔[6] اور ولیم ہنٹر کے بقول ''مشرقی بنگال کے مقامی باشندوں کو باعزت ہندو قوم میں کبھی شامل نہیں کیا جاتا تھا۔''[7]

جب ترکوں نے حملہ کیا تو یہاں کی آبادی کی اکثریت ہندو حکمرانوں کے اذیت آمیز رویے سے تنگ تھی۔[8] لہٰذا ترک زیادہ قوت میں نہ ہونے کے باوجود مقامی باشندوں کی جانب سے کوئی مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے سین خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔[9] یہ خلجی ترک وسطی ایشیا کے دشت مارگو سے نکل کر ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع اس علاقہ میں ''جذبہ ایمانی'' سے سرشار ہو کر ''اسلام کے پھیلاؤ'' کی خاطر یہاں نہیں آئے تھے بلکہ ان کی نقل مکانی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وسطی ایشیا کی چراگاہیں معیشت ان کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھی اور دوسرے یہ کہ یہاں منگولوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی جو ان سے بھی زیادہ پس ماندہ علاقے سے آندھی کی طرح اٹھے اور بگولے کی طرح وسط ایشیا کو روندتے ہوئے ایران اور عراق کا رخ کر رہے تھے۔ چنانچہ وسط ایشیا سے ترکوں کے غول کے غول برصغیر کا رخ کر رہے تھے۔ ان میں سے خلجی ترکوں کا یہ گروہ قسمت آزمائی کرتا کرتا بنگال پہنچ گیا۔ ان کے بعد اور بہت سے ترک اور افغان گروہ بھی یہاں پہنچتے رہے اور کم و بیش پونے چار سو سال تک یہ علاقہ ان

کی آزاد و خود مختار سلطنت بنا رہا۔ ترک اور افغان جو مذہبی عقائد کے لحاظ سے مسلمان تھے جب یہاں آ کر یہاں کے وسائل پر قابض ہوئے تو اس کے نتیجے میں ان وسائل پر پہلے سے قابض ہندو حکمران محروم ہو گئے اور یہ وسائل ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایک گروہ کے باہر سے آ کر وسائل پر قابض ہو جانے اور دوسرے کے ان وسائل سے محروم ہو جانے کے نتیجے میں ان دونوں گروہوں کے مابین تضاد کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ اس مادی بنیاد نے ہندو۔ مسلم تضاد کو جنم دیا۔ یہ کوئی دو مذاہب کے مابین محض عقائد پر جھگڑا نہیں تھا بلکہ دو مفادات کے مابین لڑائی تھی جس میں ایک مفاد دوسرے پر غالب ہو گیا تھا۔

اس عہد میں اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل کر ترکوں یا افغانوں یعنی مسلمانوں کے ہاتھ میں مرکوز ہو گیا تھا۔ حاکم اعلیٰ سے لے کر شہر کے کوتوال تک مسلمان امرا فائز ہوئے۔ تمام انتظامیہ پر ان کا قبضہ رہا۔ اس عہد کے اہم عہدے یعنی قطعہ دار، وزیر، دبیر خاص، سرلشکر، امیر البحر، قاضی، عارض لشکر، شق دار اور کوتوال مسلمانوں کے لئے مخصوص رہے اعلیٰ عہدوں پر ہندوؤں کے تقرر کو حرام سمجھا جاتا تھا۔[10] زمینیں اور جاگیریں ہندو زمینداروں سے چھین کر مسلمان امرا کو دے دی گئیں۔ جن ہندو زمینداروں کے پاس زمینیں رہنے دی گئیں ان سے خراج وصول کیا گیا۔ نصف سے زائد فصل بطور جزیہ وصول کی گئی۔ فخر الدین مبارک شاہ کے دور میں ابن بطوطہ نے (46-1345ء) میں مشرقی بنگال کی سیاحت کی۔ وہ سلہٹ اور سونار گاؤں کے علاقوں میں گھوما پھرا۔ اس نے یہاں کی معاشی و سماجی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہندوؤں کی معاشی ابتری کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”حاکم ان کی فصل کا آدھا حصہ بلا وجہ چھین لیتا ہے۔ دوسرے ٹیکس اس کے علاوہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔“[11] ترک اور افغان حکمران جس علاقے کے ہندو راجہ کو شکست دیتے تھے اس کی راجدھانی کو بری طرح پامال کرتے تھے اور جس حد تک ممکن ہوتا خوب مال غنیمت لوٹتے تھے۔ محلوں، مندروں اور بتوں کے اندر محفوظ دولت کے علاوہ عورتوں کو بھی مال غنیمت کا حصہ بنا کر لے آتے تھے۔ پھر محلوں، مندروں اور بتوں کو تباہ و برباد کر دیا جاتا تھا۔[12] چونکہ جہاں ظلم ہوتا ہے وہاں مزاحمت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے ہندو راجاؤں کی جانب سے اس تمام عرصہ کے دوران مسلسل مزاحمت جاری رہی اور ترکوں اور افغانوں کی ہندو راجاؤں سے جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ اگر وقتی طور پر دب بھی جاتے تھے اور خراج دینا شروع کر دیتے

تھے تو پھر کچھ عرصہ بعد جب موقع دیکھتے تھے تو باغی ہو جاتے تھے۔ بقول عبدالکریم ''وہ بید کی مانند تھے جسے بھینچنے سے وہ دب تو جاتی ہے لیکن ذرا ڈھیل دینے سے وہ اسی قوت سے اکڑ کر سیدھی ہو جاتی ہے جتنی قوت سے اسے دبایا جاتا ہے۔''[13] چنانچہ ان مسلمان حکمرانوں کو ایک ہی علاقہ بار بار فتح کرنا پڑتا تھا۔ اس جنگ وجدال میں جہاں کہیں بھی کسی ہندو راجہ کو کامیابی حاصل ہو جاتی تھی اسے اس زمانے کے سنسکرت ادب میں بڑا خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا۔

ہندو۔ مسلم تضاد صرف حکمرانوں کی سطح پر ہی پیدا نہیں ہوا تھا کہ اقتدار کی خاطر ایک طرف ہندو راجاؤں کی ترکوں یا افغانوں کے ساتھ جنگ وجدال ہوتی رہی اور عوام الناس اس سے الگ تھلگ رہے۔ عوام الناس تاریخ کی کسی بھی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں ہوتے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کے قائم کردہ نفرت کے نظام سے تنگ آئے ہوئے یہاں کے قدیمی باشندے مسلمان بن کر نہ صرف برہمنی جبر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ نئے حکمرانوں سے تحفظ کی ضمانت کا بندوبست بھی حاصل کر سکتے تھے۔ یہ وہ مادی بنیاد تھی جس کی وجہ سے مشرقی بنگال کی آبادی کی اکثریت جسے برہمنی نظام میں گھٹیا سمجھا جاتا تھا، مسلمان ہو گئی۔ اس بنیاد پر مسلمان حملہ آوروں اور مقامی ہندو راجاؤں کی لڑائیوں نے بہت حد تک مسلمانوں اور ہندوؤں کی لڑائیوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور یہ تضاد ہندو۔ ترک تضاد یا ہندو۔ افغان تضاد کے بجائے ہندو۔ مسلم تضاد بن گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جہاں کہیں جب بھی کبھی کوئی مسلمان حملہ آور فتحیاب ہوتا تھا تو مسلمانوں کو ہر قسم کی مراعات حاصل ہو جاتی تھیں اور ہندوؤں پر مصائب ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس طرح جہاں کہیں کبھی کسی ہندو راجہ کو کامیابی حاصل ہو جاتی تھی، ہندوؤں کے لئے خوشی کا سورج طلوع ہو جاتا تھا اور مسلمان مشکل میں پھنس جاتے تھے۔ ہر صورت میں حکمران اور محکوم طبقوں یا فرقوں کے پاس مذہب کا پرچم ہوتا تھا۔ مذہب حاکمیت یا محکومیت کی علامت بن گیا تھا۔

بنگال کی تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمان رہی ہے جبکہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے علاقے جو مسلمان حکومتوں کے مرکز تھے، وہاں مسلمان اقلیت میں رہے اور زیادہ تر شہروں تک محدود رہے۔ ڈیلٹائی بنگال میں دیہی آبادی کی اکثریت مسلمان تھی۔ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہاں اسلام کے تیزی سے پھیلنے اور آبادی کی اکثریت میں پھیلنے کی وجہ پہلے سے موجود بدھوں اور ہندوؤں کا تضاد تھا۔ بالخصوص مشرقی بنگال میں جہاں

آبادی کی اکثریت غیر آریائی تھی اور بدھ مت کی پیروکار تھی۔ یہاں ایسی مذہبی روایتیں مقبول عام تھیں جو بدھوں اور ہندوؤں کے تضاد کو یہاں کے عوام الناس میں اسلام کے پھیلاؤ کا ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ ''سونیا پرانا'' کے بنگالی زبان میں منظوم باب ''نرنجن روشما'' میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح برہمن خاندان، عام لوگوں سے جو بدھ مت کے پیروکار تھے، زبردستی باقاعدہ ٹیکس ''وک شینا'' وصول کرتے تھے اور کس طرح ان لوگوں نے مسلمان ہو کر برہمنوں کے خلاف لڑائی کی اور ان کے مندروں میں داخل ہو کر وہاں رکھی مورتیوں کو توڑ ڈالا اور ان میں رکھی دولت پر قبضہ کر لیا۔[14] اس طرح یہاں پہلے سے موجود آریائی۔غیر آریائی تضاد اور بدھ۔ہندو تضاد بعد میں ہندو۔مسلم تضاد کی صورت میں ڈھل گیا۔

مقامی آبادی کے قبول اسلام کے بعد مقامی آبادی کا ہندو راجہ یا برہمن کے ساتھ تضاد ہمیں صوفیا کی روایات میں ملتا ہے۔ بنگال میں عام طور پر اور مشرقی بنگال میں خاص طور پر چپہ چپہ پر بزرگوں کی خانقاہیں اور درگاہیں ملتی ہیں۔ کم وبیش ہر بزرگ کے ساتھ اس قسم کی روایت منسوب ہے کہ یا تو بزرگ اپنے مریدوں کی فوج لے کر ہندو راجہ سے نبرد آزما ہوا اور اس جدل میں مارا گیا اور یا ہندو راجہ نے بزرگ کی عوام میں مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر اس کو مروا دیا۔ اس سلسلے میں رام پال کے بابا آدم شہید کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو یہاں آنے والا پہلا بزرگ ہے۔ اس کا مزار ڈھاکہ کے ضلع بلال باڑی میں ہے۔ یاد رہے کہ سین راجاؤں نے بختیار خلجی سے شکست کھانے کے بعد مشرقی بنگال کے ڈیلٹائی علاقہ میں اپنی ریاست کو برقرار رکھا تھا۔ انہوں نے یہاں ہندو احیا کے لئے کولن مت رائج کیا اور مقامی آبادی کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا جو اسلام کی طرف راغب ہوتی جا رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ بلال سین کے زمانے میں ایک مسلمان نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر ایک گائے ذبح کی۔ اس پر راجہ کی کڑی سزا کے خوف سے یہ مسلمان بھاگ کر مکہ پہنچا اور وہاں ایک فقیر بابا آدم کو ساری بات بتائی۔ بابا آدم اپنے چھ سات ہزار پیروکاروں کے ہمراہ بنگال پہنچا اور بلال باڑی جو راجہ کا دارالحکومت تھا، کے قریب رام پال کے مقام پر قیام کیا۔ اس نے یہاں بیٹھ کر گائیں ذبح کرنا شروع کر دیں۔ اس پر راجہ کو بڑا طیش آیا اور اس نے بزرگ اور اس کے پیروکاروں کو قتل کروا دیا۔ اس واقعہ کو لکھتے ہوئے انند بھٹ نے مسلمانوں کے لئے ملیچھ کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس سے پیشتر یہاں کے غیر آریائی بدھ مت کے پیروکاروں کے لئے استعمال کیا

جاتا تھا۔ بعد میں مسلمانوں کے لئے عام طور پر یہی لفظ استعمال کیا گیا۔ [15]

بنگال کے مسلمان صوفیا کا کردار شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان صوفیا سے قدرے مختلف تھا۔ بنگال کا مسلمان صوفی جنگجو یانہ کردار کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ تبلیغ کے علاوہ فوجی مہمات بھی انجام دیتا تھا اور لشکروں کی سپہ سالاری بھی کرتا تھا۔ ایسے لوگ جو ہندو برہمنیت کے خلاف ہوتے تھے، اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اپنی ضروریات کے پیش نظر دائرہ اسلام میں شامل ہو جاتے تھے لیکن جو اونچی ذات کے ہندو اس کے خلاف مزاحمت کرتے تھے ان کے خلاف وہ فوج کشی کر دیتا تھا۔ وہ ہندوؤں کو قوت کے زور پر مرعوب کرنے اور اطاعت تسلیم کرانے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ محمد شاہ سلطان ماہی سوار جس کا مزار ماہستان ضلع بوگرا میں ہے، دمشق سے سانديپ کے راستے ہری رام نگر پہنچا اور وہاں کے راجہ بال رام کو جو کالی دیوی کی پوجا کرتا تھا، قتل کر دیا۔ بال رام کے وزیر نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ ماہستان گیا جہاں اس کی لڑائی وہاں کے راجہ پرسورام اور اس کی بہن سیلا دیوی سے ہوئی۔ پرسورام لڑائی میں مارا گیا اور سیلا دیوی نے دریائے کراتیا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ پرسورام ایک متعصّب، کٹر اور ظالم حکمران تھا۔ اس کی رعایا نے مسلمان ہو کر اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ اس لڑائی میں مارا گیا۔ [16] محمد شاہ کو ماہی سوار اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ایک مچھلی نما کشتی پر سوار ہو کر سفر کرتا تھا۔ چٹا گانگ کے لوک ادب میں ماہی سوار کا ذکر اس حوالے سے آتا ہے کہ اس نے وہاں کے برہمن اچاریہ کی بیٹی کے ساتھ زبردستی شادی کی۔ وہ شیر پر سوار ہو کر آیا۔ سب برہمن ڈر کر بھاگ گئے اور اچاریہ نے خوفزدہ ہو کر اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دی۔ مسلمانوں کے ہندوؤں کی لڑکیوں کے ساتھ زبردستی شادی کرنے کے بارے میں مقامی بنگالی ادب میں کچھ اور جگہ بھی ذکر ملتا ہے۔ [17]

شروع میں آنے والے اکثر صوفیا کی آمد عرب سے ہوئی کیونکہ چٹا گانگ بہت قدیم تجارتی بندرگاہ تھی اور عرب تاجروں کا اس بندرگاہ سے بہت قدیم عرصہ سے تعلق تھا۔ بابا آدم اور شاہ سلطان علی الترتیب مکہ اور دمشق سے آئے۔ علاوہ ازیں مخدوم شاہ دولہ شاہ یمن سے آیا۔ جس کا مزار پبنہ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے تاجر اور اس کے پیروکار یمن سے جہاز میں بنگال پہنچے اور شہزاد پور کے ساحل پر اترے۔ بنگال اور بہار پر قابض ہندو راجہ نے ان غیر ملکیوں کے

خلاف مزاحمت کی اور لڑائی میں یہ بزرگ اور اس کے سب پیروکار مارے گئے۔ منگل کوٹ ضلع بردوان میں مخدوم شاہ محمد غزنوی کا مزار ہے۔ وہ بھی ابتدائی دور میں یہاں آیا۔ اس کی منگل کوٹ کے راجہ وکرم کیسری کے ساتھ جنگ بھی ہوئی اور اس نے یہاں اسلام کی تبلیغ بھی کی۔ راج گیر میں واقع ہندوؤں کا مذہبی مقام ''سرنگی رشی کنڈ'' تھا جس پر مسلمان صوفیا نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور اس کا نام مخدوم کنڈ رکھ دیا۔

صوفیا کے بارے میں مذکورہ بالا روایتیں اور حکایتیں اپنے اندر کتنے فیصد حقیقت اور کتنے فیصد افسانہ رکھتی ہیں، اس سے قطع نظر یہ حقیقت کہ یہ روایات و حکایات عوام نے مشتہر کیں اور ان میں مقبول ہوئیں، اس بات کی غماز ہیں کہ جس روز مسلمانوں نے حملہ آوروں، مبلغوں، تاجروں اور درویشوں کی شکل میں بنگال کی سرزمین میں قدم رکھا، اسی روز سے یہاں ہندو۔ مسلم تضاد نے جنم لیا اور یہ تضاد نیچے سے اوپر تک معاشرے کے ہر حصے میں سرایت کر گیا۔

ہر حکمران اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے بالعموم اپنے ہم مذہبوں کا اشتراک وتعاون حاصل کرتا تھا اس سلسلہ میں بھی مسلمان صوفیا نے اہم کردار ادا کیا۔ ہمسایہ ہندو راجہ کے علاقے پر حملہ سے پیشتر وہاں ایک صوفی بزرگ چلا جاتا تھا۔ وہ وہاں کے محکوم غیر آریائی اور بدھ مت کے پیروکاروں کو اپنی تبلیغ کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل کر لیتا کیونکہ وہ غریب و پسماندہ عوام کو اخوت اور مساوات کا درس دے کر عملی طور پر ان کا معاشی اور معاشرتی درجہ بلند کرتے تھے جبکہ آریائی ہندوؤں کے ظالمانہ معاشرتی نظام میں انہیں اپنی زندگی میں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جب مقامی آبادی کا ایک حصہ مسلمان ہو جاتا تھا تو اس علاقے میں ہندو۔ مسلم تضاد شدید ہو جاتا تھا۔ اس دوران طرفین کے مابین کوئی نہ کوئی اشتعال انگیز واقعہ رونما ہو جاتا تھا جس کی بنا پر قریبی ریاست کا مسلمان فرمانروا یا کوئی غازی پیر فوج لے کر اس علاقہ پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ ہندوؤں کے کسی علاقے میں مسلمان خفیہ طور پر گائے کو ذبح کرتے۔ پھر اس کے گوشت کا ٹکڑا پتنگ میں باندھ کر یا کسی اور طریقے سے ہندو راجہ کے محل یا برہمن کے مکان یا مندر کے اندر پھینک دیتے تھے۔ اس پر ہندو۔ مسلم کشیدگی کی پہلے سے موجود فضا مزید شدید ہو جاتی تھی۔ ہندو راجہ مسلمانوں پر سختی کرتا تھا۔ یہ مسلمان قریبی مسلمان ریاست کے حکمران یا غازی پیر سے درخواست کرتے تھے اور وہ اس علاقے پر لشکر کشی کر دیتا تھا۔ مقامی

آبادی کے ایک حصہ کا تعاون پہلے سے موجود ہونے کے سبب عموماً اس لشکر کو کامیابی حاصل ہو جاتی تھی۔ مسلمان اس علاقے پر قابض ہو کر ہندوؤں کو سیاسی اقتدار، معاشی بالادستی اور سماجی منصب سے محروم کر دیتے تھے۔[18]

سلطان رکن الدین کیکاؤس کے زمانے میں جب وہ سات گاؤں کی جانب اپنی سلطنت کی توسیع کر رہا تھا، ظفر خان غازی ہگلی کے راجہ بھودیو نرپتی کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ اس کا مزار تربنی میں ہے۔ اس جنگ میں شاہ صفی الدین نے بھی حصہ لیا جس کا مزار چھوٹا پاندوہ (ضلع ہگلی) میں ہے۔ اس کے بعد اس کی جگہ الغ خاں نے جہاد جاری رکھا۔ الغ خاں نے راجہ کو شکست دے کر اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی اور مقامی آبادی کو مسلمان کیا۔ اس کا مزار بھی تربنی میں ہے۔

سلطان شمس الدین فیروز کے زمانے میں سلطنت بنگال کی وسعت میمن سنگھ اور سلہٹ میں ہوئی۔ 1303ء میں سلہٹ کے راجہ گوڑ گوبند کی شکست کا سہرا، ہندو اور مسلمان دونوں کی روایت کے مطابق، حضرت شاہ جلال کے سر بندھتا ہے جس کا مزار سلہٹ میں واقع ہے۔ ہندو روایت یہ ہے کہ راجہ گوڑ گوبند کو پیروں اور غازیوں کی فوج نے شکست دی جنہیں بنگال کے سلطان شمس الدین کی کمک بھی حاصل تھی۔[19] مسلمان روایت یہ ہے کہ ''حضرت شاہ جلال نے تین سو تیرہ کا لشکر لے کر سلہٹ پر حملہ کر دیا۔ راجہ گوڑ گوبند نے ایک لاکھ پیادوں کے ہمراہ مسلمان فوج کا مقابلہ کیا۔ پھر قرآن مجید کی آیت کے مطابق ''اقلیت پر خدا کی رحمت مہربان ہوئی اور اقلیت اکثریت پر غالب آ گئی۔'' راجہ گوڑ گوبند شکست کھا کر واصل جہنم ہوا اور تمام علاقے پر لشکر اسلام کا قبضہ ہو گیا۔ خوب مال غنیمت ہاتھ لگا۔ شیخ مجرد (حضرت شاہ جلال) نے اپنے ساتھیوں میں مال غنیمت اور مفتوحہ علاقہ تقسیم کر دیا اور انہیں شادیاں کرنے کی بھی اجازت دے دی۔''[20] گویا ہندوؤں کے مطابق شاہ جلال کی پشت پر سلطان شمس الدین تھا جبکہ مسلمانوں کے مطابق اسے خدا کی مدد حاصل تھی۔ صوفیا اور سلاطین بنگال کے مابین تعاون کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ ہمت آباد ضلع دیناج پور کے پیر بدر الدین نے وہاں کے ہندو راجہ ماہی سا کے مظالم سے تنگ آ کر سلطان علاؤ الدین حسین شاہ سے مدد کی درخواست کی۔ حسین شاہ نے اس ہندو راجہ کو شکست دی اور اس علاقے میں اسلام کا خوب فروغ ہوا۔[21]

بنگال کے ہندو۔ مسلم تضاد میں مسلمان صوفیا نے عسکری کردار ادا کیا جبکہ شمال مغربی ہندوستان میں بعض صوفیا نے ہندو۔ مسلم تضاد کو کم کرنے کی ثقافتی کوششیں کیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور طرز عمل سے ہندوؤں کو قریب لانے کی کوشش کی اور ہندوؤں کی ثقافت کو اپنے رہن سہن میں جگہ دی۔ بابا فرید، امیر خسرو اور مادھولال حسین نے اس کوشش میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے شاعری، رقص، موسیقی اور رہن سہن کے زور پر ہندو۔ مسلم یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی جو اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مادی فرق موجود رہنے کی وجہ سے ناکام ہو گئیں۔ تاہم اس قسم کی کوشش ضرور کی گئی تھی۔ جبکہ بنگال میں اس قسم کی کوئی کوشش مسلمان صوفیا کی جانب سے نہیں ہوئی۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں بالائی ہندوستان میں بھگتی تحریک کے نام سے ہندو سنتوں اور مسلمان صوفیا نے ایک تحریک شروع کی جس میں انہوں نے ذات پات اور فرقہ وارانہ تضادات کو ثقافتی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں بھگت کبیر داس (1425ء تا 1518ء) اور بابا گورونانک (1469ء تا 1593ء) ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ کبیر داس کی تعلیم یہ تھی کہ رام، رحیم، اللہ، خدا، ہری اور واہے گرو اور اس طرح کے دوسرے نام دراصل ایک ہی خدا کے نام ہیں۔ وہ بت پرستی کا مخالف تھا۔ بابا گورونانک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقیدہ کے بین بین ایک نیا عقیدہ جنم دینے کی کوشش کی۔ جس دور میں بالائی ہندوستان میں یہ کوشش ہو رہی تھی بنگال میں بھی ایک سادھو چیتنیا (1486ء تا 1534ء) نے بھگتی تحریک شروع کر دی لیکن بالائی ہند کی بھگتی تحریک اور بنگال کی بھگتی تحریک میں ایک فرق یہ تھا کہ اول الذکر میں زیادہ تر زور ہندو۔ مسلم تضاد کو کم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے پر تھا جبکہ مؤخر الذکر میں ذات پات کے فرق کو مٹانے پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ چیتنیا مسلمان صوفیا کے جمہوری خیالات سے متاثر تھا لیکن اس کی تحریک زیادہ تر برہمن ازم کے رسم و رواج اور ذات پات کے ظالمانہ نظام کے خلاف رہی۔ ذات پات کے نظام کے خلاف ردعمل سے ہندو مت کو سب سے زیادہ نقصان اور اسلام کو سب سے زیادہ فائدہ بنگال میں پہنچا تھا۔ چیتنیا اگرچہ خود برہمن تھا لیکن اس نے ذات پات کے خلاف محاذ آرائی قائم کر کے ذات پات کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہوئے ہندو مت کو بچانے کی مؤثر کوشش کی۔ اس نے یہاں کے قدیم تنترک مت اور شکتی مت کا برہمنی ہندو مت سے امتزاج کر کے بنگال کے

لئے نئے ہندومت کی بنیاد رکھی جو وشنومت کہلایا۔ چیتنیا کا کردار بالائی ہند کے بھگتیوں کے برعکس بنگال میں ہندومت کے احیا کا ذمہ دار بنا۔ اس کے مناظرے پنڈتوں اور برہمنوں کے علاوہ مسلمان قاضیوں کے ساتھ بھی ہوتے تھے اور وہ اکثر یہ مناظرے جیت لیا کرتا تھا۔ جادوناتھ سرکار لکھتا ہے کہ ''وشنومت سے قبل بنگال کے ہندوؤں کے عقائد توہمات پر مبنی تھے اور وہ مسلمانوں کے عقلی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پنڈتوں نے ان کو لاوارث بھیڑ بکریوں کی طرح چھوڑ رکھا تھا اور ان کی رہنمائی کے لئے اس علاقے میں نہیں آتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کو گھٹیا سمجھتے تھے۔ وشنوازم سے بنگال میں ہندومت کا احیا ہوا اور وہ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوا۔'' اس کا لازمی نتیجہ ہندو۔ مسلم تضاد میں مزید شدت پیدا ہونے کی صورت میں نکلا۔ اگرچہ بالائی ہندوستان میں مسلمان صوفیوں اور ہندو سنتوں کی کوششوں کے نتیجہ میں بھی لامحالہ ہندو۔ مسلم تضاد مزید شدید ہوا کیونکہ یہ کوششیں محض ثقافتی سطح پر کی گئی تھیں اور اس کی جڑ میں موجود معاشی اور سیاسی مادی وجوہات کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ کسی بھی تضاد کو محض ثقافت کے زور پر حل نہیں کیا جا سکتا تاآنکہ اس تضاد کو دور کرنے کے لئے مادی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔

بنگال میں ترک اور افغان سلاطین کی جانب سے ان کی اپنی وقتی مصلحتوں کی وجہ سے بعض موقعوں پر اس قسم کی کوششیں ہوئیں۔ جب کبھی ان ترک اور افغان سلاطین کو سلاطین دہلی کی جانب سے بالادستی کا خطرہ لاحق ہوتا تھا تو یہ مقامی ہندوؤں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی پالیسی اختیار کرتے تھے۔ ایسے میں مقامی ہندوؤں کو ملازمتوں میں بھی شامل کر لیا جاتا تھا اور ثقافتی سطح پر بھی ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ان میں سے جن حکمرانوں کا دور زیادہ دیر تک رہا تھا انہوں نے اس قسم کی زیادہ تر کوششیں کی تھیں۔ غالباً داخلی استحکام کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس ضمن میں الیاس شاہ، سکندر شاہ، حسین شاہ اور نصرت شاہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو چھوٹی موٹی ملازمتیں دینے کے علاوہ ان کی ثقافتی حوصلہ افزائی بھی کی۔ بنگالی ہندو شاعروں کو دربار سے سرپرستی حاصل ہوئی۔ حسین شاہ نے مہا بھارت اور بھگوت گیتا کا بنگالی ترجمہ کرنے کے لئے شاعروں کو مامور کیا۔ ہندو شاعروں اور دانشوروں کے وظائف مقرر کئے۔ حسین شاہ نے چیتنیا کی بھی سرپرستی کی۔ اس کے دور میں سیتا پیر کا تصور بھی ابھرا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ پیر تھا۔ حسین شاہ نے اس خیالی پیر کے تصور کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن یہ کوششیں بھی زیادہ تر ثقافتی

سطح تک محدود رہیں اور ہندو۔ مسلم تضاد کو ختم کرنے میں ناکام رہیں۔

ہندوؤں کو بڑے عہدوں پر انتظامیہ میں شامل کرنا تو درکنار چھوٹی سطح پر شامل کرنے کے لئے بھی بیشتر ترک امرا تیار نہ تھے۔ مسلمان صوفیا ان ترک امرا کے لئے نظریاتی بنیاد فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کبھی کسی بادشاہ نے اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت ہندوؤں کو اپنی انتظامیہ میں چھوٹی موٹی جگہ دینے کی کوشش کی تو مسلمان قاضیوں اور صوفیوں نے اس کے خلاف فتاویٰ صادر کرنے شروع کر دیئے۔ جب راجہ گنیش الیاس شاہی انتظامیہ میں مؤثر ہونے لگا تو مسلمان علما کا اس کے ساتھ شدید ترین تضاد قائم ہو گیا۔ مولانا ظفر شمس بلخی نے سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کو ایک کھلا خط لکھا ''...... احادیث و تفاسیر میں آیا ہے کہ کافروں اور اجنبیوں کو اپنا معتمد اور وزیر مت بناؤ...... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے لئے مسائل پیدا کریں گے...... وہ تمہیں تباہ کر دیں گے...... کسی کافر کو چھوٹے موٹے کام پر تو لگایا جا سکتا ہے مگر اسے کسی جگہ کا والی نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اس طرح وہ مسلمانوں پر بھی اپنا تسلط قائم کرے گا...... وہ کافر جاگیردار جن کے سر جھکائے جا چکے ہیں، انہیں نہ صرف اپنی اپنی جاگیروں کے انتظام کا اختیار دے دیا گیا ہے بلکہ انہیں اسلامی علاقوں پر بھی منتظم مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ مسلمانوں پر حکم چلاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔[22] اس خط کا پس منظر یہ تھا کہ شمالی بنگال کا ایک بڑا ہندو جاگیردار گنیش، الیاس شاہی دربار میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ 1410ء میں سلطان غیاث کا انتقال ہوا تو اس کے کم سن بیٹے حکومت نہ سنبھال سکے اور آہستہ آہستہ گنیش مقتدر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ 1414ء میں وہ بذات خود تخت نشین ہو گیا اور خود کو راجہ گنیش کہلانے لگا۔ اس نے ہندومت کے احیا اور مسلمانوں پر مظالم میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے مسلمان رہنماؤں کا، جو اس وقت صوفیا اور علما کی صورت میں موجود تھے، قتل عام کروا دیا۔[23] ہندو۔ مسلم تضاد شدید ترین ہو گیا۔ سارا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔

راجہ گنیش کا سات سالہ دور بنگال کی داخلی بدامنی کا دور ہے جس کو اس کے بعد اس کے بیٹے جادو سین نے اسلام قبول کر کے ختم کرنے کی کوشش کی۔ جادو سین بطور ہندو نہ تو حکمرانی کر سکتا تھا اور نہ ہی حالات پر قابو پا سکتا تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف 12 سال تھی۔ ہندو امرا نے اسے کٹھ پتلی بنا کر اصل اقتدار اپنے ہاتھوں میں رکھا جس سے اس کے دل میں ان سے

نفرت پیدا ہوئی۔ مسلمان اور ہندو امرا کے باہمی تضاد سے سلطنت ویسے ہی عدم استحکام کا شکار ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے استحکام کے حصول کے لئے نہ صرف خود اسلام قبول کیا اور جادوسین سے جلال الدین بنا بلکہ اس نے عباسی خلیفہ سے مسلمانوں پر حکمرانی کا فتویٰ بھی حاصل کیا تا کہ مسلمان امرا سے اپنی اطاعت اور تعاون حاصل کر سکے۔ اس نے 1432ء تک بڑے استحکام کے ساتھ حکمرانی کی۔ ہندوؤں کو بڑی بری طرح کچلا اور جن ہندوؤں نے مسلمان صوفیا کو قتل کیا تھا اور سزائیں دی تھیں، انہیں اس نے کڑی سزائیں دیں۔[24]

جلال الدین پہلا بنگالی النسل مسلمان حکمران تھا۔ اس کی زندگی میں ترکی النسل مسلمان امرا نے اس کے اقتدار کو چیلنج نہ کیا کیونکہ وہ اپنے سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں سے بڑھ کر اسلام کا علمبردار بن گیا تھا۔ تاہم جب 1432ء میں اس کا انتقال ہوا تو ترک امرا نے جلال الدین (جادوسین) کے جانشینوں کو مستحکم نہ ہونے دیا اور 1437ء میں انہوں نے الیاس شاہی خاندان کے ناصرالدین محمود کو تخت نشین کر کے دوبارہ الیاس شاہی اقتدار کو بحال کر دیا۔ اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے تمام ہندوؤں کو انتظامیہ سے نکال باہر کیا۔ انہوں نے حبشیوں پر اعتماد کرنے کی کوشش کی لیکن اسلام کا رشتہ ترکوں اور حبشیوں کا اتحاد بھی قائم نہ رکھ سکا۔ حبشیوں نے موقع پاتے ہی اقتدار پر قبضہ کرلیا اور سات سال (93-1486ء) تک حکومت پر قابض رہے اگرچہ ترک امرا نے بہت جلد علاؤالدین حسین شاہ کی سربراہی میں ان سے دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا اور حسین شاہی خاندان کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ مسئلہ محض دو مذہبوں کی لڑائی یا کسی ایک مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی یک جہتی کا نہیں بلکہ مفادات کے ٹکراؤ کا تھا۔ ترکوں کے تمام دور میں ہندو۔ مسلم تضاد کسی مرحلہ پر بھی کم نہیں ہو سکا۔ جب کبھی ثقافتی سطح پر یا چھوٹی موٹی ملازمتوں کے ذریعے اس تضاد کو حل کرنے کی کوشش کی گئی اس کی شدت میں کمی آنے کی بجائے اس میں اضافہ ہوا۔

ترکوں کے بعد افغانوں کے دور میں بھی یہی صورت حال رہی۔ افغان بھی اس مہم جوئی کے جذبے کے تحت یہاں آئے تھے جو ترکوں کی یہاں آمد کا سبب بنا تھا لیکن ترکوں میں اپنے طویل عہد حکومت کی بدولت حسین شاہی دور کے اواخر میں وسیع المشربی اور وسیع النظری آ گئی تھی۔ یہ بات افغانوں میں نہیں تھی اس لئے انہوں نے لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ لوگ ترکوں کے مظالم

کو بھول گئے۔ انہوں نے مندروں میں پناہ لینے والی عورتوں کو بھی نہ چھوڑا۔[25] ان کے دور میں ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر شدید ہوا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہاں کے ہندوؤں نے مغل ہندو جرنیلوں ٹوڈرمل اور مان سنگھ کا ساتھ دیا اور اس تضاد کی بدولت مغل بنگال پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مسلم غالب و بالا دست اور ہندو مغلوب و محکوم...... مغل دور 1565ء تا 1775ء

سولہویں صدی کے ربع آخر میں مغلوں کے ہندو جرنیل بہار، اڑیسہ اور بنگال کے ہندو راجاؤں کو ساتھ ملا کر افغانوں کی سرکوبی میں مصروف رہے۔ یہ بذات خود ہندو۔ مسلم تضاد کی شدت کا اظہار تھا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں جہانگیر کے برسر اقتدار آنے کے بعد مغلوں کی جانب سے اعلیٰ عہدوں پر سے ہندوؤں کو ہٹا کر مسلمان امرا کو متمکن کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم ہندوؤں کی کچھ ہی عرصہ بعد انتظامیہ میں اہم حیثیت بحال ہو گئی۔ تورانی امرا جن کی نظریاتی قیادت مجدد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی) نے کی، جہانگیر کو اکبر کی وصیت کے برخلاف اس لئے برسر اقتدار لائے تھے کہ وہ ہندوؤں اور ایرانی شیعوں کو مغل انتظامیہ سے نکال دے گا۔ جہانگیر ان کی اس امید پر پورا نہ اتر سکا تو وہ اس کے بھی مخالف ہو گئے۔ مغل انتظامیہ میں تورانی، ایرانی اور ہندو بدستور شامل رہے۔ البتہ ہندوؤں کو عہد اکبر والی حیثیت پھر نہ ملی۔ اس طرح ہندو۔ مسلم تضاد نے ایک اور رخ اختیار کر لیا۔

1606ء میں جہانگیر نے اسلام خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ اس نے تو ڈھاکہ کو صدر مقام بنا کر بنگال پر مغل امرا کی حکمرانی کو مستحکم کیا اور مغلوں کے مضبوط مرکزی انتظامی ڈھانچہ کو نافذ کیا۔ سخت گیر مرکزیت کے نفاذ سے رعیت پر جبر و تشدد ترکوں اور افغانوں کے دور سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ترکوں اور افغانوں کے دور میں اتنا بڑا اور اتنا منظم انتظامی ڈھانچہ نہیں تھا۔ نہ ہی ریونیو جمع کرنے کے لئے کوئی سخت گیر بندوبست تھا کیونکہ اخراجات سلطنت بنگال تک محدود تھے۔ مغل سلطنت کے قیام سے بنگال کی صوبیداری کے اپنے اخراجات کے علاوہ مرکز کے اخراجات بھی تھے جو صوبوں کی رعیت نے برداشت کرنے ہوتے تھے۔ مغلوں کو اپنی وسیع سلطنت برقرار رکھنے اور اس کے شاہی رعب و دبدبہ کے لئے بے تحاشا ریونیو کی ضرورت ہوتی

تھی۔ بنگال جیسے خوشحال صوبہ نے مغل سلطنت کے مرکزی خزانہ کو سب سے زیادہ ریونیو دیا۔ گویا یہاں کے محنت کشوں نے مغلوں کی سلطنت کو سب سے زیادہ خون دیا۔

مغلوں کے وسیع انتظامی ڈھانچہ میں صوبائی سطح پر ہندوؤں کے لئے نچلے عہدوں کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ ترکوں اور افغانوں کے زمانے میں ملازمتوں کے معاملہ میں جو امتیاز چلا آ رہا تھا وہ تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ نہ صرف بدستور برقرار رہا بلکہ تضاد میں شدت کا موجب بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ڈھانچہ ترکوں اور افغانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع تھا اور مسلمانوں کے لئے وسیع مواقع لے کر آیا تھا۔ اس سے مسلمانوں کی بالادستی مزید مستحکم ہو گئی تھی۔ صرف مالیہ اکٹھا کرنے والے اہلکار جو کسانوں سے معاملہ کرتے تھے ہندو ہوتے تھے کیونکہ ماضی سے یہ کام وہی کرتے آ رہے تھے۔ ان کے اوپر کا ڈھانچہ پہلے اتنا لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا جتنا کہ اب بن گیا تھا۔ یہ بالائی ڈھانچہ جو صوبیدار، دیوان، بخشی، فوجدار، قاضی، کوتوال، منشی اور وقائع نویس پر مشتمل تھا۔ اس پر مغل، ایرانی اور افغان امرا کی اجارہ داری تھی۔ دیوانی اور فوجداری محکموں کے بالائی ڈھانچہ میں کم و بیش تمام مسلمان ہوتے تھے۔ ان میں مقامی مسلمانوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ فوج بھی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک آدھ اعلیٰ منصب کے علاوہ زیادہ تر پیادوں میں ہندو بھرتی کئے جاتے تھے۔[26] ایسے ہندو اہلکار جو مسلمانوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر شہنشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے تھے، انہیں ترقی بھی دے دی جاتی تھی۔

ترکوں اور افغانوں کے دور میں سرکاری کاغذات فارسی کے علاوہ مقامی بنگالی زبان میں بھی رکھے جاتے تھے اور ایسے اہلکار جن کا عوام الناس سے لین دین ہوتا تھا وہ مقامی بنگالی زبان میں ہی لین دین کیا کرتے تھے لیکن مغلوں کے دور میں اکبر کے وزیر ٹوڈرمل نے تمام سرکاری کاروبار فارسی میں کر دیا اور ہندوؤں سے کہا گیا کہ وہ فارسی میں مہارت حاصل کریں تا کہ سرکاری عہدوں پر کام کر سکیں۔ اس طرح مالیہ اکٹھا کرنے والے اور سرکاری محکموں میں کام کرنے والے منشی ہندوؤں نے فارسی پر عبور حاصل کیا۔ بعض نے فارسی میں شاعری بھی کی۔ لیکن زبان کی بنیاد پر ان کو بھی کبھی کوئی اعلیٰ منصب حاصل نہ ہو سکا۔ اگر مغل حکمران اپنی مصلحتوں کی بنا پر ہندوؤں کو اپنی انتظامیہ میں عہدے دینے شروع کرتے تھے تو نہ صرف ترک، ایرانی اور افغان امرا کی جانب سے مخالفت ہوتی تھی بلکہ مسلمان علما و مشائخ بھی اس کے خلاف مہم کا آغاز کر دیتے

تھے۔فتوے جاری کئے جاتے تھے اور اسلامی احیا کی تحریکیں شروع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ مغلوں کے عہد کے اواخر تک انتظامیہ میں ہندوؤں کو کوئی قابل ذکر حصہ نہیں مل سکا تھا۔ اگر کبھی کوئی ہندو عہدیدار بنایا بھی گیا تو اس کا تعلق بالائی ہندوستان سے ہوتا تھا، مقامی بنگالی ہندو نچلی سطح کی اہلکاری سے آگے نہیں جاسکا تھا۔

مغلوں کے آخری دور میں ہندوؤں پر اضافی معاشی جبر جو فرقہ وارانہ بنیاد پر عائد کردہ ٹیکسوں کے ذریعہ مسلط کیا گیا تھا ترکوں اور افغانوں کے دور سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس وقت صرف جزیہ پر اکتفا کیا جاتا تھا اور اس کی وصولی بھی اتنی سختی سے نہ ہوتی تھی کیونکہ انتظامیہ اتنی مستعد نہیں تھی۔ مغل انتظامیہ نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر مزید اضافی ٹیکس عائد کئے جنہیں ابواب کہا جاتا تھا۔ آبادی کا وہ حصہ جو حکمرانوں کا اتحادی نہیں تھا اسے اس کی آمدنی کے ایک حصے سے اس کی مذہب کی بنیاد پر محروم کیا گیا جبکہ دوسرے حصے کو جو حکمرانوں کا اتحادی بنا اسے مذہبی حوالے سے رعایت دے دی گئی۔ ایک مسلمان کسان کو ایک ہندو کسان پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ اسے جزیہ اور ابواب سے چھوٹ تھی۔ مسلمان کاشتکار اپنی پیداوار فروخت کرتا تو اس سے اڑھائی فیصد سیلز ٹیکس وصول کیا جاتا لیکن جب ہندو کاشتکار اپنی پیداوار فروخت کرتا تو اس پر اس سے پانچ فیصد ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔[27] جزیہ کے علاوہ اس نوعیت کے ابواب مختلف وقفوں میں کم یا زیادہ ہوتے رہتے تھے۔ مختلف مصلحتوں کے تحت جب کبھی مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں کی خوشنودی درکار ہوتی تھی یا ان کا تعاون درکار ہوتا تھا تو جزیہ میں بھی چھوٹ دے دی جاتی تھی اور ابواب کی تعداد میں بھی کمی کر دی جاتی تھی۔ میراث احمد میں ان ابواب کی تعداد 41، ضوابط عالمگیری کے مطابق 74 اور دستور العمل میں ان کی تعداد 78 تھی۔ مغلیہ عہد کے آخر تک 19 قسم کے ابواب وصول کئے جاتے رہے۔

ہندوؤں کو سیاسی و معاشی سطح پر محروم و محکوم کرنے کے علاوہ ان کو ثقافتی سطح پر بھی دبا دیا گیا تھا۔ ان کی عبادت گاہیں تباہ کر کے جلا دی جاتی تھیں۔ ان کے مذہبی رسوم و رواج پر بھی ٹیکس لگا دیئے گئے تھے۔ گنگا یا کسی اور پوتر دریا میں نہانے پر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار اس زمانے کے چار سے چھ روپے تک ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جو ہندو اپنے مردے جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں گنگا میں بہاتے تھے تو ان پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔[28]

ترکوں کے دور کے برعکس مغلوں کے دور میں ہندو۔ مسلم تضاد کو کم کرنے کی کوئی کوشش ثقافتی سطح پر بھی نہیں کی گئی۔ جب اکبر کے عہد میں ہندوستان میں یہ کوشش کی گئی تھی، اس وقت بنگال پر مغل مستحکم نہیں ہو سکے تھے اور یہ دور یہاں کے افغانوں اور مغل جرنیلوں کی جنگ وجدال میں گزر گیا تھا۔ اس کے بعد نہ تو کسی مغل شہنشاہ نے ہی اس قسم کی کوئی کوشش کی اور نہ ہی بنگال میں کسی مغل صوبیدار نے کسی مقامی ہندو شاعر یا فنکار کی حوصلہ افزائی کی یا ہندوؤں کے مذہبی ادب کے پھیلاؤ کی سرپرستی کی۔

سماجی سطح پر بھی ہندوؤں کی تذلیل کی جاتی تھی۔ مسلمان امرا جس ہندو لڑکی کو چاہتے تھے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کے لئے گنگا میں نہانا دوبھر ہوتا تھا۔[29] زوال پذیر جاگیردار مسلمان حکمران اپنے حرم میں رعیت کی بیٹیوں کو کنیزیں بنا کر رکھنا عین اسلام سمجھتے تھے۔ جن راجاؤں یا زمینداروں کی سرکوبی کی جاتی ان سے خراج اور تاوان میں ان کی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی حاصل کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب جیسے دیندار شہنشاہ کے حرم کے لئے بھی خراج میں لڑکیاں حاصل کی جاتی تھیں۔ بنگال کے صوبیدار میر جملہ خان خاناں نے آسام کے راجہ کے خلاف مہم سر کرنے کے بعد جن شرائط پر صلح کی وہ یہ تھیں ''راجہ فی الحال ایک لاکھ بیس ہزار تولہ چاندی اور بیس ہزار تولہ سونا، پچاس ہاتھی مع اپنی خوبصورت لڑکی کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے اور خان خاناں کے لئے پندرہ ہاتھی اور ایک لڑکی مع نقد و جنس روانہ کرے۔''[30]

سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں وہ آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے جو مغلوں کی زوال پذیر جاگیردارانہ سلطنت کے خاتمے کی نشاندہی کرتے تھے اور محروم و محکوم ہندوؤں کے لئے روشن مستقبل کی نوید تھے۔ ترکوں اور افغانوں کے عہد کے برعکس مغلوں کے عہد میں جب بنگال کا بالائی ہند کے ساتھ سیاسی، معاشی و ثقافتی رشتہ قائم ہوا تو یہاں کے ہندوؤں اور بالائی ہند کے ہندوؤں کے مابین بھی روابط قائم ہو گئے۔ اپنی بقا کی جنگ میں یہاں کے ہندوؤں نے بنگال سے باہر اپنے ہم مذہبوں کے قریب ہونا شروع کیا۔ وشنومت کے حوالے سے ان میں جدید ہندومت کے احیا کی تحریک کی بھی یہی مادی بنیاد تھی۔ اس کے ساتھ ہی بنگال میں سنسکرت زبان کا احیا ہوا جو بارہویں صدی میں ہندو حکمرانوں کے زوال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو گئی تھی۔ اب یہاں کے ہندوؤں نے بالائی ہند کے ہندوؤں کے ساتھ اپنا ثقافتی

رشتہ جوڑا تو اس زبان کو فروغ دیا، بنگالی شاعری میں بھی سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے۔ انہوں نے بنگال سے باہر نکل کر مقدس ہندو مقامات کی یاترا کے لئے سفر کئے۔ چونکہ ان بنگالی ہندوؤں کی معاشی بنیاد کوئی نہ تھی اس لئے وہ بالائی ہند کے ہندوؤں کے ساتھ ثقافتی رشتہ ہی استوار کر سکتے تھے۔ سنسکرت کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی کا علم حاصل کر کے مغل انتظامیہ میں چھوٹی سطح پر اہلکاری بھی سنبھالی ہوئی تھی۔ اس وقت کا یہ بنگالی ہندو جو فارسی کے بل پر مغل انتظامیہ میں منشی تھا بعد میں انگریزوں کے دور میں انگریزی زبان سیکھ کر بابو بن گیا۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ہند سے راجستھان کے مارواڑیوں نے قسمت آزمائی کے لئے بنگال کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت تک یورپی تاجر بنگال کو اپنی تجارت کا مرکز بنا چکے تھے اور ان کے ساتھ لین دین کے لئے مقامی گماشتہ تاجروں کے لئے راہیں کھل رہی تھیں۔ مارواڑ کے تاجر پٹنہ، ڈھاکہ، مرشد آباد، ہگلی، قاسم بازار اور کلکتہ میں آ کر مقیم ہونے لگے اس طرح مغربی ہندوستان کے ہندوؤں کو بنگال میں مغل انتظامیہ سے ہٹ کر ایک علیحدہ معاشی بنیاد میسر آ گئی اور بنگالی ہندوؤں اور ان مارواڑی سیٹھوں کے مابین معاشی رشتہ استوار ہو گیا۔ بنگالی ہندوؤں نے یورپی تاجروں کا گماشتہ بن کر اور ان مارواڑی سیٹھوں کی ملازمتیں اختیار کر کے اپنی بقا کی جنگ کے لئے نئی بنیاد حاصل کر لی۔ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بنگال میں مارواڑی سیٹھوں اور یورپی تاجروں کے گرد جو ایک نئی معاشی بنیاد تعمیر ہو رہی تھی بنگالی ہندو اس کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس نئی معاشی بنیاد میں جہاں زوال پذیر جاگیردارنہ مغل حکمرانی کی قبر تیار ہو رہی تھی وہاں بنگالی اور مارواڑی ہندوؤں کے روشن مستقبل کا سورج طلوع ہونے کے آثار بھی نمودار تھے۔ ہندوؤں کی یہ معاشی بنیاد مستقبل میں ان کی سیاسی قوت کی بنیاد بنی۔

ادھر سترہویں صدی کے اختتام تک مغل سلطنت کی سیاسی و معاشی بنیادوں کی جڑیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ بالائی اور جنوبی ہند میں مرہٹوں نے مسلمان حکمرانوں کے صدیوں کے جبر کا خاتمہ کر کے ہندو راج پر مبنی مرہٹہ سلطنت قائم کرنے کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مرہٹوں کے ساتھ طویل جنگ نے مغلوں کو سیاسی اور معاشی دونوں اعتبار سے دیوالیہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ اورنگ زیب شمالی، بالائی اور

جنوبی ہندوستان کی لڑائیوں میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ داخلی امن اگر تھا تو وہ مشرقی علاقے میں تھا اور یہاں صرف بنگال ہی وہ خوشحال صوبہ تھا جس کی دولت پر اورنگ زیب نے مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کے ساتھ طویل اور وسیع جنگ کے اخراجات کا سب سے زیادہ بوجھ ڈالا۔[31] شروع میں اورنگزیب نے میر جملہ کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا جس نے کوچ، بہار اور آسام کے راجاؤں کے خلاف مہمات سر کر کے بے شمار مال و دولت حاصل کر کے شاہی خزانے کو ارسال کیا۔

میر جملہ کے بعد اورنگ زیب کے تعینات کردہ صوبیدار شائستہ خاں (88-1664ء) نے چٹاگانگ کے ماگھ راجاؤں کو شکست سے دوچار کر کے مغل سلطنت کی حدود برما کی سرحدوں تک پہنچا دی تھیں۔ اس سے مغل سلطنت کے خزانہ میں بنگال سب سے زیادہ ریونیو داخل کرنے والا صوبہ بن گیا۔ شائستہ خان نے 1678ء میں شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر تین لاکھ روپے نقد اور چار لاکھ روپے کی قیمت کے زیورات پیش کئے۔ 1680ء میں اس نے اضافی ٹیکسوں کی مد میں سات لاکھ روپے شہنشاہ کو ارسال کئے۔ 1682ء میں اسی مد میں پانچ لاکھ اور پھر یہ اضافی رقم اس وقت تک ارسال کی جاتی رہی جب تک اورنگ زیب کی دکن میں مرہٹوں کے خلاف مہم جاری رہی۔ اسے ''خرچ ایثاق'' کا نام دیا گیا تھا۔ ان اضافی رقوم کے بوجھ سے نمٹنے کے لئے شائستہ خاں نے جو سخت اقدامات کئے ان میں ہندوؤں سے جزیہ اور ابواب کی وصولی بھی سختی کے ساتھ کی گئی۔ جون 1682ء میں بنگال سے صرف جزیہ کی مد میں جو رقوم جمع کر کے اورنگ زیب کو بھیجی گئی وہ ایک لاکھ روپیہ تھی۔[32]

بنگال یورپی تاجروں کی تجارت کا بھی سب سے بڑا دروازہ تھا۔ تجارتی محصولات سے اتنی زیادہ آمدنی ہونے لگی کہ مغل امرا اپنی تعیناتی کے لئے بنگال کی طرف لالچ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں وہ یورپی تاجروں سے بھاری رشوتیں بھی حاصل کرتے تھے۔ جسے ''سودائے خاص'' کہا جاتا تھا۔ شائستہ خاں کے بعد تعینات ہونے والے صوبیدار ابراہیم خان (97-1689ء) کے عہد میں یہ بدعنوانیاں عروج کو پہنچ گئیں تو 1697ء میں اورنگ زیب نے اپنے پوتے عظیم الدین عظیم الشان کو صوبے دار بنا کر بھیجا۔ مذکورہ ''سودائے خاص'' کے ذریعہ شائستہ خاں نے اپنے اٹھارہ سالہ دور میں 9 کروڑ روپے کمائے اور ابراہیم خان کو اس سے دو کروڑ روپے سالانہ ذاتی آمدنی ہوتی تھی۔ عظیم الدین اپنے 9 سالہ دور کے بعد جب یہاں سے واپس گیا تو

8 کروڑ روپے کی نقدی اس کی ذاتی ملکیت تھی۔ اورنگ زیب نے اس مالی افراتفری کو منضبط کرنے اور اپنی جنگی مہمات کے اخراجات کے لئے یہاں سے آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے اپنے ایک معتمد نومسلم مرشد قلی خان کو 1701ء میں بنگال کا دیوان یعنی وزیر مال مقرر کیا۔ مرشد قلی نے 1702ء سے شاہی خزانے کے لئے ایک کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کا بندوبست کر دیا تھا۔[33] چونکہ زوال پذیر عیش پرست مغل امرا یہاں سے اس قدر مالیہ جمع کر کے اورنگ زیب کی مالی ضروریات پوری نہ کر سکتے تھے اس لئے ایک برہمن ہندو سے مسلمان ہونے والے اہلکار مرشد قلی خاں کے ذریعہ یہ کام لیا گیا۔ کوئی ہندو بطور ہندو تو خیر اس اعلیٰ منصب پر اس وقت تک فائز ہوا ہی نہیں تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے باوجود مرشد قلی خاں مغل شہزادوں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ان کا اس کے ساتھ تضاد بنا۔ مسئلہ مذہبی نہیں تھا بلکہ مفادات کا تھا۔ مقامی نومسلم مرشد قلی اور مغل شہزادوں کے مابین کوئی ''اسلامی اخوت'' قائم نہ ہو سکی۔ لیکن اورنگ زیب جیسے راسخ العقیدہ حنفی مسلمان کا نومسلم شیعہ مرشد قلی خاں کے ساتھ محبت کا رشتہ اس لئے قائم ہو گیا کہ مرشد قلی اسے سالانہ ایک کروڑ روپیہ کا ریونیو ارسال کرتا تھا۔ مرشد قلی اور مغل شہزادوں کے مابین تضاد کی وجہ سے مرشد قلی نے صوبے کی انتظامیہ میں اور بالخصوص دیوانی میں اہم عہدوں پر ہندوؤں کو فائز کر دیا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ مالیہ کی وصولی کے لئے سب سے زیادہ بولی دینے والے ہندوؤں کو مالیہ کی وصولی کا ٹھیکہ دے دیا۔ اس نظام کو ''اجارہ'' کہتے تھے اور ٹھیکیدار کو اجارہ دار کہتے تھے۔ سلیم اللہ کے مطابق مرشد قلی نے سوائے بنگالی ہندوؤں کے کسی کو مالیہ وصول کرنے کی اجارہ داری نہیں سونپی۔[34] اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مرشد قلی نے جن ہندوؤں کو مختلف اراضی پر مالیہ کی وصولی کا ٹھیکیدار مقرر کیا تھا اٹھارویں صدی کے اواخر میں لارڈ کارنوالس (Cornwallis) نے بندوبست دوامی کے ذریعہ ان کو اس اراضی کا مستقل زمیندار بنا دیا۔ یہ ٹھیکیدار جو اورنگزیب کی مرہٹوں کی سرکوبی کی مہم کے لئے ریونیو جمع کرتے تھے بعد میں زمیندار بن کر مسلمان کسانوں کے لئے مصائب کا پہاڑ بن گئے۔ اس وقت انتظامی عہدے حاصل کرنے کی خاطر جن ہندوؤں نے مرشد قلی کے ساتھ مل کر اورنگزیب کا ساتھ دیا تھا، 1757ء میں پلاسی کی جنگ کے موقع پر سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ میں ہندو سیٹھوں کا کردار

اورنگ زیب نے 1707ء میں مرشد قلی خان کو بنگال کا نائب صوبیدار مقرر کر دیا۔ اسی سال اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے مرشد قلی سے ایک ایک کر کے تمام عہدے چھین لئے گئے۔ تاہم 1708ء سے 1709ء تک دکن کا دیوان رہنے کے بعد یہ 1710ء میں دوبارہ بنگال کا دیوان مقرر ہوا۔ 1713ء میں اسے بنگال کا نائب صوبے دار بنا دیا گیا۔ 1717ء میں مرشد قلی خان کو بنگال کا باقاعدہ صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ ادھر اورنگ زیب کے جانشینوں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، مغل مرکزی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی اور صوبوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی چلی گئی۔ صوبیدار خود مختار ہو کر نواب بن گئے۔ صوبیدار مرشد قلی خان بھی تھوڑے ہی عرصہ میں نواب مرشد قلی خان بن گیا۔ اس نے اپنی حکومت کے لئے نئے صدر مقام کی بنیاد ڈالی جس کا نام مرشد آباد رکھا گیا جو مغربی بنگال میں واقع تھا۔ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے گماشتہ ہندو سیٹھوں کے اشتراک عمل سے ہگلی اور کلکتہ بہت بڑے تجارتی مرکز بن گئے تھے اور تجارتی مغربی بنگال کو زرعی مشرقی بنگال پر معاشی فوقیت حاصل ہو گئی تھی، اس لئے سیاسی فوقیت برقرار رکھنے کے لئے مرشد قلی خاں نے بحیثیت دیوان ہی اپنا صدر مقام مرشد آباد، مغربی بنگال میں منتقل کر دیا تھا۔ مرکزی مغل حکومت یعنی مغل شہنشاہ کا اس پر کوئی انتظامی کنٹرول نہیں تھا البتہ نواب مرشد قلی خاں کی جانب سے ہر سال نذرانہ کے طور پر خاصی خطیر رقم شہنشاہ کو بھیجی جاتی تھی۔ اب بنگال اور دہلی کا تعلق صرف روپے کی وصولی تک رہ گیا تھا۔

مرشد قلی خاں کے دور میں بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد نے ایک تاریخ ساز کروٹ لی۔ ایک طرف تو مرشد قلی نے اپنے پیش رووں کی طرح ہندو رعیت سے مالیہ اور دوسرے ٹیکسوں کی وصولی میں پر تشدد طریقے اختیار کئے لیکن دوسری طرف اس نے "وفادار" ہندوؤں کے چند افراد کو عہدے اور مراعات دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان کا تعلق برہمن، ویدا اور کھیشت ذاتوں کے علاوہ نچلی ذاتوں سے بھی ہوتا تھا۔ بہت سے سرکاری عہدوں کے نام بنگالی ہندو خاندانوں کے ناموں کا حصہ بن گئے مثلاً بخشی، سرکار، قانونگو، موجمدار، شاہنہ، چاکل دار، طرفدار، منشی اور خان وغیرہ۔ اس طرح ہندو عاملوں، اجارہ داروں اور دوسرے عہدہ داروں پر مشتمل ایک نئی ہندو اشرافیہ نے جنم

لیا۔علاوہ ازیں مرشد قلی نے ہندو ساہوکاروں میں اپنے ساتھ تعاون اور دوستی کا دم بھرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور بنگال میں ایک ایسے طبقے نے جنم لیا جو سیٹھ کہلایا۔ جب سترہویں صدی میں خلیج بنگال کی بندر گاہوں سے یورپ کے تاجر ہندوستانی مال کے جہاز بھر بھر کے لے جانے کے لئے پہنچنے لگے تو بہار سے خلیج بنگال تک آبی راستوں کے ذریعے اس مال کو پہنچانے کا کام انجام دینے کے لئے ہندو کاروباری طبقہ آگے بڑھا۔ وہ یورپی تاجروں کے لئے گماشتہ بن کر دھڑا دھڑ روپیہ کمانے لگا۔ راجپوتانہ کے علاقہ مارواڑ کے ہندو تاجر جو سورت اور بمبئی کی بندر گاہوں سے یورپی تاجروں کے ساتھ کاروبار کا تجربہ رکھتے تھے، جوق در جوق بنگال کے تجارتی مراکز میں پہنچ گئے اور انگریزوں کے کاروباری گماشتے بن گئے۔

مارواڑی سیٹھوں میں سب سے اہم جگت سیٹھ کا خاندان ہے۔ اس خاندان کا سربراہ ہیرا نند ساہا 1652ء میں پٹنہ میں آکر مقیم ہوا اور یہاں اپنی تجارتی فرم قائم کی۔ اس کے سات بیٹے بعد میں بنگال کے ساہوکار اور سیٹھ بنے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت مانک چند کو حاصل ہوئی جس نے ڈھاکہ میں اپنی تجارتی فرم قائم کی جو اس وقت صوبائی دارالحکومت تھا۔ 1704ء میں جب مرشد قلی نے مرشد آباد کو دیوانی کا صدر مقام بنایا تو مانک چند نے بھی اپنی تجارتی فرم مرشد آباد منتقل کر دی۔ وہ مرشد قلی کے خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ کچھ عرصہ بعد مرشد قلی نے مانک چند کو سرکاری خزانے کا سربراہ Chancellor of Exchequeor مقرر کر دیا۔ مانک چند کے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے۔ کلکتہ کونسل ہمیشہ اس کا ذکر معروف تاجر کے طور پر کرتی تھی۔ کمپنی اپنے لئے تجارتی مراعات کے حصول کے لئے مانک چند کے ذریعے مرشد قلی سے رابطہ رکھتی تھی۔ تھوڑے عرصہ میں یہ سیٹھ اس قدر بڑی مالی قوت بن گئے کہ ہندوستان کے نواب یہاں تک کہ مغل شہنشاہ بھی ان سے قرضے لینے لگا۔ 1712ء میں اپنی تخت نشینی کی جنگ کے دوران فرخ سیر نے پٹنہ میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا تو اس کو مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ اس موقع پر اس نے سیٹھ مانک چند سے قرضہ حاصل کیا۔[35] تخت نشین ہونے کے بعد فرخ سیر (19-1713ء) نے مانک چند کو نگر سیٹھ کا خطاب دیا۔ سیٹھ مانک چند کا بھانجا فتح چند دہلی میں اس کی فرم کی شاخ کا منتظم تھا۔ مرشد قلی کی جانب سے ہر سال ڈیڑھ کروڑ روپے کا ریونیو جو دہلی کے مرکزی خزانے کو جاتا تھا، اسی فرم کی وساطت سے بذریعہ ہنڈی بھیجا جاتا تھا۔ بادشاہ

فرخ سیر اس کا بڑا احسان مند رہتا تھا۔

1714ء میں مانک چند کے انتقال کے بعد اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تمام کاروبار فتح چند کو منتقل ہو گیا۔ اسے صوبائی اور مرکزی دونوں حکومتوں میں اہمیت حاصل تھی۔ انگریز تاجر فتح چند کے ذریعے اپنے محصولات بچاتے تھے۔[36] مرشد قلی نے 1704ء میں مانک چند کے مشورے اور تعاون سے مرشد آباد میں ٹکسال قائم کی جہاں سونے چاندی کے سکوں کو ڈھالنے کا کام ہونے لگا۔ مرشد قلی نے مانک چند اور پھر فتح چند کو اس ٹکسال سے سکے ڈھالنے کی اجازت دے رکھی تھی جس کے عوض میں وہ سرکار کو ڈھائی فیصد محصول ادا کرتے تھے۔ فتح چند کی سفارش پر 1717ء میں مغل شہنشاہ فرخ سیر نے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو مرشد آباد کی ٹکسال بلا معاوضہ استعمال کرنے کا فرمان جاری کیا۔ 1721ء تک فتح چند کو اس ٹکسال پر مکمل اجارہ داری حاصل ہو چکی تھی۔ 1722ء میں مغل شہنشاہ محمد شاہ نے فتح چند کو جگت سیٹھ یعنی عالمی بینکر کا خطاب دے دیا۔ کرنسی اور مالیاتی سرمایہ (Capital Finance) پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد جگت سیٹھ فتح چند بنگال اور دہلی کے حکمرانوں کو انگلیوں پر نچانے کی اہلیت اختیار کر چکا تھا۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اس کی مرہون منت ہوتی تھی۔ شہنشاہ اور نواب کے ساتھ تمام معاملات اس کے ذریعے طے پاتے تھے۔

ساہو کاروں اور بینکاروں کے علاوہ یہاں ایک اور طبقہ ابھرا۔ یہ یورپی کمپنیوں کے لئے مال کی سپلائی اور دلالی کا کام کرتے تھے۔ انہیں دادنی تاجر کہا جاتا تھا۔ انگریزوں نے کبھی یہ کام کسی مسلمان کو نہیں سونپا۔ عبدالکریم کی مہیا کردہ کمپنی کے دلالوں کی فہرست اس کی غماز ہے۔[37] مال سپلائی کرنے کے معاوضہ کو دادنی کہتے تھے اور یہ 75 فیصد تک ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جنہوں نے یہ کاروبار معمولی سرمائے سے شروع کیا وہ بھی چند برسوں میں لاکھوں میں کھیلنے لگے۔

مرشد قلی خان کے عہد میں بنگال میں ہندوؤں کے چار اہم اور طاقتور طبقے پیدا ہوئے (1) نئی ہندو اشرافیہ (2) مغل انتظامیہ میں اہم سرکاری عہدیدار (3) بینکار اور ساہوکار (سیٹھ) (4) تاجر، دلال اور گماشتے۔ اول الذکر دو طبقے مرشد قلی کی مالیاتی اور انتظامی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے جو اس لئے کی گئی تھیں کہ ریونیو کا انبار لگایا جا سکے اور زوال پذیر مغلیہ سلطنت کو بچایا جا سکے جو اب اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ مؤخر الذکر دو طبقوں کو یورپی بالخصوص انگریزوں کی تجارت نے جنم دیا تھا۔

30/جون 1727ء کو مرشد قلی کے انتقال کے بعد اس کا داماد شجاع الدین (شجاع الدولہ) بنگال و اڑیسہ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ نواب شجاع الدولہ (39-1727ء) عیاش طبع اور سہل پسند تھا۔ اس نے ریاست کے انتظام کے لئے ایک چار رکنی مشاورتی کونسل کو تشکیل دیا جس کا ایک اہم رکن فتح چند جگت سیٹھ تھا۔ باقی تین ارکان عالم چند، علی وردی خاں اور حاجی احمد تھے۔ گویا تمام مالی اور تجارتی امور پر فتح چند اور عالم چند کا کنٹرول تھا جبکہ فوجی امور دو بھائیوں علی وردی اور حاجی احمد کے سپرد تھے جو اڑیسہ میں شجاع کی نائب صوبیداری کے دوران مشیر رہ چکے تھے۔ رعیت سے اضافی ٹیکسوں، جنہیں ابواب کہا جاتا تھا، کی وصولی شروع میں تو نرم رکھی گئی لیکن جب شجاع کی عیش پرستانہ زندگی کے اخراجات کی طلب پوری کرنے کے ساتھ ساتھ دہلی کے بڑھتے ہوئے مطالبات زر کو پورا کرنا پڑا تو ابواب کی وصولی میں سختی کی جانے لگی۔ ابواب کا زیادہ تر اطلاق ہندوؤں پر ہوتا تھا۔ شجاع الدولہ ہر سال دہلی کے شہنشاہ کو ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے ادا کرتا تھا جبکہ صوبہ کی عمومی آمدنی ایک کروڑ بیالیس لاکھ تھی۔ اس میں اضافی ٹیکسوں کے ذریعے مزید انیس لاکھ روپے کا اضافہ کیا گیا۔[38]

13/مارچ 1739ء کو شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں بنگال کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ وہ زیادہ تر "کاسہ لیس ملاؤں اور حرم کی عورتوں جن کی تعداد 1500 تھی"[39] کے زیر اثر رہتا تھا اور اگرچہ اس نے اپنے باپ کے زمانے کی چار رکنی کونسل برقرار رکھی ہوئی تھی لیکن وہ ان مشیروں کی سر عام بے عزتی کر دیتا تھا۔ نواب کا محل سازشوں کا گڑھ بن گیا جس میں بیگمات ملوث ہوتی تھیں۔ یہ صورت حال تاجروں، ساہوکاروں اور بینکاروں کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ اس لئے جگت سیٹھ فتح چند اور رائے رایان عالم چند نے حاجی احمد اور علی وردی خاں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی جس میں نواب سرفراز خاں مارا گیا اور 9/اپریل 1740ء کو علی وردی خاں بنگال کا نواب بن گیا جو کہ مغل سلطنت کا برائے نام صوبیدار بھی تھا۔ چونکہ ہندو سیٹھوں نے علی وردی خاں کو اس منصب تک پہنچانے میں مدد کی تھی اس لئے اس کے دور (56-1740ء) میں ہندو سیٹھوں بالخصوص جگت سیٹھ کو پہلے سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ دیگر ہندو عہدیداروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ابھرتے ہوئے ہندو بورژوا کے سرمائے میں وسعت اور قوت بڑھی اور ہندو زمینداروں کو کسی حد تک اپنے اپنے علاقے میں خودمختاری حاصل ہوئی۔

جب بنگال میں ہندوؤں کے مراعات یافتہ طبقہ کو بنگال کے معاملات پر کنٹرول حاصل ہوتا جا رہا تھا، وسطی اور جنوبی ہند میں مرہٹے ایک بہت بڑی قوت بن چکے تھے۔ 1741ء میں مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کر دیا۔ گیارہ سال (51-1741ء) تک یہ لڑائی جاری رہی اور علی وردی خاں مرہٹوں سے الجھا رہا۔ نادیہ کے برہمن زمیندار کرشن چندر کے ایک درباری شاعر بھارت چندر نے بنگالی زبان میں ''انا ڈا منگلہ'' کے نام سے مرہٹوں کے حملوں کو منظوم کیا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے حملوں کو یہاں کے ''ظالم مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہندوؤں کا جہاد'' قرار دیا ہے۔[40] گویا بنگال کی حکومت داخلی اور خارجی ہر لحاظ سے ہندو۔ مسلم تضاد کے نرغے میں آ چکی تھی۔ داخلی اور خارجی طور پر ہندو ایک ایسی مؤثر قوت کے طور پر ابھر آئے تھے کہ انہیں قرون وسطیٰ کے زوال پذیر مسلمان نواب اور جاگیردار کسی صورت پسپا نہیں کر سکتے تھے۔ علی وردی خان نے 1743ء میں مرہٹہ سردار بالاجی راؤ کو خراج کے طور پر اپنی ریاست کی آمدنی کا چوتھائی حصہ جسے ''چوتھ'' کہتے تھے ادا کیا اور 22 لاکھ روپیہ اس کے علاوہ ادا کیا۔ اس کے بعد بھی مرہٹہ سرداروں کے ساتھ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم 1751ء میں علی وردی نے تھک ہار کر مرہٹوں سے صلح نامہ کر لیا۔ اس کے تحت اڑیسہ پر مرہٹوں کی بالادستی تسلیم کر لی گئی۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ بنگال کی جانب سے بارہ لاکھ روپے سالانہ بطور ''چوتھ'' رگھوجی کو ادا کیا جائے گا جس کے عوض میں رگھوجی بنگال پر حملے بند کر دے گا۔ ''مہاراشٹر پرانا'' کا مصنف گنگا رام جس کا خیال ہے کہ بنگال کے زبوں حال عوام الناس نے اپنی نجات کے لئے مرہٹوں سے امیدیں وابستہ کی تھیں، آخر میں لکھتا ہے کہ ''مرہٹے ان امیدوں پر پورے نہیں اترے اور یہاں کے ہندو عوام الناس کو مایوسی اور تباہی کا منہ دیکھنا پڑا۔''[41] لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرہٹوں کی بار بار یلغار سے بنگال کی مسلمان حکومت کی کھوکھلی جڑوں میں ایسے شگاف ضرور پڑ گئے کہ چند سال بعد جب اس کا خاتمہ ہوا تو ہندو عوام الناس کو بھی بے شمار دور رس فوائد حاصل ہوئے۔

مرہٹوں کی مہمات کے دوران ہندو تاجروں اور سیٹھوں کا انگریزوں کے ساتھ تعاون بڑھا اور وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے۔ ہندو تاجر اور سیٹھ مرشد آباد سے نقل مکانی کر کے کلکتہ میں جا کر محفوظ ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے خرچ سے کلکتہ کے گرد خندق کھدوائی۔ جنگی اخراجات کے لئے نواب انگریزوں کی کمپنی سے زیادہ محصولات کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا۔ کمپنی

جگت سیٹھ سے قرضہ لے کر نواب کی ادائیگیاں کر دیتی تھی۔ جگت سیٹھ فتح چند کا 1744ء میں انتقال ہوا تو اس کا پوتا مہتاب چند جگت سیٹھ بنا۔ مرہٹوں کا ہندو تاجروں اور انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ رویہ ہمدردانہ تھا۔ ایک مرتبہ مرہٹہ فوج کے ایک گروہ نے کمپنی کے جہازوں کو لوٹ لیا۔ تاہم انگریزوں نے ایک بہت بڑے اور بااثر دادنی تاجر سیٹھ اومی چند کے ذریعے اپنا سامان مرہٹوں سے حاصل کر لیا۔ مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے اومی چند کو اس سلسلے میں ایک معذرت خواہانہ خط بھی تحریر کیا۔[42]

1751ء کے صلح نامہ کے بعد نواب علی وردی خاں نے اپنی حکومت میں استحکام پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ہندو اہلکاروں کی اعلیٰ عہدوں پر تقرریاں پہلے کی نسبت زیادہ کر دیں۔ ہندو اہلکار، سیٹھ اور زمیندار اوپر سے نواب کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے نواب کی حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ جہاں تک ہندو عوام الناس کا تعلق تھا، ان کا مسلمان حکمرانوں سے ویسے ہی صدیوں پرانا تضاد موجود تھا۔ گویا اب وہ وقت آ پہنچا تھا کہ زوال پذیر جاگیردارانہ ڈھانچے پر کھڑی ہوئی مسلمان حکمرانی کی بوسیدہ عمارت کو کسی بھی وقت گرایا جا سکتا تھا۔ اس ضمن میں بنگال میں کمپنی کے چیف انجنیئر کرنل سکاٹ کا ایک خط جو اس نے 1754ء میں اپنے دوست نوبل کو لکھا، تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے لکھا ''یہاں کے ہندو راجے اور ہندو باشندے مسلمان حکومت سے انتہائی غیر مطمئن ہیں اور خفیہ طور پر چاہتے ہیں کہ کوئی تبدیلی واقع ہو اور انہیں مسلمانوں کے جبر کا جوا اتار پھینکنے کا کوئی موقع ملے۔''[43] چنانچہ ان حالات میں جب 1756ء میں علی وردی خاں کا انتقال ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کے نواسے سراج الدولہ کو نواب مقرر کیا گیا تو مسلم اقتدار کے خاتمے کا مکمل بندوبست ہو چکا تھا۔

1756ء میں یورپ میں جنگ ہفت سالہ شروع ہو گئی تھی۔ فرانس اور انگلینڈ میں لڑائی چھڑنے والی تھی۔ فرانسیسیوں کے حملے کے خدشے کے پیش نظر کلکتہ میں کمپنی نے قلعہ بندیاں تعمیر کرنا شروع کیں جو نواب کے ساتھ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔ سراج الدولہ نے پرتگیزیوں اور فرانسیسیوں کی مدد سے کلکتہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ انگریز مورخین کا کہنا ہے کہ نواب نے 146 قیدیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دیا اور ان میں سے بیشتر دم گھٹنے سے مر گئے۔ بچی کھچی کمپنی کے اہلکاروں نے فالٹا کے جزیرے میں آ کر پناہ لی اور جگت سیٹھ

مہتاب چند اور اومی چند کو خطوط لکھے کہ نواب کے ساتھ صلح صفائی کروادی جائے لیکن اس دوران جگت سیٹھ اور نواب کے مابین بھی تضاد پیدا ہو چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ رعیت سے ریونیو کی وصولی کا کام جگت سیٹھ کے ذریعے ہوتا تھا اور اب جگت سیٹھ نے رعیت کا حد سے زیادہ خون نچوڑنے پر نواب سے سخت احتجاج کر دیا تھا۔[44] تاہم فروری 1757ء میں نواب اور کلائیو (Clive) کے مابین معاہدہ طے پا گیا کہ نواب کلکتہ پر حملہ نہیں کرے گا۔

پلاسی کی جنگ کے ذریعہ بنگال میں مسلمانوں کے دور کا خاتمہ کروانے میں نمایاں کردار ہندو زمین داروں اور سیٹھوں نے ادا کیا۔ مرشد آباد میں جگت سیٹھ کے گھر پر سیٹھ اور بااثر ہندو زمین دار جمع ہوئے اور سازش کی منصوبہ بندی کی گئی۔ میر جعفر نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ اومی چند رنجیت رائے اور جگت سیٹھ اس سے پہلے ہی واٹس (Watts) کے ذریعہ کلائیو (Clive) کو یقین دلا چکے تھے کہ نواب اندر سے انگریز دشمن ہے اور کسی بھی وقت معاہدہ توڑ کر کلکتہ پر حملہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ انگریزوں، ہندو سیٹھوں اور میر جعفر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت میر جعفر کو نواب بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اومی چند کو سازش میں اہم کردار ادا کرنے پر انقلاب کے بعد بیس لاکھ روپیہ ادا کیا جائے گا۔ کلکتہ پر قبضہ کے وقت نقصان اٹھانے پر وہاں آباد ہندوؤں کو بیس لاکھ روپے دیئے جائیں گے۔ باقی ماندہ شقیں انگریزوں کے نقصانات پورا کرنے اور 1716ء کے فرمان کی مراعات بحال کرنے سے متعلق تھیں۔ 3/جون 1757ء کو کلائیو اور دوسرے انگریز فوجیوں کی موجودگی میں میر جعفر کے ساتھ یہ معاہدہ جگت سیٹھ کے گھر پر طے پایا۔ اس وقت بااثر ہندو سیٹھ رائے ورلبھ بھی موجود تھا۔[45] اس پس منظر میں 23/جون 1757ء کو پلاسی کے میدان میں کلائیو اور نواب کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ میر جعفر اور رائے ورلبھ کی کمان میں فوج کے بڑے حصے نے جنگ میں حصہ ہی نہیں لیا۔ نواب سراج الدولہ شکست سے دوچار ہو کر فرار ہو گیا مگر راستے میں پکڑا گیا۔ اسے قیدی بنا کر مرشد آباد لایا گیا جہاں میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔

ہندو بنگالی مؤرخ جادو ناتھ سرکار کے مندرجہ ذیل اقتباسات نہ صرف خود جادو ناتھ کے حوالے سے ہندو۔ مسلم تضاد کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کے بوسیدہ جاگیرداری اقتدار کے خاتمے سے ہندوؤں کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔

وہ لکھتا ہے ''مسلمان راج نے ہندوؤں کی نشوونما روک دی تھی۔ فتوحات کے پہلے مرحلے میں ہمارے تمام مندر اور عبادت گاہیں اپنے قبضے میں لے لی گئیں۔ ہندو علوم کے مراکز کو تباہ کر دیا گیا......''[46] ''پلاسی کے بعد ایک ایسی تابناک صبح طلوع ہوئی جو تاریخ عالم نے کسی اور خطے میں نہ دیکھی ہوگی۔ 23 رجون 1757ء کو ہندوستان میں قرون وسطیٰ کے دور کا خاتمہ اور جدید دور کا آغاز ہوا۔''[47] یہ حقیقت ہے کہ ہندو انگریزوں کے اتحادی بن کر جدید صنعتی دور کے آغاز سے ہی اس کے پھل سے بہرہ ور ہو گئے اور برصغیر میں ایک نئے عہد کی بالادست قوت بن گئے۔

بنگال میں مسلمان حکمرانی کے خاتمے کا اصل سہرا انگریزوں کے نہیں بلکہ مارواڑی سیٹھوں اور بنگالی ہندوؤں کے سر پر بندھتا ہے۔ ہندو۔ مسلم تضاد مصنوعی نہیں تھا اور انگریزوں کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ اصل حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ساڑھے پانچ سو سال مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سماجی ظلم و جبر برداشت کرنے کے بعد ہندوؤں میں اس جبر سے نجات کے حصول کی کوئی خواہش نہیں تھی اور انہیں یہ جبر بہت پیارا تھا اور انگریزوں نے آ کر انہیں مسلمانوں سے لڑوا دیا تھا تو یہ محض اس کے ذہنی دیوالیہ پن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ ایک بالکل مختلف بات ہے کہ اس تضاد کا فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔ لیکن یہ کہ یہ تضاد پیدا ہی انگریزوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول پر کیا تھا تاکہ وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھ سکے تاریخ کے علم سے سراسر ناانصافی ہے۔ تاریخ کا کوئی سنجیدہ طالب علم ایک ایسے تضاد کو، جس کی جڑیں تاریخ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اتار چڑھاؤ کے اندر گوندھی ہوئی تھیں، مصنوعی قرار نہیں دے سکتا۔ جہاں تک اس سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے تو جب کوئی چیز موجود ہوتی ہے تو اس سے ہر کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے فائدہ اٹھانا ہی چاہیے۔ انگریزوں کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کو اس تضاد سے جس کی اتنی مضبوط جڑیں تھیں فائدہ پہنچنے کی پوری گنجائش تھی اور اس نے اس سے فائدہ اٹھانا ہی تھا۔

یہ تضاد 1757ء میں بھی حل نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ ساڑھے پانچ سو سال کے بعد اس میں محض ایک معیاری تبدیلی یہ آئی تھی کہ اب تک مسلمان حاوی اور ہندو مغلوب تھا، اب مسلمان مغلوب اور ہندو غالب ہو گیا تھا۔ پہلے مسلمان مراعات یافتہ تھا اور ہندو محروم و محکوم۔ اب ہندو مراعات یافتہ ہو گیا اور مسلمان محروم و محکوم۔ 1757ء کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی

حیثیتیں الٹ ہوگئیں۔ تضاد بدستور موجود رہا۔ میر جعفر 1757ء سے 1760ء تک انگریزوں، ہندو تاجروں اور سیٹھوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ پھر انہوں نے اس کے داماد میر قاسم کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کر کے میر جعفر کو معزول کر دیا۔ نئے نواب میر قاسم (1670ء تا 1763ء) نے شروع میں ان کے اشاروں پر کام کیا مگر پھر اس نے مسلمان حکمرانوں کی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ باسی کڑھی میں ابال ثابت ہوئی۔ اس نے ہندو اعلیٰ عہدیداروں کو برطرف کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں نے ان ہندو اعلیٰ عہدیداروں کی طرف داری کی اور میر قاسم کو بے بس کر دیا۔ میر قاسم نے جگت سیٹھ خاندان کے سربراہوں کو قتل کروا دیا۔ 1763ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں میر قاسم شکست کھا گیا تو انگریزوں نے پھر سے میر جعفر کو نواب بنا دیا اور جسے مرتے دم (1765ء) تک مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی حکمرانی کی آخری علامت کے طور پر برقرار رکھ کر مسلمانوں کی حکمرانی کا ڈھونگ رچائے رکھا۔ اس کے مرنے پر مسلمان حکمرانی کا یہ ڈھونگ بھی ختم ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1765ء میں بنگال کے مالی انتظام (دیوانی) کا پروانہ مغل شہنشاہ سے حاصل کر کے تمام اقتدار براہ راست اپنے ہاتھ میں لے کر نواب کے منصب کو عملاً حکومت سے بے دخل کر دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد نواب کی یہ نمائشی حیثیت بھی ختم کر دی گئی۔ تاہم عملاً 1765ء میں بنگال پر کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا تھا۔

ہندو غالب و بالا دست اور مسلمان مغلوب و محکوم......

کمپنی کا دور (1765ء - 1857ء)

کمپنی کے دور حکومت (1765ء تا 1857ء) میں ہندو۔ مسلم تضاد اپنی انتہا تک شدید ہوا۔ ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا وہ اس سارے عرصے میں بدستور قائم رہا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے مسلمانوں کو سیاسی اور پھر معاشی، معاشرتی اور ثقافتی محرومی و محکومی سے دوچار کیا گیا۔ جس سیاسی ادارے نے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی بالادستی کا تحفظ کیا ہوا تھا وہ نواب تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے نواب کی حیثیت کا خاتمہ کیا گیا۔ اس کی حفاظتی بنیاد یعنی اس کی فوج کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کی معاشی بنیاد یعنی دیوانی کو کمپنی نے مغل شہنشاہ کے فرمان کے ذریعے حاصل کر لیا۔ فوج کے

خاتمے سے ہزاروں مسلمان بے روزگار ہوئے۔ دیوانی میں شروع میں مسلمانوں کو رہنے دیا گیا لیکن آہستہ آہستہ ان کی جگہ ہندو لیتے چلے گئے۔ نچلے اہلکار پہلے ہی ہندو تھے چنانچہ یہ محکمہ بھی آہستہ آہستہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ بے شمار مسلمان بے روزگار ہو گئے۔ ہندوؤں کے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے۔ ہندوؤں کو جزیہ اور ابواب سے نجات ملی۔ محکمہ انصاف مکمل طور پر مسلمانوں کے پاس ہوتا تھا اور ہر شہر میں قاضی مقرر ہوتے تھے۔ اگر چہ ان قاضیوں کو رہنے دیا گیا لیکن ان کے اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ ان کی فیصلہ صادر کرنے کی قوت چھین لی گئی۔ ان کی محض مشاورتی حیثیت رہ گئی۔ ہندوؤں کے لئے عدالتوں میں علیحدہ مشیر مقرر کر دیئے گئے۔ پھر ایک وقت آیا جب مشیروں کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔ برطانوی طرز کی عدالتیں قائم ہوگئیں جن کے بیشتر جج ہندو ہوتے تھے۔ مسلمان قاضی بے روزگار ہو گئے۔

کمپنی نے دیوانی کا کاروبار ہندوؤں کے تعاون سے چلانا شروع کیا۔ شروع میں زمینوں کا بندوبست دو دو سال کے بعد کیا۔ پھر وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) (1785ء-1785ء) نے 1777ء میں سال بہ سال شروع کر دیا۔ مالیہ جمع کرنے کا ٹھیکہ مرشد قلی کے زمانے سے زیادہ تر ہندوؤں کے پاس تھا۔ سال بہ سال بندوبست سے یہ غیر یقینی کا شکار رہتے تھے اور ہر سال ٹھیکہ کی مقدار میں اضافہ ہوجاتا تھا اس صورت حال سے یہ ہندو ٹھیکیدار غیر مطمئن تھے اگر چہ اس طریقہ کار سے بے تحاشا ریونیو جمع ہوا اور ہر سال ٹھیکے کی نئی رقم کا تعین ہونے سے جب رقم میں اضافہ ہوتا تھا تو یہ دباؤ براہ راست کاشتکار کے کندھوں پر آن پڑتا تھا۔ تاہم 1793ء میں لارڈ کارنوالس (1785ء-1805ء) نے تمام اراضی کا بندوبست مستقل طور پر طے کر دیا اور ہندو ٹھیکیدار کو مالیہ کی وصولی کا دائمی حق دے دیا گیا۔ اسے بندوبست دوامی (Parmanent Settelement) کہا جاتا ہے۔ اس بندوبست کے ذریعے بیشتر اراضی جو کہ مسلمان امرا کے پاس تھی عملاً اس کے قبضے سے نکل کر مذکورہ ہندو ٹھیکیداروں کے قبضہ میں آ گئی اور مسلمان امرا ان کے دست نگر ہو گئے۔ ولیم ہنٹر لکھتا ہے کہ ''ہم نے مسلمان افسروں سے ان کا وہ منصب چھین لیا جس کی بدولت وہ مالیہ وصول کرنے والے اصل اہلکاروں اور حکومت کے مابین رابطہ بنے ہوئے تھے...... اس سے مسلمان خاندانوں کو بڑا دھچکہ لگا۔ بندوبست میں یہ رجحان غالب تھا کہ ماتحت ہندو عامل جو کسان سے براہ راست وصولی کا کام کرتے تھے، باقاعدہ زمیندار بن جائیں۔''[48]

بندوبست دوامی نے بنگال میں ہندو۔مسلم تضاد کو گہرا کرنے کے لئے معاشی بنیاد پیدا کی۔ رومیش دت اور دوسرے ہندو مؤرخین نے جو ویسے تو انگریزی سامراج کے دشمن بنتے ہیں لیکن بندوبست دوامی کے بارے میں انگریزوں کی بڑی تعریف کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں "بندوبست دوامی ان تمام اقدامات میں سے انتہائی دانشمندانہ اور کامیاب ترین اقدام ہے جو برطانوی قوم نے اب تک اٹھائے ہیں۔"[49] وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس بندوبست نے راتوں رات نئے ہندو زمینداروں کی ایک کھیپ کو جنم دیا جنہوں نے آنے والے برسوں میں بنگال کے سیاسی حالات پر کنٹرول حاصل کیا کیونکہ ان کو اس بندوبست کی بدولت معیشت پر کنٹرول حاصل ہو چکا تھا۔ بندوبست دوامی میں ایسی اراضی جو مغل بادشاہوں یا ان سے قبل ترک یا افغان حکمرانوں نے مختلف رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے وقف کی ہوئی تھی اور ان پر مالیہ معاف تھا اور جن سے مسلمانوں کی درسگاہیں، عبادت گاہیں اور خانقاہیں اپنے اخراجات پورے کرتی تھیں مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر حکومت کے قبضہ میں چلی گئیں۔ وہ اراضی بھی جو مختلف مسلمان امرا کو بخشیش کے طور پر مالیہ معاف کر کے دی ہوئی تھیں اور یہ جاگیریں کئی نسلوں سے چلی آتی تھیں مسلمان امرا سے اس بنا پر لے لی گئیں کہ وہ بخشیش کا پروانہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔[50] ان مسلمان امرا کے آباؤ اجداد کو جس وقت یہ بخشیش کی گئی تھی اس وقت ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ایک روز اس پروانے کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ کہ اس کو حفاظت سے رکھنا چاہیے۔ ویسے بھی یہ دور افراتفری کا دور رہا تھا اور مسلمان امرا جاگیردارانہ لاپرواہی کا شکار تھے۔ ان سے ان پروانوں کی حفاظت نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم یہ ایک بہانہ تھا جس کی بنیاد پر بہت سے مسلمان امرا جو مالیہ معاف زمینوں کے مالک تھے اور جن کو لکھی راج دار کہا جاتا تھا، ان زمینوں سے محروم ہو گئے۔ کلکٹروں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے لکھی راج داروں کو ہراساں کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔[51] اٹھارہویں صدی کے اختتام تک مسلمان امرا مفلوک الحال ہو چکے تھے۔ نئے ہندو امرا کی ایک نسل پیدا ہو چکی تھی۔

مسلمانوں کی اکثریت جو کہ کسانوں پر مشتمل تھی ہندوؤں اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ سے بری طرح متاثر ہوئی۔ نئے ہندو زمیندار ان کی زمینوں کے مالک بن گئے تھے۔ صدیوں سے قائم نظام میں زمینوں کے مالک کسان ہوتے تھے۔ جاگیردار کو صرف مالیہ پر حق حاصل ہوتا

تھا۔ بندوبست دوامی کی بدولت جہاں مسلمان جاگیرداروں کو اس حق سے محروم کیا گیا وہاں کسانوں کے ہاتھ سے زمین کا حق ملکیت نکل کر نئے ہندو زمیندار کے پاس آ گیا کہ وہ مستقل طور پر مالک بنا دیا گیا تھا۔ کمپنی کے ایک اعلیٰ افسر میٹکاف (Metcalfe) کے الفاظ میں ''کارنوالس ہندوستان میں ذاتی ملکیت کا خالق ہے۔ ایک زمیندار کے وجود میں آنے سے سینکڑوں ہزاروں کے ملکیتی حقوق تلف ہوئے۔''[52] چنانچہ اب مسلمان کسان ہندو زمینداروں کے رحم وکرم پر تھے۔ وہ ان کو بے دخل بھی کر سکتا تھا جبکہ ماضی میں مسلمان جاگیردار کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ان ہندو زمینداروں کو یہ حق بھی تھا کہ وہ کسانوں سے جتنی چاہیں وصولی کریں۔ فرید پور مجسٹریسی کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ''ہندو زمیندار مسلمان کسانوں سے 23 قسم کے ناجائز ٹیکس وصول کرتے تھے۔ وصولیوں کے لئے مار پیٹ اور قید میں ڈالنا عام تھا۔ مسلمان کسانوں کے ان پڑھ ہونے کا بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا اور زمیندار اور پینشن دار کے ایجنٹ جھوٹی رسیدیں بنا لیتے تھے۔''[53] چنانچہ ان ہندو زمینداروں نے مسلمان کسانوں کا عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ انہیں مطیع وفرمانبردار بنانے کے لئے مختلف بہانوں سے تنگ کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان مسلمان کسانوں کو مذہبی رسوم ورواج کی ادائیگی کے معاملہ میں بھی ہندو زمیندار کے مظالم کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ ہندو زمیندار نئی قسم کی وصولیاں عائد کر دیتا تھا۔ جن کی عدم ادائیگی کی صورت میں انگریزوں کی سرکاری مشینری اس کا ساتھ دیتے ہوئے ان مسلمان کسانوں کے ساتھ زیادتیاں کرتی تھی اور زبردستی وصولیاں کی جاتی تھیں نیز جرمانے عائد کئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ہندو زمینداروں نے مسلمانوں پر داڑھی ٹیکس بھی عائد کیا تھا۔[54]

مسلمان کسانوں پر نئے ہندو زمیندار کے استبداد کے علاوہ ہندوؤں کے ایک اور طبقہ کا جبر بھی مسلط ہو گیا تھا۔ یہ انگریزوں کا گماشتہ جو ''من مانے'' داموں ان کی پیداوار اٹھا کر لے جاتا تھا۔ اس کے مقرر کردہ نرخ پر اگر کوئی مسلمان کسان اپنی پیداوار نہ دینے کا ارادہ ظاہر کرتا تو اس کو مارا پیٹا جاتا تھا۔ سرکاری مشینری اس ہندو گماشتے کا ساتھ دیتی اور حکم عدولی کرنے والے کسانوں کو جیلوں میں ڈال کر ان پر تشدد کیا جاتا تھا۔ یہ ہندو گماشتے بازار کے عام نرخ سے بہت کم نرخ پر پیداوار خریدتے لیکن جب اپنی اشیا کی فروخت کرتے تو بازار کے نرخ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ ان اشیا کی فروخت بھی جبراً کرائی جاتی تھی اور مسلمان کسان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ

ہندوگماشتے کے مقرر کردہ نرخ پر اشیا حاصل کرے۔ جنوب مشرقی ڈیلٹا کے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں ہندوگماشتوں نے سب سے زیادہ ظلم ڈھائے۔ ہندوگماشتوں کے خوف سے یہاں کے مسلمان کسان نقل مکانی کر گئے۔ یہ علاقہ ویران ہوگیا۔[55] قحط میں ہزاروں لاکھوں لوگ مر گئے۔ لوگوں نے تنگ آکر اپنے بچوں تک کو فروخت کر دیا۔ ادھر لوگ بھوک سے بلبلا رہے تھے، ادھر ہندوگماشتے اپنے چاولوں کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھے تھے۔[56]

ہندو زمینداروں اور ہندوگماشتوں کے علاوہ ایک تیسری قوت جو مسلمان کسانوں پر مسلط ہوئی وہ نیل یعنی انڈیگو (Indigo) کاشت کرانے والے انگریز تاجر تھے۔ یہ لوگ انڈیگو کی کاشت کا جو عوضانہ مسلمان کسانوں کو ادا کرتے تھے اس سے کسان کو کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔ اگر مسلمان کسان انڈیگو کی کاشت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تو ان پر تشدد کیا جاتا اور ان سے زبردستی انڈیگو کاشت کرائی جاتی اور جو انگریز کے دل میں آتا عوضانہ ادا کرتا تھا۔ مسلمان کسان کسی منافع بخش فصل کی کاشت نہیں کر سکتے تھے۔[57]

مسلمان جولاہے بھی اس جبر کا بری طرح شکار ہوئے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ نے مسلمان جولاہے کی زندگی وبال کر دی تھی۔ ہندوگماشتہ اپنی مرضی سے ان کے کپڑے کا نرخ مقرر کرتا تھا اور اگر وہ اس نرخ پر فروخت نہ کرتے تو ان کو تشدد کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ یہ وہی جولاہے تھے جن کی تیار کردہ ململ کا پوری دنیا میں شہرہ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بنگال کی ململ کا پورا تھان ایک مٹھی میں سما سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے اپنی مانچسٹر اور برمنگھم کی کپڑے کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے بنگال کے مسلمان جولاہوں کی کپڑے کی قدیمی صنعت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلمان جولاہے جو بیشتر اوقات بیک وقت کسان بھی ہوتے تھے۔ نہ تو زراعت سے اپنا پیٹ پالنے کے قابل رہے اور نہ ہی صنعت و حرفت ان کے پاس رہنے دی گئی کہ وہ اس سے اس کمی کو پورا کر سکتے جو زرعی معیشت میں ان پر جبر کے ذریعہ پیدا کی جارہی تھی۔ کمپنی کی طرف سے مقامی صنعت و حرفت کی حوصلہ شکنی کی وجہ سے ڈھاکہ کے کپڑے کی مانگ 1789ء سے کم ہونی شروع ہوئی۔ صرف ڈھاکہ میں تیار ہونے والا جو کپڑا برآمد ہوتا تھا وہ 1799ء میں بارہ لاکھ روپے کی مالیت سے گر کر 1813ء میں صرف ساڑھے تین لاکھ روپے تک رہ گیا۔ 1817ء میں ڈھاکہ سے انگلینڈ کو برآمد کی جانے والی ململ بالکل بند کر دی گئی اور ڈھاکہ کی تجارتی کوٹھی

(کمرشل ریذیڈنسی) کو بالکل بند کر دیا گیا۔ گویا مسلم اکثریتی مشرقی بنگال کی صنعتی ترقی کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔[58] اس سے وابستہ لاکھوں اہل حرفہ بے روزگار ہو گئے اور دیہاتوں کا رخ کرنے لگے مگر وہاں بھی بندوبست دوامی کے ہولناک اثرات اور ہندو زمیندار کا ہولناک جبر منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کی مسلمان اکثریت کے تمام طبقے ہندوؤں اور انگریزوں کے مشترکہ استحصال کا شکار ہو کر معاشی اور معاشرتی طور پر ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ ہندوؤں نے ساڑھے پانچ سو سالہ جبر کا بدلہ لینا شروع کیا ہوا تھا۔

باب: 2

بنگالی مسلمانوں کی
انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مزاحمت

فرائضی تحریک اور وہابی تحریک

19 ویں صدی کے اوائل میں بنگال میں مسلمان کسانوں کی مسلح تحریک فرائضی تحریک کے نام پر چلی۔ یہ تحریک مسلمان کسانوں کی ہندو زمینداروں اور انڈیگو کے انگریز کاشتکاروں کے خلاف تھی۔ اس کی نوعیت طبقاتی تھی تاہم مذہب کے حوالے سے اسے فرائضی یعنی اسلام کے فرائض کی پابندی کرنے والوں کی تحریک کہا گیا۔ اس تحریک کے علمبردار جن میں حاجی شریعت اللہ، دودو میاں اور تیتو میر زیادہ قابل ذکر ہیں، یہ سمجھتے تھے کہ بنگالی مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی فرائض کی پابندی نہ کرنے اور ہندووانہ رسوم ورواج کے اختیار کرنے کی وجہ سے ہر قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ حقیقت کہ یہ تحریک ترقی پسند اور طبقاتی تحریک ہوتے ہوئے بھی مذہب کے حوالے سے چلائی گئی، اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہندو۔ مسلم تضاد کس قدر شدید تھا۔ اس مسلح تحریک میں ہندو زمینداروں اور انگریز تاجروں کو قتل کیا گیا اور ان کی املاک کی لوٹ مار کی گئی۔ مزید برآں ہندوؤں کے مندروں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔[59]

اسی نوعیت کی تحریک وہابی تحریک کے نام پر چلی۔ اس تحریک کے قائدین جزیرہ نما عرب کے ایک رہنما محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر تھے جس کی تعلیم یہ تھی کہ اسلام کی اس شکل کا احیا کیا جائے جو جزیرہ نما عرب سے باہر نکلنے سے پہلے تھی اور جسے اس کے بقول عجمیوں یعنی ترکوں اور ایرانیوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دراصل عثمانی ترکوں کے جزیرہ نما عرب پر غلبہ کے خلاف عرب احیا کا علمبردار تھا۔ یہ بھی مسلح تحریک تھی جسے جہاد قرار دیا گیا تھا۔ برصغیر میں اس کا

محاذ برصغیر کے شمال مغرب میں واقع تھا اس کا قائد سید احمد بریلوی اگرچہ یو۔ پی کے علاقہ سے تھا لیکن اس کو پیروکاروں کی کثیر تعداد بنگال سے حاصل ہوئی۔ وہ 1821ء میں کلکتہ سے ہوکر حج کرنے مکہ گیا اور وہاں محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوا۔ 1823ء میں وہ مکہ سے واپس آیا تو اس نے پورے برصغیر کا دورہ کیا اور بنگال بھی آیا۔ اس کی طرف سے جہاد کی دعوت کا سب سے موٴثر جواب بنگال سے ملا۔ بنگالی کسان ہندووٴں کے ساتھ پورے برصغیر میں لڑنا چاہتا تھا اس لئے وہابی تحریک کے رہنما انہیں بھرتی کر کے شمال مغربی محاذ پر لے جاتے تھے جو پنجاب کے سکھ حکمرانوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ بعد میں جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرلیا تو یہ محاذ انگریزوں کے خلاف قائم رہا۔ بنگال سے مسلمان نوجوان جذبہ جہاد کے تحت شمال مغربی محاذ تک پہنچتے اور لڑائی میں حصہ لیتے تھے۔ اس جذبہ جہاد کی مادی بنیاد یہ تھی کہ ہندووٴں اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ نے مسلمانوں پر بنگال کی زمین کو تنگ کر دیا تھا جس سے نجات ان کو اس جہاد میں نظر آتی تھی۔ ولیم ہنٹر (William Hunter) نے ان تمام شکایات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جو مسلمانوں کو انگریزوں سے تھیں۔ اس نے مسلمانوں اور ہندووٴں کے تعلیمی اور معاشی فرق کا بھی جائزہ لیا۔[60] یہ تحریک جو تقریباً 1872ء تک چلتی رہی اور نوجوان جذبہ جہاد سے سرشار ہوکر اس میں شامل ہوتے رہے، ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی مگر مذہبی حوالے سے چلی اور رجعتی سوچ کے مالک مسلمان ملاوٴں کی قیادت کے تحت چلنے کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔

مذکورہ ترقی پسند مسلح تحریکوں کی قیادت پر ملاوٴں کے قبضے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے محروم رکھنے میں انگریزوں اور ہندووٴں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے باہمی گٹھ جوڑ نے ہندووٴں کے لئے تو جدید تعلیم کا بندوبست کیا مگر مسلمانوں کو اس سے محروم رکھا۔ مسلمان اپنی معاشی پس ماندگی کے سبب اور ملا کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے خود بھی جدید تعلیم کے حصول کا بندوبست نہ کر سکے۔ ہندووٴں نے جدید تعلیم کے لئے راجہ رام موہن رائے (1772ء۔1833ء) کی زیر قیادت اور انگریزوں کی سرپرستی میں 19 ویں صدی کے اوائل میں کلکتہ اور دوسرے شہروں میں کالج کھولے لیکن دوسری طرف مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی کی حالت یہ تھی کہ نہ صرف انگریزی تعلیم دینے والے سکولوں اور کالجوں میں ہندووٴں کی اکثریت تھی بلکہ فارسی اور عربی کے سکولوں میں بھی ہندو اکثریت میں تھے۔ اس کا اندازہ ولیم ایڈم (William Adam) کی 1838ء کی اس

رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جواس نے بنگال وبہار کے پانچ اضلاع مرشد آباد، بردوان، بیربھوم، تیرہٹ اور جنوبی بہار کے سروے کے بعد پیش کی تھی۔اس کے مطابق عربی اور فارسی مدرسوں کے کل طلبا کی تعداد 3654 تھی جس میں 2096 ہندو اور 1558 مسلمان تھے۔[61] اور جہاں تک بنگالی زبان اور ہندی یعنی مقامی زبانوں کے سکولوں کا تعلق تھا توان میں کل تعداد 24211 تھی جس میں ہندو طلبا 22951 اور مسلمان طلبا صرف 1260 تھے۔[62] یعنی مقامی زبانوں کے سکولوں میں مسلمان بالکل آٹے میں نمک کے برابر تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس صورت حال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوئی۔ہندو۔مسلم تضاد میں شدت اور ہندو۔انگریز گٹھ جوڑ کے نتیجے میں بنگال جیسے مسلم اکثریتی علاقے میں مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا اندازہ 1841ء سے 1856ء تک کے گورنمنٹ کالجوں اور سکولوں کے طلبا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تناسب سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔[63]

سال	ہندو	مسلمان	دوسرے	میزان
1841	3188	751	95	4034
1846	3846	606	85	4537
1852	3814	796	64	4674
1856	6194	727	147	7068

اس موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس پندرہ سال کے عرصہ میں ہندو طلبا کی تعداد بڑھ کر تقریباً دوگنی ہوگئی جبکہ مسلمانوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہوا اور وہ تقریباً اتنے ہی رہے۔لارڈ ہارڈنگ (Hardinge) نے دیہی آبادی کو سستی تعلیم مہیا کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ بھی ہندوؤں تک محدود رہا۔سستی تعلیم دینے کے جو سکول قائم کئے گئے وہ تمام جنوب مغربی بنگال میں قائم کئے گئے جو ہندو اکثریت کا علاقہ تھا جبکہ اس علاقے میں پہلے ہی سکولوں کی کافی تعداد موجود تھی۔یہاں 38 ماڈل سکول قائم کئے گئے جن پر حکومت 1100 پونڈ خرچ کرتی تھی جبکہ فیسوں کی ادائیگی سے صرف 267 پونڈ حاصل ہوتے تھے۔[64]

مسلمانوں میں تعلیمی زبوں حالی کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ہنٹر کی رپورٹ کے مطابق 1871ء میں بنگال میں سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب یہ تھا:[65]

نمبر شمار	عہدہ/محکمہ	یورپین	ہندو	مسلمان	میزان
1	سول سروس (تاج برطانیہ کی جانب سے براہ راست تقرری)	260	-	-	260
2	جوڈیشل آفیسرز	47	-	-	47
3	ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	26	7	-	33
4	ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر	53	113	30	196
5	انکم ٹیکس اسیسرز (assesssors)	11	43	6	60
6	رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ	33	25	2	60
7	ماتحت جج اور سمال کاز کورٹ کے جج	14	25	8	47
8	منصف	1	178	37	216
9	پولیس ڈیپارٹمنٹ (گزٹیڈ آفیسرز)	106	3	-	109
10	پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ، انجینئر اسٹیبلشمنٹ	154	19	-	173
11	پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ				
12	پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ	72	125	-	197
	(اکاؤنٹس کا عملہ)	22	54	-	76
13	میڈیکل ڈیپارٹمنٹ	89	65	4	158
14	محکمہ تعلیم	38	14	1	53
15	دوسرے محکمے مثلاً				

کسٹمز، میرین، سروے اورافیون وغیرہ	412	10	-	422
	......	......	......	......
میزان	1338	681	88	2107

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبہ بنگال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ملازمتوں کا تناسب ایک اور سات کا تھا۔ جبکہ ایک سوسال پہلے صورت حال بالکل اس کے برعکس تھی۔ مجموعی تعلیم پر ہندوؤں کی بالادستی نے ہندوؤں میں درمیانہ طبقہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں میں کوئی درمیانہ طبقہ پیدا نہ ہوسکا جو اپنی بقا کی تحریک کو جدید خطوط پر منظم کرسکتا۔ کمپنی کا دور مسلمانوں کے لئے انتہائی تاریک دور تھا جبکہ ہندوؤں کے لئے بڑا روشن دور تھا۔ اس دور میں ہندوؤں میں روشن خیال ہندو احیا کی تحریکیں بھی چلیں۔

1857ء کے بعد جب بنگال باقی برصغیر کے ہمراہ کمپنی کے ظالمانہ تسلط سے نکل کر تاج برطانیہ کے تحت آ گیا تو گزشتہ ایک سوسال تک ہندوؤں اور انگریزوں کے مشترکہ جبر و استحصال کا شکار رہنے والے مسلمانوں کے لئے بھی ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ اس کی وجہ تاج برطانیہ کی انسان دوستی یا فراخدلی نہیں تھی بلکہ اس کا اندازہ ولیم ہنٹر کی اس رپورٹ سے لگتا ہے جو اس نے حکومت برطانیہ کے ایما پر مسلمانوں کے بارے میں تیار کی۔ انگریز انیسویں صدی کے وسط میں شمال مغربی سرحد پر جو اس وقت روس کی توسیع پسندی کی زد میں تھی، مسلمان باغیوں یعنی وہابی مجاہدین کی موجودگی سے خائف تھے۔ اس مسلح جدوجہد کی افرادی قوت بنگال کے مسلمان کسان مہیا کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ گزشتہ ایک سوسال میں انگریز کے اشتراک کی وجہ سے جو ہندو درمیانہ بورژوا طبقہ ابھر رہا تھا اس کے مطالبات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور انگریز اس کے عزائم کو ایک حد میں رکھنے کے لئے مسلمانوں کے لیور (Lever) کو استعمال کرنا چاہتے تھے چنانچہ 1870ء میں ولیم ہنٹر نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کے ساتھ گزشتہ ایک سوسال میں کی گئی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کے لئے سفارشات کیں۔[66] اس طرح انگریز ہندو۔ مسلم تضاد کو پیدا نہیں کر رہے تھے بلکہ اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ہندو بنگالی بابوؤں کی بالادستی اور اس کے خلاف مسلم درمیانہ طبقہ کی نمود......

سید امیر علی اور نواب لطیف

1862ء کی اصلاحات کے نتیجے میں جو بنگال لیجسلیٹو کونسل وجود میں آئی تھی اس کے تین مقامی نمائندوں میں دو ہندو اور ایک مسلمان لیا گیا تھا لیکن ہندو۔ مسلم تضاد میں اس قدر شدت تھی اور ہندو بنگالی بابو اس قدر مؤثر حیثیت اختیار کر چکے تھے کہ انگریز مسلمانوں کو کوئی لمبی چوڑی مراعات نہ دے سکتے تھے۔ اس دوران مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی میں بھی کوئی خاص فرق نہ آیا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں ادھر انگریزوں نے مسلمانوں کے بارے میں ذرا ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ادھر بنگال کے ہندو درمیانہ طبقہ میں جدید حوالوں سے ہندو احیا کی تحریکوں نے جنم لیا اور بنگال کے ہندو درمیانہ طبقے نے بنگالی نیشنلزم کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے مطابق مسلمان اور انگریز دونوں بیرونی حملہ آور تھے اور ان سے نجات حاصل کی جانی چاہیے تھی۔ اس دور میں بنکم چندرا چڑ جی اور اس قبیل کے بہت سے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے بنگالی ہندوؤں پر گزشتہ کئی صدیوں کے دوران مسلمانوں کے جبر و تشدد کو اجاگر کر کے پیش کیا اور بندے ماترم کے نعرے نے جنم لیا۔ بنکم چندرا چڑ جی اور دوسرے ہندو ادیبوں کو بنگالی قوم پرستی میں ماضی کے صرف ہندو حوالے ہی نظر آئے۔ اس نے ہندو سنیاسیوں کی مسلمان امرا کے خلاف 1770ء کی مسلح تحریک کو اپنے ناول ''انند مٹھ'' کا موضوع بنایا۔ لیکن اسے انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کے مسلمان کسانوں کی انگریزوں کے خلاف مسلح تحریک میں کوئی قوم پرستی نظر نہ آئی۔ ناول کے مطابق مسلمان جاگیرداروں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والے ہندو سنیاسی مل کر ایک ترانہ گاتے تھے جس میں ''بندے ماترم'' کا مصرع بار بار دہراتے تھے۔ بنگالی نیشنلزم کے نام پر ''انند مٹھ'' میں ''بندے ماترم'' کا جو نعرہ گونجا تھا اس میں مذہب سے ماورئ کسی بنگالی یا انڈین نیشنلزم کی بات نہیں کی گئی تھی۔ یہ ترانہ سیدھا سیدھا مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس قسم کا بے شمار ادب انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوا جس سے ہندو۔ مسلم تضاد کے شدید ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس دوران بنگالی بابوؤں نے اپنے مطالبات میں زور پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا سطح پر تحریک چلائی۔ انہوں نے 1851ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی اور 1876ء میں انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا لیڈر سر یندر ناتھ بیز جی اٹلی کے بورژوا نیشنلسٹ لیڈر

مازینی(Mazzini) سے متاثر تھا۔[67] ہندو بورژوازی کی یہ جدوجہد بالآخر 1885ء میں کلکتہ میں آل انڈیا نیشنل کانفرنس کے انعقاد پر منتج ہوئی۔ اسی سال بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آئی۔ آئندہ سال 1886ء میں کلکتہ میں دونوں تنظیموں کے مشترکہ اجلاس میں ادغام ہوگیا اورآل انڈین نیشنل کانگرس کا صحیح معنوں میں قیام عمل میں آگیا۔ اس آل انڈین نیشنل تنظیم میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مسلمانوں نے اپنی تعلیمی، معاشی اور سیاسی اصلاح کے لئے علیحدہ جدوجہد کی۔ جن لوگوں نے رہنمایانہ کردار ادا کیا ان میں امیر علی خان نواب بہادر (79-1810ء)، مولوی عبداللطیف نواب (93-1828ء) نواب سرعبدالغنی (96-1830ء)، سید ولایت علی نواب بہادر، سید امیر حسین (نواب) اور سید امیر علی (1929ء-1847ء) ہیں۔ انہوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کے لئے بورژوا جمہوری طریقوں سے اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لئے راہ ہموار کی۔ ان میں انگریزی تعلیم کا حصول، بورژوا ایسوسی ایشنوں اور اداروں کی تشکیل، سرکاری ملازمتوں، سرکاری بورژوا جمہوری اداروں میں شمولیت، کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے اپنے نصب العین کی تکمیل کی جدوجہد کے طریقے شامل تھے۔ انہوں نے 1856ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، 1863ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی اور 1879ء میں سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ یہ پلیٹ فارم مسلمانوں کی تعلیم وترقی اور دیگر عمومی مسائل کے حل کی جدوجہد کے لئے استعمال کئے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک کسی مقام پر بھی نہ ہو سکا۔ مسلمانوں نے اپنی جداگانہ جدوجہد کی بنا پر 1892ء کی اصلاحات کے نتیجے میں بنگال کونسل میں مؤثر نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

تقسیم بنگال سے مسلمانوں کا فائدہ مگر ہندوؤں کی ایجی ٹیشن اوردہشت گردی سے تقسیم کی تنسیخ

1905ء میں جاپانیوں کے ہاتھوں روسیوں کی شکست فاش کے بعد جب انگریزوں نے برما اور مشرقی ہندوستان کی بڑھتی ہوئی دفاعی اہمیت کے پیش نظر اس خطے کی انتظامی حد بندی پر نظر ثانی کی تو بنگال کو بہت بڑا انتظامی یونٹ سمجھتے ہوئے وائسرائے لارڈ کرزن(Curzon) کی تجویز کے تحت انتظامی سہولت کی خاطر بنگال کو مشرقی اور مغربی دوحصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ڈھاکہ کو مشرقی حصے

کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ مشرقی بنگال چونکہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اس لئے لامحالہ اس تقسیم کا فائدہ مسلمانوں کو بھی پہنچا تھا۔ چنانچہ اسے ہندو درمیانہ طبقے نے قوم پرستی کا مسئلہ بنالیا۔ ہندو۔ مسلم تضاد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ہندو بورژوازی نے پورے زور وشور کے ساتھ بنگال کی تقسیم کو کالعدم کرانے کے لئے جو تحریک چلائی وہ سودیشی تحریک یعنی ہندو بورژوازی کی تیار کردہ مصنوعات کے فروغ کی تحریک بن گئی۔ اس بھرپور ایجی ٹیشن میں سریندر ناتھ بینرجی سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور تک معتدل رہنماؤں کے علاوہ ہندو درمیانہ طبقے کی دہشت پسندی بھی جدید انداز سے سامنے آئی جس کی قیادت بمبئی کے بال گنگا دھر تلک اور بنگال کے آروبندو گھوش اور بپن چندر پال نے کی۔ یہ دہشت پسند گروہ اگرچہ بنگالی یا انڈین قوم پرستی کی بنیاد پر وجود میں آئے تھے لیکن ان میں کوئی مسلمان شریک نہیں تھا۔ اب مسلمان وہ کردار ادا کر رہے تھے جو اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کے نصف آخر تک ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کر کے ادا کیا تھا۔ اسی عرصہ میں ہندوؤں نے انگریزوں سے مراعات حاصل کی تھیں اور مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف مسلح فرائضی اور وہابی تحریکوں کا ساتھ نہیں دیا تھا جو کہ سامراج دشمن تحریکیں تھیں۔ اب مسلمان انگریزوں سے رعایتیں حاصل کرنا چاہتے تھے جو بنگال کی تقسیم کی صورت میں ان کو حاصل بھی ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ہندو اور مسلمان دو مختلف راستوں پر چل رہے تھے جن کا ٹکراؤ تو ہوتا تھا مگر اشتراک کہیں نہیں ہوتا تھا۔

16 را کتوبر 1906ء کو تقسیم بنگال کا ایک سال مکمل ہونے پر ہندو بورژوا تنظیموں نے ایجی ٹیشن کر کے یوم سوگ منایا جبکہ مسلمانوں نے اس کا جشن سالگرہ منایا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ان کے جلسے منعقد ہوئے۔ مسلمانوں کے ڈھاکہ کے جلسہ میں بیس ہزار، میمن سنگھ کے جلسہ میں 10 ہزار، فرید پور میں 6 ہزار اور سلہٹ میں ایک ہزار افراد نے شرکت کی۔[68] جلسوں میں تقسیم بنگال کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، حقوق دینے کے حق میں تقریریں کی گئیں۔ اس صورت حال میں 30 رستمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔ مسلم لیگ کے وجود میں آتے ہی اس نے پہلی قرارداد تقسیم بنگال کے حق میں منظور کی۔ انہی دنوں کلکتہ میں کانگرس کا سالانہ سیشن منعقد ہوا جس میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا مطالبہ دہرایا گیا اور اس کے خلاف

ایجی ٹیشن اور سودیشی تحریک کو وسیع تر کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ اس کے بعد بنگالی ہندو انتہا پسندوں نے دہشت پسند کارروائیوں کو منظم کرنا شروع کیا اور اگلے دو تین سال تک یہ کارروائیاں بڑے زور و شور سے جاری رہیں جس میں انگریز افسروں پر حملے اور بم دھماکے بھی شامل تھے۔

مسلمان اس سودیشی تحریک سے الگ تھلگ رہے اور اپنے لئے جداگانہ نمائندگی کے حقوق کے لئے پر امن طریقوں سے جدوجہد کرتے رہے۔ چنانچہ 1909ء کی منٹو مورلے اصلاحات میں ان کے لئے جداگانہ نمائندگی کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ تاہم 1912ء میں ہندو بورژوازی کے ایجی ٹیشن کے دباؤ کے تحت تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا گیا۔ یکم اپریل 1912ء کو متحدہ صوبہ بنگال کی لیجسلیٹو کونسل وجود میں آئی جس کے 53 ارکان میں 23 یورپین، 22 ہندو اور صرف 8 مسلمان تھے۔[69]

ہندو درمیانے طبقے کی بنگالی نیشنلزم اور مارواڑی بورژوازی کی انڈین نیشنلزم کو پورے برصغیر میں ہندوؤں کی جانب سے جو بھرپور تعاون حاصل ہوا اور جس مقصد کے ساتھ بنگالی ہندو دہشت پسندوں نے کارروائیاں کیں اس نے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو تقسیم بنگال کے فوائد سے محروم کر دیں۔ بنگالی مسلمانوں میں ابھی تک کوئی مؤثر درمیانہ طبقہ موجود نہیں تھا جو تقسیم بنگال کے تحفظ کے لئے بھرپور ایجی ٹیشن منظم کر سکتا اور نہ ہی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی جانب سے اسے کوئی تعاون حاصل ہوا۔ اس وقت برصغیر کے بیشتر مسلمان رہنماؤں اور علما کو سینکڑوں میل دور واقع ترک سلطنت عثمانیہ کا غم کھائے جا رہا تھا جو بلقان کی جنگ سے دوچار ہو کر اپنی طبعی موت کے قریب پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے ہندو ایجی ٹیشن کے مدمقابل بنگال کی تقسیم کو بچانے کے لئے کوئی بھرپور ایجی ٹیشن نہ کیا۔ البتہ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ اور سر آغا خان جیسے اعتدال پسند رہنماؤں نے 1906ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور شملہ میں وائسرائے کو عرضداشت پیش کر کے اس مسئلہ پر اپنے موقف سے آگاہ کیا۔ لیکن یہ سب کچھ بنگالی ہندو درمیانہ طبقہ کی ایجی ٹیشن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا کہ اس کی جانب سے بم دھماکے اور گوریلا دہشت گرد کارروائیاں کی جا رہی تھیں۔ چنانچہ 1912ء میں جبکہ دوسری عالمی جنگ کے سائے منڈلا رہے تھے بنگال کی تقسیم کالعدم کر دی گئی تاہم جداگانہ نمائندگی کا اصول موجود رہا۔

سیاسی اصلاحات......جداگانہ خودارادیت اور ہندو مسلم تضاد میں شدت

1919ء کی مانٹیگو۔ چیمسفورڈ(Montigu-Chelmsford) اصلاحات میں کونسلوں میں جداگانہ نمائندگی کی بنیاد پر عوامی نمائندوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو کونسل کی مجموعی تعداد 125 میں مسلمانوں کی تعداد 39 ہوگئی۔ تمام اصلاحات ہندوؤں اور مسلمانوں کے تضاد کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیتی تھیں۔ اگرچہ بظاہر یہ اصلاحات اس تضاد کو کم کرنے کے نقطہ نظر سے عمل میں لائی جاتی تھیں۔ ان اصلاحات میں مسلمانوں کو اگر ایک انچ کا بھی فائدہ ہوتا نظر آتا تو ہندوؤں کو ناگوار گزرتا تھا حالانکہ بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ ہونے کے باوجود تعلیم، تجارت، صنعت و معیشت میں ہندوؤں کے زیر نگیں تھا۔ ہندو۔ مسلم تضاد کے تاریخی پس منظر کی وجہ سے ہندوؤں کو ماضی کے مسلم غلبہ کے احیا کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ حالانکہ اس وقت چونکہ غالب قوت ہندو تھے اور ان کی جانب سے وسیع المشربی اور وسیع النظری ہی اس تضاد کو کم کرنے میں کوئی کردار ادا کرسکتی تھی۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے اوائل میں بنگال کے ہندو درمیانے طبقے میں ایک ایسی وسیع النظر شخصیت کی قیادت ابھری جس کا نام سی۔ آر۔ داس تھا۔ وہ کلکتہ کارپوریشن کا میئر، بنگال پراونشل کانگرس کا صدر اور پھر انڈین نیشنل کانگرس کا بھی صدر بنا۔ اس کی قیادت نے خلوص دل سے مسلمانوں کو جائز مراعات دے کر اس تضاد کو کم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف انہی دنوں مغربی ہندوستان کے مارواڑی سرمایہ داروں کے نمائندے موہن چند کرم داس گاندھی نے ایک مذہبی حوالے سے یعنی تحفظ خلافت کے حوالے سے مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی کی منافقانہ باتیں کیں اور تحریک خلافت، جس میں مسلمانوں کا برطانوی سامراج کے خلاف شدید جذبہ ابھر کر سامنے آیا تھا، کی قیادت میں شامل ہوکر سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ دونوں کوششوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی محض منافقانہ سیاست کے زور سے مسلمانوں کے دل جیتنا چاہتا تھا جبکہ سی۔ آر۔ داس مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے مخلصانہ کوشش کرنا چاہتا تھا اور ان کی ماضی کی کمی پوری کرنے کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ مراعات دینے کے حق میں تھا۔ مسلمان بھی یہی چاہتے تھے۔ اس زمانے میں سی۔ آر۔ داس کی سوراج پارٹی اور مسلمانوں کے مابین

تعاون کی صورت حال نظر آتی ہے۔ چنانچہ دو تین سال تک یعنی (1923ء سے 1925ء تک) سی۔آر۔داس کے معاہدۂ بنگال کے دور میں ہندو۔مسلم تضاد میں حقیقی کمی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس کی مثال بنگال کی کونسل کی سوراج پارٹی میں مسلمانوں کی اکثریت کا ہندوؤں کے شانہ بشانہ کام کرنے اور کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ اور جواب میں ان کے ہندوؤں کے ساتھ باہمی تعاون سے پیش کی جاسکتی ہے۔ اس معاہدہ کے مطابق بنگال لیجسلیٹو کونسل میں مسلمانوں کی صوبے میں آبادی کے تناسب سے نشستیں رکھی گئی تھیں۔ آبادی کے تناسب کا یہی اصول لوکل باڈیز پر بھی لاگو کیا گیا تھا۔ مسلم اکثریتی اضلاع میں لوکل باڈیز کے لئے مسلمانوں کو ساٹھ فیصد اور ہندوؤں کو چالیس فیصد نمائندگی دی گئی تھی۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے پچپن (55) فیصد کوٹہ مختص کیا گیا۔ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کی ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے اسی (80) فیصد کوٹہ مختص کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چھ نکات بھی طے کئے گئے:

1۔ کسی ایسے قانون یا قرارداد کی منظوری نہیں دی جائے گی جو مختلف قوموں میں سے کسی قوم یا مذہب کو متاثر کرتی ہو تا آنکہ اس قوم کے منتخب شدہ ارکان کا 75 فیصد حصہ اس کے حق میں نہ ہو جائے۔

2۔ مسجدوں کے سامنے بینڈ باجے کی اجازت نہ ہوگی۔

3۔ مذہبی قربانی کے لئے گائے کے ذبح کرنے پر مسلمانوں کے ساتھ مداخلت نہیں کی جائے گی۔

4۔ لیجسلیٹو کونسل میں کوئی قانون یا ضابطہ منظور نہیں کیا جائے گا جس کا تعلق خوراک کے لئے گائے ذبح کرنے کے ساتھ ہو۔ لیکن

5۔ گائے کو اس طرح ذبح کیا جائے گا کہ اس سے ہندوؤں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

6۔ ہر سال ہر سب ڈویژن میں نمائندہ کمیٹیاں منتخب کی جائیں گی جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو نصف نصف نمائندگی حاصل ہوگی۔ یہ کمیٹیاں اپنا صدر خود منتخب کریں گی۔ ان کمیٹیوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی جھگڑوں سے باز کرسکیں اور فریقین کے مابین ثالثی کرسکیں۔[70]

معاہدۂ بنگال میں مسلمانوں کو ایسی رعایات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کے ہوتے

ہوئے وہ علیحدہ ملک کے لئے سوچتے بھی نہیں تھے لیکن مغربی ہندوستان کا ہندو بورژوا، جسے انڈین نیشنل کانگرس پر غلبہ حاصل تھا، مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے سی۔آر۔داس کی پر خلوص کوشش ہندو۔ مسلم تضاد کو ختم کرنے میں نا کام رہی۔ سی ۔ آر۔ داس (1924ء۔1925ء) میں آل انڈیا نیشنل کانگرس میں مؤثر کردار ادا کرتا رہا یہاں تک کہ گاندھی کو نا کام ہو کر اپنی بساط سیاست لپیٹنا پڑی۔ لیکن سی۔ آر۔ داس کی بے وقت موت (1925ء) نے ہندو۔ مسلم تضاد کو کم کرنے کی حقیقی کوششوں کو دھچکا پہنچایا۔ گاندھی کی سیاست دوبارہ چمک اٹھی۔

گاندھی کی ہندو۔ مسلم ہم آہنگی کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمانوں کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے اور انہیں علیحدہ سے حقوق نہیں دیئے جانے چاہئیں۔ اس کی بنیاد ہندو مارواڑی بورژوازی کی انڈین نیشنلزم تھی جس کے مطابق یہ ہندو بورژوا متحدہ برصغیر سے انگریزوں کو نکال کر اس پر بلاشرکت غیرے قابض ہونا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں یا دوسری اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کر لینے سے اپنے ان عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ محسوس کرتا تھا۔

بنگالی مسلمان درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا جو تھوڑا بہت تھا وہ اس قدر کمزور اور پسماندہ تھا کہ اپنے حقوق اور مطالبات منوانے کے لئے جدید قسم کی ایجی ٹیشن یا دہشت گردی کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندو۔ مسلم تضاد کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ جب کبھی ہندوؤں نے انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن کیا، اور یہ زیادہ تر بیسویں صدی میں کیا، تو مسلمانوں نے ہندوؤں کی بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اسی طرح جب کبھی مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن کیا اور یہ زیادہ تر انیسویں صدی میں کیا، تو ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ 1930ء میں گاندھی کی سول نافرمانی اور سوبھاش چندر بوس کی پر تشدد تحریک سے مسلمان الگ تھلگ رہے۔ دوسرے عشرے کے اوائل میں گاندھی کی عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران جو عارضی سی فرقہ وارانہ ہم آہنگی نظر آئی تھی، اس مرتبہ ناپید تھی۔ خلافتی رہنماؤں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ اس تحریک میں کانگرس کا بالکل ساتھ نہ دیا جائے کہ اس کا مطلب برصغیر کے سات کروڑ مسلمانوں پر ہندوؤں کی بالادستی قائم کروانا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں دو مکاتب فکر تھے۔ اول یہ کہ کانگرس یعنی ہندو بورژوا کے ساتھ مل کر انگریزوں سے آزادی اور اپنے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد کی جائے اور دوئم یہ کہ ہندو بورژوا

کے ساتھ تضاد لاینحل ہے اور کانگرس کے ساتھ تعاون کے ذریعہ مسلمانوں کی بقا ناممکن ہے۔ لہٰذا جداگانہ بنیادوں پر آزادی اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے انگریزوں سے براہ راست معاملات طے کئے جائیں۔ یہ مؤخر الذکر نظریہ درست ثابت ہوا۔ بنگال کے مسلمانوں میں غالب رائے عامہ بھی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح اسی نظریے کے حق میں تھی اور اس کا بیشتر موقعوں پر اظہار بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہاں کے مسلمانوں نے گول میز کانفرنس میں شمولیت کی۔ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس منعقدہ 12رنومبر 1930ء میں بنگال سے مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق اور عبدالحلیم غزنوی نے نمائندگی کی اور اس طرح گول میز کانفرنس کے انعقاد کے منصوبہ کو کامیاب بنانے میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا۔ جبکہ کانگرس نے اس کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ قبل ازیں کانگرس نے اپنی دوعملی کی پالیسی کے تحت حکومت میں شمولیت سے بھی بائیکاٹ کیا ہوا تھا اور مسلمان بھی اس مسئلہ پر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ اس لئے بنگال میں 1929ء تک، 1919ء کے دوعملی کے اصول کے تحت کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ 1929ء میں پہلی مرتبہ دوعملی کے اصول کے تحت پہلی مستحکم وزارت قائم ہوئی جس کے تین وزرا میں سے دو مسلمان اور ایک ہندو تھا۔ دو مسلمان وزرا خواجہ ناظم الدین اور کے۔ جی۔ ایم فاروقی تھے۔ اس کے بعد 1934ء تک دوعملی کی وزارت برقرار رہی اور مسلمان اس میں شامل رہے۔ خواجہ ناظم الدین اس تمام عرصہ میں وزیر رہا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں نے تھوڑے بہت اقتدار میں حصہ دار بننے کا جو مزہ چکھا اس سے مسلمان درمیانے طبقہ میں ایک اعتماد پیدا ہوا اور ان کا احساس کم مائیگی دور ہوا۔ تاہم اس تھوڑے سے عرصہ میں محدود اختیارات کی حامل وزارتوں کی مدد سے مسلمانوں کی کثیر آبادی کی پس ماندگی پر کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ معاشی غلبہ ہندو بورژوازی کو ہی حاصل رہا۔

اگرچہ اس دوران مسلمانوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان کا انگریزوں کے ساتھ تضاد ختم ہو گیا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ تضاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہو جانے کی وجہ سے ان کا انگریزوں کے ساتھ تضاد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ تاہم چونکہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور یہاں مسلمانوں کے انگریزوں سے شدید تضاد کا برصغیر کے کسی بھی علاقے سے زیادہ طویل عرصہ کا پس منظر موجود تھا، اس لئے بعض مقامی معاملات میں مسلمان کانگرس کا ساتھ بھی دے دیتے تھے۔ 18راپریل 1930ء کو چٹاگانگ میں انقلابیوں نے مسلح

بغاوت کی جس میں انگریزوں کے ساتھ براہ راست مسلح ٹکراؤ ہوا تھا۔ 21/اپریل 1930ء کو چٹا گانگ میں بنگال مسلم پولیٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت اشرف الدین احمد نے کی۔ سارے ماحول میں انگریزوں کے خلاف اس قدر شدید نفرت پائی جاتی تھی کہ اس کانفرنس نے ''نمک ستیا گرہ'' کے سلسلہ میں کانگرس کے ساتھ تعاون کا اعلان کر دیا۔ پھر 1931ء میں اس مسلح بغاوت کے بارے میں کانگرس نے ایک انکوائری کمیٹی تشکیل دی تو اس میں مولانا محمد اکرم کو بھی شامل کیا گیا جو اس وقت بنگال خلافت کمیٹی کا صدر بھی تھا۔

مختلف تاریخی عوامل کی وجہ سے طویل عرصہ تک بنگال کے مسلمانوں میں مؤثر درمیانہ طبقہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں نے جتنے طویل عرصے کے لئے جتنی شدت کے ساتھ انگریزوں کے مظالم برداشت کئے تھے وہ برصغیر کے کسی اور خطے کے لوگوں نے نہیں کئے تھے۔ باقی ماندہ ہندوستان کی نسبت انگریزوں نے اس علاقہ پر کم وبیش ایک سو سال زیادہ عرصہ حکومت کی اور یہ دور بھی وہ تھا جب انگریز کسی قسم کے رعایت دینے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ یہاں کے ہندو زمینداروں، ساہوکاروں اور گماشتوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان کی مثال بھی برصغیر کے کسی اور علاقے کے مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ کمپنی کے دور کے بعد تاج برطانیہ کا دور آیا تو یہاں کے مسلمان زمانے کی دوڑ میں اس قدر پیچھے رہ گئے تھے کہ تاج کی جانب سے جو تھوڑی دیر بعد اصلاحات یا مراعات حاصل ہوئیں یہ مسلمان ان کے ذریعے اپنی اس کمی کو پورا نہ کر پائے۔ تاج کے دور میں بھی بنگال کے لوگوں کے لئے وہ مراعات یا سہولتیں نہیں تھیں جو شمالی ہندوستان کے صوبوں کے لئے تھیں۔ دوسرے نمبر پر مسلم اکثریت کے صوبے پنجاب کے بارے میں انگریزوں کا وہ رویہ نہیں تھا جو بنگال کے بارے میں رہ چکا تھا۔ یہاں پر انگریزوں کا کردار بالکل برعکس تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کو کمپنی کے ظالمانہ دور کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ انہوں نے تاج برطانیہ کا وہ دور دیکھا جو سیاسی ومعاشی اصلاحات اور سہولتیں دیئے جانے کا دور تھا۔ یہاں پر انگریزوں نے 1847ء میں قبضہ محض شمال سے حملے کے خطرے کے پیش نظر دفاعی نقطۂ نگاہ سے کیا تھا۔ یہاں کی آبادی کو جس کی اکثریت مسلمان تھی، فوج میں بھرتی ہونے کی سہولت حاصل ہوئی۔ انگریزوں نے پنجاب کو پرامن، خوشحال اور خود کفیل رکھنے کے لئے یہاں کی معیشت کو جو کہ زرعی معیشت تھی نہریں نکال کر مستحکم کر دیا، یہاں کے زمینداروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے یہاں کے بیشتر مسلمان کسانوں کو معلوم ہی

نہیں تھا کہ ہندو زمیندار کے ہاتھوں استحصال کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہاں کی خودکفیل زرعی معیشت کے بطن سے جس مسلمان درمیانے طبقے نے جنم لیا اس کی حیثیت اور قوت بنگال کے مسلمان درمیانہ طبقہ سے کہیں مختلف تھی۔ پنجاب میں سر محمد شفیع اور سر فضل حسین نے مسلمانوں کے لئے جو کچھ حاصل کرلیا تھا وہ بنگال میں وزارتوں میں رہنے کے باوجود فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین حاصل نہ کرسکے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ پنجاب کے مسلمان درمیانہ طبقہ کے فکروشعور میں بنگالی مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ جو تضاد ہندوؤں میں بالائی وشمالی ہند اور بنگال کے درمیان تھا وہ مسلمانوں میں بے انتہا پس ماندگی کی وجہ سے اس وقت شدت سے نہیں ابھر سکا۔ تاہم اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہا۔1905ء سے1912ء تک تقسیم بنگال کو کالعدم کئے جانے کے بارے میں پورے ہندوستان سے ہندو بورژوازی اور درمیانے طبقے نے ایجی ٹیشن کیا مگر تقسیم بنگال بحال رکھنے کے لئے پورے برصغیر کے مسلمانوں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی جانب سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ پنجاب سے لالہ لاجپت رائے تقسیم بنگال کالعدم کئے جانے کی ایجی ٹیشن میں بڑے زوردار طریقے سے حصہ لے رہا تھا مگر تقسیم بنگال کی بحالی کے لئے بنگالی مسلمانوں کو پنجابی مسلمانوں میں سے کوئی لاجپت رائے مہیا نہ ہوسکا۔ اس فوجی اہمیت کے علاقے سے کی جانے والی حمایت کا مطلب کسی اور علاقے سے کی جانے والی حمایت سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن پنجاب کے مسلمان دانشور، سیاستدان اور علما سب خاموش رہے جن میں مفکر پاکستان علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

بنگالی مسلمانوں کے ساتھ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی بیگانگی کا دوسرا مظاہرہ دسمبر1930ء کو الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مفکر پاکستان علامہ اقبال کے خطبہ صدارت سے ہوا جسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خطبہ کا اقتباس جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں علامہ نے مستقبل کے پاکستان کا نقشہ پیش کیا حسب ذیل ہے: ''ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ سلطنت برطانیہ میں رہتے ہوئے یا اس سے باہر رہتے ہوئے ایک خودمختار حکومت (سیلف گورنمنٹ) کا قیام اور شمالی مغربی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں کا نوشتہ تقدیر نظر آتا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفکر پاکستان کے افکار میں بنگال کے مسلمانوں کا سرے سے کوئی وجود ہی

نہیں تھا۔علامہ اقبال نے''پاکستان'' کا جو''خواب'' دیکھا تھا اس میں برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا صوبہ غائب تھا۔انہیں صرف شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی فکر تھی اور وہ شمال مغربی مسلم ریاست کا قیام چاہتے تھے۔ان کی حد نظر صرف یہاں تک محدود تھی۔ان کی مسلم قومیت میں جسے وہ جغرافیائی اور نسلی حدود سے ماورئ گردانتے تھے صرف شمال مغربی علاقے میں مسلم ریاست کے قیام تک محدود تھی۔حالانکہ 1924ء میں لالہ لاجپت رائے نے پاکستان کی جو سکیم پیش کی تھی اس میں بنگال کا مسلم اکثریتی علاقہ بھی شامل تھا۔ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اس اجلاس میں جس میں یہ تاریخی خطبہ دیا گیا کوئی قابل ذکر بنگالی مسلمان رہنما موجود نہیں تھا۔صرف کلکتہ کے ایک اردو بولنے والے سر مولوی محمد یعقوب کا ذکر ملتا ہے جس نے اس اجلاس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔[71]

1933ء میں نظریۂ پاکستان کے ایک اور مفکر چودھری رحمت علی جو کہ پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، نے اس شمال مغربی مسلم ریاست کو''پاکستان'' کے نام سے موسوم کر کے جس ریاست کا نقشہ پیش کیا اس میں بھی بنگال موجود نہیں تھا۔البتہ بعد میں یعنی 1940ء میں اس نے برصغیر میں مسلمانوں کی مختلف ریاستوں کا جو نقشہ پیش کیا تھا اس میں بنگال کے قدیمی نام بانگ کے نام پر ''بانگ اسلام'' کے نام کا علیحدہ ملک تجویز کیا تھا جس میں بنگال اور آسام کو شامل کیا گیا تھا۔[72] جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا،اس کی تشریح میں اس نے لکھا کہ''اس میں پ پنجاب کے لئے الف افغانستان کے لئے ک کشمیر کے لئے س سندھ کے لئے اور تان بلوچستان سے لیا گیا تھا۔'' بنگال اس پوری سکیم میں سے غائب ہے لیکن 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد پنجاب کا یہی مسلمان درمیانہ طبقہ جس کے نظریۂ پاکستان میں بنگال کا دور دور ذکر موجود نہیں تھا، بنگال کے سر پر سوار ہو گیا اور ان پر ہر طرح سے سیاسی، معاشی اور ثقافتی بالادستی قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا اور اس مقصد کے لئے اس نے اس''نظریۂ پاکستان'' اور''مسلم قومیت'' کے نظریے کو استعمال کیا جس میں بنگال کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں رہا تھا۔حقیقت یہ تھی کہ پاکستان ان پنجابی مسلمان مفکرین کی ''فکر'' یا''خواب'' کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کو وجود میں لانے میں برصغیر میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص کئی صدیوں سے موجود اور لاینحل ہندو۔مسلم تضاد کارفرما تھا جس کی جڑیں عوام الناس میں گہری ہو چکی تھیں اور عوام الناس اس تضاد کا حل چاہتے تھے۔خواہ پنجابی مسلمان مفکرین خواب دیکھتے یا نہ دیکھتے، بنگال کی مسلمان عامتہ الناس نے ہندو بورژوازی کے

تسلط سے نجات کی جدوجہد کرتے ہوئے اس تضاد کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے حق میں حل کرنا تھا۔

بنگال میں ایک مضبوط ہندو بورژوا طبقہ پیدا ہونے اور بورژوا ذرائع پیداوار آ جانے سے یہاں کی آبادی کا کثیر حصہ متاثر ہوا جو کہ مسلمان تھا اور زرعی معیشت کے روایتی ذرائع پیداوار کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہاں کی بے شمار روایتی صنعتوں اور دستکاریوں کو انگریز اور ہندو بورژوا کی جدید صنعت کھا گئی تھی ایسے جیسے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ ذرائع پیداوار کی تبدیلی کے نتیجے میں ہندوؤں کا مراعات یافتہ بورژوا طبقہ پیدا ہوا اور مسلمان محروم اور پس ماندہ طبقہ بن گئے۔ 1931ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق روایتی غیر زراعتی پیشوں سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کا 67 فیصد حصہ اپنا روایتی پیشہ ترک کر کے زراعت میں آ گیا تھا۔[73] جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ یہاں کی روایتی کپڑے کی صنعت کے ساتھ وابستہ جولاہوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ لنکا شائر میں انگریزوں کی اور احمد آباد میں مارواڑیوں کی ٹیکسٹائل ملیں اس صنعت کو کھا گئی تھیں اور یہ مسلمان بے روزگار ہو کر کاشتکاری کے پیشے پر بوجھ بن گئے تھے یا ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے تھے۔ گاندھی کی کھدر تحریک میں صرف انڈین سپنرز ایسوسی ایشن کی اور وہ بھی برلا ٹیکسٹائل ملز کی مہر لگا ہوا کھدر سودیشی تھا اور بغیر مہر والا کھدر پہننا اس کی انڈین نیشنلزم میں جائز نہیں تھا۔ اس تحریک کی وجہ سے بنگال میں مسلمانوں کی رہی سہی کپڑے کی روایتی صنعت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور مسلمان جولاہے شدید معاشی بحران کا شکار ہوئے۔

غیر ترقی یافتہ زرعی معیشت جو پہلے ہی بڑھتی ہوئی آبادی جو کہ زیادہ تر دیہی تھی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ اس پر مزید بے روزگار افراد کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ قدرتی امر ہوتا ہے کہ جب مخلوق خدا کے لئے کوئی زمین تنگ ہو جائے اور ان کے لئے اس زمین پر انحصار کر کے زندہ رہنا دوبھر ہو جائے تو وہ یہ علاقہ چھوڑ کر نئے علاقوں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں جو ان کے زندہ رہنے کا سامان مہیا کر سکیں۔ چنانچہ تیسرے عشرے کے دوران بنگال سے آسام کی جانب آبادی کا انخلا بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔ آسام میں آبادی کم تھی اور بے شمار اراضی بغیر استعمال پڑی ہوئی تھی۔ زمین بے حد زرخیز تھی۔ بنگالی جاتے تھے اور تھوڑی سی زمین کو بھی کاشت کے لئے تیار کر لیتے تھے تو ان کا کنبہ پل سکتا تھا۔ جب ایک خاندان وہاں جا کر رہائش پذیر ہو جاتا تو وہ اپنے عزیز و اقارب اور دوسرے ملنے والوں کو بھی بلا لیتا تھا۔ 1931ء کی مردم شماری کی رپورٹ

میں لکھا گیا ہے کہ ''بنگال سے زمین کی تلاش میں غول کے غول آسام کی طرف چلے آتے ہیں اور آسام کے اضلاع بنگالیوں کی نوآبادیاں بنتے جا رہے ہیں۔''[74] اس سے بنگالیوں کے ساتھ آسامیوں کا تضاد پیدا ہوا اور آسامیوں نے بنگالیوں کے خلاف ایجی ٹیشن کیا۔ جس کے نتیجے میں حکومت نے آسام میں بنگالیوں کی آبادکاری پر پابندی عائد کردی جسے لائن سسٹم کا نام دیا گیا۔ بنگالی وہاں کام کاج کر سکتے تھے لیکن مستقل سکونت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح بنگالی مسلمانوں کے لئے نقل مکانی کا راستہ بھی محدود ہو گیا تھا چنانچہ ذرائع پیداوار کی تبدیلی کے نتیجے میں بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد کی جڑیں اور بھی گہری ہوگئی تھیں۔ بنگال میں مسلمانوں پر عرصہ حیات اس قدر تنگ ہو چکا تھا کہ انہیں اپنی بقا کی جنگ کے لئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے کسی پنجابی حکیم الامت کے خواب کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بنگال میں فضل الحق جیسے ہیر پھیر کرنے والے مسلمان رہنما یا اور دوسرے مسلمان رہنما جن کی سیاسی بصیرت بے حد پس ماندہ تھی، یہاں کی مسلمان عوام الناس کی تقدیر میں تاریخ نے جو عوامل داخل کر دیئے تھے، ان کے راستے کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر پختہ اور گہرا تھا کہ جناح سے فضل الحق تک تمام مسلمان رہنماؤں نے بارہا مسلمانوں کی رائے عامہ کے برخلاف اس تضاد سے ماورئ ہو کر ہندوؤں کے ساتھ چلنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ اپنی لیڈری قائم رکھنے کے لئے انہیں مسلمان عوام الناس کی رائے کا ترجمان بننا پڑتا تھا۔ اسے لئے کہ ہندو بورژوازی یہ ثابت کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی کہ اس نے مسلمانوں کو کوئی رعایت نہیں دینی ہے۔ فضل الحق نے جو کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے قبل تک نہرو رپورٹ کو من وعن قبول کرنے کے لئے تیار تھا جس میں کہ مسلمانوں کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا، گول میز کانفرنس میں اس کے برعکس موقف اختیار کیا۔ اس نے دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی جو لندن میں 7 ستمبر 1931ء سے یکم دسمبر 1931ء تک جاری رہی۔ کانفرنس کے سامنے سب سے اہم سوال ہندو۔ مسلم تعلقات کا تھا۔ فضل الحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ بنگال میں اگر مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کردی جائیں تو وہ مخلوط انتخاب کو بھی تسلیم کر لیں گے۔ اس نے اس امر کی وضاحت کی کہ آخر مسلمان علیحدہ نشستیں مخصوص کرانے پر زور کیوں دے رہے ہیں۔ اس نے کہا ''اس وقت بنگال میں صورت احوال کیا ہے؟ یہاں اٹھائیس اضلاع ہیں، ان میں سے تیرہ اضلاع میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

تین اضلاع میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تقریباً برابر آبادی ہے۔ باقی ماندہ بارہ اضلاع میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ آبادی کی تقسیم کے سلسلے میں ایک اور اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے ہندو بھائی زیادہ تر شہروں میں آباد ہیں۔ ایسے علاقوں میں جہاں کی دیہی آبادی میں وہ اقلیت میں ہیں وہ ایک جگہ پر مجتمع ہو کر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص نہ کی جائیں اور مخلوط انتخابی فہرستوں کی بنیاد پر کھلا انتخاب ہو تو ہمارے ہندو دوست نہ صرف ان بارہ اضلاع میں تمام نشستوں پر قابض ہو جائیں گے جہاں وہ اکثریت میں ہیں بلکہ ان تین اضلاع میں بھی اکثریت حاصل کر لیں گے جہاں ان کی آبادی مسلمانوں کے برابر ہے۔ نتیجتاً پورے صوبہ میں مسلمان اپنی آبادی کی بنیاد کے تناسب سے نشستیں حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے جس کے کہ وہ اپنی آبادی کی بنیاد پر حق دار ہیں۔'' اس نے مسلمانوں کی عمومی معاشی اور سیاسی پسماندگی کے پیش نظر کہا کہ جن نشستوں کا اس نے اندازہ لگایا ہے اس سے بھی کہیں کم نشستیں مسلمانوں کے حصے میں آئیں گی۔ اس نے کہا کہ ''اس وقت بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت غریب کسانوں پر مشتمل ہے جو ان پڑھ اور غیر منظم ہیں اور ووٹ کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ نہ ہی انہیں اسمبلی میں اپنی ترجمانی کے لئے نمائندے بھیجنے کی خاطر مجتمع ہونے کی ضرورت کا احساس ہے۔'' اس نے کہا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے وسائل بھی محدود ہیں اور تنظیمی صلاحیتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے آبادی میں کثرت میں ہونے کے باوجود کھلے انتخاب میں مسلمانوں کا اسمبلی میں اپنا حق حاصل کرنا دو بھر ہو جائے گا۔ اس نے 1916ء کے معاہدہ لکھنؤ کی مخالفت کی اور کہا کہ اس میں پنجاب اور بنگال کے ساتھ شدید ناانصافی کی گئی تھی۔ چنانچہ نہ صرف ہندو بلکہ مسلمان بھی اس معاہدہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ فضل الحق نے اس معاشی ناانصافی کا بھی ذکر کیا جو مالی امور میں برصغیر میں سب سے زیادہ آبادی والے صوبے کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔ اس نے کہا کہ ''آپ پٹ سن پر چار کروڑ روپے سالانہ کا ٹیکس وصول کر کے لے جاتے ہیں، لیکن یہ کام حکومت بنگال کے ذمہ ہوتا ہے کہ وہ پٹ سن کی پیداوار میں ترقی کے اقدامات کرے، کاشتکاروں کی صحت کا بندوبست بھی کرے۔'' اس نے اسے شدید بے انصافی قرار دیا۔ اس نے ہندو بورژوازی کے مفادات کی نگرانی کرنے والی تنظیموں کو اسمبلیوں میں نمائندگی دیئے جانے پر بھی اعتراض کیا۔ اس نے کہا ''مارواڑی ایسوسی ایشن کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص کی گئی

ہیں۔ کلکتہ میں آباد مٹھی بھر مارواڑیوں کو بنگال لیجسلیٹو کونسل میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار ہے۔"
اس نے ہندو مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب پر تو اعتراض ہے لیکن کلکتہ میں آباد مارواڑی غیر ملکیوں کے لئے جداگانہ انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" پھر اس نے کہا "ساہوکاروں کی تنظیم مہاجن سبھا کو جس کے ووٹروں کی کل تعداد 230 ہے اور اس میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں ہے لیجسلیٹو کونسل میں اپنا ایک نمائندہ بھیجنے کا اختیار ہے۔" اس نے مطالبہ کیا کہ اس قسم کے مخصوص مفادات کے لئے مخصوص حلقہ جات کا خاتمہ کیا جائے۔[75]

فضل الحق کی اسی تقریر سے بنگال کے مسلمانوں کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس خطے کی اکثریتی آبادی کو انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ نے اس سرزمین سے حاصل ہونے والی کل دولت سے محروم کر دیا تھا جس پر کہ وہ زندہ تھے اور اب یہ ہندو انگریزوں کو نکال کر اس دولت پر بلا شرکت غیرے قابض ہونا چاہتے تھے۔ ہندو بورژوا جس بورژوا جمہوریت کے نام پر اپنی آمریت قائم کرنا چاہتا تھا اس میں مسلمان اکثریت خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ یہ کیسی جمہوریت تھی جس میں اکثریت خود کو اقلیت کے ہاتھوں غیر محفوظ سمجھے؟ لہٰذا مسئلہ نصابی نہیں تھا بلکہ عملی تھا۔ اکثریتی آبادی کو سیدھی سادھی جمہوریت نہیں چاہیے تھی۔ اس پر مسلمانوں کو کہا گیا کہ وہ جمہوریت کے مخالف اور فرقہ پسند ہیں۔ لیکن دوسری طرف مارواڑی مفاد اور مہاجن مفاد کے تحفظ کی ضمانت جداگانہ نمائندگی کے ذریعے حاصل کی ہوئی تھی۔ سوبھاش چندر بوس جس نے جمہوریت اور بنگالی نیشنلزم کے حوالے سے سی۔ آر۔ داس کے بعد بنگالی ہندو درمیانہ طبقہ کی قیادت سنبھالی تھی، مارواڑیوں سے تضاد کے باوجود بنگال کی اکثریتی آبادی کے حقوق کی حمایت نہیں کرتا تھا! بلکہ یہ ہندو۔ مسلم تضاد کے سوال پر مارواڑی بورژوازی کے ساتھ متحدہ محاذ بناتا تھا جس کی مثال نہرو کمیٹی میں سوبھاش بوس کے کردار سے ظاہر ہوتی تھی۔

بنگال کا ہندو درمیانہ طبقہ دہشت پسندی کے زور پر انگریزوں کو نکال کر اس خطہ کی دولت پر سے مسلمانوں کو محروم رکھ کر بلا شرکت غیرے اس پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مارواڑی بورژوا، گاندھی کی سول نافرمانی کے زور پر اس خطے کی دولت پر قبضے کے بارے میں انگریزوں کے ساتھ سودے بازی کرنا چاہتا تھا۔ بنگال کے ہندو درمیانہ طبقے اور مارواڑی بورژوازی دونوں کے منصوبے میں مسلمان اکثریت کو محروم رکھنا وہ مشترک قدر تھی جس پر ان کا اتحاد ہو جاتا تھا یا پھر انگریزوں کو نکالنے کے معاملہ میں دونوں کا اشتراک عمل ہو جاتا تھا۔ تاہم

دولت کی بانٹ پران کا باہمی تضاد تھا جو کہ تمام بورژوا طبقوں کا آپس میں ہوتا ہے۔

1930-31ء میں بنگالی نیشنلسٹوں اور انقلابیوں کی دہشت گردی اور گاندھی کی سول نافرمانی نے ہندو بورژوازی کی سودے بازی کی پوزیشن کو مضبوط کر دیا تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس سے باہر رہ کر کانگرس نے اسے ناکام بنانے کی جو کوشش کی تھی وہ بھی ناکام ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ہندو بورژوازی کے ساتھ سودے بازی کے بغیر انگریزوں کے لئے برصغیر میں اپنے مفاد کے تحفظ کا بندوبست ناممکن تھا۔ بین الاقوامی عظیم معاشی بحران بڑھتا جا رہا تھا اور عالمی جنگ کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ چنانچہ 1931ء میں وائسرائے لارڈ اِروِن (Irvin) نے گاندھی کے ساتھ مذاکرات کر کے سمجھوتے کی راہ نکالی جسے گاندھی۔ اِروِن معاہدہ کہا جاتا ہے۔ ایجی ٹیشن سے ہندو بورژوازی کو جو قوت حاصل ہوئی تھی اس کی بنیاد پر وہ اب گول میز کانفرنس میں جا کر زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں سودے بازی کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس معاہدہ کی رو سے گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کے عوض میں حکومت نے ایسے تمام لوگوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا جو اس تحریک کے دوران گرفتار ہوئے تھے۔ اس تحریک کے دوران کافی لوگوں نے سرکاری ملازمتوں سے بھی استعفے دے دیئے تھے۔ حکومت نے وعدہ کیا کہ جن اسامیوں کو مستقل طور پر نہیں بھرا گیا، حکومت ہر استعفیٰ کا انفرادی طور پر جائزہ لے کر انہیں واپس ملازمت پر بحال کر دے گی۔ لیکن اس معاہدہ میں طے ہوا کہ معاہدہ کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہو گا جنہوں نے تشدد کا ارتکاب کیا ہے چنانچہ بنگالی نیشنلسٹوں اور انقلابیوں کو نہ تو رہا کیا گیا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی اور اس معاہدہ کا فائدہ صرف ان لوگوں کو ہوا جنہوں نے گاندھی کی حکمت عملی کے مطابق تحریک میں حصہ لیا تھا۔ اس پر بنگال میں گاندھی کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ ہوا۔ سین گپتا نے گاندھی۔ اِروِن معاہدہ کا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ سوبھاش چندر بوس نے اس معاہدہ کی شرائط پر سخت تنقید کی۔ اس کے علاوہ اس نے اس امر پر بھی کڑی تنقید کی کہ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی جانب سے گاندھی تنہا نمائندگی کر رہا تھا اور کسی اور کو اس کے ساتھ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ سوبھاش چندر بوس اپنی دہشت پسندی کی بنا پر خود کو پورے برصغیر میں رہنما یانہ حیثیت دیتا تھا اور اس بنا پر وہ انگریزوں کے ساتھ جو سودے بازی کرنا چاہتا تھا اسے گاندھی نے بیچ میں آ کر ختم کر دیا تھا۔

ستمبر سے دسمبر 1931ء تک لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں جہاں ہندو۔مسلم تضاد پر بحث ہوئی وہاں دوسری اقلیتوں نے بھی اپنے حقوق کے تسلیم کئے جانے پر زور دیا۔ اچھوتوں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں نے ان اقلیتوں کے حقوق کی اس بنیاد پر حمایت کی جس پر وہ خود اپنی جداگانہ حیثیت منوانا چاہتے تھے۔ ہندو بورژوازی جو برصغیر کے تمام اقلیتی گروپوں پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتی تھی کہ اس کے بغیر اس کے سرمایہ دارانہ عزائم کی تکمیل مشکل تھی، ان مطالبات کے خلاف ڈٹ گئی۔ گاندھی کسی اقلیت کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صرف کانگرس کو ہندوستان کا نمائندہ تسلیم کیا جائے۔ گویا صرف ہندو بورژوازی کے ساتھ سودے بازی کی جائے اور اسے ہندوستان پر بالادستی کا حق دے دیا جائے۔ اقلیتوں کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص یہ بات ناقابل قبول تھی اس لئے یہ کانفرنس تعطل کا شکار ہو کر بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے ختم ہو گئی۔ گاندھی نے واپس آ کر پھر سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی، سوبھاش چندر بوس، سین گپتا اور جواہر لعل نہرو دوبارہ گرفتار کر لئے گئے۔ بنگال میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی سے ہندو۔مسلم تضاد میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہوا اور یہ بات عیاں ہو گئی کہ ہندو۔مسلم تضاد ایک لاینحل تضاد ہے لیکن انگریز اپنی سلطنت کو داخلی اور خارجی خطرات سے بچانے کے لئے اس وقت کی بین الاقوامی صورت حال میں کچھ نہ کچھ حل ضرور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست 1932ء کو برطانوی لیبر پارٹی کے وزیر اعظم رمزے میکڈانلڈ (Ramsay Macdonald) نے اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ اس میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ اچھوتوں، سکھوں اور عیسائیوں کو بھی جداگانہ انتخابات کی رعایت دے دی۔ گاندھی نے اچھوتوں کے علیحدہ فرقہ تسلیم کئے جانے اور ان کو جداگانہ نمائندگی کا حق مل جانے کے خلاف جیل میں مرن برت رکھ لیا۔ اونچی ذات کی ہندو بورژوازی جو کہ مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں سب کو اپنے زیر تسلط کرنا چاہتی تھی، اچھوتوں کو بھی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر بلبلا اٹھی تھی۔ اچھوتوں پر ان کی بالادستی تو کئی ہزار سال سے ان کا تسلیم شدہ حق بن چکا تھا۔ اچھوتوں کی علیحدہ حیثیت تسلیم کر لئے جانے سے ہند بورژوا کا انڈین نیشنلزم کا تصور بالکل ہی دھڑام سے آن گرتا تھا جس پر وہ پورے ہندوستان کی بالادستی کے حصول کی کوشش کر رہا تھا۔ انگریزوں کا

موقف یہ تھا کہ اگر اچھوت خود اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو وہ ان کی جداگانہ نمائندگی کی رعایت واپس لے لیں گے۔ لیکن اب اچھوت بھی برہمنوں کے ہزاروں سال کے جبر و تشدد کے خلاف مزاحمت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے چنانچہ ہندو بورژوا اپنے انڈین نیشنلزم کے تصور کو بچانے کے لئے اچھوتوں سے سمجھوتہ بازی کے لئے تیار ہو گئے۔ کانگرسی رہنماؤں نے اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبید کر اور گاندھی کے مابین سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔ پونا میں جہاں گاندھی نظر بند تھا، راج گوپال اچاریہ اور ڈاکٹر امبید کر کے مذاکرات ہوئے اور ستمبر 1932ء کو گاندھی اور ڈاکٹر امبید کر کے مابین ایک سمجھوتہ طے پایا جس میں کانگرس نے اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے اچھوتوں کی نمائندگی کے اصول کو تسلیم کر لیا اور تمام صوبوں میں کانگرس نے اپنے پلیٹ فارم سے اسمبلیوں میں جانے والے ارکان میں اچھوتوں کے لئے علیحدہ نشستوں کو مخصوص کر دیا۔ یہ معاہدہ کرنے کے بعد گاندھی نے برت ختم کیا۔ اسے معاہدہ پونا کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق بنگال کی 78 غیر مسلم نشستوں میں سے اچھوتوں کے لئے تیس نشستیں مخصوص کی گئیں۔ جب بنگال میں معاہدہ پونا کی تفصیلات کی خبر پہنچی تو وہاں کے اونچی ذات کے ہندوؤں میں شدید ردعمل ہوا۔ بنگال کی کل آبادی میں اونچی ذات کے ہندوؤں کا تناسب صرف 5.6 فیصد تھا۔[76] لیکن تمام سرکاری و غیر سرکاری بورژوا اداروں اور تنظیموں پر یہ چھائے ہوئے تھے چنانچہ اچھوتوں نے کانگرس سے جو رعایت حاصل کی تھی اس پر بنگال کے اونچی ذات کے ہندوؤں میں بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے ایک نیشنلسٹ پارٹی بنا لی جس کا مقصد صوبے میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے مفادات اور حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ اگرچہ یہ الگ سے تو کوئی قوت نہ بن سکے لیکن ہندو مہاسبھا کے ساتھ مل کر انہوں نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو مزید ہوا دی۔ 1934ء میں مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات میں بنگال کے اونچی ذات کے ہندوؤں نے بنگال نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے اپنے مفادات کے تحفظ کے حوالے سے انتخاب لڑا۔[77]

اونچی ذات کے ہندوؤں کو اپنی علیحدہ تنظیم کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بنگال پراونشل کانگرس کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں اور نیشنلسٹ دہشت پسندوں اور انقلابی گروپوں کی قیادت پر بھی اونچی ذات کے ہندو چھائے ہوئے تھے۔[78] یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی پر بھی اونچی ذات کے ہندوؤں کو غلبہ حاصل تھا اور اچھوتوں کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ اگرچہ مسلمانوں میں سے مظفر احمد اس کا سرکردہ رکن تھا۔ تاہم گاندھی مرن برت کے ذریعے اس وقت اچھوتوں کو

بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انگریزوں نے ڈاکٹر امبید کر اور گاندھی کے مابین معاہدہ ہو جانے کے بعد کمیونل ایوارڈ میں سے اچھوتوں کی علیحدہ نمائندگی کی شق کو ختم کر دیا گیا۔ تاہم مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے لئے جداگانہ اصول کے تحت نشستوں کی تقسیم برقرار رہی۔

کمیونل ایوارڈ کے مطابق بنگال کی لیجسلیٹو اسمبلی میں 250 نشستیں رکھی گئی تھیں جن میں سے 119 مسلمانوں کے لئے مخصوص کی گئی تھیں جو جداگانہ انتخاب کے ذریعے پر کی جانی تھیں۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا پچپن فیصد تھی لیکن اسمبلی میں مسلمانوں کو 48 فیصد نشستیں دی گئی تھیں۔ کہا گیا کہ ایوارڈ بناتے وقت معاہدہ لکھنؤ کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور بنگال کے مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی دے کر مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کے تناسب سے زیادہ نمائندگی کا ویٹیج (Weightage) دے دیا جائے گا۔ حالانکہ بنگالی مسلمانوں کا ایک عرصہ سے یہ مطالبہ تھا کہ انہیں ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی دی جائے اور دوسری گول میز کانفرنس میں فضل الحق نے واشگاف الفاظ میں معاہدہ لکھنؤ کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ اس میں بنگالی مسلمانوں کے ساتھ شدید ناانصافی کی گئی ہے۔ تاہم معاہدہ لکھنؤ میں تو صرف 40 فیصد نمائندگی دی گئی تھی اس میں 48 فیصد نمائندگی مل جانے پر مسلمان قدرے مطمئن تھے اور جو کچھ مل گیا تھا اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے لیکن جو نہیں ملا تھا اس کے حصول کے لئے ابھی یہ اتنے منظم نہیں تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی مشکل یہ تھی کہ ان کی تقریباً تمام آبادی پس ماندہ زرعی معیشت کے رشتوں میں پھنسی ہوئی تھی، درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا کہ جو اپنے مطالبات منظور کرانے کے لئے کوئی مؤثر قسم کی ایجی ٹیشن یا تشدد کی کاروائیاں کر سکتا جس طرح کہ بنگال کا ہندو درمیانہ طبقہ کر رہا تھا۔ جو تھوڑی بہت قیادت اس قلیل درمیانے طبقے نے پیدا کی تھی وہ زیادہ تر غیر بنگالیوں پر مشتمل تھی جن کی جڑیں مقامی آبادی میں نہیں تھیں، علاوہ ازیں ان کی ایک اور مشکل یہ تھی کہ ان کو شمالی اور بالائی ہندوستان کے مسلمانوں کی حمایت اور تعاون حاصل نہیں تھا جس طرح یہاں کے ہندو درمیانہ طبقہ کو بالائی ہند کے مارواڑی یا آریائی ہندو بورژوازی سے تضاد کے باوجود مسلمانوں یا انگریزوں کے خلاف تعاون حاصل ہو جاتا تھا، بنگالی مسلمانوں کو یو۔ پی اور پنجاب کے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں سے کبھی کوئی تعاون یا حمایت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مسلم لیگ جو کہ اگرچہ 1906ء میں بنگال میں قائم ہوئی تھی لیکن بہت جلد

اس پر یو۔ پی، بمبئی اور پنجاب کے تعلقہ دار، جاگیردار، سرمایہ دار اور درمیانہ طبقہ کے عناصر چھا گئے تھے۔ بنگالی مسلمانوں کو اس میں کبھی نمایاں مقام نہ دیا گیا جو کہ سب سے بڑا مسلم اکثریتی صوبہ ہونے کی وجہ سے ان کو دیا جانا چاہیے تھا۔ مسلم لیگ کی آل انڈیا حیثیت برقرار رکھنے کی خاطر اس کے عہدیداروں میں ایک آدھ نمائندہ بنگال سے رکھ لیا جاتا تھا اور وہ بھی زیادہ تر کلکتہ میں آباد کوئی غیر بنگالی ہوتا تھا۔ یہاں کے ایک اردو بولنے والے مولوی سر محمد یعقوب کو 1927ء کے سیشن کا صدر بنایا گیا تھا۔ 1930ء کے الہ آباد سیشن کے وقت اس کو سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس عہدے کی معیاد تین سال ہوتی تھی۔ چنانچہ دوسرے عشرے کے اواخر اور تیسرے عشرے کے اوائل کے لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں یہی مولوی محمد یعقوب ہے جو سرگرم نظر آنے والے لیگ کے کارکنوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ 1931ء کا سالانہ اجلاس دسمبر میں دہلی میں سر ظفر اللہ خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی حاضری گزشتہ سال 1930ء کے اجلاس سے بھی محدود تھی۔ اس سیشن میں مولوی محمد یعقوب نے ایک قرارداد منظور کروائی جس میں دہشت پسندانہ کارروائیوں کی مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ خون بہانا مسلمانوں کی ثقافت اور مذہب کے خلاف ہے۔[79] ایک تو ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر شدید تھا کہ ہندو جس قسم کی کارروائی کرتے تھے مسلمان اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ غیر بنگالی مسلمان درمیانہ طبقہ بنگال میں مسلمانوں کے حقوق کے لئے ایجی ٹیشن کو منظم کرنے سے بھی قاصر تھا چنانچہ جو کچھ لینے کی کوشش کی جاتی تھی وہ انگریزوں کے وفاداروں کے ناطے سے ہی لیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی وفاداریاں بنگالی مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں نے بنگالیوں سے کبھی گہرا رشتہ استوار کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اپنی فوجی خدمات کے صلہ میں بقول علامہ اقبال شمال مغربی مسلم ریاست چاہتے تھے جو جنگجو مسلمان نسلوں پر مشتمل تھی اور ہندوستان پر شمال سے حملے کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

1932ء تک جس وقت کمیونل ایوارڈ آیا تو مسلم لیگ شدید انتشار کا شکار تھی۔ ظفر اللہ خان کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کا رکن بننے کے لئے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ لیگ کی صدارت پر دو گروہوں میں رسہ کشی ہو گئی۔ ایک گروہ پشاور کے میاں عبدالعزیز کے ساتھ تھا اور دوسرے گروہ کی قیادت مولوی سر محمد یعقوب کر رہا تھا۔ میاں عبدالعزیز قائم مقام صدر بننے میں

کامیاب ہو گیا لیکن 1932ء کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہوسکا اور جولائی 1933ء میں مولوی سرمحمد یعقوب کے گروہ نے میاں عبدالعزیز کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کر دی۔ اس طرح لیگ ایک بار پھر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ 1933ء میں 1927ء کی طرح مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس منعقد ہوئے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بنگال کے مسلمان، مولوی سرمحمد یعقوب کا ساتھ دینے کے بجائے میاں عبدالعزیز کا ساتھ دے رہے تھے۔ چنانچہ 21/اکتوبر 1933ء کو عزیز گروپ کا اجلاس ہوڑہ (کلکتہ) میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت میاں عبدالعزیز نے کی۔ یہ اجلاس بلانے کے لئے مسلم لیگ کونسل کے 25 ارکان نے میاں عبدالعزیز کو اپنے دستخطوں سے ایک درخواست بھیجی تھی جسے میاں عزیز نے اپنی تقریر کے آغاز میں پڑھ کر سنایا۔ ان 25 ارکان میں سے دس کا تعلق بنگال سے تھا، سات کا تعلق پنجاب اور باقی ارکان بہار، مدراس، سی۔ پی، یو۔ پی اور سرحد سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا یہ لیگ کا سب سے نمائندہ اجلاس تھا۔ کونسل کے ارکان نے جن میں اکثریت بنگال سے تھی، کمیونل ایوارڈ کے پس منظر میں اجلاس طلب کرنے کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ ان بنگالی ارکان میں نواب حبیب اللہ آف ڈھاکہ، سر عبدالحلیم غزنوی، سر عبداللہ سہروردی، رضا الرحمان خان، عبدالمتین چودھری، محمود سہروردی، کبیرالدین احمد، چودھری محمد اسماعیل خان، انوارالعظیم اور شیخ رحیم بخش شامل تھے۔[80] ہوڑہ میں منعقد ہونے والے اس اجلاس میں مندوبین کی تعداد بھی زیادہ تر بنگال سے تھی۔ دراصل یہ اجلاس کمیونل ایوارڈ کے تحفظ اور اس میں مسلمانوں کی غیر تسلی بخش نمائندگی پر عدم اطمینان کا اظہار کرنے کے لئے بنگال کے مسلمانوں کی پیش رفت پر ہی منعقد ہوا تھا، پہلا موقع تھا جب مسلم لیگ کے اجلاس میں بنگالیوں کی اکثریت نے حصہ لیا۔ اس کی استقبالیہ کمیٹی کا چیئرمین مولوی ابوالقاسم تھا۔ اس نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں کمیونل ایوارڈ میں جو کچھ مسلمانوں کو ملا تھا اس کے تحفظ کے لئے متحدہ محاذ قائم کرنے پر زور دیا۔ جس قسم کی مخالفت ہندوؤں کی جانب سے ہو رہی تھی اور سول نافرمانی اور تشدد کی کاروائیاں ہو رہی تھیں ان میں یہ ایوارڈ بھی غنیمت تھا اور اس کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کے متحد و منظم ہونے کی اشد ضرورت تھی ورنہ تو جس طرح 1905ء کی تقسیم بنگال 1912ء میں ہندوؤں کی منظم ایجی ٹیشن اور مسلمانوں کی جانب سے اس کو برقرار رکھنے کے لئے مؤثر تحریک کی عدم موجودگی میں کالعدم ہو گئی تھی، اندیشہ تھا کہ اس مرتبہ بھی یہ تاریخ نہ دہرائی جائے۔

لیکن اس مرتبہ بنگال کے مسلمان پہلے سے آگے تھے اور انہوں نے اپنی کچھ نہ کچھ تنظیم اور قیادت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ مولوی ابوالقاسم نے کہا کہ چند ایک کانگرسیوں کو چھوڑ کر بنگال کے سارے مسلمان ایک نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ میاں عبدالعزیز نے بھی اپنے خطبہ صدارت میں صوبائی خودمختاری کے حصول پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس ایوارڈ کی روشنی میں جب وفاق عمل میں آنے لگے تو لیگ کو دھیان رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے حقوق پر کوئی زد نہ پڑے۔ ہندو بوژوازی کے ساتھ تضاد کا ایک اور اظہار اس اجلاس میں اس طرح ہوا کہ ان دنوں شملہ میں برطانوی حکومت اور حکومت ہند کے جاپان کے ساتھ تجارت کے لئے جاپانی وفد کے ساتھ مذاکرات ہو رہے تھے۔ کانگرس ہندو بورژوا کے مفاد کی خاطر جاپانی تجارت کی شدید مخالفت کر رہی تھی۔ میاں عبدالعزیز نے اپنے خطبہ صدارت میں جاپانی تجارت کی بھرپور حمایت کی اور کہا کہ جاپان کے ساتھ بھی لین دین ہونا چاہیے۔

ہوڑہ کے اس سیشن میں جس پر بنگال کے مسلمان چھائے ہوئے تھے، مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق نے کمیونل ایوارڈ کو خوش آمدید کہتے ہوئے ایک قرارداد پیش کی جس میں مندرجہ ذیل امور پر عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا:

1۔ بالائی اور زیریں وفاقی آئین میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی نہیں دی گئی۔
2۔ بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی نہیں دی گئی۔
3۔ اڑیسہ کی علیحدگی کے بعد بہار کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کم کر دی گئی ہے۔
4۔ قرطاس ابیض میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ باقی ماندہ اختیارات نئے وفاقی آئین میں صوبوں کو دیئے جائیں گے یا نہیں۔
5۔ خصوصی حلقہ جات سے مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔
6۔ بلوچستان میں اصلاحات کے بارے میں کوئی شق شامل نہیں کی گئی اور نہ ہی اسے گورنری صوبے کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

ایک اور قرارداد میں قرطاس ابیض میں دی گئی اس تجویز کو کہ بنگال میں ایک بالائی ایوان بھی قائم کیا جائے گا، غیر ضروری اور رجعت پسندانہ قرار دیا گیا۔ مسٹر اے۔ ایف۔ نورالنبی نے دوسرے ایوان کے قیام کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ''بنگال لیجسلیٹو کونسل اس تجویز کو پہلے ہی رد کر چکی ہے۔ بنگال کے مسلمان متفقہ طور پر اس دوسرے ایوان کے قیام کو رد کر چکے ہیں کیونکہ

اس ایوان پر غلبہ لازمی طور پر ہندوؤں کو حاصل ہوگا اور وہ ایوان زیریں کے ہر ایکٹ میں ترمیم کر سکے گا'' بنگال میں ہندوؤں کے مختلف مفادات نے اس ایوان بالا کے قیام کی کوشش کی تھی اور اس سلسلے میں یورپینوں (Europeans) کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ نورالنبی نے یورپینوں سے اپیل کی کہ وہ دوسرے ایوان کی تشکیل کے بارے میں ہندوؤں کا ساتھ نہ دیں۔[81]

ہندو درمیانہ طبقہ اس علاقے میں دہشت گردی کے ذریعہ جو غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں میں انگریزوں سے تضاد ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس دہشتگردی میں کسی قسم کی شرکت نہیں کی تھی بلکہ اس کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ہوڑہ سیشن میں اس دہشت گردی کی مذمت بھی کی گئی اور مدنا پور میں ہونے والے واقعات کو مذموم قرار دیا گیا۔

25 اور 26 رنومبر 1933ء کو مولوی سر محمد یعقوب کے گروپ کا اجلاس حافظ ہدایت حسین کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا لیکن اس میں کسی قابل ذکر بنگالی رہنما نے شرکت نہیں کی۔ نہ ہی اس اجلاس میں بنگال کی صورت حال سے متعلق کوئی قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں زیادہ تر مندوبین یو۔ پی سے تھے جنہوں نے مولوی محمد یعقوب کو مزید تین سال کے لئے لیگ کا سیکرٹری چن لیا۔ اس میں مسلم لیگ کے پندرہ نائب صدر بھی بنائے گئے جن میں بنگال سے سر عبدالرحیم کو بنایا گیا جسے بنگال میں مسلمانوں کے کسی مؤثر گروپ کی حمایت حاصل نہیں تھی۔

کمیونل ایوارڈ کی روشنی میں نئے آئین کی آمد آمد تھی۔ محمد علی جناح جو ہندو۔ مسلم اتحاد کی بنیاد پر اپنی سیاست کی عمارت تعمیر کرنے میں ناکام ہو کر انگلستان میں جا کر آباد ہو چکے تھے، اب دوبارہ ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ 4 رمارچ 1934ء کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں میاں عبدالعزیز اور حافظ ہدایت حسین دونوں جناح کے حق میں دست بردار ہو گئے اور جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہو گئے۔ مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں کسی قابل ذکر بنگالی رہنما کا ذکر نہیں ملتا۔[82] پھر اس کے بعد 2 اور 3 راپریل 1934ء کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس جناح کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا جس میں آسام کے عبدالمتین چودھری اور بنگال کے کبیر الدین احمد شامل ہوئے اور ان دونوں حضرات کو اپنے اپنے صوبوں میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام سونپ دیا گیا۔ جناح نے اس اجلاس میں صوبائی مسلم لیگیوں کی تنظیم پر زور دیا۔ لیکن بنگال میں صوبائی مسلم لیگ 1935ء کے ایکٹ سے پہلے واضح خطوط پر منظم نہ ہو سکی۔

باب: 3

1935ء کا ایکٹ، پہلے عام انتخابات، پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت

1935ء کا گورنمنٹ انڈیا ایکٹ اور مسلمانوں کی اپنے تناسب سے کم نمائندگی

1934-35ء میں برصغیر کی عمومی سیاسی صورت حال میں انارکی غالب ہو رہی تھی۔ ہندو بورژوا لیڈروں کی بھی صورت حال پر گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ ہندو۔مسلم فسادات کا سلسلہ جاری تھا۔ اونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے تضاد میں بھی شدت آ گئی تھی۔ 1933ء میں گاندھی جیل سے رہا ہوا تو معاہدہ پونا کے حوالے سے اونچی ذات کے ہندو برہمنوں کی جانب سے اس پر خوب لعن طعن کی گئی تھی۔ گاندھی خود برہمن نہیں تھا اگرچہ اونچی ذات کے ہندوؤں میں ہی شمار ہوتا تھا۔ تاہم وہ دل برداشتہ ہو کر ایک بار پھر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سوبھاش چندر بوس کو یورپ جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ بنگال میں گاندھی گروپ کا سربراہ سین گپتا 1932ء میں انتقال کر گیا تھا۔ مقامی بنگالی لیڈر گاندھی گروپ کی رہنمائی کے لئے سین گپتا کی جگہ جن رہنماؤں کو لا رہے تھے ان میں ڈاکٹر بی۔سی۔رائے اور نلنی رنجن سرکار تھے۔ ڈاکٹر بی۔سی۔رائے کلکتہ یونیورسٹی کی انتظامیہ سے وابستہ تھا جبکہ نلنی رنجن سرکار بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس کا صدر تھا۔ لیکن یہ لیڈر بنگالی ہندو درمیانے طبقے سے کٹ کر مارواڑی گھنشام داس برلا کے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ اس لئے بنگالی درمیانے طبقے پر ان کا وہ اثر نہیں تھا جو ماضی میں ان کو حاصل تھا جب یہ سوبھاش بوس کے ساتھ تھے۔ سوبھاش بوس کا بھائی سرت چندر بوس ابھی جیل میں ہی تھا۔

اس صورتحال میں انگریز چاہتے تھے کہ وہ بورژوا سیاستدانوں کی حمایت حاصل کریں

اور بورژوا جمہوری اداروں کے ذریعے صورت حال پر کنٹرول کریں۔ اس لئے وہ گاندھی جیسے ہندو بورژوا سیاستدانوں اور محمد علی جناح جیسے اعتدال پسند مسلمان رہنماؤں کو مؤثر کرانے کے لئے جلد از جلد اصلاحات نافذ کرنا چاہتے تھے۔ عالمی جنگ قریب تر آ رہی تھی اور ایسی صورت میں ہندوستان میں انارکی انگریز سامراجیوں کے لئے انتہائی خطرناک ہو سکتی تھی۔ اس صورت حال میں ہندو بورژوا کا کردار زیادہ اہم تھا کہ وہ ان اصلاحات کے ذریعے ہندو درمیانہ طبقہ کی دہشت گردی پر کنٹرول کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کی جانب سے کسی قسم کی ایجی ٹیشن یا دہشت گردی تو نہیں ہو رہی تھی لیکن بڑھتے ہوئے ہندو۔ مسلم فسادات تشویش ناک صورت حال پیدا کر رہے تھے۔ ان حالات میں حکومت برطانیہ نے 1935ء میں سیاسی اصلاحات نافذ کر دیں جس میں مقامی لوگوں کو حکومت میں زیادہ عمل دخل کا حق دے دیا گیا۔ اسے 1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کہا گیا۔ اس کی بنیاد 1932ء کے کمیونل ایوارڈ پر رکھی گئی تھی۔ اس کے مطابق بنگال لیجسلیٹو اسمبلی کی 250 نشستوں کی فرقہ وارانہ اور مفادات کے حوالے سے تقسیم اس طرح تھی:[1]

عام نشستیں	=	78
(ان میں سے 30 نشستیں اچھوتوں کے لئے مخصوص کی گئی تھیں)		
مسلمان	=	117
اینگلو انڈین	=	3
یورپین	=	11
ہندوستانی عیسائی	=	2
تجارت، صنعت، کان کنی اور شجر کاری کی تنظیموں کے نمائندے	=	19
زمیندار	=	5
یونیورسٹیوں کی نشستیں	=	2
مزدور	=	8

خواتین

(عمومی)	=	2
(مسلمان)	=	2
(اینگلوانڈین)	=	1
کل:	=	250

نشستوں کی اس تقسیم پر ایک نظر ڈالنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ 250 نشستوں کے ایوان میں مسلمانوں کے لئے 119 نشستیں مخصوص کی گئی تھیں حالانکہ صوبہ کی آبادی میں ان کا تناسب 54.7 فیصد تھا۔ بظاہر ہندوؤں (اچھوتوں سمیت) کی تقریباً 44 فیصد آبادی کے لئے 80 نشستیں مخصوص کی گئی تھیں لیکن عملاً ان کے لئے نشستوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی کیونکہ تجارت، صنعت، لیبر، زمینداروں، معدنیات، باغات اور یونیورسٹی کے لئے جو 34 نشستیں رکھی گئی تھیں ان میں سے کسی نشست پر کسی مسلمان امیدوار کی کامیابی کا امکان بہت کم تھا اور اگر کوئی امکان تھا بھی تو وہ مسلمان امیدوار ہندوؤں کا ہی نامزد کردہ ہوسکتا تھا کیونکہ ان سارے شعبوں پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ یورپینوں، اینگلوانڈینوں اور انڈین عیسائیوں کے لئے 17 نشستیں تھیں حالانکہ صوبہ کی آبادی میں ان کا تناسب ایک فیصدی سے زیادہ نہیں تھا۔ تجارت، صنعت، زمینداریوں اور باغات کی نشستوں کے لئے بھی ان فرقوں کے امیداروں کا امکان روشن تھا۔ گویا اسمبلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان طاقت کا توازن مؤخرالذکر عناصر کے پاس رکھا گیا تھا کیونکہ اس صوبہ میں برطانیہ کے کاروباری عناصر کے مفادات ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ بالخصوص پٹ سن اور چائے کے کاروبار پر ان کا غلبہ تھا جبکہ اس شعبہ میں مغربی ہندوستان کے ہندو مارواڑی عناصر دوسرے نمبر پر تھے۔ 1935ء کے ایکٹ کے تحت یہ بھی قرار دیا گیا تھا کہ بنگال میں لیجسلیٹو اسمبلی (ایوان زیریں) کے علاوہ ایک صوبائی کونسل (ایوان بالا) بھی ہوگی۔ یہ کونسل 27 ارکان پر مشتمل ہوگی جن میں سے 7 ارکان صوبائی گورنر نامزد کرے گا اور باقی 19 منتخب ارکان، 3 یورپینوں، 10 مسلمانوں اور 6 ہندوؤں پر مشتمل ہوں گے۔

مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی پس ماندگی

صوبہ کی معیشت میں مسلمانوں کی نمائندگی تقریباً صفر تھی۔ ان کی اکثریت مشرقی بنگال میں گنگا اور برہم پتر کے زیر تشکیل ڈیلٹا کے ایسے علاقے میں رہتی تھی جسے صوبہ کی لنگڑی بستی کہا جاتا تھا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہندو زمینداروں کی زمینوں پر کاشت کرتے تھے اور ہندو ساہوکاروں کے مقروض رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی معیار نہیں تھا۔ بس کسی نہ کسی طرح زندہ رہتے تھے اور اسی لئے صوبہ کے تعلیم یافتہ اونچی ذات کے ہندوان سے معاشرتی طور پر تقریباً ایسا ہی سلوک کرتے تھے جیسے کہ وہ اچھوتوں سے کرتے تھے۔ کلکتہ میں اصفہانی اور آدم جی وغیرہ کے چند ایک چھوٹے چھوٹے مسلم کاروباری ادارے تھے لیکن اصفہانی اور آدم جی خود بھی بنگالی نژاد نہیں تھے۔ چونکہ صوبہ کی معیشت میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر مقام نہیں تھا اس لئے قدرتی طور پر صوبائی سیاست میں بھی انہیں کوئی مؤثر پوزیشن حاصل نہیں تھی۔ پنجابی مسلمانوں کے برعکس بنگالی مسلمانوں کے پاس (چند ایک خاندانوں کے ماسوا) زمینداریاں نہیں تھیں اور نہ ہی ان میں سیاسی قوت کا حامل تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ تھا۔

مقامی سول انتظامیہ میں مسلمانوں کا تناسب بہت ہی کم تھا اور اعلیٰ اسامیوں پر تو ان کی کوئی نمائندگی تھی ہی نہیں۔ یہ حقیقت کس قدر نمایاں اور تلخ تھی اس کا اندازہ کلکتہ کے اخبار سٹار آف انڈیا کی فروری 1935ء کی اس اطلاع سے لگایا جا سکتا ہے کہ کلکتہ کے سنٹرل سٹیشنری آفس کے 280 چھوٹے بڑے ملازموں میں مسلمانوں کی تعداد صرف 23 تھی۔ ان 23 مسلم ملازمین میں سے ایک اسسٹنٹ کیمسٹ تھا جس کی اسامی عارضی تھی اور جس کی تنخواہ کا گریڈ 300-150 روپے تھا۔ 18 کلرک تھے جن کی تنخواہ کا گریڈ 140-95 تھا۔ 2 ٹائپسٹ تھے جو 100-45 کے گریڈ میں تھے۔ ایک ریکارڈ سپلائر تھا جس کی تنخواہ بیس روپے تھی اور تین چپڑاسی تھے جن کا گریڈ 20-15 روپے تھا ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ اس دفتر میں کسی بھی ذمہ دار عہدے پر کوئی ایک بھی مسلمان فائز نہیں تھا حالانکہ صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 55 فیصد تھی۔ 9 / مارچ 1935ء کو مرکزی اسمبلی میں مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق نے سرکاری محکموں میں بنگالی مسلمانوں کی مناسب نمائندگی نہ ہونے پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے بتایا کہ آسام اور بنگال کے پوسٹ

ماسٹر جنرل کے دفتر میں 129 سلیکشن گریڈ کے ملازمین میں سے صرف دو مسلمان ہیں۔ 25 سپرنٹنڈنٹوں میں سے صرف ایک مسلمان ہے۔ 102 انسپکٹروں میں 27 مسلمان ہیں اور کلکتہ کے جنرل پوسٹ آفس کے 1600 کلرکوں میں سے صرف 80 مسلمان ہیں۔

صوبہ میں مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کا کلکتہ میں مرزا ابوالحسن اصفہانی اور بعض دوسرے کاروباری بوہروں، خوجوں اور میمنوں سے رابطہ تھا لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے یہ رابطہ بالکل بے سود تھا۔ ان غیر بنگالی سرمایہ دار عناصر کا بنگال کے غریب مسلم عوام سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور اس بنا پر ان کی امداد سے عام انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کی کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں کی جا سکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں کہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت رائے دہندگی کے حق کا دائرہ خاصا وسیع کر دیا گیا تھا۔ کلکتہ میں خلافت کمیٹی اور نیو مسلم مجلس کے دفاتر تھے لیکن مسلمانوں کے لئے ان جماعتوں میں کوئی دلکشی نہیں تھی کیونکہ وہ ان جماعتوں کو کانگرس کی ذیلی تنظیمیں تصور کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ صوبہ میں جو تھوڑے بہت مسلمان زمیندار تھے انہوں نے اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ و فروغ کے لئے ان تینوں جماعتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا تھا بلکہ ان کے سرغنہ نواب حبیب اللہ نواب بہادر آف ڈھاکہ نے سندھ کے سر عبداللہ ہارون، پنجاب کے سر فضل حسین اور صوبہ سرحد کے صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی طرح صوبہ کے مسلمانوں کے بالائی طبقہ کے مفادات کے تحفظ و فروغ کے لئے ایک مقامی پارٹی بنام یونائیٹڈ مسلم پارٹی بنائی جس میں خواجہ سر ناظم الدین اور اس قسم کے جاگیرداروں کا غلبہ تھا اور حسین شہید سہروردی کلکتہ کے مسلم بورژوا عناصر کے نمائندہ کی حیثیت سے اس پارٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اس پارٹی کے مقابلے میں باریسال کے ایک خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ ابوالقاسم فضل الحق نے پہلے ہی سے کرشک پرجا پارٹی کے نام سے اپنی ایک الگ تنظیم بنائی ہوئی تھی جس کے منشور میں غریب کسانوں کی فلاح و بہبود کا مسئلہ سر فہرست تھا۔

مولوی اے۔ کے فضل الحق

فضل الحق کی شخصیت، اپنی متلون مزاجی، موقع پرستی اور سیماب پائی کے باوجود بڑی جاذبیت کی حامل تھی۔ وہ اگرچہ کلکتہ ہائی کورٹ میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے وکالت کرتا تھا لیکن

پبلک جلسوں میں حاضرین کے موڈ کے مطابق بڑی جذباتی اور لچھے دار تقریر کرنے کا ماہر تھا۔ وہ اپنے کردار کی اسی منفرد خصوصیت کی بنا پر 1913ء میں ڈھاکہ ڈویژن کے حلقہ کے ایک ضمنی انتخاب میں بنگال صوبائی کونسل کا رکن منتخب ہوگیا تھا حالانکہ اس زمانے میں رائے دہندگی کا حق صرف مالکان جائیداد کو حاصل تھا۔ ان مالکان کی بھاری اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اور اس کا مخالف امیدوار ایک نہایت بااثر ہندو زمیندار رائے بہادر کمار چندرناتھ مترا تھا۔ 1913ء کے بعد اس کی سیاسی زندگی تضادات سے بھرپور رہی اور یہ اپنے وقتی مفادات کو پیش نظر رکھ کر مسلم لیگ، کانگرس، تحریک خلافت اور سوراج پارٹی سے منسلک رہا۔ 1924ء میں اس نے سوراج پارٹی سے علیحدگی اختیار کر کے صوبہ کی وزارت تعلیم کا قلمدان حاصل کرلیا مگر یہ اس عہدہ پر چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک فائز نہ رہ سکا کیونکہ کونسل میں اس کی پارٹی کو شکست ہوجانے کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا تھا۔

1935ء میں مولوی فضل الحق کلکتہ کارپوریشن کا پہلا مسلمان میئر منتخب ہوا مگر تقریباً دس ماہ بعد جنوری 1936ء میں کارپوریشن کے تقریباً سارے مسلم ارکان کے زیر اثر اس عہدہ سے مستعفی ہوگیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس بلدیاتی ادارے میں مسلمان ملازمین کا تناسب گیارہ فیصد سے زیادہ نہیں تھا اور اس کے ہندو اور یورپی ارکان مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کا کوٹا مقرر کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتے تھے حالانکہ شہر کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً 25 فیصد تھا۔ چونکہ مولوی فضل الحق کو معلوم تھا کہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت عام انتخابات جداگانہ رائے دہندگی کے اصول کے تحت ہوں گے اس لئے وہ بنگالی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ وفروغ کی کسی بھی چھوٹی موٹی تحریک سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ، باریسال اور صوبہ کے بعض دوسرے علاقوں میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوتے رہتے تھے جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتے تھے کہ صوبہ میں جو مسلمان لیڈر انڈین نیشنلزم کی آڑ میں ہر شعبۂ زندگی میں ہندوؤں کی بالادستی کو قبول کرے گا اس کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہوگا۔

کل ہند سیاسی قیادت میں بنگالی ہندوؤں کی ثانوی حیثیت اور گاندھی...... نہرو منافقانہ سیاست کا غلبہ

بنگالی مسلمانوں کے مقابلے میں بنگالی ہندوؤں کی سیاسی پوزیشن بہت بہتر تھی اگرچہ

ان کی سیاست کا کمزور ترین پہلو یہ تھا کہ اونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان شدید معاشرتی و معاشی تضاد کے باعث انڈین نیشنل کانگرس اور ہندو مہا سبھا دونوں ہی کو ہمہ وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ بنگالی مسلمانوں کی قیادت اچھوتوں کے چند لیڈروں سے سودا بازی کر کے صوبہ میں اس طرح اپنی سیاسی بالادستی قائم کر سکے گی جس طرح کہ پنجاب میں پہلے سر فضل حسین اور پھر سر سکندر حیات خان نے یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم پر ہندو اور سکھ جاٹوں کے چند لیڈروں کو ساتھ ملا کر قائم کر لی تھی۔ مزید برآں تعلیم یافتہ بنگالی ہندوؤں کو اب کل ہند سیاست میں وہ پوزیشن حاصل نہیں تھی جو انہیں 1924ء سے قبل بپن چندر پال اور سی۔آر۔داس کی زیر قیادت ملی ہوئی تھی۔ اب انڈین نیشنل کانگرس اور ہندو مہا سبھا کی کل ہند تنظیموں کی عنان قیادت شمال مغربی ہندوستان کے گاندھی، نہرو، پٹیل اور ساورکر وغیرہ کے ہاتھ میں تھی۔ 1925ء میں سی۔آر۔داس کے انتقال کے بعد سوبھاش چندر بوس نے سوشلزم، نیشنلزم، سیکولرزم اور مکمل آزادی کا پرچم اٹھا کر کانگرس کی مرکزی قیادت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر گاندھی کی مذہبی قدامت پسندی اور نہرو کی ''سوشلسٹ رقابت'' نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔ مغربی ہندوستان کا ہندو بورژوا اب بنگالی ہندوؤں کی قیادت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ سوبھاش بوس مایوس ہو کر 1933ء میں یورپ چلا گیا اور 1937ء تک وہیں مقیم رہا اور اس عرصے میں اس نے اپنے آپ کو ہندوستان کی سیاست سے بے تعلق رکھا جبکہ جواہر لال نہرو اس دوران گاندھی کی حمایت سے تین مرتبہ آل انڈیا کانگرس کا صدر منتخب ہوا۔

جب اپریل 1936ء میں نہرو دوسری مرتبہ کانگرس کا صدر بنا تو اس وقت بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو چکا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت برطانیہ کے کمیونل ایوارڈ نے اس تاریخی فرقہ وارانہ تضاد کو بلاشبہ ہوا دی تھی اور بنگالی ہندوؤں نے مہاراجہ ادھیراج بردوان کی زیر قیادت اس ایوارڈ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ بنگال کے جن تھوڑے بہت مسلمان نوجوانوں نے کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کر لی تھی ان کے لئے روزگار کے سارے دروازے بند تھے۔ صوبہ کے سرکاری محکموں، کلکتہ کارپوریشن سمیت سارے بلدیاتی اداروں اور تجارتی و صنعتی شعبوں میں ہر جگہ ہندو ہی ہندو تھے۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں کو ان میں اپنے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی

تھی۔ جنوری 1936ء میں کلکتہ کارپوریشن میں مولوی فضل الحق اور دوسرے مسلم ارکان کے استعفے کے باعث جو بحران پیدا ہوا تھا اس کا فوری سبب یہی تھا۔ مسلمانوں کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کا مطالبہ یہ تھا کہ کارپوریشن میں مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کا کوٹا مقرر کیا جائے لیکن ہندو مہاسبھا کے علاوہ کانگرس کا موقف یہ تھا کہ ''ملازمتوں کی فرقہ وارانہ یا مذہبی بنیاد پر تخصیص کا مطالبہ فرقہ وارانہ بے چینی اور کشیدگی میں اضافہ کرے گا اور قومی اتحاد حاصل کرنے کے مقصد میں رکاوٹ ڈالے گا۔''[2]

اپریل میں کلکتہ میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا تو جواہر لال نہرو نے اپنی صدارتی تقریر میں صوبائی کانگرس کے اس موقف کی بالواسطہ تائید کرتے ہوئے کہا کہ ''فرقہ وارانہ مسئلہ کی وسیع نظام اشیا میں کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگ جو اسے اہم مسئلہ سمجھتے ہیں وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ برطانوی ملوکیت ہندوستان پر ہمیشہ کے لئے مسلط رہے گی...... میرے خیال میں ہندوستان میں نہ تو ملوکیت ہی رہے گی اور نہ فرقہ واریت...... ہمیں بنگال کے باشندوں سے ہمدردی کرنی چاہیے جو حکومت کے سخت گیر ہاتھ اور اس کے فرقہ وارانہ فیصلوں کی وجہ سے بہت زیادہ مصیبتیں اٹھا چکے ہیں۔''[3] صوبائی کانگرس کی متذکرہ قرارداد اور نہرو کی یہ تقریر بادی النظر میں ترقی پسندانہ تھی لیکن دراصل یہ غیر حقیقت پسندانہ اور رجعت پسندانہ تھی۔ کانگرسی لیڈروں کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے سیاسی اور معاشی تحفظات اور حقوق کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے اسے پہلے فرقہ واریت قرار دے کر اور پھر اس فرقہ واریت کو برطانوی ملوکیت کے ساتھ وابستہ کر کے ہندو۔ مسلم تضاد کو خوش اسلوبی سے حل نہیں کیا جاسکے گا۔

مسلمان سیاسی پارٹیوں کا 1937ء کے انتخابات کے لئے اتحاد قائم نہ ہوسکا

جب کانگرسی لیڈروں کے اس قسم کے غیر حقیقت پسندانہ رویے کی وجہ سے برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال میں بھی ہندو۔ مسلم تضاد بڑھتا ہی چلا گیا تو 14 رجولائی 1936ء کو نواب بہادر آف ڈھاکہ کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کی جانب سے مئی 1936ء میں جاری کردہ اس اپیل پر غور کیا کہ مسلمانوں کی ساری جماعتوں کو مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ میں شامل ہو کر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر عام انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ کافی

بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ جناح کو کلکتہ آنے کی دعوت دی جائے تا کہ وہ خودا یگز یکٹو کونسل کے ارکان کے ساتھ اس مسئلہ پر گفت وشنید کریں۔ چنانچہ نواب بہادر آف ڈھاکہ کی دعوت پر محمد علی جناح اگست 1936ء کے تیسرے ہفتے میں کلکتہ پہنچے تو نہ صرف یونائیٹڈ مسلم پارٹی بلکہ فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ یہ دونوں پارٹیاں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی زیر ہدایت عام انتخابات میں حصہ لیں گی۔ اس پر جناح نے 26/اگست کو کلکتہ میں ایک انٹرویو میں مقامی مسلم پارٹیوں کے ان فیصلوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ بنگالی مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہ رہا کیونکہ جب نومبر 1936ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹوں کی تقسیم کا موقع آیا تو فضل الحق باغی ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس کی کرشک پرجا پارٹی، پنجاب کی مجلس احرار کی طرح مسلم لیگ سے الگ رہ کر صوبہ کے عام انتخابات میں حصہ لے گی۔ چنانچہ اسے 2/نومبر کو مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ سے برطرف کر دیا گیا۔

ان دنوں انتخابی مہم زوروں پر تھی اور مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ اس تلخی کے پس منظر میں مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کی یہ خواہش وکوشش تھی کہ انہوں نے انتخابی مقصد کے لئے مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کا جو وسیع متحدہ محاذ بنا رکھا ہے کانگرس اس میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش نہ کرے اور انتخابات کے بعد مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان 1916ء کے معاہدہ لکھنؤ کی قسم کے معاہدے کی بنیاد پر ہندو۔ مسلم اتحاد کی پائیدار عمارت تعمیر ہو لیکن کانگرس کی قیادت کے لئے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی۔ کانگرس کا صدر جواہر لال نہرو مسلم لیگ کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ 1936ء کے اواخر میں کلکتہ میں اس کا بیان یہ تھا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی پارٹیاں ہیں۔ ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ۔ جناح نہرو کے اس متکبرانہ بیان پر بہت برہم ہوئے اور انہوں نے 4/جنوری 1937ء کو کلکتہ میں مولانا محمد علی جوہر کی برسی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی بھی موجود ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمان ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ہر اس پارٹی سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں جو ترقی پسند ہو اور جس کا پروگرام ہماری پارٹی کے منافی نہ ہو۔ مسلمان آمادہ نہیں کہ دوسری پارٹیوں کے امدادیوں کی حیثیت سے رہیں۔ مسلمان آمادہ ہیں کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے پیش نظر دوسری پارٹیوں سے مساویانہ درجہ کی حیثیت میں تعاون کریں۔''[4] نہرو کی جانب سے جناح کی

اس تقریر کا ''ترقی پسندانہ'' جواب یہ تھا کہ ''فرقہ وارانہ یا سیاسی یا اقتصادی مسائل کو چھیڑنا دراصل قرون وسطیٰ میں واپس جانا ہے۔ آج کل کے اہم مسائل تو افلاس، فاقہ کشی، بیکاری، برطانوی استعماریت اور ہندوستانی قوموں کے درمیان جنگ ہے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو یہ مقابلہ صرف استعماریت اور قومیت کا ہے اور اگر زیادہ گہری نظر سے کام لیا جائے تو ہندوستان میں صرف دو جماعتیں رہ جاتی ہیں برطانوی استعماریت اور کانگرس جو ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسلم لیگ متوسط درجہ کے آسودہ حال مسلمانوں کی جماعت ہے۔ مسلم لیگ کے ارکان سے زیادہ مجھے عام مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لئے عام مسلمانوں کی فاقہ کشی، غربت اور مصیبتوں کا علم مجھے ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کا مطمع نظر فیصدی حقوق، کونسل کی نشستیں یا سرکاری ملازمت ہے۔ میں صدر کانگرس کی حیثیت سے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کی بھوک اور افلاس کی نمائندگی کرتا ہوں۔ کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ بھی تعاون کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ یہ تعاون عوام کی بھلائی اور استعماریت کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ہو۔''[5] نہرو کی یہ ''ترقی پسندانہ'' تقریر دراصل پنجاب کے آنجہانی لالہ لاجپت رائے کی اس پالیسی لائن کے عین مطابق تھی کہ جناح کے موقف کے برعکس ہندو۔ مسلم تضاد کی تاریخی حقیقت کے وجود کو تسلیم نہ کرو اور جب کبھی مسلمانوں کے کچھ عناصر اپنے فرقہ کے لئے علیحدہ سیاسی، معاشی حقوق کا مطالبہ کریں تو ان کے اس مطالبہ کو سیکولرزم، سوشلزم، سامراج دشمنی، انڈین نیشنلزم اور مکمل آزادی کے نعروں میں دفن کر کے یہ ظاہر کرو کہ وہ برطانوی سامراج کے پٹھو اور ہندوستان کی آزادی کے مخالف اور غریب وافلاس زدہ عوام کے دشمن ہیں۔

فضل الحق اور عبدالحلیم غزنوی کا مہاراجہ بردوان کے ساتھ سمجھوتہ

نہرو۔ جناح کے اس تقریری مناظرہ کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ ان دنوں بنگال کے مہاراجہ ادھیراج بردوان اور بعض دوسرے ہندو لیڈر مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے مولوی فضل الحق اور سر عبدالحلیم غزنوی جیسے عناصر سے بنگال کی حد تک ہندو۔ مسلم تصفیہ کے لئے بات چیت کر رہے تھے۔ یہ بات چیت 7 ر جنوری کو ختم ہوئی تو سر عبدالحلیم غزنوی اور مہاراجہ ادھیراج بردوان کے درمیان طے شدہ سمجھوتہ کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ سہ نکاتی سمجھوتہ یہ تھا کہ:

1۔ کمیونل ایوارڈ دس سال تک بحال رہے اور اس کے بعد اس پر نظر ثانی کی جائے یا اس وقت تک بحال رہے جب تک متعلقہ قوموں کے باہمی تصفیہ سے کمیونل ایوارڈ میں ترمیم نہ کی جائے۔

2۔ صوبائی کابینہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ارکان کی تعداد یکساں ہوگی۔

3۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب یکساں ہوگا یعنی یورپین، اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے مقررہ تناسب کے بعد دونوں قوموں کا تناسب مساوی ہوگا۔ اس بارے میں پراونشل کمیشن کی طرف سے قابلیت کا جو معیار مقرر ہوگا اس کا لحاظ بہر حال کرنا پڑے گا۔

اس سمجھوتہ کے بارے میں جو خط وکتابت ہوئی اس سے یہ ظاہر ہوا کہ سر عبدالحلیم غزنوی نے سر آغا خان اور بعض دوسرے کل ہند مسلم لیڈروں سے مشورہ کے بعد اس سمجھوتہ کے لئے سلسلہ جنبانی کی تھی۔ اس گفت وشنید میں متعدد مسلمان لیڈروں نے اس کی امداد کی تھی۔ وہ اس سمجھوتہ سے ہمدردی رکھتے تھے مگر انتخابات میں بے حد مصروف ہونے کی وجہ سے اعلانیہ طور پر اس سمجھوتہ کی منظوری کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ مہاراجہ بردوان نے ایک خط میں سر غزنوی کو یقین دلایا تھا کہ ''بنگال اینٹی کمیونل ایوارڈ کمیٹی کی سب کمیٹی نے ان تجاویز کو منظور کر لیا ہے اور اگرچہ دو کانگرسی لیڈر بدھان چندر رائے اور سرت چندر بوس موجودہ حالات میں ان تجاویز سے متفق نہیں ہو سکتے تاہم ان کا خیال ہے کہ جب ان تجاویز کا اعلان ہوگا تو فرقہ وارانہ منافقت کا سدباب ہو جائے گا۔''[6]

پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار انقلاب نے بنگال میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق اس سمجھوتے کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس صوبہ کے مسلمان جاگیردار بھی ہندوؤں کے ساتھ اس قسم کا سمجھوتہ کرنے کے متمنی تھے۔ انقلاب کا اداریہ یہ تھا کہ ''کاش یہ سمجھوتہ ہندوستان کے ہر حصے میں فرقہ وارانہ معاملات کے تصفیہ کا ایک اچھا نمونہ بن جائے۔ پنجاب کے شہری ہندوؤں سے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کیا انہیں بھی کبھی ہوش آجائے گا۔ کیا وہ بھی بے ہودہ، لایعنی اور بے نتیجہ مخالفت اور کشمکش کو ترک کر کے سیدھا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔''[7]

10 رجنوری کو بنگال اسمبلی میں یورپین گروپ کے لیڈر سر ایڈورڈ نتھل (Edward Nithal)

نے اپنے بیان میں سرغزنوی اورمہاراجہ بردوان کے درمیان طے شدہ سمجھوتہ کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ ''آئندہ بنگال میں خالص مذہبی معاملات کے علاوہ، فرقہ وارانہ اصولوں کی بجائے اقتصادی اصولوں کے ماتحت پارٹیوں کی تشکیل عمل میں لائی جائے گی...... جب تک فرقہ وارانہ جھگڑا ختم نہیں ہوگا اس وقت تک ہندوستان بہت کم ترقی کرسکتا ہے۔''[8] سرایڈورڈ بنتھل کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی سامراج ان دنوں کم ازکم بنگال کی حد تک ہندو۔مسلم تنازعہ کے تصفیہ کا خواہاں تھا کیونکہ اس تنازعہ کے جاری رہنے سے یہاں اس کے کاروباری مفادات کو نقصان پہنچتا تھا۔ برطانوی سامراج پنجاب میں بھی اسی قسم کا سمجھوتا چاہتا تھا کیونکہ اس صوبہ میں ہندو۔مسلم کشیدگی سے اس کے جنگی منصوبوں پر برا اثر پڑتا تھا۔

تاہم آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے غزنوی۔بردوان سمجھوتے کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ ہی بنگال کے مسلم عوام نے اسے قابل توجہ سمجھا تو کانگرس نے اس سمجھوتہ کی مخالفت کی۔ نہرو کا تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ سمجھوتہ ایک مہاراجہ اور ایک نواب کے درمیان ہوا ہے اور اسے عوام کی تائید حاصل نہیں ہے۔'' چنانچہ یہ سمجھوتہ چند دنوں میں ہی قصۂ پارینہ ہوگیا۔

1937ء کا انتخاب...... مسلم ارکان کی تقسیم، مولوی فضل الحق کی قلابازیاں اور ہندو۔مسلم تضاد میں شدت

جنوری 1937ء کے تیسرے ہفتے میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات بالعموم فرقہ وارانہ نعروں کی بنیاد پر لڑے گئے اور جب فروری کے اوائل میں ان انتخابات کے نتیجے کا سرکاری طور پر اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو کی ''سامراج دشمنی اور غیر فرقہ وارانہ غریب نوازی'' کا بنگال کے حریت پسندوں اور افلاس زدہ مسلم عوام پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ کانگرس نے 250 کے ایوان میں صرف 54 نشستیں حاصل کی تھیں اور ان کانگرسی ارکان اسمبلی میں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے کامیاب امیدواروں کی تقسیم یہ تھی:[9]

کانگرس (اونچی ذات کے ہندو	=	47
کانگرس (اچھوت)	=	7
ہندو نیشنلسٹ (جو کمیونل ایوارڈ کے خلاف تھے)	=	3

ہندومہاسبھا	=	3
اونچی ذات کے ہندو(آزاد)	=	14
اچھوت(آزاد)	=	23
مسلم لیگ	=	39
کرشک پرجاپارٹی	=	40
آزادمسلمان	=	42
یورپین،اینگلوانڈین اورعیسائی	=	31

یورپین، اینگلوانڈین اور ہندوستانی عیسائی فرقوں کے کامیاب امیدواران کی تعداد ان کے لئے مخصوص کردہ 17 نشستوں سے اس لئے زیادہ تھی کہ تجارت، صنعت، معدنیات اور باغات کے مالکان اور زمینداروں کو جو 24 نشستیں دی گئی تھیں ان میں سے یورپین امیدواروں کی خاصی تعداد کامیاب ہوئی تھی اور اس طرح اسمبلی میں یورپینوں کی پوزیشن اس پوزیشن سے بھی زیادہ طاقتور ہوگئی تھی جو بظاہر 1935ء کے ایکٹ میں متعین کی گئی تھی لہٰذا ان کے تعاون کے بغیر صوبہ میں کسی پائیدار وزارت کی تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تاہم انتخابات کے نتائج کے اعلان کے فوراً بعد کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر مولوی فضل الحق کا خیال تھا کہ وہ کانگرس پارٹی اور دوسرے ہندوؤں کے تعاون سے حکومت بنا سکے گا۔ ان دنوں اس کا مسلم لیگ کے ساتھ سخت تضاد تھا۔ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے اسے نومبر 1936ء میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کی رکنیت سے برطرف کر دیا تھا جس کے بعد اس نے پتواکھلی کے حلقے سے ایک ممتاز مسلم لیگی امیدوار خواجہ سر ناظم الدین کا مقابلہ کر کے اسے دس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے شکست دے کر بنگال کے غریب مسلم کسانوں میں اپنی مقبولیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی اور اپنی پارٹی کی فتح کے نشے کے زیر اثر 4/فروری کو ایک بیان میں اعلان کیا کہ ''جب تک پرجا پارٹی کا ہندوؤں سے اشتراک عمل ممکن ہو اس وقت تک وہ مسلمانوں کی دوسری پارٹیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔ یہ پارٹی کسی خاص فرقہ کے لئے کام نہیں کرے گی۔ اس کے مدنظر بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے مفادات ہوں گے اور اس کا پروگرام یہ ہوگا:

1۔ ہر ایک گاؤں میں ایک پرائمری سکول اور ہسپتال کا قیام۔ سکول اور ہسپتال کے

مصارف سرکاری ملازموں کی تنخواہوں کو کم کرنے سے پیدا کئے جائیں گے۔

2۔ قرضوں کا تصفیہ جو مہاجنوں اور مقروضوں دونوں ہی کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

3۔ بنگال کے ایکٹ مزارعین میں ترمیم۔ [10]

لیکن جب اس کے بیان پر بنگالی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ عناصر نے غیر موافق ردعمل کا اظہار کیا اور کانگرس نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی تو مولوی فضل الحق نے حسب روایت قلابازی کھانے میں کوئی زیادہ دیر نہ لگائی۔ اس نے نواب بہادر ڈھاکہ، مرزا ابوالحسن اصفہانی، شمس الدین احمد اور حسین شہید سہروردی کے ساتھ مصالحانہ بات چیت کے بعد 15 رفروری کو ایک مشترکہ بیان پر دستخط کر دیئے جس میں کہا گیا کہ ''صوبائی اسمبلی میں مسلمان ارکان متحد طریق پر کام کریں گے اور فضل الحق، مسلم لیگ اور پرجا پارٹی کا قائد ہوگا۔'' اس سمجھوتے کے بعد فضل الحق نے اپنی پارٹی کے پروگرام میں بھی فوراً تبدیلی کر دی۔ اب اس کے مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ پارلیمانی پروگرام میں پہلی شق یہ تھی کہ ''اسمبلی میں بندوبست دوامی کی تنسیخ کے لئے کوشش کی جائے گی۔'' مولوی فضل الحق کی اس قلابازی کا پس منظر یہ تھا کہ کئی ماہ کی انتخابی مہم کے دوران صوبہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا تضاد پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا تھا اور مسلم رائے عامہ ہندوؤں کے کسی پٹھو کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ ایک طرف تو بنگالی مسلمانوں میں 1757ء کے بعد پہلی مرتبہ یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ صوبہ میں ان کی سیاسی بالادستی قائم ہوگی تو ان کے دیرینہ معاشی مسائل کے حل کی کوئی صورت نظر آئے گی اور دوسری طرف ہندوؤں کو پہلی مرتبہ یہ حقیقی خطرہ لاحق ہوا تھا کہ آئندہ انہیں وہ سیاسی اور معاشی مراعات حاصل نہیں ہوں گی جن سے وہ اس وقت تک مستفید ہوتے رہے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد کی شدت کا ایک مظاہرہ فروری کے اوائل میں ہوا جبکہ کلکتہ یونیورسٹی کے ہندو ارباب اختیار نے یہ حکم دیا کہ جس دن یونیورسٹی کا یوم تاسیس منایا جائے سارے طلبا یونیورسٹی کے جھنڈے کے آگے ماتھا ٹیکیں۔ اس جھنڈے پر کنول کی تصویر تھی اور لفظ ''شری'' ثبت تھا اور یہ دونوں نشان ہندوؤں کی ایک دیوی ماتا سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس دن بنگالی کا مشہور گیت بندے ماترم ہر سکول اور کالج میں گایا جائے۔ جب یہ سکیم کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں پہنچی تو اس ادارے کے مسلمان طلبا نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ''یہ گیت خالص ہندوانہ گیت ہے جس میں دیوی اور ماتا

سے اظہار محبت وعقیدت کیا گیا ہے اور جس کے ہر لفظ سے بت پرستی ٹپکتی ہے۔"[11] اسلامیہ کالج کے طلبا کے اس انکار کے بعد کلکتہ کے مسلمان طلبا، اساتذہ اور دوسرے تعلیم یافتہ طبقہ نے یونیورسٹی کے اس حکم کے خلاف کچھ اس طرح اعلانیہ غم وغصہ کا اظہار کیا کہ اس کا پورے برصغیر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بڑی سنجیدگی سے نوٹس لیا اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے متعصّبانہ رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ مولوی فضل الحق کا مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ متذکرہ سمجھوتہ اسی احتجاجی ماحول میں ہوا تھا اور یہ اسی ماحول کا اثر تھا کہ جب حسین شہید سہروردی نے کلکتہ کے شمالی مسلم حلقہ کی نشست سے مستعفی ہو کر اس کے ضمنی انتخاب کے لئے خواجہ سر ناظم الدین کو کھڑا کیا تو مولوی فضل الحق نے اس کی کوئی مخالفت نہ کی۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے رویے کے بارے میں اس کا تبصرہ یہ تھا کہ "کنول کا پھول بجائے خود بے ضرر ہے مگر جب نشان کے طور پر اسے جھنڈے پر لگا دیا جائے تو مسلمانوں کے نظریے کے مطابق یہ نہایت قابل اعتراض ہے۔ اس بارے میں مسلمان طلبا نے جو دلیرانہ اقدام کیا ہے اس کے لئے میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تعلیمات کا قلمدان وزارت یقیناً کسی زبردست مسلمان وزیر تعلیم کے سپرد ہونا چاہیے تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت اور حفاظت ہو سکے۔ اگر ہمیں موقع ملا تو ہم یقیناً مسلم طلبا کی حالت بہتر بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔"[12]

مولوی فضل الحق کی زیر قیادت پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کا قیام اور کانگرس کی مخالفانہ مہم

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور کرشک پرجا پارٹی کے اس اتحاد کے بعد مولوی فضل الحق نے اس متحدہ اسمبلی پارٹی کے قائد کی حیثیت سے صوبہ میں وزارت کی تشکیل کے لئے کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے علاوہ ہندو اور اچھوت ارکان اسمبلی کے کئی گروہوں سے کئی دن تک بات چیت کی۔ جب مارچ کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی قیادت نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ جب تک صوبائی گورنروں کو صوبائی وزارتوں کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل رہے گا اس وقت تک وہ وزارتوں کی تشکیل میں حصہ نہیں لے گی تو صوبائی کانگرس سے مولوی فضل الحق کی بات چیت قطعی طور پر ناکام ہو گئی اور اس نے ہندوؤں اور اچھوتوں کے بعض دوسرے عناصر کے

تعاون سے اپنی گیارہ رکنی کابینہ کی تشکیل کی۔ اس کابینہ نے یکم اپریل 1937ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔ کابینہ کے ارکان کے نام اور ان کے محکمے یہ تھے۔

1۔	اے۔ کے۔ فضل الحق (وزیراعلیٰ)	=	تعلیم
2۔	این۔ آر۔ سرکار	=	خزانہ
3۔	خواجہ سر ناظم الدین	=	نظم ونسق
4۔	سر پی۔ بی۔ سنگھ رائے	=	مال
5۔	نواب بہادر ڈھاکہ	=	صنعت
6۔	مہاراجہ قاسم پور	=	رسل ورسائل
7۔	حسین شہید سہروردی	=	تجارت ومحنت
8۔	نواب مشرف حسین	=	عدلیہ اور قانون سازی
9۔	مولوی نوشیر علی	=	بلدیات
10۔	پی۔ ڈی۔ رائے کوٹ	=	محصولات وجنگلات
11۔	ایم۔ بی۔ ملک	=	کوآپریٹو، کریڈٹ

اور امداد یہات وغیرہ۔

چونکہ مولوی فضل الحق نے اپنی اس وزارت کی تشکیل کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے انقلابی منشور کو نظر انداز کر دیا تھا اس لئے اس کی پارٹی کے بہت سے ارکان اسمبلی اس کی اس موقع پرستی اور ابن الوقتی پر بہت برہم ہوئے۔ چنانچہ 29/مارچ کو پرجا اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر شمس الدین احمد سمیت 28 ارکان نے ایک مشترکہ بیان میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''اس گیارہ رکنی کابینہ میں صوبہ کے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے 9 ایسے نمائندے شامل کئے گئے ہیں جن سے غریب کسانوں کی فلاح وبہبود کے لئے کسی اچھے کام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔'' پرجا پارٹی کے ارکان اسمبلی کے اس بیان میں فرقہ پرستی کی کوئی علامت نہیں تھی بلکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دنوں بنگالی مسلمانوں میں ایک ایسا طاقتور عنصر موجود تھا جو صوبہ کی سیاست کی بنیاد محض اقتصادی اصولوں پر رکھنے کا خواہاں تھا۔ لیکن کلکتہ کے ہندو اخبارات نے ایسے ترقی پسند مسلمان عناصر کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اپنا یہ واویلا زور شور سے جاری رکھا کہ بنگال میں مسلم راج

قائم ہو رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق حلف وفاداری کی رسم کی ادائیگی کے بعد جب اپنی کابینہ کے ارکان کے ساتھ صوبائی سیکرٹریٹ میں گیا تو اس نے سب سے پہلے ہندو اخبارات کے اس پروپیگنڈے کا نوٹس لیا اور یہ اعلان کیا کہ ''میں اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ کہیں ہندو راج اور کہیں مسلم راج کے متعلق خوف وہراس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ میں اس موقع پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بنگال میں مسلم راج اسی طرح نہیں ہو سکتا جس طرح بہار اور یو۔پی میں ہندو راج کا امکان نہیں۔ ہر جگہ برطانوی راج ہوگا البتہ مختلف صوبوں میں جو نمایاں خصوصیت ہوگی وہ یہ ہوگی کہ کسی صوبہ میں نظم ونسق چلانے والے زیادہ تر ہندو ہوں گے اور کسی صوبہ میں یہ کام زیادہ تر مسلمانوں کے ذمہ ہوگا۔ لیکن حکومت کا تخیل اور نصب العین ہر جگہ برطانوی ہی ہوگا۔''[13] مولوی فضل الحق کا یہ دلچسپ اعلان آئینی لحاظ سے بالکل صحیح تھا کیونکہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت ''صوبائی خودمختاری'' کے باوجود گورنر کو ویٹو کا اختیار حاصل تھا اور اس بنا پر صوبائی کابینہ کوئی بھی اہم فیصلہ گورنر کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم اس کا یہ اعلان اس تلخ حقیقت کا بھی مظہر تھا کہ بنگال کے ہندو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی شعبوں میں بہت ترقی یافتہ ہونے کے باوجود برطانوی راج میں بھی مسلم اکثریت کی ذرا سی سیاسی بالادستی برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور ان کے اس ناعاقبت اندیشانہ رویے کے پیش نظر جواہر لال نہرو کا یہ موقف مضحکہ خیز لگتا تھا کہ برصغیر سے برطانوی ملوکیت کی روانگی کے ساتھ ہی فرقہ واریت کا بھی خود بخود خاتمہ ہو جائیگا۔

مولوی فضل الحق کو اپنی وزارت کی تشکیل کے بعد دو ایک ماہ تک جیوٹ ملوں کے مزدوروں کی ہڑتال کا مسئلہ درپیش رہا۔ چونکہ اس عرصے میں انڈین نیشنل کانگرس صوبائی سطح پر 1935ء کے ایکٹ پر عمل درآمد کی مخالفت کر رہی تھی اس لئے بنگال کے کانگرسیوں نے مزدوروں کے اس مسئلہ سے فائدہ اٹھا کر فضل الحق وزارت کے لئے بہت مشکلات پیدا کیں۔ ہڑتالی مزدوروں نے بہت سے پرتشدد مظاہرے کئے اور پولیس کو ان مظاہروں پر قابو پانے کے لئے دو ایک جگہ گولی بھی چلانا پڑی۔ مئی کے اواخر میں مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوگئی مگر کانگرسی لیڈروں اور اخبارات کا مخالفانہ پروپیگنڈا ختم نہ ہوا۔ اس پروپیگنڈے کی بنیاد صدر کانگرس جواہر لال نہرو کا یہ بیان تھا کہ ''بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلم اکثریتی صوبوں میں جو غیر کانگرسی وزارتیں قائم ہوئی ہیں وہ دراصل انگریزوں کی کٹھ پتلی ہیں۔'' کانگرسی اخبارات اور لیڈر اپنی اس مہم میں

کرشک پرجا پارٹی کے ان 28 ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملانے کی بھی کوشش کرتے رہے جنہوں نے 29/مارچ کو ایک مشترکہ بیان کے ذریعے صوبائی وزارت میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے غلبہ کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

مولوی فضل الحق قدرتی طور پر کانگرسیوں کے اس رویے سے بہت ناراض ہوا اور اس نے اپنی وزارت کے استحکام کے لئے ان تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا جنہوں نے اس کی حکومت سے اپنے لئے سرکاری ملازمتوں کی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ اس نے جون میں دیناج پور، ڈھاکہ، بوگرا اور بعض دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے اجتماعات میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ الزام عائد کیا کہ بنگال کانگرس پر ہندو مہاسبھائیوں کا غلبہ ہے۔ یہ جماعت اپنے غیر فرقہ واریت کے دعوؤں کے باوجود عملاً ایک ہندو جماعت ہے اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی دشمن ہے۔ چنانچہ جب 7/جولائی 1937ء کو کانگرس کی مرکزی قیادت نے صوبائی وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت بنگال میں فضل الحق کی وزارت کے مستقبل کے مسئلہ نے ہندو۔ مسلم مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ ایک طرف تو مسلمان طلبا اور دوسرے عناصر وزارت کے حق میں جلسے کرتے تھے، جلوس نکالتے تھے اور قراردادیں منظور کرتے تھے اور دوسری طرف تعلیم یافتہ ہندو عناصر نے سرت چندر بوس، بدھان چندر رائے اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں کی قیادت میں اس وزارت کا بہر قیمت تختہ الٹنے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ اس صورت حال سے فضل الحق پریشان ہوا اور اسے بجا طور پر یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ صوبہ کی کانگرس پارٹی کرشک پرجا پارٹی کے غیر مطمئن ارکان کو ساتھ ملا کر خود حکومت پر قبضہ کر لے گی۔ 29/جولائی کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے والا تھا اور کانگرسیوں کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ اس سیشن میں وہ چند مسلمان ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر صوبے کے اقتدار پر قبضہ کر لیں۔

کانگرس کی ریشہ دوانیوں کے خلاف مسلم طلبا اور عوام کی جانب سے فضل الحق وزارت کی بھرپور حمایت

وزیر اعلیٰ فضل الحق نے کانگرسیوں کے ان عزائم کے پیش نظر جولائی کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں صوبہ کی مسلم رائے عامہ کو ابھارا تا کہ کوئی مسلمان رکن اسمبلی اس رائے عامہ کے

خوف کی بنا پر کانگرس سے ساز باز نہ کرے۔اس نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس میں اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق ومفادات کا عظیم علمبردار ظاہر کیا اور کانگرسیوں کی سازشی سیاست پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس پر جب ہندو اخبارات نے فضل الحق کے خلاف خوب زہر اگلا تو 26 رجولائی کی شام کو کلکتہ کے مسلم انسٹیٹیوٹ ہال میں مسلم طلبا اور شہریوں کا ایک جلسہ عام ہوا جس میں فضل الحق وزارت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا گیا اور مسلم نوجوانوں کو تاکید کی گئی کہ وہ اس وزارت کے تحفظ کے لئے پوری کوشش کریں۔ اجلاس میں کانگرسی لیڈروں کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا گیا جو وزیر اعلیٰ کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کر رہے تھے نیز مسلمانوں سے التماس کی گئی کہ ''کانگرس کی دسیسہ کاریوں کو ناکام بنانے کے لئے پوری سرگرمی دکھائیں۔''[14] جب کلکتہ میں یہ جلسہ ہوا اس وقت وزیر اعلیٰ فضل الحق صوبائی اسمبلی کے 125 مسلم ارکان (جن کی تعداد 119 سے بڑھ کر 125 اس لئے ہوگئی تھی کہ زمینداروں اور بعض دوسرے عناصر کی جنرل نشستوں سے چھ مسلم امیدوار کامیاب ہو گئے تھے) کے نام ایک چٹھی لکھ چکا تھا جس میں اس نے ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ ''بحالات موجودہ کانگرس پر ہندو مہاسبھا کا اقتدار ہے اور کانگرس کے لیڈر سخت فرقہ پرست ہو رہے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے تمام اختلافات دور کر کے متحدہ محاذ پر جمع ہو جائیں۔'' کلکتہ کے کانگرسی اخبار ''ایڈوانس'' نے اس خفیہ چٹھی کو بڑے طمطراق سے چھاپا اور پھر تمام ہندو اخبارات نے اس پر اس قدر ہیجان واضطراب کا اظہار کیا کہ لاہور کے اخبار ''انقلاب'' نے بھی اس کا نوٹس لیا۔ اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''بنگال میں کانگرسیوں کی شرارتیں بہت زیادہ بڑھ رہی ہیں وہ بعض ڈھل مل یقین مسلمانوں کو ساتھ ملا کر بنگال اسمبلی میں ایک مضبوط پارٹی بنانے اور مسلمان وزیر اعلیٰ کو شکست دینے کے منصوبے باندھ رہے ہیں...... مسلمانان بنگال کے لئے یہ ایک بہت بڑی ابتلا وآزمائش کا وقت ہے۔ انہیں چاہیے کہ تمام ذاتی رقابتوں اور جماعتی اختلافات سے الگ ہو کر وزارت کی تائید پر متفق ومتحد ہو جائیں اور ہندوؤں کی سازشوں کے چکر میں پھنس کر اپنے آپ پر گوناگوں مصیبتوں کا دروازہ نہ کھولیں۔''[15]

29 رجولائی کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو اس سے اگلے دن وزیر اعلیٰ کے مکان پر 125 ارکان اسمبلی جمع ہوئے۔ بنگال کونسل (ایوان بالا) کے رکن مولانا اکرم خان نے بنگال کی سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''مسلمان ممبران کو اس وقت اپنے باہمی

اختلافات ترک کر کے وزارت کی اعانت کرنی چاہیے۔ مسلمان ممبران کو ترغیبات دی جارہی ہیں۔ انہیں اپنے عمل سے ظاہر کر دینا چاہیے کہ وہ ان ترغیبوں کا شکار نہیں ہو سکتے بلکہ انہوں نے اپنے رائے دہندوں سے جو وعدے کئے تھے انہیں پورا کریں گے۔"[16] یکم اگست کو البرٹ ہال میں صوبائی کانگرس کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں جس میں مولوی فضل الحق کو بھی کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس کے ساتھ مناظرہ کی غرض سے شریک ہونا تھا۔ مگر وہ اس جلسہ میں نہ پہنچا بلکہ اس کی جگہ بعض مسلمان طلبا نے وہاں پہنچ کر تقریریں کرنے کی کوشش کی مگر جلسہ کے منتظمین نے انہیں اجازت نہ دی۔ اس پر 2راگست کو بنگال کے مسلم طلبا کی انجمن کے صدر عبدالواثق، سیکرٹری نورالہدیٰ اور آل بنگال مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری شمس الرحمان نے سرت چندر بوس کے نام ایک مشترکہ خط میں "کانگرسیوں کے اس شرمناک رویے" پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ "جب بنگال کے مسلمان طلبا نے ہم آہنگ ہو کر مطالبہ کیا تھا کہ یونیورسٹی کی سند پر سے شری کا لفظ ہٹا دیا جائے اور کنول کے پھول کی تصویر حذف کر دی جائے تو ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور انڈین نیشنل کانگرس نے (پھوٹے منہ سے بھی) ہم سے ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ جب ہم نے مطالبہ کیا کہ بت پرستی کا سبق دینے والا بندے ماترم کا گیت ترک کر دیا جائے اور اس کے بجائے بنگال کے لئے کوئی اور ترانہ اختیار کیا جائے تو کانگرسیوں نے ان اسمبلیوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے اس گیت کو گانا شروع کر دیا۔ اگر انڈین نیشنل کانگرس کی یہی وطن پرستی ہے تو ہم اسے بلا حیل وحجت بے ہودہ اور ناپسندیدہ قرار دے کر مسترد کر سکتے ہیں۔"[17] مسلم طلبا کے اس خط سے ظاہر تھا کہ اگست 1937ء کے اوائل میں بنگالی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ حلقوں نے فضل الحق کی وزارت کے تحفظ کو اپنا مذہبی فریضہ بنا لیا تھا جبکہ تعلیم یافتہ ہندو عناصر اس "مسلم راج" کا تختہ الٹنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے اور کلکتہ یونیورسٹی اس فرقہ وارانہ سیاسی کشمکش کا مرکز بن رہی تھی۔

مسلم طلبا کے اس خط سے کچھ عرصہ قبل مولانا اکرم خان نے رنگ پور میں مسلم طلبا کی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کلکتہ یونیورسٹی کے ہندو ارباب اقتدار کی تنگ نظر فرقہ پرستی کا ہولناک نقشہ کھینچا تھا اور اس "پختہ عقیدے" کا اظہار کیا تھا کہ "کلکتہ یونیورسٹی نے بنگالی زبان اور تاریخ کی جو کتابیں بطور نصاب مقرر کر رکھی ہیں وہی نوجوان مسلم طلبا میں یاس و پژمردگی کا خیال

پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔'' مولانا نے اپنی اس صدارتی تقریر میں مسلم طلبا کے ساتھ کلکتہ یونیورسٹی کی بے انصافیوں کو ان چار حصوں میں تقسیم کیا تھا:

1۔ یونیورسٹی ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنا پسند نہیں کرتی جن سے مسلم طلبا میں بلند نظری اور ہمت پیدا ہو۔ مذہب، کلچر یا آبا واجداد کے کارنامے قوموں میں جوش وہمت پیدا کرتے ہیں لیکن کلکتہ یونیورسٹی مسلم طلبا کے لئے اس قسم کا کوئی سامان بہم پہنچانے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم طلبا نہ محض اپنی انفرادی ملی ہستی کو کھو رہے ہیں بلکہ ان کے دل و دماغ بھی قریباً بنجر ہو جاتے ہیں۔

2۔ یونیورسٹی نے نصاب کی کتابوں سے اسلامی موضوعات کو خارج کرنے کے بعد نہ صرف ان کی جگہ بت پرستی کے مضامین اور غیر اسلامی موضوع داخل کر دیئے ہیں بلکہ ان میں مسلمانوں کے دور حکمرانی کی اچھائیوں پر ظلم وتشدد اور تعصب کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔

3۔ کالجوں میں مسلم ٹیچروں اور پرفیسروں کی بے حد قلت ہے۔ یونیورسٹی کے 181 پروفیسروں میں سے صرف 14 مسلمان ہیں اور ان میں 8 آدمی ایسے ہیں جو صرف عربی اور فارسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملحقہ سکولوں اور کالجوں کی حالت بھی یہی ہے۔ سر ولیم ہنٹر نے آج سے قریباً سو برس پیشتر لکھا تھا کہ ''بنگال کے سرکاری مدارس کی زبان ہندوؤں کی ہے۔ اساتذہ ہندو ہیں۔ اونچے درجے کے مسلمان اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بت پرستوں کی زبان میں بت پرستوں کے ذریعے علم حاصل کریں۔'' یہ صورت حال اب تک قائم ہے۔

4۔ مسلمانوں کی شکایات اس وقت تک دور نہیں ہو سکتیں جب تک یونیورسٹی کے نظم ونسق میں انہیں کافی حصہ نہ ملے۔ اب حالت یہ ہے کہ رجسٹرار یونیورسٹی کے دفتر میں 62 اسامیاں ہیں ان میں سے ایک پر بھی مسلمان فائز نہیں۔

لاہور کے روزنامہ انقلاب نے مولانا اکرم خان کی اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے بنگالی مسلمانوں کی زبوں حالی پر بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ''پنڈٹ جواہر لال نہرو بڑے شدومد کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ کسی چیز کو فرقہ وارانہ نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ

درست ہوگا لیکن وہ مہربانی فرما کر بتائیں کہ بنگال کے مسلمان کیا کریں؟ مسلمان بنگال میں 55 فیصد ہیں لیکن ہندوؤں کے اقتدار کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کی نمائندگی بالکل برائے نام رہ گئی ہے۔ بتایئے مسلمان پنڈت نہرو کی پیروی کیونکر کر سکتے ہیں؟ نیز کیا پنڈت جی کی اس روش سے بنگال کے مسلمانوں پر یہ اثر نہیں پڑے گا کہ ان کی (پنڈت جی کی) نوزائیدہ غیر فرقہ واری کا مدعا محض یہ ہے کہ بنگال کے ہندوؤں کو جو ہمہ گیر اقتدار حاصل ہو چکا ہے اس میں کوئی فرق نہ آئے اور مسلمان اپنے جائز حصے کے لئے کوئی مطالبہ پیش نہ کر سکیں۔"[18]

صوبائی اسمبلی کے اس سیشن کے دوران کانگرس اسمبلی پارٹی نے بجٹ کی جانب تو کوئی خاص توجہ نہ کی البتہ اس نے اسمبلی کے اندر اور باہر جزائر انڈیمان میں سیاسی قیدیوں کی بھوک ہڑتال کے خلاف زبردست احتجاجی ایجی ٹیشن کی۔ اس نے اس سلسلے میں ایوان کے اندر پہلے 4راگست کو ایک تحریک التوا پیش کی جو گرما گرم بحث کے بعد 75 کے مقابلے میں 150 ووٹوں کی اکثریت سے نامنظور ہو گئی۔ اس تحریک کے خلاف 150 ووٹ پڑنے کی وجہ یہ تھی کہ یورپین گروپ اور حکومت سے منسلک ہندو اور اچھوت ارکان نے رائے شماری میں حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ پھر 9راگست کو کانگرس پارٹی نے اسمبلی میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے متعدد قراردادیں پیش کیں جو تحریک التوا کی طرح کثرت رائے سے مسترد کر دی گئیں۔ صوبہ کے ایوان بالا (کونسل) میں بھی کانگرس نے اس قسم کے اقدامات کئے مگر وہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اس مسئلے پر کئی دن کی بحث کے دوران وزیر داخلہ سر ناظم الدین کا موقف یہ تھا کہ "جب تک قیدی بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے حکومت ان کے مطالبات پر ہرگز غور نہیں کرے گی اور نہ انہیں بنگال میں واپس لانے کی تجویز پر غور کیا جائے گا۔ کیونکہ اگر ایسے مطالبات کے سامنے حکومت جھکنے لگی تو نظم ونسق کا کام نہیں چل سکے گا...... حکومت نے انڈیمان سے ان بنگالی قیدیوں اور نظر بندوں کو واپس لانے کا فیصلہ کیا ہے جو ریگولیشن (3) مجریہ 1818ء کے تحت قید اور نظر بند کئے گئے ہیں۔ ان قیدیوں اور نظر بندوں کو واپس لانے کے بعد اگر گورنمنٹ نے پبلک کی طرف سے تعاون اور خیر سگالی کی فضا دیکھی اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب مزید کسی خطرے کا امکان نہیں، اس وقت گورنمنٹ بنگال کے باقی ماندہ قیدیوں کو انڈیمان سے واپس لانے کے مسئلہ پر غور کرے گی...... اگر گورنمنٹ کو دہشت انگیز اور تشدد آمیز اقدامات کے کم ہونے کا یقین ہو گیا تو

سیاسی قیدیوں کی رہائی کا عمل بسرعت تمام انجام پا سکتا ہے۔ بعض خاص نظر بندوں کے علاوہ ایسے تمام نظر بندوں کو غیر مشروط اور مشروط طور پر رہا کر دیا جائے گا جو تین ماہ سے زیادہ عرصہ تک نظر بند رہ چکے ہیں۔" دریں اثنا سڑکوں پر ہندو طلبا متعدد احتجاجی مظاہرے کرتے رہے اور 9 اور 14 راگست کو ٹاؤن ہال میں کانگرسیوں کے احتجاجی جلسے بھی ہوئے جن میں سٹار آف انڈیا کی اطلاع کے مطابق "حاضرین کو تشدد پر اکسایا گیا۔ سرت چندر بوس اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے جو تقریریں کیں ان میں کہا گیا کہ "ظلم کی حد ہو چکی ہے اور ملک میں خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں۔ آؤ سامراج کے علمبرداروں کو تباہ کر دو اور رجعت پسندوں کو جلا کر موت کے گھاٹ اتار دو......ایک دن آنے والا ہے جب سارے ہندوستان میں خون کا سیلاب آجائے گا۔ اس قسم کے کتے (وزرا) قومی زندگی کو خراب کر رہے ہیں۔ یہ وحشی ہیں یہ اس قابل ہیں کہ کان سے پکڑ کر نکال دیئے جائیں۔ انڈیمان کے قیدی ہرگز یہ وعدہ کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ وہ دہشت انگیزی کو جائز نہیں سمجھتے۔ طالب علموں کو یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ ہم ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے پھانسی پر چڑھ جائیں گے......ایسی شورش برپا کرو کہ حکومت کا کام بالکل رک جائے۔ سارے ہندوستان میں انقلابی شورش برپا کرو۔ مزدوروں اور کارکنوں سے کہہ دو کہ بازاروں کے لیمپ نہ جلائیں اور پانی کے نلکے بند کر دیں......حق کی وزارت عوام کا خون چوس رہی ہے ہم اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس وزارت کو تباہ نہ کر لیں گے۔"[19]

فضل الحق نے کانگرس کے ان روز افزوں مظاہروں اور جلسوں کا جواب 15 راگست کو کارپوریشن کے ٹاون ہال میں ایک جلسہ عام کی صورت میں دیا۔ اس جلسہ میں کلکتہ اور گردونواح کے تقریباً 60 ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور اس کی صدارت پرنس افسر الملک اکرم حسین شاہ (خلف واجد علی شاہ بادشاہ اودھ مرحوم) نے کی۔ جلسہ میں وزیر اعلیٰ فضل الحق کی خدمت میں ایک سیاسی تہنیت نامہ پیش کیا گیا جس میں پہلے تو بنگال کے وسیع المشرب ہندو لیڈر سی۔ آر۔ داس آنجہانی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور پھر اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ کانگرس نے 6 ہندو اکثریتی صوبوں میں دیش بندھو داس کی پالیسی کے برعکس بالکل دوسری پالیسی اختیار کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار کیا گیا کہ "ہندوستان جیسے ایک مختلف الملل براعظم اور مختلف المذاہب بشریاتی میوزیم میں صرف مخلوط وزارت کا اصول جو پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبوں میں رائج کیا

گیا ہے، سب سے زیادہ مناسب، موزوں اور عادلانہ اصول سیاسی حکومت کا ہوسکتا ہے۔ مگر کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے سے صاف انکار کردیا ہے اور اس طرح اس نے ہمارے برادران دین کو ہندوستان کے ایک نئے سیاسی شدر جاتی اور اچھوت قوم کی پوزیشن میں گرادیا ہے اور ان کو اپنی انفرادیت کلیتاً اکثریتی پارٹی میں ضم، مدغم اور فنا کردینے کا حکم صادر کیا ہے...... کانگرس اپنے سوا تمام دوسری جماعتوں کو یکسر مٹادینا چاہتی ہے اور ان کے مقابلے میں خود معصوم عن الخطا ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔ مطلق اطاعت وانضمام کا مطالبہ کر رہی ہے اور ہر قوم اور ہر پارٹی کو خواہی نخواہی کانگرسی صف میں کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ ایک قائلِ کلمۂ اسلام دنیا میں آخری شخص ہوگا جو اس نئی سیاسی بت پرستی کو تسلیم کرے گا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر اس کانگرسی فسطائی ڈکٹیٹرشپ کو روکنے کی تدابیر نہیں کی گئیں تو آزادی کی چمکتی ہوئی تلوار، طبقاتی ظلم، جاتک استبداد اور پارٹی ڈکٹیٹرشپ کی سیاہ ترین شمشیر برہنہ بن جائے گی اور زاریت اور قیصریت کی شخصی استبدادیت اور نازیت اور بالشویزم کی قہرمانیت اس مختلف المذاہب ملک کی فسطائیت کے سامنے گرد ہو جائے گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بنگال اور پنجاب کی مخلوط وزارت اس کانگرسی فسطائیت کے فتنۂ تازہ کے خلاف حصار آہنی اور فصیل فولادی ثابت ہوگی کیونکہ یہ کانگرسی ڈکٹیٹرشپ ہندوستان کو ایک خانہ جنگی کے جہنم زار کی طرف ہانک رہی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ ایک آزاد متحد ہندوستان کی تعمیر کی تمام امیدوں کا خاتمہ کردے گی...... کلکتہ کارپوریشن بنگال کے ناصیہ جمال پر ایک بدنما داغ بن چکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی اصلاح کا کام پوری متانت اور توجہ سے شروع کردیا جائے لیکن اگر ماضی کا تجربہ مستقبل کے لئے رہنما ہوسکتا ہے تو ہمیں یہ یقین ہے کہ جب تک خود کارپوریشن کے قانون اساسی میں بنیادی ترمیم نہیں کی جائے گی اور دوسرا قانون پاس نہیں ہوگا کوئی اصلاح حال کی امید نہیں ہے۔ نیز ہمارا خیال ہے کہ قانون جدید میں جداگانہ انتخاب، مسلم اقلیت کے نیابتی پاسنگ، عہدوں اور ملازمتوں کی منصفانہ تقسیم، اسٹینڈنگ کمیٹیوں، تعلیم، ٹیکس اندوزی، تعمیرات، مالیات کے صیغوں پر حکومت کی نگرانی اور ایک میونسپل سروس کمیشن کے قیام کی تدابیر کا انتظام ہونا ضروری ہے تاکہ کارپورشن کی خرابیوں، فسادوں اور بے انصافیوں کا علاج ہو اور خارجی سیاسی اثرات کا، جن کا اس وقت دور دورہ ہے، خاتمہ ہو۔ کلکتہ یونیورسٹی جسم بنگال کا دوسرا ناسور ہے۔ یہ دارالعلوم محض ایک قوم کے چند طبقوں کی کلچرل حاکمیت

اور تمدنی غلبہ کا قلعہ بن گیا ہے۔ اس کی عمومی پالیسی بنگال کی عظیم اکثریت کے تعلیمی اور تمدنی مفاد کے صریحاً خلاف ہے۔ بندے ماترم کا بت پرستانہ اور مشرکانہ گانا اور کنول وشری کے نشانات کو مسلم قوم کسی طرح ایک عام اور قومی یونیورسٹی کے نشانات کے طور پر قبول نہیں کر سکتی ہے جہاں تک جلد ہو کلکتہ یونیورسٹی کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے بہتر ہے۔"[20]

یہ تہنیت نامہ کسی تشریح وتعبیر کا محتاج نہیں تھا۔ اس کا مطلب روز روشن کی طرح عیاں تھا اور وہ یہ تھا کہ کانگرس نے جولائی 1937ء میں چھ ہندو اکثریتی صوبوں میں برسر اقتدار آنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کی جانب سے پیش کردہ اشتراک وتعاون کی تجویز کو بہ حقارت مسترد کر کے چند مسلمان افراد یا افراد کے کسی چھوٹے سے گروہ کو ساتھ ملا کر من مانی کرنے کی جو فرقہ پرستانہ پالیسی اختیار کی تھی اس سے برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال کے مسلمانوں میں بھی یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ اگر انگریز کانگرس کو عنان اقتدار دے کر برصغیر سے روانہ ہو گئے تو مسلمانوں کو ان کے جائز سیاسی، معاشی حقوق کبھی نہیں ملیں گے اور ان کی اپنی مخصوص معاشرت وثقافت فنا ہو جائے گی۔ کانگرس مسلم لیگ کو تو برصغیر کے کسی علاقہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کرتی تھی لیکن چند مسلمان ارکان اسمبلی کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا کر ان پر مسلمانوں کی نمائندگی کا لیبل لگا دیتی تھی۔ اس نے اپنی اسی کوتاہ اندیشی کے تحت یو۔ پی میں رفیع احمد قدوائی کو جو خلیق الزماں سے ساز باز کر کے، ایک ضمنی انتخاب میں اسمبلی کا بلا مقابلہ رکن منتخب ہوا تھا، وزارت کا منصب سونپ دیا تھا اور ساتھ ہی حافظ محمد ابراہیم کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوا تھا، یہ لالچ دیا تھا کہ اگر وہ لیگ سے مستعفی ہو کر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر دے تو اسے وزارت عطا کر دی جائے گی چنانچہ حافظ ابراہیم اس لالچ کا شکار ہو گیا تھا۔ یہی حربہ کانگرس نے مدراس، بمبئی، سی۔ پی اور بہار میں استعمال کیا تھا۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن اور بہار میں ڈاکٹر سید محمود کو وزیر بنا دیا گیا تھا۔ بمبئی اور سی۔ پی میں کوئی مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ یہاں بھی وہی حافظ ابراہیم والا کھیل کھیلا گیا اور یاسین نوری اور محمد یوسف شریف کو لیگ سے توڑ کر کانگرس میں شامل کیا گیا اور انہیں علی الترتیب بمبئی اور سی۔ پی کا وزیر بنا دیا گیا تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ (Coupland) کے بقول "مسلم اکثریتی صوبوں میں کانگرس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہاں غیر کانگرسی وزارتوں کے مخالفوں کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ

افزائی کی جائے اور حامیان وزارت میں پھوٹ ڈالی جائے۔ مسلم لیگ کا زیادہ زور اقلیت کے صوبوں میں تھا۔ کانگرس محسوس کر رہی تھی کہ اگر اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو کچل دیا گیا تو باقی صوبوں میں اس کا زور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چونکہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے اس لئے لیگ کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا بے والی و وارث ہو جانا یقینی تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت (ہندو مہاسبھا کے تعاون سے) قائم ہو ہی چکی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں اگرچہ کانگرس کا برسر اقتدار ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن اگر ان صوبوں کے مسلمانوں کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی تو پھر کانگرس ان میں ہر صوبے کے لیڈروں سے الگ الگ مفاہمت کر کے اور انہیں چند تحفظات عطا کر کے اپنی بالادستی قائم کر لے گی۔،،[21]

چونکہ وزیر اعلیٰ فضل الحق گزشتہ چار پانچ ماہ میں کانگرس کے اس رویے کے تلخ تجربے کی بنا پر اب تہنیت نامے کے مندرجات اور پروفیسر کوپ لینڈ کی اس رائے سے متفق ہو چکا تھا اس لئے اس نے اس جلسہ عام میں اپنی جوابی تقریر میں کانگرس کی مسلم دشمن پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے الزام لگایا کہ صوبہ بہار میں کانگرسی وزارت مسلمانوں کے حقوق کو بری طرح پامال کر رہی ہے۔ اس نے کہا کہ بنگال کے کانگرسی کسی صورت میں دیکھ نہیں سکتے کہ بنگال میں غیر کانگرسی حکومت ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے اقدامات کو مذموم قرار دیا جا رہا ہے اور وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن کی جا رہی ہے کہ موجودہ حکومت قوم کے مفاد کے منافی ہے۔ یہ تمام اقدامات اس لئے اختیار کئے جا رہے ہیں کہ موجودہ حکومت کانگرس کے پروگرام اور اصول پر عمل نہیں کرتی۔ جس وقت سے پرجا سمتی اور مسلم لیگ پر مشتمل اتحادی پارٹی نے بنگال میں وزارت قائم کی ہے کانگرس حکومت کے راستے میں مزاحمتیں عائد کرنے کے لئے ادھار کھائے ہوئے ہے۔ کانگرسی صوبوں کی مسلم اقلیت کانگرسی وزرا کے راستے میں کسی قسم کا روڑا نہیں اٹکاتی مگر بنگال کی کانگرس اقلیت تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے معاملہ کو اتنی اہمیت دے رہی ہے۔ ہم نے اپنی پالیسی کا واضح طور پر اعلان کر دیا ہے۔ ہم ہر حالت میں اس پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے۔ کسی قسم کی دھمکی یا غیر ہمدردانہ اقدام ہمیں ہمارے فرض منصبی سے منحرف نہیں کر سکتا۔،،[22]

فضل الحق کی اس تقریر میں یہ حقیقت بالکل واضح تھی کہ وہ اپنی وزارت کو برقرار رکھنے کے لئے

کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ وہ اس مقصد کے لئے صرف مسلمانوں کی تائید وحمایت پر انحصار کرتا تھا کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ حلقے اس کی وزارت کے خلاف اور حق میں پوری طرح صف بندی کر چکے تھے اور اس بنا پر صوبہ میں ہندو۔ مسلم تضاد میں بہت شدت پیدا ہوگئی تھی۔ فضل الحق کو اس قسم کی تقریر کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی تھی کہ کانگرس پارٹی نے پرجا پارٹی کے غیر مطمئن مسلم ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملانے کی جو کوششیں شروع کر رکھی تھیں وہ بارآور ہوتی نظر آرہی تھیں کیونکہ ان مسلم ارکان اسمبلی میں سے بعض نے ایوان کے اندر اور باہر کھلم کھلا وزارت پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔

پرجا پارٹی کے شمس الدین احمد گروپ کی مولوی فضل الحق کے خلاف کانگرس کے ساتھ سازباز

ٹاؤن ہال کے اس جلسہ کے اگلے دن جب انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ نے بنگال کی صورت حال پر غور کرنے کے بعد صوبائی کانگرس کو ہدایت کی کہ وہ صوبائی اسمبلی میں دوسری پارٹیوں سے مل کر کام کر سکتی ہے تو پرجا پارٹی کے ناراض ارکان کی یہ نکتہ چینی اس حد تک بڑھ گئی کہ 19 راگست کو پارٹی کے 20 ارکان نے ایک مشترکہ بیان میں فضل الحق پر الزام عائد کیا کہ وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو کرشک پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد کے موقع پر طے پائی تھیں۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں پرجا پارٹی کے سیکرٹری شمس الدین احمد کا نام بھی شامل تھا۔ بیان کے آخر میں کہا گیا تھا کہ ''ہم کابینہ کے استحکام کے لئے انتخابی منشور کو قربان کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ منشور پر قائم رہا جائے گا۔ ہم عوام کے مفاد کے لئے کام کریں گے اور اس پارٹی کی حمایت کریں گے جو اس قسم کے اقدام عمل میں لائے گی جن سے کسانوں اور عوام کی حالت بہتر ہو۔''[23] جب یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا تو سب کو یقین ہو گیا کہ کانگرس پارٹی اور پرجا پارٹی کے شمس الدین گروپ میں ایسا گٹھ جوڑ ہو رہا ہے جس سے فضل الحق وزارت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ چنانچہ اسی دن پرجا پارٹی کے 33 مسلم ارکان نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''شمس الدین گروپ نے پرجا پارٹی کے قائداعظم فضل الحق کے خلاف جو الزامات عائد کئے ہیں وہ بے ہودہ اور لغو ہیں۔ شمس الدین اور اس کے

ساتھیوں کی یہ بغاوت کانگرس کے اثر کے ماتحت عمل میں آئی ہے۔ یہ لوگ اسلام کے مفاد سے خیانت کر رہے ہیں اور ان کا یہ رویہ کانگرس کی غلامی کے مترادف ہے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ مسلمان ووٹروں کو نظر بندوں اور انڈیمان کے قیدیوں کا ہرگز کوئی خیال نہیں۔ پرجا پارٹی فضل الحق وزارت کی پوری حمایت کرتی ہے اور کانگرس کے خیمہ برداروں کے خیالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موجودہ وزارت کی پالیسی کی تکمیل کے لئے کوشاں رہے گی۔"[24]

فضل الحق کی 15/اگست کی تقریر کے پیش نظر انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ نے 16/اگست کو قرارداد منظور کی تو اس کے بعد ایک طرف تو پورے برصغیر میں کانگرسیوں نے بنگال کے وزیراعلیٰ کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈے کا محاذ کھول دیا اور دوسری طرف مسلم لیگ اور بعض دوسری جماعتوں کے مسلمان لیڈروں اور اخبارات نے حق وزارت کی زوردار حمایت شروع کر دی۔ صوبہ بہار کے ہندو کانگرسی وزیراعلیٰ اور اس کے ایک مسلمان وزیر ڈاکٹر سید محمود نے بہاری مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کے بارے میں فضل الحق کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ بہار میں مسلمانوں سے کوئی بے انصافی نہیں ہوئی ہے۔ فضل الحق نے ان کے بیانات کے جواب میں 23/اگست کو ایک بیان جاری کیا جس میں بہار کے ضلع گیا اور بھاگل پور کے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کی مثالیں پیش کیں اور بتایا کہ مسلم لیگ ان اضلاع کے مسلمانوں پر زیادتیوں کے خلاف قرارداد منظور کر چکی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سید محمود کے اس بیان پر کہ "میں نے بہار کے مسلمانوں پر کسی قسم کا ظلم ہوتے نہیں دیکھا" تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "میرے لئے ڈاکٹر محمود کا بیان موجب حیرت نہیں کیونکہ جس شخص کی روٹی کانگرس کے رحم و کرم پر ہو اسے کانگرس کے قصور دیکھنے میں قدرتی طور پر اندھا ہو جانا چاہیے۔" فضل الحق کے ان سخت الفاظ کی ایک وجہ یہ تھی کہ بہار کی صوبائی اسمبلی میں مسلمان ارکان کی تعداد 40 تھی جن میں سے 36 ارکان ڈاکٹر سید محمود کو اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بہاری مسلمانوں کے حقوق کی علمبرداری کر کے برصغیر کے مسلمانوں میں اپنی مقبولیت کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ بنگالی کانگرسیوں کی جانب سے اس کی پرجا پارٹی میں پھوٹ ڈلوانے کی مسلسل کوششوں نے اسے بہت سیخ پا کر رکھا تھا۔

بہار کے مسلمانوں کا فضل الحق کے اس جرأت مندانہ بیان پر فوری ردعمل اس صورت میں ظاہر ہوا کہ 25/اگست کو وہاں کی صوبائی مسلم لیگ نے ایک قرارداد کے ذریعے وزیراعلیٰ بنگال کا اس بنا پر شکریہ ادا کیا کہ ''اس نے بہار میں مسلم اقلیت کی مظلومیت کو دنیا پر آشکار کر دیا ہے۔'' اس قرارداد میں بنگال اسمبلی کے کانگرسی ممبروں کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی مذمت کرتے ہوئے حق وزارت کی پرزور حمایت کی گئی۔ تاہم بنگالی کانگرسیوں کی ایجی ٹیشن جاری رہی۔

جب 31/اگست کو تقریباً ایک ہزار ہندو۔ طلبا نے وزیراعلیٰ کے مکان کے سامنے بہت معاندانہ مظاہرہ کیا تو اس سے اگلے دن یکم ستمبر کو کلکتہ کی خلافت کمیٹی نے مسلمانان بنگال سے اپیل کی کہ وہ 12/ستمبر کو یوم وزارت منا کر حق وزارت کی پرزور تائید وحمایت کا اظہار کریں۔ اسی دن فضل الحق نے پرجا اسمبلی پارٹی کے اجلاس کے بعد اعلان کیا کہ شمس الدین گروپ کو پرجا پارٹی سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ پارٹی کو اس قسم کے غدار عناصر سے پاک کر دیا جائے۔ یہ لوگ حزب مخالف کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہیں اور ان کی مخالفت کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے شمس الدین کو اپنی کابینہ میں شامل نہیں کیا ہے۔''

قانون مزارعت ترمیمی بل پر کانگرس کی طرف سے مخالفت

6/ستمبر 1937ء کو صوبائی اسمبلی نے کانگرس کی سرتوڑ مخالفت کے باوجود سالانہ بجٹ کی منظوری دے دی تو اس کے چند دن بعد وزیراعلیٰ فضل الحق نے اسمبلی میں قانون مزارعت میں ترمیم کے لئے ایک بل پیش کر کے صوبہ کے کانگرسیوں اور دوسرے ہندوؤں کے خلاف ایک اور سیاسی محاذ کھول دیا۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ کوئی زمیندار انتقال کی فیس وصول نہیں کر سکے گا اور اسے شفع کا حق بھی نہیں ہوگا۔ زمیندار کو لگان میں اضافہ کرنے کا جو حق حاصل ہے وہ دس سال تک معطل رہے گا۔ مزارع کو ہر وقت اپنی مزارعت ترک کرنے کا حق ہوگا۔ کوئی زمیندار سرٹیفکیٹ کے طریقہ کے ذریعہ لگان وصول نہیں کر سکے گا۔ ہر مزارع اپنی مزارعیت اسی طرح منتقل کر سکے گا جس طرح کہ موروثی مزارع کر سکتا ہے۔ زمیندار کے لگان کی شرح سود ساڑھے بارہ فیصد کی بجائے صرف سوا چھ فیصد ہوگی۔ اگر کوئی زمیندار یا اس کا گماشتہ ابواب وصول کرے گا تو اسے جرمانہ کی سزا دی جا سکے گی۔ لگان کی وصولی کی ڈگری کی تعمیل ساٹھ دن کی

معیاد گزرنے سے پہلے نہیں ہو سکے گی۔ حکومت لگان میں اضافہ سے متعلقہ مروجہ قانون مزارعت (Tenancy Act) کی کسی ایک دفعہ یا ساری دفعات کو معطل کر سکے گی۔ زمیندار پورے واجب الادا لگان کی وصولی کی بجائے اپنے بقایاجات کے محض ایک حصہ کی وصولی کے لئے دعویٰ دائر کر سکے گا اور موروثی مزراع اپنی رہن کردہ اراضی کا بعض شرائط کے تحت دوبارہ قبضہ حاصل کر سکے گا۔''

ظاہر ہے کہ فضل الحق کی اس مجوزہ ترمیم کا مقصد بنگال کے انتہائی ظالمانہ نظام اراضی میں کوئی بنیادی تبدیلی کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ غریب کسانون کو، جن کی بھاری اکثریت مسلمانوں اور اچھوتوں پر مشتمل تھی کچھ رعایتیں دے کر ان کی اشک شوئی کی جائے۔ تاہم ہندو زمینداروں کے لئے یہ ترمیم بھی قابل قبول نہیں تھی اور یورپین گروپ بھی اس کے خلاف تھا کیونکہ ان میں سے بھی بعض ارکان وسیع رقبہ اراضی کے مالک تھے۔ اگرچہ کانگرس نے اپنے انتخابی منشور میں زمینداریوں کے خاتمہ کا وعدہ کیا ہوا تھا لیکن پنجاب اور سندھ کی طرح بنگال کے مسلم اکثریتی صوبہ میں بھی اس مسئلہ کے بارے میں اس کا رویہ منافقانہ اور ریاکارانہ تھا۔ وہ یہ کہہ کر اس بل کی مخالفت کرتی تھی کہ یہ مسودۂ قانون ناکافی ہے۔

کانگرسیوں کے اس رویے سے بعض ایسے مسلمان بھی نالاں تھے جو غیر فرقہ وارانہ قوم پرستی پر ایمان رکھتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے سیاسی مسئلہ پر کانگرس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ ان ''قوم پرست'' مسلمانوں میں کلکتہ کا ایک پروفیسر عبدالرحیم بھی تھا۔ اس نے چند سال قبل گاندھی کی تقلید میں برت رکھا تھا اور اگست 1937ء میں انڈیمان کے بھوک ہڑتالیوں کی حمایت میں بھی فاقہ کیا تھا۔ تاہم غریب کسانوں کے بارے میں کانگرسیوں کی ذہنیت کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ ''مجھے شرم وندامت کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بنگال کے کسانوں کے مسئلہ میں سو درجہ کانگرس پارٹی کے ارکان کا رویہ ہمیشہ نہایت درجہ افسوسناک رہا ہے۔ حتیٰ کہ میرے محترم دوست سوبھاش چندر بوس جیسے بزرگ نے بھی جو مکمل آزادی کے بہت بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، تیس چالیس مرتبہ ایسے محضرناموں پر دستخط کئے ہیں جو کسانوں کے لئے زہر قاتل سے بھی کہیں زیادہ خطرناک حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے قانون کاشتکاران بنگال (بنگال ٹیننسی ایکٹ) کی مخالفت میں ایک بار نہیں متعدد بار کونسل میں ووٹ دیئے ہیں اور

مہاجنوں اور سرمایہ داروں کی کھلی حمایت کی ہے۔ بلاشبہ سوبھاش جی کا یہ فعل حقیقی وطن پرستوں اور سچے اشتراکیت پسندوں کے لئے حد درجہ الم اور افسردگی کا باعث ہے۔"[25] لیکن پروفیسر عبدالرحیم وغیرہ کے ان خیالات کا سوبھاش چندر بوس پر، جوان دنوں یورپ سے عارضی طور پر کلکتہ آیا ہوا تھا، اور دوسرے کانگرسیوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مختلف طریقوں سے اس بل کی مخالفت کرتے رہے۔ جب یکم اکتوبر کو اس بل پر رائے شماری ہوئی تو کانگریسوں نے اس میں حصہ نہ لیا اور بل کی منظوری 27 کے مقابلے میں 110 ووٹوں سے ہوئی۔ صوبائی گورنر نے اس بل کی توثیق دس ماہ بعد 18/اگست 1938ء کو کی۔

کلکتہ مونسپل کارپوریشن میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ملازمت کے بل پر کانگرس کی طرف سے مخالفت

قانون مزارعت (ترمیمی) بل کی منظوری کے بعد وزیراعلیٰ فضل الحق کلکتہ کارپوریشن کی طرف متوجہ ہوا تو تعلیم یافتہ ہندو مرنے مارنے پر تل گئے۔ فضل الحق کی جانب سے اس مسئلہ پر توجہ کرنے کی فوری وجہ یہ تھی کہ کارپوریشن نے 22/ستمبر کو یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ بلدیہ میں ہر درجہ کے ملازموں کی بھرتی کے موقع پر ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جو سیاسی نظر بند رہ چکے ہوں گے اور کارپوریشن کے اس فیصلہ کی بنا پر نورالامین، اصفہانی اور دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ سیاسی نظر بندوں کو دوسرے باصلاحیت امیدواروں پر ترجیح دینے سے بلدیہ کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب اور بھی کم ہو جائے گا۔ چونکہ وزیراعلیٰ کو اس خیال سے اتفاق تھا، اس لئے اس کی خواہش یہ تھی کہ کلکتہ کے مسلمانوں کے دیرینہ مطالبہ کے مطابق کارپوریشن ایکٹ میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ کارپوریشن کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی دی جائے۔ جنوری 1936ء میں جب ہندو اکثریت نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا تو کارپوریشن کے سارے مسلم ارکان مستعفی ہو گئے تھے اور انہوں نے جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے ایک احتجاجی تحریک شروع کر دی تھی۔ اس موقع پر بنگال پراونشل کانگرس کا موقف یہ تھا کہ "ملازمتوں کی فرقہ وارانہ یا مذہبی بنیاد پر تخصیص کا مطالبہ فرقہ وارانہ بے چینی اور کشیدگی میں اضافہ کرے گا" اور صدر کانگرس جواہر لال نہرو کا فیصلہ یہ تھا کہ

اس قسم کی ''فرقہ واریت برطانوی ملوکیت کی پیداوار ہے۔'' لیکن اب جب صوبائی اسمبلی میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو بنگال کانگرس کا مہانیتا سوبھاش چندر بوس آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے 2/اکتوبر 1937ء کو ڈلہوزی سے ایک بیان میں دھمکی دی کہ اگر فضل الحق نے اس قسم کا رجعت پسندانہ اقدام کیا تو اس کے نتائج ہولناک ہوں گے۔ اس نے کہا کہ ''کلکتہ کے شہریوں نے موجودہ دستور بغیر جنگ کے حاصل نہیں کیا ہے۔ فضل الحق کو لازم ہے کہ وہ اپنے خیالات کو آج سے دس بیس سال پیچھے لے جائے جب کارپوریشن کے ارکان نے اس زمانے کی حکومت کا دماغ درست کرنے کے لئے زبردست جنگ کی تھی۔ لیکن اگر فضل الحق نے اور اس کے رجعت پسندوں کی جماعت نے سریندر ناتھ آنجہانی کے ترکہ کو پاؤں تلے روندنے کی کوشش کی تو جنگ وجدل کا بازار اس طرح گرم ہوگا کہ گزشتہ زمانہ کی جنگ مقابلتہً ایک معمولی جھگڑے کی حیثیت کی ہوگی۔ فضل الحق کو ایسا کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے جسے برطانوی حکومت نے بھی کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ایجی ٹیشن اٹھاؤں گا جس کی نظیر اس نے اپنی عمر بھر میں بنگال میں نہیں دیکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس وقت بھی جب معاملات بہت آگے بڑھ گئے ہیں تو فضل الحق فہم وفراست کو راہ دے گا۔''[26] یہ سوبھاش چندر بوس اپنے آپ کو جواہر لال نہرو کی طرح سوشلسٹ اور فرقہ واریت سے بالاتر کہتا تھا لیکن جب کبھی بنگال کے غریب مسلمان کسانوں اور شہروں کے بے روزگار مسلم نوجوانوں کی فلاح وبہبود کا مسئلہ اٹھتا تھا تو وہ پروفیسر عبدالرحیم کے بقول بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بدترین ہندو فرقہ پرست کا کردار ادا کرتا تھا۔

باب: 4

مسلم لیگ کو سب سے پہلے بنگال میں عوامی مقبولیت ملی

1937ء کا مسلم لیگ کا لکھنو میں سالانہ اجلاس...... فضل الحق اور جناح کی صلح

سوبھاش چندر بوس کا 2 اکتوبر 1937ء کا اعلان جنگ بنگالی مسلمانوں کے لئے ناگزیر طور پر نہایت اشتعال انگیز تھا اس لئے قدرتی طور پر اس سے ہندو۔مسلم تنازعہ میں اور بھی شدت پیدا ہوئی اور مسلمان لیڈروں نے اپنی الگ فرقہ وارانہ تنظیموں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ 11 اکتوبر کو مولانا اکرم خان اور سید بدرالدجیٰ کی طرف سے بیان یہ شائع کیا گیا کہ 23 اور 24 اکتوبر کو مرشد آباد میں ایک آل بنگال مسلم کانفرنس ہوگی جس کی صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کریں گے اور اس میں مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلمان زعما شرکت کریں گے۔ اس بیان میں مزید کہا گیا تھا کہ یہ کانفرنس بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ مسلمانان بنگال کے لئے ایک جدید باب اور درخشاں مستقبل قائم کر دے گی۔ وقت کے اہم ترین سوالات جو نہ صرف مسلم بنگال کی قسمت سے وابستہ ہیں بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ مسلمانوں میں اگرچہ تاخیر سے سہی، نئی زندگی شروع ہوگئی ہے اور وقت ہے کہ ہم عظیم مسلم قوم کے سربر آوردہ لیڈروں کی سرکردگی میں منظم و متحد ہو جائیں۔ مسلم انڈیا کی ایک تہائی آبادی تنہا بنگال میں ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مسلمان بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں کہ بنگال کے مسلمان ہماری سیاسی تاریخ کے اس نازک موقع پر کس طرح اٹھتے اور ''خود امدادی'' کی اسلامی اخوت کے اصولوں پر اپنے آپ کو منظم کرتے ہیں۔ ہم بنگال کے تمام مسلمانوں سے اپیل کرتے

ہیں کہ جوق در جوق کانفرنس میں شریک ہوں اور اسے کامیاب بنائیں۔"[1] اس بیان پر وزیر اعلیٰ اے۔کے۔فضل الحق، وزیر محنت حسین شہید سہروردی، وزیر صنعت نواب حبیب اللہ بہادر آف ڈھاکہ، خواجہ شہاب الدین، جسیم الدین، ابوالہاشم اور فضل الرحمان کے علاوہ بہت سے دوسرے افراد اور ارکان اسمبلی کے دستخط تھے۔

یہ بیان کلکتہ کے اخبارات میں 11/اکتوبر 1937ء کو شائع ہوا تو اس سے اگلے دن وزیر اعلیٰ اے۔کے۔فضل الحق، وزیر محنت حسین شہید سہروردی اور بہت سے دوسرے بنگالی مسلمان لیڈر لکھنؤ روانہ ہو گئے جہاں 17/اکتوبر سے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق اس اجلاس سے دو دن پہلے جو لوگ مسلم لیگ کونسل کے رکن منتخب ہوئے ان میں مولوی فضل الحق اور سر ناظم الدین کے نام بھی شامل تھے۔ 17/اکتوبر کو اجلاس شروع ہوا تو سب سے پہلے یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ مسلم لیگ کا نصب العین مکمل آزادی ہوگا۔ یہ اعلان مولانا حسرت موہانی کی ایک قرارداد کی صورت میں کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے کہ "ہندوستان میں آزاد جمہوری حکومتوں کی شکل میں، جن میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کافی اور مؤثر طور پر محفوظ کر دیئے گئے ہوں، آزادی کامل قائم کرنا ہے۔" یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی اور اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ "آئندہ مسلم لیگ کی رکنیت کی فیس ایک روپیہ کی بجائے صرف دو آنے ہوگی۔ مرکزی کونسل کے ممبروں کی تعداد 465 ہوگی جن میں 100 ممبر بنگال سے ہوں گے۔"

ان قراردادوں پر بحث کے دوران جب حاضرین نے دیکھا کہ مولوی فضل الحق اور صدر مسلم لیگ محمد علی جناح میں صلح ہو گئی ہے تو انہوں نے زبردست خوشیاں منائیں۔ فضل الحق نے حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھا تو وہ بھی خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور اس نے اعلان کیا کہ "وہ اور اس کی پارٹی والے ہمیشہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے سایہ میں رہیں گے۔" اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ جواہر لال نہرو، سوبھاش چندر بوس، سرت چندر بوس، بدھان چندر رائے اور دوسرے کوتاہ اندیش اور کوتاہ نظر ہندو لیڈروں نے اس فضل الحق کو زبردستی مسلم لیگ کی صفوں میں دھکیل دیا تھا جسے جناح نے 1936ء میں اپنے پارلیمانی بورڈ سے برطرف کر دیا تھا اور جس نے 1937ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ ان کانگرسی لیڈروں کی

پالیسی تو یہ تھی کہ مسلمانوں میں ہر ممکن طریقے سے پھوٹ ڈلوائی جائے مگر اس پالیسی کا الٹا اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی کو فروغ حاصل ہوا اور ڈاکٹر امبید کر کے بقول بالآخر ان میں پاکستان کے تصور نے جنم لیا۔

مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ کے زیر سایہ رہنے کے اپنے اس اعلان کے بعد بڑی زوردار تقریر کی۔ اس نے کہا کہ "جب تک بنگال کے مسلمانوں میں اتحاد ہے بنگال کے اندر نہ تو کانگرسی وزارت ہو سکتی ہے اور نہ ہی مجالس مقننہ کے اندر "بندے ماترم" گایا جا سکتا ہے اور کانگرس نے جو غیر کانگرسی وزارتوں کے ساتھ رویہ رکھا ہے انہیں دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں صرف ایک مسلم پارٹی ہونی چاہیے اور وہ پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ پارٹی ہے۔ اس لئے ہمیں لیگ کو با اقتدار اور صاحب اثر بنانا چاہیے۔ آج بنگال اسمبلی میں 123 مسلم ارکان میں سے 112 ارکان میری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ اتحاد و اتفاق عدیم النظیر ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ کانگرس کے بار بار کوشش کرنے کے باوجود وہاں کانگرسی وزارت قائم نہیں ہوئی۔ اسمبلی میں کانگرس پارٹی 60 سے زیادہ ووٹ کبھی حاصل نہیں کر سکی۔" فضل الحق نے ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی مسلم کش پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ "اگر ان صوبوں میں مسلمانوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی گئی تو میں اس کا بدلہ اپنے صوبے میں لوں گا اور سر سکندر ان زیادتیوں کا انتقام پنجاب میں لے گا۔ میں سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا اور ثابت قدمی کے ساتھ 22 کروڑ ہندوؤں کا مقابلہ کروں گا۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے اور باوجودیکہ ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ہندوؤں کو بٹھا دوں گا اور دبا دوں گا۔ وہ صرف مسلمان ہیں جن کے سامنے ایک مستقبل ہے۔ کافر کے سامنے مستقبل نہیں ہے کیونکہ اس کو اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ کافر کے پاس آئندہ زندگی کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔"[2]

مرشد آباد میں جناح کی زیر صدارت آل بنگال مسلم کانفرنس کے بعد مسلم لیگ عوامی جماعت بن گئی

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کے بعد صدر مسلم لیگ محمد علی جناح 22/ اکتوبر کو براستہ کلکتہ مرشد آباد پہنچے جہاں آل بنگال مسلم کانفرنس کی صورت میں فضل الحق وزارت کی حمایت

میں بنگالی مسلمانوں کی حمایت کا بھرپور مظاہرہ ہوا۔ اس کانفرنس میں فضل الحق، حسین شہید سہروردی، سرناظم الدین، خواجہ شہاب الدین، مولانا اکرم خان اورایم۔اے۔ایچ اصفہانی کے علاوہ بہت سے دوسرے بنگالی مسلمان لیڈروں نے شرکت کی اوران سب نے اپنی تقریروں میں بنگال میں کانگرس کی تفرقہ انگیزی پر نکتہ چینی کی اور اعلان کیا کہ وہ مسلم لیگ کو اس صوبہ میں ایک عوامی جماعت کی حیثیت سے ہر سطح پر منظم کریں گے۔

آخر میں محمد علی جناح نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''کانگرس کی پالیسی اور مسلم لیگ کی پالیسی کے درمیان حقیقی اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم اس بات پر مصر ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی سمجھوتے کے بغیر کمیونل ایوارڈ نہیں بدلا جاسکتا۔ ہمارا اصرار ہے کہ ملک میں آئندہ خواہ جیسا دستور اساسی بھی ہو، اس میں مسلمانوں کے حقوق ومفاد مؤثر طور سے محفوظ کر دیئے جائیں۔ کانگرس ہمارے اس موقف کا بددیانتی سے جواب دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ سوال بھوک وافلاس کا اقتصادی سوال ہے جس میں ہندواور مسلمان یکساں طور سے مبتلا ہیں۔'' جناح نے کہا کہ ''ہمارا جواب الجواب یہ ہے کہ مجالس قانون ساز میں ہر قانون کثرت رائے سے منظور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں حتیٰ کہ بنگال میں بھی ان کی اکثریت کوئی ایسی مضبوط نہیں ہے اور یہ اکثریت متعدد حربوں سے گھٹا کر اقلیت بنادی جاسکتی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگرس دیانتداری سے آگے بڑھ کر اقلیت کے معاملہ کو صفائی کے ساتھ طے کیوں نہیں کرتی؟ دنیا کے دوسرے حصوں مثلاً کینیڈا، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور مصر میں یہ معاملہ طے کر دیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں کانگرس اس مسئلہ کے وجود سے ہی انکار کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''تم اکثریت پر اس کی خوش دلی، اس کے انصاف اور خوش معاملگی کے فہم پر اعتماد کرو، یہ سراسر دھوکا بازی ہے۔ کانگرس کے اس وعدے پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آج کل ہندو جہاں اکثریت میں ہیں وہاں وہ شری اور کنول کے علاوہ بندے ماترم کو قومی ترانے کی حیثیت سے مسلمانوں کے گلے منڈھ رہے ہیں۔ کیا یہی مساوات واخوت ہے؟ کیا اسی کے معنی ذمہ داری اور خوش دلی ہے۔''

جناح کی اس تقریر کے بعد کانفرنس نے کئی ایک قراردادیں منظور کیں۔ جن میں مطالبہ کیا گیا کہ کلکتہ میونسپل ایکٹ میں اس قسم کی ترمیم کر دی جائے جس سے مسلمانوں کے مفادات محفوظ ہو جائیں۔ کلکتہ یونیورسٹی ایکٹ میں اس طرح کی ترمیم کر دی جائے کہ سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے

علاوہ انتظامیہ اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو کافی نمائندگی مل سکے گی۔ نیز کلکتہ یونیورسٹی سے اصرار کیا جائے کہ وہ شری اور کنول کے نشان کو چھوڑ دے۔ ایک اور قرارداد میں بندے ماترم کے گیت کو قومی ترانہ بنائے جانے کی مذمت کی گئی اور حکومت بنگال سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بنکم چندر چیٹر جی کے دو ناولوں انند مٹھ اور راج سنگھ کو ضبط کرے کیونکہ ان سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔"[3]

بنگال کی سیاسی تاریخ میں مرشد آباد کی یہ مسلم کانفرنس ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بعد مسلم لیگ اس صوبہ میں آناً فاناً ایک عوامی جماعت بن گئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس جماعت کے بنگالی ممبروں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی جبکہ پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ گویا مسلم لیگ کی پچاس فیصد سیاسی قوت صرف بنگال میں مرکوز تھی۔ یہاں ہر گاؤں، ہر قصبے، ہر یونین، ہر تھانے ہر سب ڈویژن اور ہر ضلع میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم تھیں جبکہ پنجاب میں وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان کی دوغلی پالیسی کے باعث چند بڑے شہروں کے سوا کہیں بھی مسلم لیگ کی تنظیم نہیں تھی۔ لکھنؤ میں طے شدہ سکندر۔ جناح معاہدہ کے تحت مسلم لیگ کی غیر پنجابی مرکزی قیادت اس صوبہ کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ بنگال میں تو وزیر اعلیٰ فضل الحق کی اعانت سے ہر جگہ مسلم لیگ کا بول بالا تھا لیکن پنجاب میں وزیر اعلیٰ سکندر حیات خان کا اعلان یہ تھا کہ "پنجاب پنجاب ہے۔ کسی غیر پنجابی کو اس صوبہ کے معاملات میں مداخلت کرنے اجازت نہیں دی جا سکتی۔" بنگال اور پنجاب میں 1937ء کے بعد مسلم لیگ کی صورت حال کا یہ موازنہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ پنجاب کے مقابلے میں بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد بہت زیادہ معاندانہ تھا اور یہ کہ بنگالی مسلمانوں نے مرشد آباد کی کانفرنس کے بعد اپنے صوبہ میں مسلم لیگ کو عملی طور پر مسلمانوں کی عوامی جماعت بنا کر سب سے پہلے پاکستان کے قیام کی بنیاد رکھی تھی۔

مرشد آباد کانفرنس کے خلاف بنگالی ہندوؤں کا ردعمل......"بندے ماترم" کے حق میں پرزور ایجی ٹیشن

آل انڈیا مسلم لیگ کے نہایت کامیاب لکھنؤ سیشن کے بعد مرشد آباد کی یہ آل بنگال مسلم کانفرنس اس قدر کامیاب تھی کہ انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ نے اس امر کی یقین

دہانی ضروری سمجھی کہ بندے ماترم کے گیت سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا مقصود نہیں۔ اس سلسلے میں مجلس عاملہ نے کلکتہ میں 27راکتوبر کو ایک بیان جاری کیا جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ''اس گیت کے بعض حصوں پر مسلمانوں کا اعتراض درست ہے۔ بنابریں کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ یہ گیت جہاں بھی قومی ترانہ کی حیثیت سے گایا جائے اس کے شروع کے صرف دو بند گائے جائیں۔ دریں اثناء عاملہ نے ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، سوبھاش چندر بوس اور نریندر دیو پر مشتمل ایک سب کمیٹی مقرر کی ہے جو تحقیق و تدقیق کر کے قومی ترانوں کا ایک مجموعہ اکٹھا کرے گی تاکہ ان میں سے کسی موزوں ترانے کو اپنایا جائے۔'' لیکن بنگال کے بیشتر ہندو تعلیم یافتہ حلقوں نے اس مسئلہ پر کانگرس کی پسپائی کو بہت ناپسند کیا۔ یہ حلقے اس گیت کے مسئلہ کو ایک بہت بڑا قومی مسئلہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ اسی دن کلکتہ میں ہندو عورتوں نے ایک جلوس نکالا۔ انہوں نے کانگرسی جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور وہ بندے ماترم کا پورا گیت بڑے جوش و خروش سے گا رہی تھیں۔

28راکتوبر کو بنگال کے ایک ممتاز ہندو لیڈر اکھیل چندر دت نے سوبھاش چندر بوس کو ایک تار بھیجا جس میں اسے بتایا گیا تھا کہ ''بندے ماترم'' قومی ترانہ رہے گا۔ بنگال تیس سال سے اس سے جوش و ولولہ پاتا رہا ہے۔ انتہا سے زیادہ اشتداد کے باوجود شہنشاہیت پسند حکومت اس کو نہیں دبا سکی۔ ہم اس کے بارے میں کسی جماعت یا قوت سے نہیں دب سکتے۔''[4] 3رنومبر کو چرنجن گوہا ٹھا کر، جس نے 1906ء میں تقسیم بنگال کے خلاف تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا، نے ایک بیان میں اعلان کیا کہ ''بندے ماترم ہماری قومی ہستی میں روح ہے، اس کے بغیر قومی تحریک بے جان لاش ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بندے ماترم ہماری قومی تحریک کا ''سدھ منتر'' ہے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ کانگرس کے لیڈر کچھ بھی فیصلہ کریں، میں اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں کہ غیر شورش پسند جنگ میں اس کا زبردست روحانی اثر ہے۔''[5] کانگرس کا صدر جواہر لال نہرو 4رنومبر کو کلکتہ سے روانہ ہوا تو اس نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''میں کلکتہ سے جتنی یادیں اپنے دل میں لے جا رہا ہوں ان میں سب سے زیادہ حسین یاد چند لڑکیوں کا قومی ترانہ گانا ہے۔ جس دلکش طریقے سے انہوں نے بندے ماترم کا گیت گایا ہے میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔ کاش! دوسرے صوبوں میں بھی یہ گیت اسی طرح گایا جائے۔''

اس کے چند دن بعد 10 نومبر کو سوبھاش چندر بوس نے کلکتہ کارپوریشن کے ایلڈر مین کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھایا تو اس کا بندے ماترم کے نعروں سے استقبال کیا گیا اور پھر 14 نومبر کو کلکتہ کے ہندو ادیبوں، شاعروں اور سیاسی لیڈروں کے اجتماع میں سوبھاش چندر بوس نے حاضرین کو یقین دلایا کہ اگرچہ کانگرس نے قومی ترانوں کے بارے میں تحقیق وتدقیق کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی ہے، تاہم وہ بندے ماترم کی جگہ کسی اور گیت کو بطور قومی ترانہ اپنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ "بندے ماترم دوسرے صوبوں میں اس حد تک مشہور نہیں جس حد تک بنگال میں ہے۔ اس لئے ضروری ہے اس ترانے کو دوسرے صوبوں میں عام کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔" جلسہ کے آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ "دو ایک روز میں گاندھی جی (جو ان دنوں کلکتہ میں ہی تھا) کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جائے گا جو شرکائے جلسہ کے خیالات کو ان کے سامنے پیش کرے گا۔ یہ وفد راما نند چیٹر جی، رائے بہادر راما پرشاد چند، رائے بہادر ونیش چندر سین، ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹر جی، رائے بہادر پروفیسر کھگندر ناتھ مترا اور جیتندر موہن پر مشتمل ہوگا۔" اس فیصلہ کے بعد دو تین قراردادیں بھی منظور کی گئیں جن میں بندے ماترم کو دو ٹکڑے کر دینے کے فیصلہ پر بے اطمینانی ظاہر کی گئی اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ بندے ماترم ہندوستان کے قومی ترانوں میں اونچی جگہ رکھتا ہے۔ ایک اور قرارداد میں سفارش کی گئی کہ بنگالی نوجوان ملک کے مختلف حصوں میں بندے ماترم کو مقبول عام کرنے کے لئے بھیجے جائیں۔

17 نومبر کو بنگال پراونشل کانگرس کی مجلس عاملہ نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد پروفیسر راجکمار چکرورتی کی پیش کردہ یہ قرارداد منظور کی کہ "اس حقیقت کے پیش نظر کہ بندے ماترم کا ترانہ 30 سال سے زیادہ عرصے سے ہماری قومی تحریک کا ایک زندہ حصہ رہ چکا ہے اور بہادرانہ قربانی اور مصائب کے بہت سے واقعات ہماری قومی زندگی کے ارتقا میں اس کے ساتھ وابستہ ہیں، قرار دیا جاتا ہے کہ بنگال پراونشل کانگرس کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ مرکزی مجلس عاملہ سے استدعا کرتا ہے کہ بندے ماترم کو مجلس عاملہ کی ترمیم شدہ صورت میں ہندوستان کا قومی ترانہ قرار دیا جائے۔"[6]

بنگالی کانگرسیوں کی ان تقریروں، بیانات اور قراردادوں سے صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے محض ایک گیت کے مسئلہ کو ہندوستان کی زندگی وموت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ان کا یہ رویہ مسلمانوں

کے خلاف ان کی حقارت ونفرت کا مظہر تھا۔ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اس چھوٹے سے مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دے کر ہندو۔ مسلم مسئلہ میں ایسا زہر بھر رہے تھے جو برصغیر کے اتحاد و یک جہتی کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ بندے ماترم کا یہ گیت انیسویں صدی کے ایک متعصب ہندو مصنف بنکم چندرا کے ایک ناول ''انند مٹھ'' سے لیا گیا تھا۔ اس ناول کا ہیرو بنگال میں مسلم حکومت کا باغی ہے۔ وہ مسلمانوں، اسلام اور مسجدوں کے خلاف معاندانہ جذبات کا حامل ہے اور وہ ان جذبات کے اظہار کے لئے یہ گیت گاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب بنگال کے ہندوؤں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ نے بنگال کی تقسیم، جو بنگالی مسلمانوں کے لئے سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر فائدہ مند تھی، کے خلاف پر تشدد ایجی ٹیشن شروع کی تو دہشت پسندوں نے اس گیت کو ترانہ کے طور پر اپنا لیا۔ پھر جب 1923ء کے بعد گاندھی کی رام راجی ذہنیت نے کانگرس میں فروغ پایا تو یہ گیت کانگرس کے اجتماعات میں بھی گایا جانے لگا۔ چونکہ اس گیت کے پہلے دو بند سنسکرت میں ہیں اور باقی سنسکرت مخلوط بنگلہ میں ہیں اس لئے مسلمان بہت دیر تک اس کے معنی و مفہوم کو نہ سمجھ سکے لیکن اب جب 1937ء میں یہ گیت صوبائی اسمبلی میں قومی ترانہ کے طور پر گایا جانے لگا تو تعلیم یافتہ مسلمان بہت معترض ہوئے اور انہیں یہ تاثر ہوا کہ کانگرس غیر فرقہ وارانہ قوم پرستی کی آڑ میں واقعی قرون اولیٰ کا ہندو راج نافذ کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

بندے ماترم کا پورا متن

کلکتہ کے اخبار ''عصر جدید'' نے 14 راکتوبر کو پہلی مرتبہ اس گیت کا جو اردو ترجمہ شائع کیا تھا، وہ یہ تھا:

ماں! ہم تیرے آگے جھکتے ہیں
اچھے پانی والی، اچھے پھلوں والی، دکھن کی ٹھنڈی ہواؤں والی
ماں! ہرے بھرے کھیتوں والی

....

حسین چاندنی سے روشن رات والی
کھلے ہوئے پھولوں والی، گنجان درختوں والی

میٹھی ہنسی والی، میٹھی بھاشا والی

ماں! سکھ دینے والی، برکت دینے والی

....

سات کروڑ گلے کی پرزور اور زبردست آواز

دوسات کروڑ بازوؤں سے سنبھالی ہوئی تلواروں سے

(ہم تیری حفاظت کریں گے)

ماں! اتنی قوت کے موجود ہوتے ہوئے تم کمزور کیوں ہوگئی!

مضبوط بازوؤں والی، میں تمہیں نمسکار کرتا ہوں۔ اے نجات دہندہ!

دشمن کی فوج کو تباہ کرنے والی ماں!

....

تم ہی علم ہو، تم ہی دھرم ہو

تم ہی دل ہو، تم ہی دل کا راز ہو

تم ہی جسم کے اندر جان ہو

بازوؤں کے اندر تم ہی قوت ہو

دل کے اندر تم ہی عقیدت ہو

تمہاری ہی تصویر براجمان ہے

تمام مندروں میں

....

تم ہی درگا ہو۔ دس ہتھیاروں والی

(تم ہی) لکشمی دیوی ہو، پھولوں کے دل میں سیر کرنے والی

(تم ہی) سرسوتی دیوی ہو، علم تقسیم کرنے والی

تمہیں نمسکار کرتا ہوں

پھول جیسی حسین، بے عیب، بے مثل، میں تمہیں نمسکار کرتا ہوں

اچھے پانی والی، اچھے پھلوں والی میری ماں

ماں! میں تیرے آگے جھکتا ہوں

....

ہرے بھرے کھیتوں والی، نیک زیب وزینت والی ماں!
میں تیرے آگے جھکتا ہوں ماں!

ثانوی تعلیمی بورڈ کے قیام کے مسودۂ قانون کے خلاف کانگرسی اخباروں اور لیڈروں کی پرزور احتجاجی مہم

جن دنوں کلکتہ میں اس گیت کے بارے میں بنگالی ہندوؤں کی زوردار ایجی ٹیشن جاری تھی ان ہی دنوں وہاں ایک اور واقعہ بھی ہوا جس نے ہندو۔مسلم تنازعہ کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ مرشد آباد کی مسلم کانفرنس کے بعد وزیراعلیٰ فضل الحق نے بطور وزیر تعلیم 18 سال قبل کے سیڈلر (Sadler) کمیشن کی سفارشات کے مطابق ایک مسودۂ قانون تیار کروایا جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبہ میں ثانوی تعلیم کا ایک بورڈ قائم کیا جائے گا جس کے 34 ممبروں میں مسلمان ممبروں کی تعداد 15 ہوگی۔ اس نے یہ مسودۂ قانون اپنی کابینہ سے منظور کروانے سے پہلے برائے تبصرہ کلکتہ اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیوں اور آسام کی حکومت کو بھیج دیا۔ چونکہ کلکتہ یونیورسٹی کی انتظامیہ پر اوپر سے لے کر نیچے تک ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اس لئے یہ مسودہ فوراً ہی ہندوستان سٹینڈرڈ، امرت بازار پتریکا اور دوسرے ہندو اخبارت کے دفتروں میں پہنچ گیا اور وہاں فوراً ہی یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ اگر صوبہ میں اس قسم کا قانون نافذ ہوگیا تو آسمان گر پڑے گا۔ چنانچہ حق وزارت کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز پروپیگنڈے کی ایک اور مہم شروع ہوگئی۔

ہندوستان سٹینڈرڈ کے 26 نومبر کے اداریے کا عنوان یہ تھا کہ ''آج بنگال کہاں ہے'' اور اس میں لکھا تھا کہ ''کیا بنگال مردہ ہوگیا ہے۔ بنگال کے بیٹے کہاں ہیں؟ وہ بہادر مرد اور عورتیں کہاں ہیں جو اس صوبے کی شاندار تاریخ میں حکمرانوں یا ارباب نظم کو اکثر لرزہ براندام بنا دیا کرتے تھے۔ آج وہ کہاں ہیں۔ اگر بے رحمانہ جدوجہد کا، خواہ وہ کتنی ہی طویل اور کتنی ہی تلخ ہو، کوئی موقع ہوسکتا ہے تو وہ موقع یہ موقع ہے اور وہ وقت یہ وقت ہے...... اس مسودۂ قانون کا مقصد، جیسا کہ اس کی دفعات سے ظاہر ہوتا ہے، تعلیم کو ناقابل تقسیم طور پر ہمیشہ کے لئے ایسے

لوگوں کے حوالے کرنا نہیں جو ماہرین تعلیم ہیں، جو ماہرین تعلیم کے قابل قدر نمائندے ہیں، جوان لوگوں کے نمائندے ہیں جنہوں نے بنگال میں اپنی ذہانت، اپنی اعلیٰ قابلیت اور اپنے مال سے ثانوی سکولوں کو قائم کیا ہے بلکہ بھونکنے والے خبطیوں سے بدتر لوگوں کے، فرقہ پرور پاگلوں اور ان اضطراب زدہ حکام کے حوالے کرنا ہے جو تعلیمی آزادی کی راہ میں شدید خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس مسودۂ قانون کی واحد غرض وغایت فرقہ پرور ''دہشت انگیزوں'' کی جماعت قائم کرنا ہے...... ہم پھر پوچھتے ہیں کہ بنگال آج کہاں ہے؟ سر آشوتوش مکرجی کی آواز کہاں ہے؟ جو سینیٹ ہال میں بے انصافی، ظلم اور اختیارات کے بے جا استعمال کے خلاف گرجتی تھی۔ ہمارے بہادر مرد اور عورتیں کہاں ہیں؟ ان کی طاقت، ان کے وقار اور ان کی عزت کو جو چیلنج دیا گیا ہے کیا وہ اس سے خوفزدہ ہوکر بیٹھ جائیں گے۔''

ہندوستان سٹینڈرڈ کی طرح امرت بازار پتریکا کا بھی لب ولہجہ اسی طرح کا نہایت اشتعال انگیز اور فرقہ پرستانہ تھا۔ اس اخبار کا 25 نومبر کا اداریہ یہ تھا کہ ''گورنمنٹ صوبے کے سرکاری ثانوی سکولوں کی نشرواشاعت اور غیر سرکاری ثانوی اسکولوں کے استحقاق کو روکنا چاہتی ہے...... یہ بل بنگال کی ثانوی تعلیم کے سسٹم اور روایات کو، جو گزشتہ ایک سو سال سے قائم ہوگئی ہیں، اعلانیہ برباد کرنا چاہتا ہے...... 34 ممبروں کے بورڈ میں مسلمانوں کو اس قانون کی رو سے کم از کم 15 نمائندوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ جب وزیر تعلیم کے عہدہ پر ایک مسلمان قائم ہے تو ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ ان کے برادران مذہب زیادہ نشستیں حاصل کرلیں تاکہ مسلمان بنگال کے ثانوی تعلیم کے بورڈ میں غالب رہیں...... اس بل کے پیچھے واضح اور ظاہر پالیسی بہت سے شاندار تعلیمی اداروں کو جن کو ہندو ذہانت، ہندو قابلیت اور ہندو مال نے آگے بڑھایا ہے، برباد کرڈالنا ہے۔ اس کا صاف مقصد آئندہ نسل کے ہندو دل ودماغ کی ترقی کو روکنا ہے۔''

ان دونوں اخبارات کی انتظامیہ میں انگریزوں کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ ہندو سرمایہ داروں کی ملکیت تھے اور انہی کے مفادات کی ترجمانی کرتے تھے۔ گاندھی اور جواہر لال نہرو بظاہر سیکولر انڈین نیشنلزم کے علمبردار تھے لیکن بباطن نہایت تنگ نظر ہندو فرقہ پرست تھے۔ ان کا اعلانیہ موقف یہ تھا کہ ہندو۔ مسلم تنازعہ انگریزی سامراج کا پیدا کردہ ہے اور جب انگریز یہاں سے چلا جائے گا تو ہندو۔ مسلم فرقہ پرستی کا خود بخود خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن ان کا دراصل مطلب یہ

تھا کہ جب انگریز چلا جائے گا تو جمہوریت کی آڑ میں ہندو کا سیاسی غلبہ بھی قائم ہو جائے گا اور پھر مسلمانوں کو اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ کہتے تھے کہ مسلمان فرقہ پرور ہیں اور کسی چیز کو خالص قوم پرورانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کے اہل نہیں ہیں۔

وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے 2 ردسمبر کو ایک طویل بیان میں ان بنگالی ہندوؤں کے دوغلے رویے کی پرزور مذمت کی جن کے فرقہ پرستانہ عزائم کی یہ اخبارات ترجمانی کرتے تھے۔ اس کے بیان کا ایک اقتباس یہ تھا کہ ''اگرچہ بنگالی ہندوؤں کے بعض عناصر دوسرے لوگوں کو فرقہ پرست کہتے ہیں حالانکہ وہ خود روئے زمین کے سب سے زیادہ فرقہ پرست لوگوں میں سے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ رواداری کا سلوک نہیں کر سکتے۔ ان کی نظر میں، جیسا کہ یونان کے پرانے باشندوں کا حال تھا، باقی تمام دنیا بربریوں سے آباد ہے جو انسانی سوسائٹی کے معمولی شمار میں بھی آنے کے قابل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک عام رائے، عام احساس اور عام جذبہ کے معنی بنگال کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی رائے، احساس اور جذبہ سے زیادہ یا کم نہیں ہیں اور وہ اس تصور کو گوارا نہیں کر سکتے کہ اس اونچی ذات کی ہندو جماعت کے باہر کا کوئی آدمی یہ دعویٰ کرنے کی گستاخی کرے کہ اس کے ساتھ عام انسانوں کا سا سلوک کیا جائے۔ ذرا دیکھئے کہ مسلمانوں کو سابقہ فیصلہ سے صرف چھ نشستیں زیادہ دینے کی تجویز نے ہندو ایڈیٹروں کو غیظ وغضب میں ڈالا ہے اور وہ تہذیب کا دامن چھوڑ کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں۔ ان میں سے ایک نے نوجوان مردوں اور عورتوں کو حقیقتاً ان جرائم کی حدود میں داخل ہونے کو ابھارا ہے جو ماضی میں بنگال کے لئے موجب شرم وندامت رہ چکے ہیں۔ کوئی شخص ان پاگلوں کی بکواس کی پرواہ نہیں کرتا تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کی اس قسم کی تحریریں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے جذبات کو مشتعل کرتی ہیں اور دونوں اقوام کے درمیان اتحاد و مصالحت کے کام کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ امرت بازار پتریکا اور دوسرے ہندو اخبارات اپنی یاسیت اور جوش وغضب میں گورنر سے کہہ رہے ہیں کہ موجودہ وزارت کو معطل کر دیا جائے اور اس کی جگہ ان کے پسندیدہ لوگوں کو اقتدار سونپا جائے۔ میرا اس سلسلے میں جواب یہ ہے کہ بے چارے خود فریب خوردہ بے وقوفو! ہم تم پر افسوس کرتے ہیں۔''[7] مولوی فضل الحق کا یہ بیان بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی پوری طرح ترجمانی کرتا تھا۔

بنگال میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے قیام کی تجویز 18 سال قبل ایک کمیشن نے پیش کی تھی جس میں ایک ہندو ماہر تعلیم سر آشوتوش مکرجی بھی شامل تھا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن امتحان کے لئے امیدواروں کو بھیجنے کی غرض سے اسکولوں کے الحاق کے معاملے کو کسی ضابطہ و قانون کا پابند بنایا جائے تاکہ مسلمانوں کو اس یونیورسٹی کے ہندو ارباب اقتدار کی فرقہ پرستی کے خلاف جو شکایات ہیں ان کا کسی حد تک ازالہ ہو۔لیکن یونیورسٹی نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس تجویز کو کھٹائی میں ڈالے رکھا۔1924ء میں فضل الحق پہلی مرتبہ صوبہ کا وزیر تعلیم بنا تو اس نے پنجاب کے سر فضل حسین کی طرح مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کچھ اقدامات کرنے کی کوشش کی مگر اسے اس سلسلے میں انگریزوں کی تائید و حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ناکامی ہوئی اور وہ حسب خواہش ثانوی بورڈ قائم نہ کر سکا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے اپنی فوجی حکمت عملی کے تحت پنجابی مسلمانوں کو کچھ رعائتیں دینے کی پالیسی اپنائی تھی لیکن بنگالی مسلمانوں کی کسی قسم کی ترقی میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بنگال میں مغلوں کے عہد زوال میں انگریزوں اور ہندو سرمایہ داروں کے درمیان جو اشتراک عمل شروع ہوا تھا وہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بھی جاری تھا۔ پنجاب کی مسلم فوج نے پنجابی ملاؤں کے فتوے کے مطابق انگریزوں کے ساتھ اپنے جذبہ وفاداری کے تحت مکہ پر گولی چلانے میں بھی پس وپیش نہیں کیا تھا جبکہ عام بنگالی مسلمانوں میں انگریز سامراج کے خلاف بدستور باغیانہ رجحانات پائے جاتے تھے۔ وہ پنجابی ملاؤں کے اس شرمناک فتوے سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔تاہم اب 1937ء میں مولوی فضل الحق نے محکمہ تعلیم کے انچارج کی حیثیت سے بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی طرف پھر دھیان دیا تو کانگرسی اخبارات اور لیڈروں نے اس قدر شور مچایا اور اتنی دھمکیاں دیں کہ مسلمانوں کے باشعور حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی باعزت سمجھوتے کا امکان نہیں۔ یہ تاثر 3رد سمبر کو اور بھی شدید ہو گیا جبکہ آسام پراونشل کانگرس کمیٹی نے صدر کانگرس جواہر لال نہرو کے نام ایک میمورنڈم میں اسے متنبہ کیا کہ اگر مسلم اکثریت والے ضلع سلہٹ کو آسام سے الگ نہ کیا گیا تو سلہٹ کو چھوڑ کر باقی ماندہ آسام کو برما کی مانند ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنا پڑے گا۔اگرچہ آسام کانگرس کے اس مطالبہ کی بنیاد نسلی شاونزم پر تھی تاہم اس مطالبہ کی زد میں آنے والوں کی بھاری اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

بنگالی مسلمانوں کی کانگرس سے نفرت اور بیزاری میں اضافہ

بنگالی کانگرسیوں کی ہر معاملہ میں تنگ دلی کے اس قسم کے مظاہروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1937ء کے اواخر میں بنگالی مسلمانوں کی کانگرس سے بیزاری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک تو اس خیال سے شروع کی تھی کہ کانگرس کا مسلمان عوام الناس سے براہ راست رابطہ قائم ہوگا اور اس طرح مسلم لیگ کی سیاسی بیخ کنی ہوجائے گی مگر برخود غلط اور نہایت کوتاہ بین تعلیم یافتہ بنگالی ہندوؤں نے اس صوبہ میں نہرو کی یہ تحریک بری طرح ناکام کردی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے شروع ہوگئے۔ اس کا ایک واضح ثبوت 12ر دسمبر کو ہوڑہ میں ملا جبکہ مقامی مسلمانوں نے کانگرس کی مسلم عوامی رابطہ کمیٹی کے ایک ''عظیم الشان'' جلسہ عام کو ناکام کردیا۔ حسب اعلان جب اس جلسہ کی کاروائی ایک مسلم خاتون فرخ سلطانہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی زیر صدارت شروع ہوئی تو بندے ماترم کا نعرہ بلند ہونے پر حاضرین میں سے ایک شخص وصی محمد نے اٹھ کر اعتراض کیا کہ اس وقت قریبی مسجد میں نماز ہورہی ہے اور آپ لوگ بندے ماترم کے نعرے لگارہے ہیں۔ اس پر مسلم عوامی رابطہ کمیٹی کے سیکرٹری نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرکے جلسہ کسی کاروائی کے بغیر برخواست کردیا اور پھر تھوڑی دیر بعد اسی جگہ مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔

اس کے دو دن بعد 14ر دسمبر کو بنگال کے وزیر داخلہ سر ناظم الدین کی تحریک پر کلکتہ کے مانک تلہ کے علاقے میں بنگال اور آسام کے علما کا ایک اجتماع ہوا جس میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ کانگرس سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور ہر جگہ مسلم لیگ کی شاخیں منظم کریں۔ علما کی رائے یہ تھی کہ '' کانگرس ہندوانہ اور مسلمانوں کے خلاف ہے اور اس پر ہندو مہاسبھا کا کنٹرول ہے۔ وہ بت پرستانہ ترانہ بندے ماترم مسلمانوں سے گوانا چاہتی ہے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ چیز مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے منافی ہے۔ مزید براں کانگرس جن صوبوں میں بااختیار ہے ان میں مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ نہیں ہوتا۔'' علما کا مطالبہ یہ تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی اور کارپوریشن سے متعلقہ قوانین میں مناسب ترامیم کرکے ان اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا بندوبست کیا جائے اور ''شری و کنول'' کو ہٹا کر ایسی چیز کو یونیورسٹی کا نشان بنایا جائے جو سب

فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

دسمبر کے اواخر میں صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کلکتہ پہنچے تو مقامی مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگوں نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا۔ یہاں تک کہ میمنوں، خوجوں اور بوہروں نے بھی ان کی خدمت میں البرٹ ہال میں سپاس نامہ پیش کیا جس کے جواب میں جناح نے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ اب مسلمانوں کے کاروباری حلقوں میں بھی اقلیتوں کے مسئلہ کی اہمیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مسلم لیگ جو کچھ کر رہی ہے وہ نہ صرف مسلمانوں کے مفاد میں ہے بلکہ اس سے پورے ملک کا مفاد وابستہ ہے اور اس کی بنیاد انصاف، رواداری اور دیانت داری پر ہے۔"

جنوری 1938ء میں جب جواہر لال نہرو کی جگہ سوبھاش چندر بوس کو انڈین نیشنل کانگرس کا صدر بنانے کا فیصلہ ہوا تو بنگالی مسلمانوں کی کانگرس سے بیزاری میں اور بھی اضافہ ہوا۔ سوبھاش چندر بوس وہی شخص تھا جس نے پروفیسر عبدالرحیم کی اطلاع کے مطابق بنگال کونسل میں قانون کاشتکاران بنگال کی مخالفت میں ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ ووٹ دیئے تھے، اس نے مہاجنوں اور سرمایہ داروں کی کھلی حمایت کی تھی اور تیس چالیس مرتبہ ایسے محضر ناموں پر دستخط کئے تھے جو غریب کسانوں کے لئے زہر قاتل سے بھی کہیں زیادہ خطرناک حیثیت رکھتے تھے۔ پھر جب ستمبر 1937ء میں فضل الحق وزارت نے کلکتہ کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کرنے کی تجویز پر غور کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے ڈلہوزی سے حق وزارت کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا جس میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فضل الحق نے ایسا کام کرنے کی جرأت کی تو میں اس کے خلاف ایسا ایجی ٹیشن اٹھاؤں گا جس کی نظیر اس نے اپنی عمر بھر میں بنگال میں نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ شخص بظاہر مکمل آزادی اور سوشلزم کا علمبردار تھا لیکن اس کی آزادی اور سوشلزم کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کا اقتدار ہندو۔ مسلم تنازعہ کے تصفیہ کے بغیر ہندو اکثریت کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت دیئے گئے کمیونل ایوارڈ کے سخت خلاف تھا اور یہ اس مسئلہ پر حکومت برطانیہ کے خلاف اسی طرح کی پر تشدد ایجی ٹیشن کے حق میں تھا جیسی کہ بیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کے ہندوؤں کے درمیانہ طبقہ نے بنگال کی تقسیم کے خلاف کی تھی۔ چنانچہ جب اس کی اس سیاست کے پس منظر میں جنوری 1938ء میں یہ اعلان ہوا کہ یہ نہرو کی جگہ کانگرس کا صدر ہوگا تو بنگال کے

سارے مسلم حلقوں میں کانگرس کا جنازہ ہی نکل گیا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب فروری میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے لئے بنگال کے نمائندوں (Delegates) کا انتخاب ہوا تو بنگال کے کل 485 نمائندوں میں سے صرف 8 مسلمان تھے۔ جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی منتخب کی گئی اس کے 62 بنگالی ممبروں میں سے صرف 2 مسلمان تھے۔ اس صورت حال پر کلکتہ کے مولانا راغب احسن کا تبصرہ یہ تھا کہ کانگرس کا یہ دعویٰ کہ وہ سارے ملک کی نمائندہ ہے ایک وہم باطل سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ یہ اعداد خود اپنی تفسیر آپ کر رہے ہیں اور اپنی خاموش زبان میں بتا رہے ہیں کہ ہندو کانگرس میں مسلمانوں کی قیمت کیا ہے۔

مارچ 1938ء میں بنگالی مسلمانوں کی کانگرس سے نفرت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ عداوت کے کئی ایک مظاہرے ہوئے۔ پہلا مظاہرہ یکم مارچ کو ہوا جب کہ یہ خبر شائع ہوئی کہ کلکتہ کارپوریشن کی سب کمیٹی نے اس مسودۂ قانون کو مسترد کر دیا ہے جو صوبائی حکومت نے کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کرنے کی غرض سے تیار کیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ کارپوریشن کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے۔ دوسرا مظاہرہ 6 ؍مارچ کو کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر ہوا جبکہ مسلمان وزرا اور اسمبلی کے مسلمان سپیکر نے اس جلسہ کا بائیکاٹ کیا۔ ان کا یہ بائیکاٹ اس بے پناہ غصہ کا نتیجہ تھا جو صوبہ کے مسلمانوں میں یونیورسٹی کے ہندو ارباب اختیار کی فرقہ پرستی کے خلاف پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کا دیرینہ مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی ایکٹ میں مناسب ترمیم کر کے اس اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے میں مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے مگر یونیورسٹی کے ہندو منتظمین کے علاوہ صوبہ کے کانگرسی اور دوسرے ہندو سیاسی لیڈر صوبائی حکومت کو اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے اور جب کبھی اس مسئلہ کا ذکر ہوتا تھا تو وہ خون خرابے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اس جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مہاسبھائی لیڈر شیاما پرشاد مکر جی یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔ اس نے اپنی 22 منٹ کی تقریر میں متنبہ کیا کہ ''اس صوبہ کی رائے عامہ یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اصلاح کی آڑ لے کر کوئی ہماری سہولتوں کا خاتمہ کر دے۔'' اس کی اس تنبیہ کا مطلب یہ تھا کہ یونیورسٹی ایکٹ میں کسی ایسی ترمیم کی اجازت نہیں دی جائے گی جو ہندوؤں کے تعلیم یافتہ حلقوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔ وہ اپنی ''رائے عامہ'' میں مسلم رائے عامہ کو شامل نہیں کرتا تھا۔

پرجا پارٹی میں پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر گاندھی نے حق وزارت گرانے کی کوشش کی

ان دنوں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہو چکا تھا اور کانگرسیوں اور مہا سبھائیوں کو یہ خطرہ تھا کہ اس سیشن میں کارپوریشن ایکٹ اور یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کوشش کو ناکام کرنے کے لئے کانگرس پارٹی فضل الحق کی پرجا پارٹی کے چند اور ارکان اسمبلی کو منحرف کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس طرح جب 9/مارچ کو اس پارٹی کے باغی ارکان کی کل تعداد تیس تک پہنچ گئی تو اسی دن وزارت داخلہ کے اخراجات میں تخفیف کرنے کے لئے ایک تحریک پیش کی گئی۔ یہ تحریک پرجا پارٹی کے ایک باغی رکن غیاث الدین احمد نے پیش کی تھی اور اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ڈویژنل کمشنروں کے عہدوں کو ختم کر دیا جائے۔ محرک کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو ''اسلام خطرے میں نہیں پڑ جائے گا۔'' اس پر سرکاری مخلوط پارٹی کے ایک رکن عبدالباری کا جواب یہ تھا کہ ''اگر اس تحریک کی منظوری کی صورت میں وزارت کا تختہ الٹ گیا تو اسلام کو واقعی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ محرک کو کانگرسی صوبوں کے، بالخصوص یو۔ پی۔ اور بہار کے حوادث اور ان صوبوں کے مسلمانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں، ان سے سبق لینا چاہیے'' مگر پرجا پارٹی کے ایک اور باغی رکن شمس الدین احمد نے عبدالباری کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس وزارت کا خاتمہ ہو جائے تو اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ بعد ازاں کانگرس پارٹی کے متعدد ارکان نے حکومت پر لعن طعن کی اور سرکاری پارٹی کے عبداللطیف بسواس، تمیز الدین خان اور شاہ عبدالرؤف نے بھی اپنی تقریروں میں انتظامیہ کی کارگزاری پر نکتہ چینی کی۔ اس پر وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے ایک جوشیلی تقریر میں اسمبلی کے مسلمان ارکان کو متنبہ کیا کہ اگر یہ تحریک منظور ہو جائے اور مخلوط وزارت مستعفی ہو جائے تو اس کی جگہ کانگرس کی وزارت قائم ہو جائے گی اور پھر صوبائی انتظامیہ میں بھی ہندو فرقہ پرستی کا ویسا ہی مظاہرہ ہوگا جیسا کہ کلکتہ کارپوریشن اور کلکتہ یونیورسٹی میں کیا جا رہا ہے۔ فضل الحق کی تقریر کے بعد وزات داخلہ کے اخراجات کے لئے ایک کروڑ 14 لاکھ 8 ہزار روپے کی منظوری دے دی گئی اور تحریک تخفیف مسترد ہوگئی۔ اس رائے شماری میں یورپین گروپ نے سرکاری پارٹی

کے ساتھ ووٹ دیئے اور اس طرح حق وزارت کو لاحق شدہ خطرہ ٹل گیا۔ اگر چہ اس وقت تک پرجا پارٹی کے مولوی تمیز الدین خان، ابو حسین سرکار، عبداللطیف بسواس اور چھ سات دوسرے مسلم ارکان حزب اختلاف سے جا ملے تھے۔

مگر جب 16 رمارچ کو گاندھی یکا یک کلکتہ پہنچ گیا تو یہ خطرہ پھر فضل الحق کے سامنے منڈلانے لگا۔ ''عصر جدید'' کا الزام یہ تھا کہ گاندھی کے اس دورۂ بنگال کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا، موجودہ وزارت کو توڑنا اور کانگرسی حکومت قائم کرانا ہے۔ اس الزام کی ایک بنیاد تو یہ تھی کہ جب جولائی 1937ء میں کانگرس نے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے فوراً ہی بعد اگست 1937ء میں بنگالی کانگرسیوں کی سازشوں کے باعث پرجا پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ دوسری بنیاد یہ تھی کہ گاندھی نے 12 رفروری کو وٹیٹھل نگر میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گائے کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''بنگال اور صوبہ سرحد کے دوسرے ایسے مسائل ہیں جن کو حل کرنا ابھی باقی ہے اور مجھے اس کام کے لئے اپنی طاقت کو محفوظ رکھنا ضروری ہے''[8] اور تیسری بنیاد یہ تھی کہ کلکتہ پہنچنے کے فوراً بعد گاندھی نے ابوالکلام آزاد، صوبائی وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار، شیش سین اور بعض با اثر مقامی لیڈروں سے ملاقاتیں کی تھیں۔

حق وزارت کی پورے برصغیر کے مسلمانوں نے حمایت کی

جب گاندھی کی ان سرگرمیوں کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو پورے برصغیر کے مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ اس وقت تک کانگرسی وزارتوں کے صحیح یا غلط فرقہ پرستانہ اقدامات کے باعث مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں اس جماعت کے بارے میں بڑی مایوسی اور بددلی پھیل چکی تھی اور مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سیاسی کشمکش نے اسلام اور کفر کے درمیان مذہبی کشمکش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بالخصوص یو۔ پی کے مسلمان تعلقہ داروں اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کو فضل الحق کی وزارت کے مستقبل کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر بنگال میں بھی کانگرس کی وزارت قائم ہوگئی تو پھر ان کے حقوق و مفادات کی پامالی کے خلاف کوئی مؤثر آواز نہیں اٹھے گی۔ ان کے اس خطرے کی ترجمانی فرنگی محل کے مولانا ہاشم انصاری نے کلکتہ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مولانا راغب احسن کے

نام خط میں کی۔ مولانا انصاری کا خط یہ تھا کہ ''آج کل اخبارات میں پرجا پارٹی سے مسلمان ممبروں کے استعفوں کی خبریں آرہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک 30 ممبر علیحدہ ہو چکے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد حق منسٹری ختم ہو جائے گی۔ چونکہ مسلمانوں کی محبوب ترین منسٹری صرف فضل الحق صاحب کی منسٹری ہے اس وجہ سے ہر وہ مسلمان جس کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے صبح کو اٹھ کر سب سے پہلے اخباروں میں حق منسٹری بنگال کے متعلق خبر تلاش کرتا ہے۔ یہاں چونکہ اخبار زیادہ تر کانگرسی ہیں اور وہ سب مخالفانہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں لہٰذا یہ اور بھی زیادتی اضطراب کا باعث ہے۔ بنگال پر اسلامی ہند کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ گو بنگال سے اسلامی ہند اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو مساوی اور براہ راست کوئی فائدہ نہ پہنچے گا لیکن مسلمانوں کے دل حق وزارت سے بہت مضبوط ہیں اور ہمتیں بلند ہیں۔ اگر خدانخواستہ مسلمانوں کی خانہ جنگی اور خود غرضی سے یہ وزارت ٹوٹ گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمان مایوسی اور تباہی کے تاریک ترین غار میں گر جائیں گے۔''[9] گویا مولانا انصاری کی رائے میں برصغیر میں اسلام کا مستقبل واقعی حق وزارت کے مستقبل سے وابستہ تھا۔ اس کی اس رائے کی وجہ یہ تھی کہ فضل الحق جوشیلی اور غیر ذمہ دارانہ تقریریں کرنے کا عادی تھا۔ اس نے اکتوبر 1937ء میں مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر یو۔پی میں ایک جان لی گئی تو میں بنگال میں دو جانیں لوں گا۔''[10]

بنگالی مسلمانوں نے ''یوم حق وزارت'' منا کر باغی ارکان کو مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا

مولانا انصاری کا حق منسٹری کے بارے میں اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ خود مولوی فضل الحق کو بھی اپنی وزارت واقعی خطرے میں نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی وزارت کو بچانے کے لئے اس مرتبہ بھی وہی حربہ استعمال کیا جو اس نے اگست 1937ء میں استعمال کیا تھا۔ اس نے 20 مارچ 1938ء کو ٹاؤن ہال میں کلکتہ اور مضافات کے تقریباً 60 ہزار مسلمانوں کے جلسہ عام کا انتظام کیا جس نے وزیر اعلیٰ پر مکمل اعتماد کا اظہار کر کے یہ فیصلہ کیا کہ 27 مارچ کو پورے بنگال میں ''یوم حق وزارت'' منایا جائے گا۔ اس فیصلہ کا مقصد صوبہ کی مسلم رائے عامہ کو ان مسلمان ارکان اسمبلی کے خلاف ابھارنا تھا جو پرجا پارٹی سے منحرف ہو گئے تھے یا منحرف ہونے پر مائل

ہو سکتے تھے۔ فضل الحق کا یہ حربہ اس مرتبہ بھی کامیاب رہا۔ چنانچہ جب 21، 23 اور 26 / مارچ کو اسمبلی میں مختلف تحاریک تخفیف پر رائے شماری ہوئی تو حکومت کو تقریباً تیس ووٹوں کی اکثریت حاصل تھی حالانکہ پرجا پارٹی کے باغی ارکان کے علاوہ اچھوتوں کی انڈیپینڈنٹ پارٹی نے اپنے سابقہ رویے سے انحراف کر کے کانگرس پارٹی کے ساتھ ووٹ دیئے تھے۔ حکومت کے حامیوں میں مسلم لیگ کے علاوہ زمینداروں کا گروپ اور یورپین گروپ شامل تھے۔

تاہم اسمبلی میں حکومت کی اس فتح کے بعد پورے بنگال کے ہر طبقہ کے مسلمانوں نے ''یوم حق وزارت'' منانے کے لئے جلسے کئے جن میں وزیر اعلیٰ فضل الحق پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان ''خارجین جماعت'' کے طرز عمل کی سخت مذمت کی گئی جو متحدہ مخلوط مسلم پارٹی سے علیحدہ ہو گئے تھے اور وزارت کے خلاف ''اغیار وا جانب سے ذاتی اغراض سے ساز باز'' کر رہے تھے۔ ان جلسوں میں مطالبہ کیا گیا کہ خارجین جماعت اور عہد شکن ممبران، بنگال اسمبلی اور کونسل سے مستعفی ہو جائیں اور دوبارہ الیکشن کے لئے ''اتحاد اسلامی'' کے سوال پر کھڑے ہوں اور قوم سے فیصلہ حاصل کریں۔'' اس قسم کے جلسوں کا سلسلہ 27 / مارچ کے بعد بھی جاری رہا جس کی وجہ سے پرجا پارٹی کے باغی ارکان پر مسلم رائے عامہ کا اتنا زبردست دباؤ پڑا کہ انہیں بار بار یہ اعلانات کرنے پڑے کہ انہوں نے کانگرسیوں سے ساز باز کی بنا پر مخلوط وزارت کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے یہ اقدام اس لئے کیا تھا کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے ان مطالبات کی تکمیل نہیں کی جو اس کی پارٹی کے ارکان نے مسلمانوں کے مفاد کے لئے فروری 1938ء میں اس کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان مطالبات کی فہرست حسب ذیل تھی:

1۔ سرکاری ملازمتوں اور سول اسامیوں میں مسلمانوں کے لئے 55 فیصدی کوٹا مقرر کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری قوانین بنائے جائیں اور متعلقہ افسروں کے نام سرکلر اور احکام صادر کر دیئے جائیں۔ مسلمانوں کو ان کے تناسب کی مقررہ اسامیاں 5 سال تک مل جائیں۔ ضروری سرکلروں اور قوانین کے ذریعے اعلان کر دیا جائے کہ جو افسران احکام کی خلاف ورزی کریں گے انہیں قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ بھرتی اور ترقی کی رفتار بھی ایسی ہونی چاہیے جس سے مسلمانوں کا تناسب پورا ہو

سکے۔ نیز مسلمانوں کو اہم اسامیوں پر مقرر کیا جائے۔

2۔ بجٹ میں مسلم طلبا کے وظیفوں کے لئے 10 لاکھ روپے سالانہ منظور کئے جائیں تا کہ اس رقم کی امداد سے مسلم طلبا ہندوستانی یا غیر ملکی درسگاہوں میں ٹیکنیکل تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔

3۔ مجوزہ لینڈ ریونیو کمیشن کے لئے اسمبلی سے ان امور کی منظوری حاصل کی جائے (الف)۔عملہ (ب) فیصلہ طلب امور (ج) مدت تحقیقات (د) مصارف کا تعین۔
مزید برآں موجودہ بجٹ میں 50 لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی جائے تا کہ آبپاشی کے وسائل کو ترقی دی جائے اور دیہاتی علاقوں کے باشندوں کو بھی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

4۔ پورے بنگال میں لازمی پرائمری تعلیم کا نظام نافذ کیا جائے۔

5۔ اعلیٰ اور ابتدائی اسلامی مدرسوں کے سسٹم کے احیا کے لئے موجودہ بجٹ میں تین لاکھ روپے مخصوص کئے جائیں۔

6۔ 25 سال کی ملازمت کے اختتام پر تمام سرکاری ملازمین کو ریٹائر کر دیا جائے اور اس مدت ملازمت میں توسیع نہ کی جائے۔

7۔ بعض مہاجنوں اور ساہوکاروں نے قانون قرضہ زراعتی کے نفاذ کے خیال سے متاثر ہو کر قبل از وقت بعض مقروضوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا، ایسے مہاجنوں اور ساہوکاروں سے زمینیں واپس لے کر اصلی مالکان کو واپس دی جائیں۔

8۔ کلکتہ یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کر دی جائے تا کہ مسلمان قوم کو یونیورسٹی کے نظم و نسق میں اہم حیثیت دستیاب ہو سکے۔

9۔ کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کی جائے تا کہ مسلمان قوم کو اس ادارے کے نظم و نسق میں اہم حیثیت حاصل ہو جائے۔

10۔ ساہوکارہ ایکٹ میں ترمیم کر دی جائے تا کہ مقروضوں کے حقوق زیادہ محفوظ ہو جائیں نیز اس مقصد کے لئے قانون قرضہ زراعت میں بھی ترمیم کی جائے۔

فضل الحق اپنے انتخابی منشور پر عمل نہ کرنے کے باوجود عوامی حمایت سے کیوں محروم نہ ہوا

متذکرہ مطالبات تقریباً ایسے ہی تھے جیسے کہ پنجاب اور سندھ کے مفلوک الحال مسلمان اپنی حکومتوں سے کیا کرتے تھے۔ پنجاب میں پہلے سر فضل حسین اور پھر سر سکندر حیات خان کی حکومتوں نے اس سلسلہ میں انگریز گورنروں کے تعاون سے اس سلسلے میں کچھ اقدامات کئے بھی تھے۔ مگر بنگال میں مولوی ابوالقاسم فضل الحق غریب مسلمان عوام کی فلاح کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہیں کر سکا تھا حالانکہ 1937ء میں اس کی پارٹی کا انتخابی منشور غریبوں کی بھلائی کے نعروں سے بھرپور تھا۔ اگرچہ فضل الحق نے اکتوبر 1937ء میں اور اپریل 1938ء میں مزارعین کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ قانون سازی کی تھی مگر اس کی جانب سے اپنی پارٹی کے منشور پر پوری طرح عمل نہ کرا سکنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے جن عناصر کی حمایت سے وزارت بنائی تھی ان میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی تعداد خاصی تھی اور یہ عناصر غریبوں کی فلاح و بہبود کے ہر کام کے خلاف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کانگرس ہمہ وقت اس کی وزارت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی اور اسے اپنی وزارت بچانے کے لئے ان زمینداروں اور سرمایہ داروں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا پڑتا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ یورپین گروپ، جس کے پاس اسمبلی میں طاقت کا توازن تھا، ہر قسم کی ترقی پسندانہ اصلاحات کے خلاف تھا۔ اس گروپ کو صرف اس بات میں دلچسپی تھی کہ صوبہ میں بڑے پیمانے پر بدامنی نہ ہو تاکہ وہ اپنا استحصالی کاروبار بلا روک ٹوک جاری رکھ سکیں۔ اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ 38-1937ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی کوتاہ اندیشی کے باعث ہندو۔ مسلم تضاد یکایک اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ فضل الحق مفلوک الحال بنگالی مسلمانوں کے لئے کوئی فلاحی کام کئے بغیر بھی ان کی حمایت پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ بنگالی کانگرسیوں نے اسے موقع فراہم کیا تھا کہ وہ اپنی وزارت کے مستقبل کو اسلام کے مستقبل سے وابستہ کر لے۔ مثلاً انہوں نے بندے ماترم کے گیت کو اتنی اہمیت دے کر اس کی وزارت کو بہت مستحکم کیا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی اور کلکتہ کارپوریشن کے ہندو ارباب اختیار کی تھڑدلی اور بخیلی بھی اس کی وزارت کے استحکام کا باعث بنی تھی۔

ان کانگرسیوں اور مہا سبھائیوں کو، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود، اتنا شعور نہیں تھا

کہ تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری کا مسئلہ صوبہ میں ہندو۔مسلم تنازعہ کے زخم کو روز بروز ناسور بنا رہا تھا اور اس کا فائدہ برطانوی سامراج کو پہنچتا تھا۔جب کبھی کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کا ذکر ہوتا تھا تو سوبھاش چندر بوس اور دوسرے ہندو لیڈر اعلان جنگ کر دیتے تھے اور جب کبھی یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی بات ہوتی تھی تو شیاما پرشاد مکرجی وغیرہ کے علاوہ ہندوستان سٹینڈرڈ اور امرت بازار پتریکا قتل و غارت کی دھمکیاں دیتے تھے۔

گاندھی، کانگرس پارٹی اور یورپین گروپ کی جانب سے زمینداری نظام بچانے کی کوششیں

کانگرسی لیڈر یو۔پی، بہار اور سی۔پی وغیرہ میں تو زمینداری نظام ختم کر دینے کے نعرے لگاتے تھے کیونکہ وہاں مسلمان جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کی تعداد زیادہ تھی لیکن وہ بنگال، سندھ اور پنجاب میں اس نظام کو ختم کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ ان مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندو۔سکھ زمینداروں اور ساہوکاروں کا غلبہ تھا۔کانگرس کے باپو گاندھی کی رائے یہ تھی کہ کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنگال کا موجودہ زمینداری نظام بالکل ختم نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس نظام کو ختم کرنا ہے تو اسے بتدریج ختم کرنا چاہیے۔کسانون کی حالت بہتر بنانے کا کام زمینداروں کے سپرد کر دینا چاہیے اور اس مقصد کے لئے انہیں کسانوں کا ٹرسٹی قرار دینا چاہیے۔[11]

گاندھی نے بنگال کے زمینداری نظام کے بارے میں اپنی اس رائے کا اظہار 13 اپریل کو مقتدر کانگرسیوں سے دو گھنٹے کی گفتگو کے دوران کیا تھا۔یہ وہی کانگرسی تھے جنہوں نے اکتوبر 1937ء میں قانون مزارعت کے ترمیمی بل کی مخالفت کی تھی اور اس پر رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔پھر اپریل 1938ء کے اوائل میں جب فضل الحق وزارت نے اسمبلی میں قانون مزارعت کا دوسرا بل پیش کیا تھا تو کانگرس پارٹی نے اس پر بھی بہت پیچ و تاب کھائے تھے اور بالآخر اس نے اس رائے شماری میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔لیکن جب دونوں ایوانوں نے کانگرسی پارٹی اور یورپین گروپ کی مخالفت کے باوجود یہ بل منظور کر دیا تو سرت چندر بوس وغیرہ نے یورپین گروپ کے تعاون سے صوبائی گورنر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس بل کی توثیق نہ کرے۔اس ترمیم میں قرار دیا گیا تھا کہ کوئی عدالت زمیندار کو واجب الادا لگان میں اس وقت تک اضافہ نہیں کر سکے

گی جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ مزارعت کے رقبہ میں واقعی اضافہ ہوا ہے۔ ہندو اور یورپی زمینداروں کے لئے نہ تو اکتوبر 1937ء میں منظور کردہ پہلا ترمیمی بل اور نہ ہی یہ دوسرا ترمیمی بل قابل قبول تھا۔ چنانچہ 13 راپریل تک گورنر نے ان کے زیر اثر ان دونوں بلوں کی توثیق نہیں کی تھی۔ گورنر اس تجویز پر غور کر رہا تھا کہ یہ دونوں بل برائے استصواب وائسرائے کے پاس بھیج دیئے جائیں اور بظاہر گاندھی گورنر کے اس رویے سے مطمئن تھا۔

گاندھی کی بنگال کے زمینداری نظام کے بارے میں متذکرہ رائے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ فضل الحق حکومت نے چند دن قبل یکم اپریل کو سر فرانسس فلاوُڈ (Francis Floud) کی زیر صدارت ایک لینڈ کمیشن مقرر کیا تھا جس کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ صوبہ کے زمینداری نظام کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ چونکہ فلاوُڈ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ غریب کسانوں سے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اس لئے کانگرسیوں کو اندیشہ تھا کہ یہ کمیشن زمینداری نظام کے خاتمہ کی سفارش کرے گا۔ گاندھی کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو جاگیرداروں کے اس اندیشہ میں شریک تھا اسی لئے وہ بنگال میں زمینداری نظام ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا بلکہ وہ زمینداروں کو کسانوں کا ٹرسٹی بنانا چاہتا تھا۔ وہ کلکتہ میں اپنے تقریباً ایک ماہ کے قیام کے دوران صوبہ سرحد کی طرح بنگال کا مسئلہ حل نہیں کر سکا تھا۔ وہ بنگال اسمبلی کے چند مسلمان ارکان کو فضل الحق سے منحرف کرنے میں تو کامیاب ہوا تھا لیکن وہ حق وزارت کی جگہ کانگرسی وزارت قائم نہیں کروا سکا تھا۔ تاہم 13 راپریل کی شام کو جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو وہ اپنے ساتھ یہ امید لے کر گیا کہ صوبہ میں ہندو زمینداروں کے مفادات کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کی اس امید کی ایک بنیاد یہ تھی کہ مہاراج ادھیراج بہادر بردوان 31 رمارچ کو بنگال کے زمینداروں کی جماعت برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا دوبارہ صدر منتخب ہونے کے بعد زمینداری نظام کے تحفظ کے لئے بہت سرگرم عمل ہو گیا تھا۔ 20 راپریل 1938ء کو اس مہاراج بہادر نے صوبائی گورنر کو ایک میموریل پیش کیا جس میں استدعا کی گئی تھی کہ بنگال کے دونوں ایوانوں نے لگان داری کا جو ترمیمی بل منظور کیا تھا اس کی توثیق نہ کی جائے۔ یہ میموریل صوبہ کے دس ہزار جاگیرداروں کی جانب سے تھا اور اس پر سر عبدالحلیم غزنوی جیسے چند مسلمان زمینداروں کے بھی دستخط تھے۔ میموریل میں لکھا تھا کہ "مذکورہ بل حق ملکیت کو سلب کرتا ہے۔ بندوبست دوامی کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کے

ڈائریکٹروں اور جاگیرداروں میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس میں تبدیلی کرتا ہے اور اقلیت کے جائز حقوق پر اثر انداز ہوتا ہے۔''[12]

جب ہندو اخبارات میں اس میموریل کا بہت چرچا ہوا اور کانگرسی اور غیر کانگرسی زمینداروں کی جانب سے گورنر پر دباؤ میں اضافہ ہوگیا تو وزیراعلیٰ فضل الحق نے ایک بیان میں متنبہ کیا کہ اگر یہ بل منظور نہ کیا گیا تو نہایت نازک آئینی تعطل پیدا ہو جائے گا اور ہمارے نزدیک استعفیٰ کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہ رہے گا۔ فضل الحق کے اس بیان سے برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حلقوں میں بڑی ہلچل مچی کیونکہ ان کی رائے میں ہندو۔ مسلم تنازعہ کے باعزت تصفیے کے لئے بنگال میں حق وزارت کا استحکام ضروری تھا۔ چنانچہ لاہور کے روزنامہ انقلاب کا فضل الحق کے بیان پر تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ حالات بے حد تشویشناک ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سوبھاش چندر بوس صدر کانگرس کے بھائی سرت چندر بوس کی کانگرس پارٹی اور بڑے بڑے زمینداروں اور تعلقہ داروں نے اتحاد کر کے گورنر پر دباؤ ڈالا ہے تاکہ جو مقصد انہیں جمہوری طریق سے حاصل نہیں ہوسکا اسے انگریز کی مدد سے حاصل کریں۔ اگر گورنر نے اس بل کو منظور نہ کیا تو بنگال کی صورت حال نہایت خطرناک ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ مولوی فضل الحق کے مستعفی ہو جانے کے بعد کوئی استوار وزارت قائم نہ ہو سکے۔ گورنر اور وائسرائے کو عاقبت اندیشی سے اور تدبر سے کام لینا چاہیے۔''[13]

فضل الحق نے چند دن کے بعد مستعفی ہونے کی پھر دو ایک دھمکیاں دیں تو انقلاب نے اس مسئلہ پر پھر ایک اداریہ لکھا جس میں اس نے سرت چندر بوس وغیرہ کی زمیندار نوازی کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہندو پریس کی یہ کیفیت ہے کہ اگر یو۔ پی اور بہار کی وزارتیں ان صوبوں کے مزارعین کی حمایت میں ایک اشارہ بھی کریں تو یہ اخبارات ان کی قصیدہ خوانی میں تر زبان ہو جاتے ہیں لیکن بنگال کے مزارعین کی بہتری کے لئے ایک قانون بنایا گیا تو یہی اخبارات جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے ہیں اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں۔ ٹربیون نے بہت لکھا تو یہ لکھا کہ مولوی فضل الحق استعفیٰ نہیں دیں گے۔ محض خالی خولی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ بل کی اچھائی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ یہ ان لوگوں کی قوم پرستی اور غربا نوازی ہے۔ مزارع قابل امداد اور مستحق ہمدردی ہے لیکن اسے ہندو ہونا چاہیے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اس کی بہبود کے لئے جتنی بھی کوششیں کی جائیں وہ سب ''رجعت پسندانہ'' ہیں۔ جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس بل سے مالکان

اراضی اور مزارعین کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی وہ بالکل غلط کہتے ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مزارعین بنگال کی حالت ہندو زمینداروں کے ماتحت ناگفتہ بہ ہے۔ اگر ان کے لئے کچھ نہ کیا گیا تو زمانۂ حاضر کی عام بیداری کے زیر اثر وہ ایک دن اٹھ کھڑے ہوں گے اور وہ وقت مالکان اراضی کے لئے چنداں خوشگوار نہ ہوگا۔ تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی حالت کو بتدریج بہتر بنایا جائے تا کہ زمینداروں کو تکلیف نہ ہو اور مزارعین کو پیٹ بھر کر روٹی مل سکے۔''[14] یہ روزنامہ انقلاب پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں کا ترجمان تھا اس لئے وہ اصولی طور پر زمینداری نظام کے خاتمہ کے خلاف تھا۔ وہ گاندھی کی طرح مزارعین کی حالت کو بتدریج بہتر بنانے کے حق میں تھا تا کہ زمینداروں کو تکلیف نہ ہو۔ تاہم اس نے کانگرسی لیڈروں اور اخبارات کی اس سلسلے میں دوغلی پالیسی پر جو نکتہ چینی کی تھی وہ بالکل حق بجانب تھی البتہ اس نے اس تلخ حقیقت کی نشاندہی نہیں کی تھی کہ جہاں تک کانگرسی صوبوں کا تعلق تھا انڈین نیشنل کانگرس ان میں گورنر کو ویٹو کے اختیارات استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اور اس نے اسی بنا پر وزارتیں قبول کرنے میں کئی ماہ کی تاخیر کی تھی لیکن جہاں تک پنجاب اور بنگال کے غیر کانگرسی صوبوں کا تعلق تھا وہ ان میں گورنروں سے توقع کرتی تھی کہ وہ ہندو زمینداروں، ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ویٹو کے اختیارات کے استعمال میں ذرا سا بھی تامل نہ کرے۔

گاندھی نے فضل الحق اور بنگال کانگرس کی مخلوط حکومت بنوانے کی کوشش کی مگر مارواڑیوں کے کہنے پر یہ کوشش ترک کر دی

گاندھی کی کلکتہ سے روانگی کے تین چار دن بعد 17 اپریل کو وہاں محمد علی جناح کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس ہوا تو مولوی فضل الحق نے یہ عجیب و غریب الزام عائد کیا کہ ''گزشتہ چند دنوں میں کانگرس نے مجھ پر متعدد بار ڈورے ڈالنے کی کوشش کی اور تجویز پیش کی کہ بنگال میں کانگرس کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت قائم کی جائے تو مجھے وزیر اعلیٰ رہنے دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں اور اسلام کی تباہی کے قرطاس پر دستخط کر دوں۔ اگر میں ایسا کرتا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دیتا۔'' اس نے کہا کہ ''مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے باعث جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کرنے کی ضرورت

ہے اس ایوارڈ کی بدولت جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ اقلیت میں بدل گئی ہے۔ ہمارے لئے دوسرا نہایت ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو راہ راست پر لایا جائے جو غلط روی سے کانگرس میں شریک ہو گئے ہیں۔ انہیں اس بعید از عقل اقدام کا احساس دلانا ضروری ہے۔'' اس نے آخر میں کہا کہ ''میں اب بھی کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ (1) کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر وزارتوں کی از سر نو تشکیل عمل میں لائے۔ (2) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب اور مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات میں لیگ کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کرے۔ (3) مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مفاہمت کرانے کے لئے کانگرس بطور ثالث کام کرے۔''[15]

مولوی فضل الحق کا یہ الزام بعید از امکان نہیں تھا کیونکہ ان دنوں کانگرس کی کھلم کھلا پالیسی یہ تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو چند مسلمان ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیے تا کہ اس طرح مسلم لیگ کے پاؤں کے نیچے سے خود بخود زمین نکل جائے۔ اس نے اس پالیسی کے تحت یو۔ پی، بہار، سی۔ پی، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس میں مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سارے صوبوں میں بظاہر ایسی خالص کانگرسی وزارتیں بنانے کے حق میں تھی کہ جن کے ارکان میں پالیسی و پروگرام کے معاملے میں کوئی اختلاف نہ ہو لیکن عملاً مسلم اکثریتی صوبوں میں اس نے اپنے اس اصول کو ترک کر دیا تھا۔ ان صوبوں میں اس کا اصول یہ تھا کہ پہلے تو مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالی جائے اور پھر ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر غیر کانگرسی وزارتوں کو توڑا جائے اور اپنی مخلوط وزارتیں قائم کی جائیں۔ چنانچہ جب ستمبر 1937ء میں صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم کی وزارت کو حزب مخالف کے ہاتھ سے شکست ہوئی تو کانگرس نے وہاں اپنے اس ''سنہری اصول'' پر عمل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس وقت سرحد اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد 50 تھی جن میں کانگرسی ممبر صرف 19 تھے۔ اس لئے اس نے ڈاکٹر خان صاحب کو یہ اجازت دی کہ وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے چار ارکان، دو انڈیپنڈنٹ ارکان اور دو مہا سبھائی ممبروں کو ساتھ ملا کر ''کانگرسی وزارت'' قائم کر لے۔ سر عبدالقیوم کی کابینہ میں تین وزیر تھے لیکن ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لئے ڈیموکریٹک پارٹی کا ایک غیر کانگرسی وزیر بھی شامل کر لیا اور وزرا کی تعداد تین کی بجائے چار کر دی گئی۔ پھر اسی طرح جب مارچ 1938ء

میں سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی تو اس وقت اسمبلی میں کانگرسی ممبروں کی تعداد صرف 9 تھی۔ چونکہ اس قلیل تعداد سے کانگرس مخلوط وزارت تو نہیں بنا سکتی تھی اس لئے کانگرس ہائی کمان نے خان بہادر اللہ بخش کو مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ اس طرح اللہ بخش نے اپنی یونائیٹڈ پارٹی کے 18 مسلم ارکان، ہندو مہا سبھا کے گیارہ ارکان اور کانگرس کے 9 ممبروں کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت قائم کر لی تھی۔

بظاہر اسی خود فریبی، موقع پرستی اور منافقت کو ساتھ لے کر گاندھی 16 / مارچ کو بنگال اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران کلکتہ پہنچا تھا اور ایک مسلم اخبار عصر جدید کا الزام یہ تھا کہ اس دورہ کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوا کر بنگال میں سندھ اور سرحد کی طرح کی کانگرسی وزارت قائم کرنا ہے۔ گاندھی کے کلکتہ میں قیام کے دوران فضل الحق کی پرجا پارٹی میں اتنی پھوٹ پڑ گئی تھی کہ اس کی وزارت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی۔ ایسی صورت حال میں یہ امر بعید از قیاس نہیں تھا کہ بوس برادران نے بنگالی قوم پرستی کے جذبہ کے تحت اس کے ساتھ مخلوط وزارت بنانے کی پیشکش کی ہو۔ فضل الحق کی ابن الوقتی اور موقع پرستی کا پورے برصغیر میں شہرہ تھا۔ اس لئے اس سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر لے گا مگر بنگالی مسلم رائے عامہ کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ کانگرس سے سودا بازی کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مزید برآں اس وقت پورے ہندوستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار اور اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا اور اس کا خصوصی اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا، اس لئے فضل الحق کے لئے ایسے حالات میں لیگ ہائی کمان کے خلاف بغاوت کرنا آسان نہیں تھا۔ سوبھاش چندر بوس کے گاندھی کے نام 21 / دسمبر 1938ء کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی نومبر 1938ء تک بوس برادران کی اس تجویز سے متفق تھا کہ بنگال میں لیگ۔ پرجا مخلوط پارٹی کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ کانگرس۔ پرجا مخلوط وزارت بنائی جائے۔ لیکن دسمبر 1938ء میں اس نے گھنشام داس برلا کے مشورہ کے مطابق یہ رائے قائم کر لی کہ ''اگر حق وزارت کا تختہ الٹ کر کانگرس۔ پرجا مخلوط وزارت بنائی گئی تو اس سے کانگرس کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' سرت چندر بوس کے پرائیویٹ سیکرٹری نراد۔ سی چودھری کے بیان کے مطابق ''گھنشام داس برلا کی جانب سے بنگال کی سیاست میں مداخلت کرنے کی وجہ اس کے اس خدشہ میں مضمر تھی کہ بنگال میں ہندو۔ مسلم اتحاد یعنی مخلوط وزارت کے قیام سے کلکتہ میں مارواڑیوں کے معاشی غلبہ پر برا

اثر پڑے گا۔گاندھی نے مارواڑیوں کے مفاد کے پیش نظر دانستہ طور پر اپنی رائے بدلی تھی۔وہ بوس اور بنگالی مفادات کے خلاف تھا۔وہ بنگال میں صرف اپنے ہی لوگوں کا فائدہ چاہتا تھا۔"[16]

کانگرس کے ساتھ مصالحت کے لئے جناح کا 21۔نکاتی فارمولا جسے کانگرس نے مسترد کردیا

مولوی فضل الحق نے ہندوستان کی مسلم اقلیت کے خلاف کانگرس کی اس سازشی سیاست کے باوجود اپنی متذکرہ تقریر میں کانگرس کو اشتراک عمل کی جو دعوت دی، وہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ جناح کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ کی قسم کا معاہدہ ہو اور پھر اس معاہدے کی بنیاد پر ہندوستان کے سارے صوبوں میں کانگرس اور لیگ کی مخلوط وزارتیں بنائی جائیں جو پائیدار ہندو۔مسلم اتحاد کے لئے مشترکہ پروگرام پر عمل کریں۔وہ اپنی اس پالیسی کے تحت مرکزی اسمبلی میں کانگرس کے ساتھ بالعموم اشتراک وتعاون کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان کے اسی دوستانہ رویے کی وجہ سے مرکزی اسمبلی میں برطانوی سامراج کے خلاف اکثر ہندو۔مسلم اتحاد کی فضا پائی جاتی تھی۔لیکن جب جولائی 1937ء میں کانگرس نے صوبائی وزارتیں قبول کرنے کے فیصلے کے بعد مسلم لیگ کے دست تعاون کو حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا اور اکے دکے مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا کر خالص کانگرسی وزارتیں قائم کرنے کی پالیسی پر بالا اصرار عمل کیا اور پھر یو۔پی اور بہار وغیرہ کی کانگرسی وزارتوں نے جو بعض فرقہ پرستانہ اقدامات کئے تو ان سب عوامل سے نہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تعلیم یافتہ مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں سخت اضطراب و ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ جناح کانگرس کے ساتھ اشتراک وتعاون کے بدستور خواہاں رہے۔اگرچہ اب ان کی شرائط ذرا سخت ہوگئی تھیں۔انہوں نے لیگ کے اس خصوصی سیشن میں شرکت کے لئے کلکتہ آنے سے چند دن قبل 11 راپریل کو دہلی میں کانگرس سے مصالحت کے لئے ایک 21 نکاتی فارمولا پیش کیا تھا۔ ان میں 14 نکات تو وہ تھے جو انہوں نے مارچ 1927ء میں مسلم لیگ کے دو دھڑوں میں اتحاد کے موقع پر پیش کئے تھے اور مزید سات نکات یہ تھے:

1۔ مسلم لیگ سیاسی پارٹی کی حیثیت میں کانگرس سے الگ بدستور قائم رہے گی اور کانگرس میں مدغم نہیں ہوگی۔

2۔ کانگرس نے مسلم عوام کو کانگرس میں لانے کا جو پروگرام مرتب کیا ہے اسے ترک کردے۔

3۔ فرقہ وارانہ مسائل پر مسلم لیگ کو کامل آزادی ہوگی۔

4۔ لوکل باڈیز کے انتخابات میں جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج رہے گا اور اس کی بجائے مخلوط نیابت کا سلسلہ جاری کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

5۔ کانگرس کو قومی سہ رنگے کے برابر مسلم لیگ کے جھنڈے کو اہمیت دینی ہوگی اور دونوں جھنڈے ہر جگہ ہمیشہ لہرائے جائیں گے۔

6۔ کانگرس بندے ماترم کے گیت کو ترک کردے گی۔

7۔ ہندی کے حق میں کانگرس نے جو پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے اسے بند کرے گی، ہندی سہاپتہ سمّیلن اور ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والے دیگر تمام اداروں سے تعلق منقطع کرلے گی اور ہندی کے برابر اردو کو درجہ دے گی۔

جب جناح نے یہ مصالحتی فارمولا پیش کیا تھا، اس وقت سوبھاش چندر بوس انڈین نیشنل کانگرس کا صدر تھا۔ وہ اگرچہ اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتا تھا لیکن دراصل اس کے سیاسی رجحانات فسطائی تھے۔ وہ کمیونل ایوارڈ، جداگانہ طریقۂ انتخاب اور فرقہ وارانہ جماعتوں کا سخت مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ پورے ہندوستان میں کانگرس اور صرف کانگرس کا راج ہو۔ چنانچہ کانگرس نے جناح کے ان مطالبات کو فوراً مسترد کردیا اور اس نے اپنی مسلم رابطۂ عوام، یعنی مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی پالیسی پر عمل جاری رکھا۔

صدر کانگرس سوبھاش بوس کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے منافقانہ حربے ناکام رہے...... مسلم لیگ کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ

سوبھاش بوس نے اس مقصد کے لئے پہلے 11راپریل کو ایک مسلمان مولوی اشرف الدین چودھری کو بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کا سیکرٹری منتخب کروایا اور پھر پورے صوبہ کا دورہ کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ’’بنگال کی مسلم وزارت کے فرقہ وارانہ شوروغوغا کا یہی ایک مؤثر علاج ہو

سکتا ہے۔ وہ امید کرتا تھا کہ مسلم عوام میں طویل پروپیگنڈا کیا جائے اوران پر کانگرس کے اقتصادی پروگرام کی اہمیت واضح کی جائے تو فرقہ وارانہ کشیدگی رفع ہو جائے گی۔ وہ اس سلسلے میں پرجا پارٹی کے ان مسلم ارکان سے امداد کی توقع کرتا تھا جو سرکاری پارٹی سے قطع تعلق کر چکے تھے۔''[17]
اس کے اس پروگرام کے مطابق 21/اپریل کو کانگرس میونسپل ایسوسی ایشن نے یہ فیصلہ کیا کہ ''کلکتہ کارپوریشن کے میئر کے انتخاب کے لئے کسی مسلم رکن کو امیدوار کھڑا کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں جن مسلم امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوں گی ان کے ناموں کی فہرست ابوالکلام آزاد کو پیش کی جائے گی جس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔''[18] پھر اسی پروگرام کے تحت 26/اپریل کو کلکتہ میں چند کانگرسی مسلمانوں کی کانفرنس ہوئی جس میں قرار پایا کہ صوبہ بنگال کے مولویوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں بیرون بنگال سے بھی مولوی مدعو کئے جائیں اور اس طرح مسلم عوام میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے فضا تیار کی جائے۔ مقتدر کانگرسی لیڈر وقتاً فوقتاً مسلم محلوں میں جائیں اور محلوں کے چودھریوں سے مل کر ان کو کانگرس کے اغراض و مقاصد سے آشنا کریں گے۔ مسلمانوں کو کانگرس کے ممبر بنانے کے لئے ایک کمیٹی مرتب کی جائے، مسلم والنٹیر وں کی ایک کور صوبہ سرحد کے خدائی خدمتگاروں کے اصولوں وضوابط کے مطابق قائم کی جائے۔''[19]

29/اپریل کو اے۔ کے۔ ذکریا اور ایم۔ سی۔ نائر کو کلکتہ کارپوریشن کا علی الترتیب میئر اور ڈپٹی میئر منتخب کیا گیا۔ ذکریا کا نام سوبھاش چندر بوس نے تجویز کیا اور نلنی سین گپتا نے ان کی تائید کی۔ یہ کاروائی کانگرس میونسپل ایسوسی ایشن کے 21/اپریل کے فیصلے اور سوبھاش چندر بوس کے اس اعلان کے مطابق ہوئی کہ اس سال کارپوریشن کے یہ دونوں عہدے مسلمان اور اچھوت کو دیئے جائیں گے کیونکہ بنگال کی فرقہ وارانہ فضا اور سیاسی صورت حالات میں اس طرح اصلاح ہو جائے گی اور اچھوتوں اور مسلمانوں میں کانگرس کا پروپیگنڈا نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جا سکے گا۔[20] لیکن بوس کی یہ ساری تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں اور چند ہی دنوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ بنگال کے مسلم عوام کانگرس کی اس فریبی سیاست کا شکار نہیں ہوں گے۔

صدر مسلم لیگ محمد علی جناح ان دنوں اپنی جماعت کے خصوصی اجلاس کے 19/اپریل کو خاتمہ کے بعد کلکتہ میں ہی مقیم تھے اور وہ جہاں جاتے تھے شہر کے مسلمان ان کا والہانہ استقبال کرتے تھے۔ چنانچہ 22/اپریل کو انہوں نے سٹیٹس مین (Statesman) سے ایک

انٹرویو میں کہا کہ لیگ کے خصوصی اجلاس نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانان بنگال، مسلم لیگ کے جملہ اغراض و مقاصد کی کامل تائید و حمایت کرتے ہیں۔ خضر پور گھاٹ پر مسلم رضا کاروں نے جس والہانہ سرگرمی کے ساتھ میرا استقبال کیا اس نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور حاضرین نے جس جوش و خروش کے ساتھ نعرے بلند کئے اس سے یہ بات مترشح تھی کہ رضا کار اور عوام سب بیدار ہو چکے ہیں اور مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے ہیں۔''

جناح کا یہ انٹرویو خود فریبی پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد حقیقت پر تھی جس کا ایک مظاہرہ 6رمئی 1938ء کو کلکتہ کے نئے مسلمان میئر کی زیر صدارت کارپوریشن کے پہلے اجلاس میں ہوا جبکہ ایک مسلمان ممبر نے تحریک پیش کی کہ علامہ اقبال کی وفات (21۔اپریل) پر اظہار تعزیت کے لئے کارپوریشن کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ اس پر سوبھاش چندر بوس رضامند نہ ہوا اور اس نے یہ تحریک پیش کی کہ کارپوریشن کا اجلاس سارے دن کے لئے ملتوی کرنا جائز نہ ہوگا۔ عام اتفاق رائے سے صرف دس منٹ کے لئے ملتوی کیا جاسکتا ہے۔ محمد ذکریا میئر نے کہا کہ کارپوریشن اس سے پیشتر یہ قرارداد منظور کر چکی ہے کہ کسی موت کے باعث اجلاس ملتوی نہ کیا جائے۔ میئر کے اس بیان کے بعد کارپوریشن کے تمام مسلمان ارکان احتجاج کے طور پر اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے۔[21]

کارپوریشن کے اس اجلاس کے چند دن بعد کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کی مسلمانوں کے سارے طبقوں میں روز افزوں مقبولیت کے پیش نظر سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح سے ہندو۔ مسلم سمجھوتے کے لئے گفت وشنید کی جائے۔ اس کا یہ فیصلہ دراصل اس اعتراف کے مترادف تھا کہ اس کے پیشرو جواہر لال نہرو نے مارچ 1937ء میں مسلم رابطۂ عوام کی جو تحریک شروع کی تھی وہ صرف اس لحاظ سے نتیجہ خیز ہوئی ہے کہ مسلم لیگ نے جو اکتوبر 1937ء سے قبل مسلمان جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور سرمایہ داروں کی تنظیم تھی، اس نے اب ایک زبردست عوامی جماعت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ اس نے 11 اور 12رمئی کو کلکتہ میں جناح سے کئی گھنٹے تک ملاقاتیں کیں مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب جناح کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی با اختیار نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ سوبھاش بوس اس مطالبہ کو کسی صورت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور وہ اپنی مسلم رابطۂ عوام

کی تحریک جاری رکھنے پر مصر تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ''مسلمانوں کے ان حلقوں اور طبقوں میں بیداری کے آثار ہویدا ہیں جو اب تک کانگرس کی (مسلم رابطۂ عوام کی) تحریک سے بالکل الگ تھلگ رہے ہیں۔''

بوس کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد تھا۔ کانگرس کی مسلم رابطۂ عوام کی تحریک نہ صرف بنگال کے شہری مسلمانوں میں بلکہ دیہات کے غریب کسانوں میں بھی بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ اس کی ایک فوری وجہ یہ تھی کہ سرت چندر بوس اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی جانب سے لگان داری کے ترمیمی بل کی مخالفت ہو رہی تھی اور ان کے دباؤ کے تحت صوبائی گورنر نے مقررہ معیاد میں یعنی 31 رمئی تک اس بل کی منظوری نہیں دی تھی۔ اس بل کے تحت غریب مسلمان اور اچھوت کسانوں کو کچھ رعائتیں ملنے کی توقع تھی مگر گورنر کانگرسی لیڈروں اور یورپین گروپ کے زیر اثر انہیں یہ رعائتیں دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ مہاراج ادھیراج بہادر بردوان کے اس خیال سے متفق تھا کہ ''اس بل کے تحت جاگیرداری کی فیس کی قطعی تنسیخ بندوبست دوامی کی شرائط کے منافی ہوگی اور اس سے زمینداروں کے حقوق ملکیت سلب ہوں گے۔'' چنانچہ گورنر نے یہ بل برائے استصواب وائسرائے کو بھیج دیا اور پھر اس نے وائسرائے کی منظوری سے یکم جون کو ایک آرڈیننس جاری کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انتقال اراضی کی رجسٹریشن کے لئے جو معیاد مقرر ہے اس کی توسیع کر دی جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں گورنر ہاؤس سے جو اعلان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ یہ آرڈیننس عارضی نوعیت کا ہے اور اس سے لگان داری بل کی منظوری کے متعلق آخری فیصلے کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق گورنر کے اس رویے سے برہم ہوا اور اس نے ایک مرتبہ پھر اعلان کیا کہ ''اگر اس بل پر مہر تصدیق ثبت نہ کی گئی تو ہمارے لئے مستعفی ہو جانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔''

کانگرس کی مسلم رابطہ عوام کی تحریک کے پس منظر میں فضل الحق کے اس قسم کے اعلانات سے مسلمانان بنگال پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوئے ان کی ایک مثال 14 رجون کو کومیلا میں نظر آئی۔ یونائیٹڈ پریس کی اطلاع کے مطابق ''صدر کانگرس سوبھاش چندر بوس کے اعزاز میں ایک مقامی مسلمان نے اپنے مکان پر دعوت ترتیب دی تھی جو ایک افسوسناک واقعہ کے باعث انجام نہ پا سکی۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسلمان کا بہنوئی بھی اس مکان کا حصہ دار تھا۔ اس نے مہمانوں کو مکان میں

داخل ہونے سے روک دیا اور کہا کہ میں دعوت کی اجازت نہیں دے سکتا۔اس نے مہمانوں اور صدر کانگرس کو مکان میں داخلے سے روکنے کے لئے مکان پر پہرہ لگوا دیا۔اس سبب سے مہمان مکان کے اندر داخل نہ ہو سکے۔صورت حالات نازک ہوگئی۔مقامی سب ڈویژنل آفیسر کو اطلاع ملی۔اس نے موقع پر حالات کا اندازہ کرنے کے بعد اجتماع کو خلاف قانون قرار دے کر منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔اس پر صدر کانگرس دیگر مہمانوں کے ساتھ مکان سے چلے گئے۔"[22] اس کے دو دن بعد سوبھاش چندر بوس مسلم عوام سے رابطہ کے لئے برہمن باڑیا پہنچا تو وہاں کے کانگرسیوں نے اس کی عزت افزائی کے لئے ایک استقبالیہ جلوس نکالا۔اس جلوس پر مسلمانوں نے سنگ باری کی جس کے نتیجے میں 10 اشخاص مجروح ہوئے۔مجروحین میں سوبھاش چندر بوس کے علاوہ بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کا سیکرٹری مولوی اشرف الدین چودھری بھی شامل تھا۔"[23]

بلاشبہ یہ دونوں واقعات افسوس ناک تھے لیکن یہ اس حقیقت کا بین ثبوت تھے کہ کانگرس ہائی کمان کا یہ خیال سراسر خود فریبی پر مبنی تھا کہ وہ بنگال میں محض اقتصادی نعرے لگا کر غریب مسلم عوام کو اپنے ساتھ ملا لے گی۔بنگال میں اس تحریک کی ناکامی اس لئے بھی ناگزیر تھی کہ اس صوبہ کے کانگرسی لیڈر کلکتہ کارپوریشن، کلکتہ یونیورسٹی، صوبائی حکومت کے محکموں، تجارت، صنعت اور زراعت میں مسلمانوں کو ذرا سی بھی رعایت دینے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ان کے اس تنگ دلانہ رویے کے پیش نظر یہ کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ غریب مسلم عوام محض کھوکھلے اقتصادی نعرے سن کر کانگرس کا دامن تھام لیں گے۔علاوہ بریں بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف ایک معاشی تضاد ہی نہیں تھا بلکہ ان کے تاریخی فرقہ وارانہ تعلقات بے شمار سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تضادات سے بھرپور تھے۔ان تضادات کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کئے بغیر بنگالی مسلمانوں کو کانگرس کے جھنڈے تلے جمع نہیں کیا جا سکتا تھا۔بنگالی مسلمانوں کی جانب سے بندے ماترم کے گیت کے خلاف احتجاج سیاسی و ثقافتی نقطہ نگاہ سے بے معنی نہیں تھا اور کانگرسی ہندوؤں کی جانب سے اس گیت کے مسئلہ کو ایک قومی مسئلہ بنا لینا بھی اہمیت سے خالی نہیں تھا۔اس مسئلہ پر ہندو۔مسلم تنازعہ دونوں فرقوں کے درمیان شدید ثقافتی تضاد کی آئینہ داری کرتا تھا۔کانگرس ہائی کمان نے اس تنازعہ کو حل کرنے کی جو نیم دلانہ کوشش کی اس سے تعلیم یافتہ بنگالی مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

باب: 5

مسلمانوں کے لئے رعایتوں کا مسئلہ اور ہندوؤں کی مخالفانہ مہم، حق وزارت زبردست مسلم عوامی حمایت کی بدولت محفوظ رہی

حق وزارت کا بحران...... باغی گروپ کو نکال کر فضل الحق نے وزارت بچالی

حق وزارت کے خلاف سوبھاش چندر بوس، سرت چندر بوس، گھنشام داس برلا، مہاراجہ ادھیراج بردوان اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے علاوہ ہزاروں ہندو زمینداروں، سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی مہم کا یہ نتیجہ نکلا کہ صوبائی وزارت میں وقتی طور پر بحران پیدا ہو گیا۔ وزارتی بحران کی خبریں مئی 1938ء کے اواخر میں ہی پھیلنا شروع ہو گئی تھیں جبکہ یہ واضح ہو گیا تھا کہ صوبائی گورنر ہندو اور یورپین زمینداروں کے زیر اثر مزارعت سے متعلقہ دوسرے ترمیمی بل کی منظوری دینے میں پس وپیش کر رہا ہے۔ اس بحران کا سبب یہ تھا کہ وزیر بلدیات مولوی نوشیر علی کو یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ اگر وہ حق وزارت کا تختہ الٹنے میں کانگرس کا ساتھ دے تو صوبہ میں وہ خود ایک ترقی پسند اور مستحکم وزارت بنا سکے گا۔ چنانچہ جب نوشیر علی نے اس امید کے تحت اسمبلی کے بعض مسلم ارکان کے ساتھ ساز باز شروع کی تو اس کے دوسرے وزرا کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ روزنامہ انقلاب کی 2/جون کی رپورٹ کے مطابق ''چونکہ وزارت کی عام پالیسی پر اس تنازعہ کا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا اس لئے وزیر اعلیٰ فضل الحق نے مولوی نوشیر علی کو راہ راست پر لانے

کی کوشش کی مگر وہ بیرونی اثرات سے اس قدر مغلوب ہو چکا ہے کہ اس پر ان نصائح اور مشوروں کا اثر نہیں ہوا لہٰذا اسے الٹی میٹم دیا گیا ہے کہ وہ وزارت کی پالیسی پر کاربند رہنا منظور کرے ورنہ اسے وزارت سے الگ کر دیا جائے گا۔''

جب اس الٹی میٹم کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو وزیر اعلیٰ فضل الحق نے جون کے دوسرے ہفتے میں نوشیر علی سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا جو اس نے 14 رجون کو ایک اخباری بیان کے ذریعے مسترد کر دیا اور اعلان کیا کہ ''میں مطلقاً مستعفی نہیں ہوں گا۔'' مولوی نوشیر علی کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے اس لئے اس کے مستعفی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نوشیر علی نے اپنے اس دعوے کی بنیاد پر 22 رجون کو صوبائی گورنر سے ملاقات کی مگر وہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ اسے واقعی ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ چنانچہ 23 رجون کو مولوی فضل الحق نے اپنی کابینہ کا استعفیٰ پیش کر دیا اور پھر اس نے اسی دن گورنر کی دعوت پر نئی کابینہ کی تشکیل کی جس میں نوشیر علی شامل نہیں تھا۔ کانگرسی حلقوں کا خیال تھا کہ چونکہ نوشیر علی کرشک پرجا پارٹی کے بانیوں میں سے ہے اس لئے اس کے فضل الحق سے قطع تعلق کے نتیجے میں پرجا اسمبلی پارٹی میں زبردست پھوٹ پڑ جائے گی اور اس طرح رجعت پسند حق وزارت کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ نوشیر علی کی ایسی ترقی پسند وزارت قائم ہو گی جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کانگرس پارٹی کی حمایت پر انحصار کرے گی۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو جولائی کے اوائل میں مولوی فضل الحق نے ایک طویل بیان میں الزام عائد کیا کہ ''نوشیر علی نے وزارت سے علیحدگی سے قبل اسے جو خطوط لکھے تھے ان کا خلاصہ چند کانگرسی اخبارات کے ایڈیٹروں سے اس منصوبے کے تحت تیار کروایا تھا کہ ان کی اخبارات میں تشہیر کی جائے گی......نوشیر علی کے خطوط کی زبان اور بنگال کے چند انگریزی اور دیسی زبان کے کانگرسی اخباروں میں ہماری وزارت پر جو اعتراضات اور اظہار رائے کئے گئے ہیں ان دونوں میں نسلی مشابہت (ہم آہنگی) معلوم ہوتی ہے۔ نوشیر علی اب تک اپنے ماسٹر کی آواز دہراتا رہا ہے۔''[1]

نوشیر علی کے خلاف فضل الحق کا یہ الزام واقعتاً صحیح تھا یا غلط، بنگال کی مسلم رائے عامہ کے نزدیک اس چھان بین کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جولائی 1938ء میں بنگال کے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ عناصر ہر اس مسلمان لیڈر کو مردود سمجھنے لگے تھے جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی

شبہ ہوتا تھا کہ اس کا کانگرسیوں سے کوئی سیاسی رابطہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ ایک سال کے دوران کانگرس نے ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کے بارے میں اور پنجاب و بنگال کی غیر کانگرسی وزارتوں کے بارے میں جو فرقہ پرستانہ، معاندانہ اور تفرقہ انگیز پالیسی اختیار کی تھی اس نے ہندو۔ مسلم اختلافات کی نوعیت دشمنانہ کر دی تھی۔

بنگالی مسلمانوں کی اکثریت کے نمائندوں نے ہندو۔ مسلم تضاد کی وجہ سے اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کا مطالبہ کیا

بنگال میں ہندو۔ مسلم تنازعہ میں اس قدر زہر بھر چکا تھا کہ بنگالی مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ محض ہندوؤں کی مخالفت کرنے کے لئے اردو زبان اپنانے پر بھی آمادہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے اسی رویے کی بنا پر 6/ جولائی کو کلکتہ کارپوریشن کے اجلاس میں اس سوال پر بڑی بحث ہوئی کہ آیا بنگالیوں کو ہندوستانی (ہندی اور اردو) سیکھنی چاہیے یا نہیں۔ یہ سوال بیگم سکینہ فرخ سلطان موئززادہ کے ایک ریزولیوشن پر پیدا ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کارپوریشن ٹیچر ٹریننگ امتحان میں ہندوستانی (ہندی اور اردو) کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ ریزولیوشن کی شدید مخالفت کی گئی۔ مخالفت کرنے والوں میں اے۔ کے۔ ایم۔ ذکریا بھی شامل تھا جو کچھ دن پہلے بوس برادران کی حمایت سے کارپوریشن کا میئر منتخب ہوا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ ”بنگال کے مسلمانوں کو شرم کرنی چاہیے کہ انہوں نے معقول طور سے بنگالی نہیں سیکھی۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی 55 فیصد ہے لیکن لٹریچر میں ان کا بہت کم حصہ ہے۔ اگر وہ دوسری جماعتوں کی سطح پر آنا چاہتے ہیں تو انہیں صوبہ کی زبان سیکھنی چاہیے۔ اس نے مولوی فضل الحق، خواجہ ناظم الدین اور عبدالرحمان صدیقی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ وہ مسلمانوں کو اردو مادری زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں حالانکہ یہاں چاٹگام، ڈھاکہ، مرشد آباد، مدنا پور اور کلکتہ کی قلیل آبادی کے سوا کون اردو بولتا ہے۔ بنگال کے سارے کے سارے مسلمان بنگالی بولتے ہیں۔“[2]

مولوی فضل الحق نے ذکریا کی اس تقریر کا جواب 21/ جولائی کو اس طرح دیا کہ اس نے ڈھاکہ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں اردو میں تقریر کی۔ اس نے اپنی اس تقریر میں پہلے تو یہ کہا کہ ”ڈھاکہ ہمارا تاریخی دارالسلطنت ہے۔ آج بھی گو انگریز کلکتہ کو دارالسلطنت بنائے ہوئے ہیں

مگر ہم مسلمانوں کے لئے ڈھاکہ ہی دارالسلطنت کی حیثیت رکھتا ہے'' اور پھر اس نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کی ایک عجیب و غریب مثال پر روشنی ڈالی۔ اس نے کہا کہ ''صاحبان! ہمارے راستے میں جو مشکلات کھڑی کی جاتی ہیں کہاں تک ان کا ذکر کریں۔ حد یہ ہے کہ محمڈن اسپورٹنگ کے کھیلوں میں بعض ہندوستانی ٹیموں نے جن کا نام میں نہ لوں گا جان بوجھ پر اپنے آپ کو ہرا دیا تا کہ مخالف کے پوائنٹ بڑھ جائیں اور محمڈن اسپورٹنگ چمپئن نہ ہو سکے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس پر بھی اس نے محمڈن اسپورٹنگ کو کامیاب کیا۔''[3] غالباً مولوی فضل الحق کا یہ الزام بے بنیاد نہیں تھا۔ ان دنوں برصغیر کے ہر علاقے کے ہر شعبۂ زندگی میں آئے دن فرقہ وارانہ تعصب کے اس قسم کے مظاہرے ہوتے تھے۔ 1922ء میں پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد پنجاب میں مسلمان والدین کو سو فیصدی یقین ہوتا تھا کہ ہندو ممتحن ان کے بچوں کو جان بوجھ کر فیل کرتے ہیں اور کلکتہ یونیورسٹی کے بارے میں بھی مسلمان والدین کا یہی تاثر تھا۔ چنانچہ اسی لئے وہ نہ صرف اس یونیورسٹی سے الگ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے قیام کا مطالبہ کرتے تھے بلکہ یہ بھی مطالبہ کرتے تھے کہ کلکتہ میں ایک الگ مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جس طرح لاہور میں اسلامیہ کالج اور ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج کے درمیان کھیلوں کے مقابلوں میں فرقہ واریت کا عنصر غالب ہوتا تھا اسی طرح کلکتہ میں فٹ بال کے میچ بھی فرقہ پرستی کے جذبہ سے بالاتر نہیں ہوتے تھے۔ فرقہ واریت سے مبرا اسپورٹنگ سپرٹ کے نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ کلکتہ میں فٹ بال کے میچ دراصل ہندو۔ مسلم میچ ہوتے تھے۔

کانگرس، ہندو مہاسبھا اور پرجا پارٹی باغی گروپ کی جانب سے حق وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریکوں کی ناکامی

فرقہ وارانہ کشیدگی کی اس فضا میں سوبھاش چندر بوس کی مسلم رابطۂ عوام کی مہم کے کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ 21 رجولائی کو برہم پور سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ رادھ گھاٹ میں چند کانگرسیوں نے مسلم عوام میں کانگرس کے پروپیگنڈے کی غرض سے ایک جلسہ کا اعلان کیا۔ لیکن مقامی مسلمانوں نے ان کو جلسہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ 29 رجولائی کو صوبائی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو اس پر بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کا طویل اور گہرا سایہ

پڑا ہوا تھا۔ کانگرس پارٹی نے اس اجلاس میں حق وزارت کا تختہ الٹنے کے لئے بڑی تیاری کی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جون میں وزیر بلدیات نوشیر علی کی وزارت سے علیحدگی کے بعد پرجا پارٹی میں پھوٹ پڑے گی تو فضل الحق کو اپنی کابینہ کے ہمراہ مستعفی ہونا پڑے گا۔ نوشیر علی 23رجون کے بعد سے یہ اعلان کر رہا تھا کہ اسے ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے اس اعلان کی ایک بنیاد تو یہ تھی کہ کانگرس اور ہندو مہا سبھا نے اسے اپنی غیر مشروط حمایت کا پورا یقین دلا رکھا تھا اور دوسری بنیاد یہ تھی کہ شمس الدین احمد اور مولوی تمیز الدین خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کچھ عرصہ قبل وزارت کی حمایت سے دستبردار ہو چکے تھے اور نوشیر علی کی ''ترقی پسند'' کابینہ میں عہدے قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ فضل الحق نے ان دونوں کو جون کے اوائل میں وزارتوں کی پیشکش کی تھی مگر انہوں نے نوشیر علی کی کامیابی کی امید میں یہ پیشکش مسترد کر دی تھی۔ چنانچہ جب 29رجولائی کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو یہ دونوں نوشیر علی کے ہمراہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تاہم اس دن فریقین کے درمیان کوئی زور آزمائی نہ ہوئی۔ اگرچہ سپیکر نے ایوان کو یہ بتایا تھا کہ صوبائی گورنر نے قانون مزارعت (ترمیمی) بل میں بعض ترامیم کر کے اسے واپس اسمبلی کے پاس بھیج دیا ہے۔

30رجولائی کو کانگرس کے زیر اہتمام کلکتہ کے میدان اور ٹاؤن ہال میں زبردست مظاہرے کئے گئے جن میں حق وزارت کو رجعت پسند قرار دے کر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے مزدوروں اور کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی مؤثر کاروائی نہیں کی۔ 31رجولائی کو مقامی مسلم لیگ نے وزارت کی حمایت میں زبردست جلسہ کیا جس میں مولانا اکرم خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''کانگرس میمن سنگھ کے مہاجنوں کے لئے اور زمینداروں کے لئے بہت بے قرار ہے۔ وہ بنگال ٹیننسی بل (TenancyBill) کی صرف اس لئے مخالف ہے کہ اس سے کسانوں کو فائدہ ہوگا۔ مولانا نے کانگرسیوں کو متنبہ کیا کہ وہ اشتعال انگیزی سے باز آ جائیں ورنہ اس کا نتیجہ بہت ہی برا ہوگا۔''

فریقین کی جانب سے عوامی قوت کے ان مظاہروں کے بعد 2راگست کو اسمبلی کا اجلاس ہوا تو حزب اختلاف کی طرف سے کابینہ کے دس وزرا کے خلاف عدم اعتماد کی دس تحریکیں پیش کی گئیں۔ سپیکر نے ان پر بحث کے لئے 8راگست کی تاریخ مقرر کر دی۔ عصر جدید کا اسمبلی کی اس کاروائی پر تبصرہ یہ تھا کہ ''اگرچہ یہ ساری سازش کانگرس پارٹی کی ہے لیکن کانگرس پارٹی نے

براہ راست کوئی تجویز پیش نہیں کی بلکہ تمام تجویزیں اپوزیشن کے پرجا ارکان، اچھوت، مزدور اور انڈیپنڈنٹ گروپوں کے نام سے پیش کی گئی ہیں۔"[4]

3راگست کو اسمبلی میں ٹیننسی (Tenancy) امینڈمنٹ بل گورنر کی تجویز کردہ ترامیم کے ساتھ اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا تو اسی دن کلکتہ مسلم لیگ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ''حق وزارت کی حمایت کے لئے 8راگست کو کلکتہ میں مکمل ہڑتال ہوگی اور ایک جلسہ عام ہوگا۔'' چنانچہ جب 8راگست کا دن آیا تو عصر جدید کی رپورٹ یہ تھی کہ ''حق وزارت کے فدائیوں نے کلکتہ میں جو مظاہرہ پیش کیا ہے شاید ہی دنیا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہو۔ پانچ لاکھ انسانوں کا پانچ میل لمبا جلوس تھا۔'' دوسری طرف اس دن اسمبلی کی کاروائی کے بارے میں اس اخبار کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اسمبلی کے تقریباً سو ممبر آج کی اسمبلی میں شرکت کرنے کے لئے گزشتہ رات ہی سے اسمبلی چیمبر میں پہنچے ہوئے ہیں۔ رات انہوں نے کونسل چیمبر میں گزاری۔ ایسا انہوں نے اس خوف سے کیا کہ شاید آج اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے پہنچنے میں دشواری پیش آئے۔ ان ممبروں میں نوشیر علی، ٹی۔ گوسوامی، تمیز الدین خان، آفتاب علی، ڈاکٹر ثنا اللہ، جوگندر ناتھ منڈل اور رائے بہادر جوگیش چندر سین وغیرہ شامل ہیں۔'' یہ ارکان سارا دن اسمبلی ہال میں بیٹھے رہے تا آنکہ پونے پانچ بجے سہ پہر اسمبلی کی کاروائی شروع ہوئی۔ چند سوالات کے بعد حزب اختلاف کی جانب سے پیش کردہ عدم اعتماد کی دس تحریکوں پر دو دن تک بحث ہوئی۔ جس کے دوران یہ ساری تحریکیں یکے بعد دیگرے کثرت رائے سے مسترد کر دی گئیں۔ باقاعدہ رائے شماری صرف ایک تحریک پر ہوئی تو معلوم ہوا کہ حکومت کو ایوان کے 130 ارکان کی حمایت حاصل ہے جبکہ حزب اختلاف کے ساتھ کل 111 ارکان ہیں۔ تاہم حق وزارت کے لئے رائے شماری کا یہ نتیجہ کوئی خاص اطمینان بخش نہیں تھا کیونکہ وہ ان تحریکوں کی زد سے صرف یورپین گروپ کی حمایت کی وجہ سے بچی تھی اور یہ حقیقت اس امر کی علامت تھی کہ آئندہ اس وزارت کے وجود کا انحصار یورپین گروپ کی حمایت پر ہی ہوگا۔ گویا کانگرس نے محض لیگ دشمنی کے جذبہ کے تحت صوبہ کی عنان اقتدار عملاً مٹھی بھر یورپی ارکان اسمبلی کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔ وزیر تجارت و محنت حسین شہید سہروردی کے بقول یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ کانگرس پارٹی کسی ایسے مسلمان کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ بنانا چاہتی ہے جو بالکل کاٹھ کا الو ہو اور اس کے ہاتھ میں کھیلے۔

حق وزارت کے خلاف کانگرس پارٹی کی اسمبلی کے اندر اور باہر سازشی سرگرمیوں پر روزنامہ ''عصر جدید'' نے 13 راگست کو ایک زوردار اداریہ میں یہ اعلان کیا کہ ''حق وزارت کو بچانا مسلمانان بنگال کا اسلامی فرض ہے اور الحمدللہ انہوں نے یہ فرض خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔ مسلمانوں کے جذبہ اسلامی کو فریب، مکر اور سازش کے زور سے دبایا نہیں جا سکتا...... بلاشبہ مسلمان یہ جانتے ہیں کہ جس طرح سات صوبوں کی کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے حتیٰ کہ قانوناً اور حکماً بعض وزارتوں نے بہت سی جگہوں کے مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے سے روک دیا ہے اور علی الاعلان اسلام کے حکم کے مطابق ایک حلال چیز کو کانگرسی وزارت نے بہت سے مقامات کے مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر بنگال میں کانگریسی راج قائم ہو جائے گا تو کیا کانگریسی یہی صورت یہاں پیدا نہیں کریں گے۔ جبکہ سرحد کی 95 فیصد مسلم اکثریت میں کانگرسی وزارت ہونے کی وجہ سے مسلمان بچوں کو انجمن حمایت اسلام لاہور کی کتابوں کے پڑھنے کی اجازت کے خلاف شور برپا ہے کیونکہ ان کتابوں میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ہے اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام موجود ہیں اور ان کی بجائے واردھا یا گاندھی جی کے اشارے سے مرتب کی ہوئی کتابیں مسلمان بچوں کو جبراً پڑھانے کا منصوبہ گانٹھا گیا ہے جس میں بھارت ماتا کے گیت ہوں گے۔ جب کانگرس سرحد میں وزارت قائم کر کے اسلامی تعلیمات کو اس طرح نظر انداز کرنا چاہتی ہے تو کیا بنگال میں وہ وزارت قائم کر کے یہی نہیں کرے گی۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اگر بنگال میں کانگرس راج قائم ہو گیا تو یہاں کے مسلمانوں کی شہری اور مذہبی آزادی کا بھی وہی حشر ہو گا جو کانگرسی صوبوں میں ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ حق وزارت کو بچانا اپنا اسلامی اور ملی فرق سمجھتے ہیں کیونکہ حق وزارت کے مسلم وزرا واردھا کے آسمان کی ہدایتوں کے فرمانبردار نہیں ہیں۔'' ''عصر جدید'' کے اس اداریے میں کانگرس کے خلاف جن تلخ جذبات کا اظہار کیا گیا تھا وہ صرف مسلمانان بنگال تک محدود نہیں تھے بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس قسم کے جذبات سے روز بروز مغلوب ہو رہی تھی مگر کانگرس کی قیادت نے اس مسئلہ سے بصیرت اور دانشمندی کے ساتھ نمٹنے کی بجائے اس مقصد کے لئے صرف یہی حربہ استعمال کیا کہ مسلمانوں کے جو عناصر ان جذبات کا اظہار کرتے تھے انہیں مذہبی جنونی اور فرقہ پرست قرار دے کر ہندوستان کی آزادی کے دشمن، رجعت پسند اور سامراج کے پٹھو قرار دیا جاتا تھا۔

ہندو مہاسبھا کی جانب سے کمیونل ایوارڈ کے خلاف مظاہرے

بنگال میں کانگرس اور ہندو مہا سبھا کی جانب سے حق وزارت کا تختہ الٹنے کی اس مشترکہ کوشش کی ناکامی کے بعد سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی پالیسی ترک کر کے مسلم لیگ کے ساتھ ٹھوس بنیادوں پر کوئی مفاہمت کی جاتی مگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ 14 راگست کو ہندو مہا سبھا کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ 18 راگست کو کمیونل ایوارڈ کے خلاف مظاہرے، جلوس اور جلسے ہوں گے۔ مہا سبھا کے اس فیصلے کی وجہ ہندوؤں کے اس غصہ میں مضمر تھی کہ 8 اور 10 اگست کو حق وزارت محض ان یورپیوں کی حمایت کی وجہ سے بچ گئی ہے جنہیں کمیونل ایوارڈ کے تحت ان کی آبادی سے بہت زیادہ نشستیں مل ہوئی ہیں۔ قدرتی طور پر کلکتہ کے مسلم لیگیوں نے ہندو مہاسبھا کے اس اعلان پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ 18 راگست کو محمد محسن خان صدر کلکتہ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی، راغب احسن سیکرٹری کلکتہ مسلم لیگ اور ملا جان محمد سیکرٹری کلکتہ خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''مسلمانان کلکتہ ہوڑہ، 24 پرگنہ و مضافات کو ہوشیار و خبردار کیا جاتا ہے کہ ہندو مہاسبھا کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ آج جمعرات 18 راگست کو ہندو کمیونل ایوارڈ کی مخالفت میں مظاہرہ، جلوس اور جلسہ کریں گے۔ مسلمانوں سے پرزور درخواست کی جاتی ہے کہ وہ بہر حال اپنے گھروں، دکانوں، محلوں اور گاؤں میں رہیں اور کسی صاحب جلوس و مظاہرہ کے پاس بھی نہ جائیں اور کسی حال میں اشتعال قبول نہ کریں بلکہ ہر حال میں پر امن رہیں۔'' چنانچہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اس دن کسی مظاہرہ، جلوس اور جلسہ میں شرکت نہ کی اور نہ ہی کوئی اشتعال قبول کیا۔ ہندوؤں کے جلسہ عام میں این۔ کے۔ باسو نے اپنی صدارتی تقریر میں کمیونل ایوارڈ کی سخت مذمت کی اور بتایا کہ اس ایوارڈ کے ذریعے ہندوؤں کی پوزیشن بہت کمزور کر دی گئی ہے۔ ایوارڈ کے ذریعے بنگال میں یورپین راج قائم ہو گیا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یورپین ایک دسواں حصہ پانے کے بھی مستحق نہیں ہیں لیکن مجالس قانون ساز میں انہیں 25 نشستیں دے دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بنگال میں انگریزوں کی حکومت اب تک باقی ہے۔ جلسہ میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں ایوارڈ کو غیر جمہوری اور غیر قومی کہہ کر اس کی مذمت کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ جب تک وہ منسوخ نہ کر

دیا جائے ایجی ٹیشن جاری رکھا جائے۔ کمیونل ایوارڈ کے خلاف اس احتجاج میں صوبائی کانگرس نے کھلم کھلا اس لئے حصہ نہیں لیا تھا کہ گاندھی اسے قبول کر چکا تھا اور بعد میں آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے بھی باپو کے اس فیصلہ کی توثیق کر دی تھی۔ تاہم صوبائی کانگرس کے پس پردہ تعاون سے ہندو مہا سبھا کے اس مظاہرے کی اصلی اور فوری وجہ یہ نہیں تھی کہ اس پر یکا یک یہ حقیقت عیاں ہوئی تھی کہ کمیونل ایوارڈ غیر جمہوری اور غیر قومی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ایوارڈ کی وجہ سے 8 اور 10 ر اگست کو حق وزارت کا تختہ نہیں الٹا جا سکا تھا۔ اگر یورپین گروپ کے 25 ارکان عدم اعتماد کی تحریک کے حق میں ووٹ دیتے اور اس کے نتیجے میں فضل الحق کی کابینہ کو مستعفی ہونا پڑتا تو ہندو مہا سبھا کو اس ایوارڈ میں کوئی برائی نظر نہ آتی بلکہ وہ اسے جمہوریت کے عین مطابق تصور کرتی۔ چونکہ بنگالی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو ہندو سرمایہ داروں، زمینداروں اور ساہوکاروں کی اس قسم کی دوغلی اور منافقانہ سیاست کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہی ہو چکی تھی اس لئے ہندو مہا سبھا کے اس مظاہرے نے اسے حق وزارت کے حق میں اور بھی زیادہ مستعد اور منظم کر دیا۔ چنانچہ 25 ر اگست کو اس طبقہ کے دباؤ کے تحت صوبائی اسمبلی میں سرکاری پارٹی کے ایک رکن عبدالحفیظ کی یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور کی گئی کہ پبلک سروسز میں 60 فیصد اسامیاں مسلمانوں کے لئے، 20 فیصد پست اقوام کے لئے اور 20 فیصد دوسری جماعتوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں۔

فضل الحق کا بہار، دہلی، شملہ اور سندھ کا دورہ......وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا اظہار یکجہتی

مسلمانوں کی جانب سے حق وزارت کی حمایت صرف بنگال کی سرحد پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اس کی حمایت کا دائرہ پورے برصغیر کے مسلمانوں تک پھیل گیا تھا۔ بالخصوص بہار، یو۔ پی، صوبہ جات متوسط (سی۔ پی) اور دوسرے ہندو اکثریتی صوبوں کے مسلمان شیر بنگال کو اپنے حقوق ومفادات کا بہترین محافظ سمجھتے تھے۔ چنانچہ صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے خاتمہ کے بعد 9 ر ستمبر 1938ء کو فضل الحق وائسرائے سے ملاقات کرنے بذریعہ ٹرین شملہ گیا تو راستے میں دہلی کے ریلوے سٹیشن پر ہزاروں مسلمانوں نے اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر شیر بنگال

نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''جس طرح آپ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں اسی طرح ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بنگال کے تمام مسلمان جو تمام ہندوستان کی اسلامی آبادی کا ایک تہائی ہیں مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں۔ جب یہ تنظیم مکمل ہو جائے گی تو کسی کی مجال نہ ہو گی کہ وہ آنکھ اٹھا کر مسلمانان بنگال کی طرف دیکھ سکے۔ تاہم میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی اگر کوئی مصیبت یو۔ پی یا دہلی کے مسلمانوں پر آئے تو میں اور بنگال کے تمام مسلمان بھائی آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

پھر شملہ سے واپسی پر یکم اکتوبر کو مولوی فضل الحق نے پٹنہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی صدارت کی اور روزنامہ عصر جدید کی رپورٹ کے مطابق ''فاضل صدر نے کانفرنس میں نہایت بلیغ اور بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ متعدد کانگرسی صوبوں میں کانگرسی حکومتوں نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ مسلم وقار اور مسلمانوں کے من حیث القوم ''آوٹ لک'' کے خلاف ہے۔ بطور مثال صوبہ جات متوسط ہی کو لیجیے۔ وہاں اسکولوں کو ودیا مندر کہا جاتا ہے۔ مسلمان بچوں کو بت پرستی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنے میں اسلام علیکم کی جگہ نمستے اور نمسکار کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان مقامات کے مسلمان مدد کے لئے چیخ رہے ہیں۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت ہی نازک وقت ہے۔ اس وقت کا مقابلہ صرف 1857ء کے بعد کے وقت سے ہوسکتا ہے جبکہ ایک ایک مسلمان کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جبکہ ہر مسلمان کی عزت اور زندگی سخت خطرے میں تھی...... میں اس ہمہ گیر ایجی ٹیشن پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو کانگرس کی طرف سے ہندی کو ہندوستان کی ''لنگوا فرانکا''(Lingua Franca) بنانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندی ''لنگوا فرانکا'' بننے کے لئے ہندوستان کی اکثر زبانوں سے بہتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن کانگرسی لیڈر ہندی کو اس قابل فخر مقام تک پہنچانے کے لئے اس فرقہ پروری کا ایک اور ثبوت دے رہے ہیں جس نے ہندوستان کے بہتیرے صوبوں میں کانگرسی نظم ونسق کو رسوا کر دیا ہے۔ کانگرس ہندو مہاسبھا کے اثر میں آ کر نہ صرف تناسب کے مفہوم کو بھول بیٹھی ہے بلکہ انصاف کی صلاحیت اور قوت ممیّزہ سے بھی محروم ہوگئی ہے۔ انصاف اور خوش معاملگی نیز غیر جانبداری اور

وطن پروری کا تھوڑا سا تصور بھی کانگرسی لیڈروں کو یقین دلا سکتا تھا کہ ہندوستان کی لنگوا فرانکا بننے کی مستحق جو زبان ہے وہ اردو ہے نہ کہ ہندی۔"[5] مولوی فضل الحق کی دہلی اور پٹنہ میں ان دونوں تقریروں کی بنیاد اس کے کسی عقیدے یا اصول پر نہیں تھی بلکہ ان کے پیچھے اس تلخی کی کارفرمائی تھی جو بنگال کانگرس کی جانب سے اس کی وزارت کا تختہ الٹنے کی کوششوں کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی۔

فضل الحق نے اسی تلخی کی بنا پر 10 راکتوبر 1938ء کو کراچی میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس میں اسی قسم کی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ "ہندوؤں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور آج ہماری حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ انہوں نے سندھ کی پہلی وزارت کو توڑ دیا۔ ہم سمجھے تھے کہ دوسری وزارت اسلام کے مفاد کی خدمت کرے گی لیکن یہ امیدیں ہی نکلی...... ہمیں سندھ اور سرحد سے، جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں بڑی امیدیں تھیں، لیکن حقیقت برعکس ہے۔ اے سندھ اسمبلی کے 35 ممبرو! اگر آپ متحد و متفق ہو جائیں تو سندھ میں مسلم لیگ وزارت قائم کر سکتے ہیں اور اس سلوک کا آپ مناسب جواب دے سکتے ہیں جو کانگرس کے حکمران صوبوں، سی۔ پی اور اڑیسہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میں ان مسلمانوں کو جو اپنے آپ کو قوم پرور کہلاتے ہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ یاد رکھیں ہندوستان کے مسلمان ان سے نپٹ لیں گے۔ اگر وہ ہماری جماعت میں نہ آئے تو یہ ہندوستان کے 9 کروڑ مسلمانوں کے لئے چیلنج ہو گا۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ضرورت ہوئی تو انہیں اسلام کے لئے اپنی جانیں قربان کرنی ہوں گی۔ وہ بھاگ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ اپنی جان دینے کو تیار نہیں تو آپ مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اگر 18 سال کا نوجوان محمد بن قاسم مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ سندھ فتح کر سکتا ہے تو یقیناً 9 کروڑ مسلمان سارے ہندوستان کو فتح کر سکتے ہیں۔"[6] اگرچہ مولوی فضل الحق کی یہ مولویانہ تقریر خطرناک قدامت پرستی، غیر ذمہ داری اور عصر حاضر کے حالات سے بے خبری کی مظہر تھی تاہم اس کا جواز یہ دیا جا سکتا تھا کہ اس زمانے میں ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، حافظ محمد ابراہیم، مولانا احمد سعید، حافظ کفایت حسین، عطاءاللہ شاہ بخاری اور دوسرے بے شمار کانگرس نواز ملا نئے مسلم لیگ اور اس کے صدر محمد علی جناح کے خلاف بھی اسی معیار کی تقریریں کیا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند عملاً غیر کانگرسی مسلمان سیاسی لیڈروں کے خلاف فتوے سازی کا کارخانہ تھا۔

کلکتہ کے مسلمانوں نے ابوالکلام آزاد کونماز عید کی امامت سے برطرف کردیا

کانگرسی ملاؤں سے مسلم رائے عامہ کی بیزاری کا یہ عالم تھا کہ 13 راکتوبر 1938ء کو کلکتہ میں حزب اللہ، خلافت کمیٹی اور دیگر مسلم تنظیموں کی جانب سے بذریعہ اشتہار یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ مسلمانان کلکتہ عید کے موقع پر ابوالکلام آزاد کی امامت قبول نہیں کریں گے۔اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ''ایک ایسا شخص جو ہندوستان میں دستوری انقلاب اور تبدیلی کے اس نازک ترین وقت میں مسلمانان ہند کی مستقل اور جداگانہ اسلامی اور قومی تنظیم و وحدت کی تحریک کو چھوڑ کر غیر مسلم اکثریت والی مجلس کے حکم پر چل کر سندھ، سرحد اور آسام جیسے صوبوں میں آزاد مسلم وزرائے اعظم کی وزارتوں کو شکست دینے اور ان کی جگہ کانگرسی وزارت کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کر رہا ہو، مسلمانان ہند کی اسلامی اخوت اور اجتماعی قوت کو شکست دینے میں غیر مسلم اکثریت والی مجلس کا آلۂ کار بنا ہوا ہو، کیا ایسا شخص مسلمانوں کی جماعت کا امام ہوسکتا ہے۔نہیں اور ہرگز نہیں۔مسلمانان کلکتہ، بنگال، بہار اور آسام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نہیں، ہرگز نہیں اور ہرگز نہیں۔ جو شخص مسلمانوں کی مستقل جماعتی حیثیت کا مخالف ہے وہ جماعت عید کا ہرگز امام نہیں ہوسکتا۔ مسلمانو! ابھی سے مظاہرہ عام اور جلسہ عام کرکے اپنے اس فیصلے کا دنیا کے سامنے اعلان کردو۔''[7]

چنانچہ اس اشتہار کے مطابق 23 راکتوبر کو کلکتہ میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں تقریباً 50 ہزار مسلمانوں نے مولانا شائق احمد عثمانی، حکیم مولانا محمد محسن، ملا جان محمد اور خان محمد شفاعت اللہ خان کی تقریریں سنیں۔جلسہ کے آخر میں ایک قرارداد میں کلکتہ مجلس خلافت سے استدعا کی گئی کہ وہ مولانا آزاد کی جگہ نئے امام کا بندوبست کرے۔حسب توقع خلافت کمیٹی نے ایسا ہی کیا اور 19 رنومبر کو کلکتہ خلافت کمیٹی اور کلکتہ مسلم لیگ کی طرف سے کلکتہ، ہوڑہ اور مضافات کے برادران اسلام سے درخواست کی گئی کہ وہ ''حسب دستور منومنٹ (Monument) میدان کی جماعت عید میں 9 بجے تک جوق در جوق شامل ہوکر نماز ادا کریں اور کسی بھی غلط پروپیگنڈے کے اثر میں نہ آئیں۔جماعت عید کا انتظام حسب معمول کلکتہ خلافت کمیٹی کرے گی اور سبحان اللہ! مولانا آزاد سبحانی صاحب خلافت کمیٹی کی دعوت پر امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیں گے۔'' خلافت کمیٹی کے اس فیصلہ سے ابوالکلام آزاد کی، جو ان دنوں کلکتہ پہنچا ہوا تھا، بڑی سبکی ہوئی۔لہٰذا اس

نے خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے مولویوں سے مفاہمت کی بات چیت کرنے کے بعد 22 رنومبر 1938ء کو یہ اعلان کر دیا کہ ''میں نے طے کرلیا ہے کہ میں عید کی جماعت کی امامت کسی حال میں اب قبول نہیں کرسکتا۔ لوگوں کو چاہیے کہ جس طرح ہر سال ایک جماعت میں نماز ادا کرتے تھے اسی طرح اس سال بھی کریں۔'' 24 رنومبر کو خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام منومنٹ میدان میں عید کی نماز ہوئی جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد نے شرکت کی جبکہ میوزیم کے بالمقابل کانگرسی مولویوں کی نماز میں نمازیوں کی تعداد پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ گویا اس طرح نومبر 1938ء میں کلکتہ کے مسلمانوں کی امامت کا یہ مسئلہ مسلم لیگ کے حق میں طے ہوا۔ اگرچہ یہ تنازعہ بظاہر طفلانہ اور فروعی تھا لیکن سیاسی لحاظ سے اس کی بہت اہمیت تھی۔ ابوالکلام آزاد سالہا سال سے کلکتہ میں عید کی نماز کی امامت کرتا رہا تھا۔ اب نومبر 1938ء میں اس کے اس اعزاز سے محروم ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب مسلمانانِ بنگال کانگرسی مولوی کی کسی حالت میں بھی قیادت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تقاضے ان کی مذہبی روایت سے بالاتر تھے۔

مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے تحت باغی ارکان نے فضل الحق کے ساتھ صلح کر لی

مسلمانانِ بنگال کی اس سلسلے میں فرقہ وارانہ جذبات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پرجا اسمبلی پارٹی کے جو ارکان جون 1938ء میں بوس برادران کی ترغیب پر فضل الحق کی کولیشن پارٹی سے الگ ہو گئے تھے، وہ بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اکتوبر 1938ء کے اواخر میں ان ارکان نے کلکتہ میں شمس الدین احمد کے مکان پر جلسہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مولوی فضل الحق سے مفاہمت کی گفت وشنید کی جائے گی۔ یہ گفت وشنید کئی دن تک جاری رہی اور بالآخر 16 رنومبر کو اس کا نتیجہ مولوی فضل الحق، مولوی تمیز الدین خان اور شمس الدین احمد کے اس مشترکہ بیان کی صورت میں نکلا کہ ''مختلف اسباب و حالات کے ماتحت جن میں بعض نادیدہ اور ناگزیر تھے، ہم ایک دوسرے کے خلاف کام رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم یہ محسوس کرتے رہے کہ ہمارا مطمع نظر ایک ہی ہے۔ اس کے حصول کے طریقہ میں ہمارے اختلافات خواہ کچھ بھی ہوں ہم نے اپنے مطمع نظر اور مقاصد کے اشتراک کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ایک مشترک پروگرام کو بروئے عمل لانے کی غرض سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر ایک ساتھ مل کر کام کریں گے۔''

اس بیان کے دو دن بعد 18 رنومبر 1938ء کو تمیز الدین خان اور شمس الدین احمد نے بطور وزرا حلف وفاداری اٹھالیا اور اس طرح حق وزارت کے ارکان کی تعداد دس سے بڑھ کر بارہ ہوگئی۔ فضل الحق نے ان دونوں کو جون میں ہی وزارتوں کی پیشکش کی تھی مگر اس وقت انہوں نے یہ سیاسی رشوت اس امید میں قبول نہیں کی تھی کہ وہ نوشیر علی کی متوقع ترقی پسند حکومت میں اہم وزارتی عہدوں پر فائز ہوں گے لیکن اب جبکہ ان کی اس امید کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی اور مسلم رائے عامہ کا دباؤ نا قابل برداشت حد تک بڑھ رہا تھا تو ان پر یکا یک یہ راز افشا ہو گیا کہ ان کے اور فضل الحق کے مطمع نظر اور مقاصد مشترک ہیں۔ تاہم جب ان دونوں کے وزیر بننے سے فضل الحق کی حکومت کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تو سرت چندر بوس، جی۔ڈی۔ برلا اور صوبائی کانگرس کے بعض دوسرے لیڈروں کی طرف سے یہ کوشش ہوئی کہ صوبہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کی مخلوط وزارت بن جائے۔ انہوں نے اور صوبائی حکومت کے وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار نے اس مقصد کے تحت واردھا میں گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے 15 ردسمبر کو ایک قرارداد میں اعلان کیا کہ ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ فرقہ وارانہ ادارے ہیں اسے لئے کسی منتخبہ کانگرس کمیٹی کا کوئی ممبر کسی فرقہ وارانہ ادارہ کا ممبر نہیں ہو سکتا۔''[8]

بظاہر اس قرارداد کے پیش نظر کلکتہ کے مسلم لیگی اخبار سٹار آف انڈیا نے 25 ردسمبر کو یہ خبر شائع کی کہ صوبہ بنگال کے اندر جو یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ مولوی فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین بنگال میں کانگرس کے ساتھ کولیشن قائم کرنے کے خیال میں ہیں، اس افواہ کا ایک ایک حرف بالکل ہی جھوٹ ہے۔ اس قسم کی افواہ غرض مند لوگ قصداً پھیلا رہے ہیں تا کہ موجودہ وزارت کے ثبات وقیام کے متعلق لوگوں کے اعتماد کو کمتر کر دیں۔ وزارت کے دشمنوں نے اس کو گرانے میں ناکامی کے بعد یہ وطیرہ اختیار کیا ہے تا کہ وزارت کو نئے ردوبدل سے جو استحکام ہوا ہے اس کو تباہ کیا جاسکے۔'' یکم جنوری 1939ء کو اس ''افواہ'' کی مزید تردید اس طرح کی گئی کہ ''نواب ڈھاکہ کے مکان پر منعقدہ صوبائی اسمبلی کی کولیشن پارٹی کے اجلاس میں مولوی تمیز الدین اور شمس الدین احمد کے وزارت میں شامل کئے جانے کی صورت حال پر غور کئے جانے کے بعد مولوی فضل الحق کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ کلکتہ کارپوریشن میں جداگانہ طریقہ انتخاب

رائج کرنے کے لئے قانون سازی کی جائے گی اور کلکتہ یونیورسٹی میں نصف صدی سے مسلمانوں کی جوحق تلفی ہورہی ہے اس کی تلافی کے لئے ان کی صحیح نیابت کا بروئے قانون انتظام کیا جائے گا۔"

کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے لئے جداگانہ انتخاب کا ترمیمی بل اور کانگرس وہندومہاسبھا کی طرف سے شدید مخالفت

کولیشن پارٹی کے اس فیصلے کے مطابق 31رجنوری1939ءکوحکومت بنگال کے ایک غیرمعمولی گزٹ میں کلکتہ میونسپل کارپوریشن (ترمیمی) بل1939ءکا مسودہ شائع کردیا گیا۔اس مجوزہ قانون میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ آئندہ کارپوریشن کے انتخابات کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب اختیار کیا جائے گا۔کارپوریشن کی نشستوں کی کل تعداد92 سے بڑھا کر 99 کردی گئی ہے جن میں سے 46 نشستیں جنرل ہوں گی، 17 اچھوتوں کے لئے اور 22 مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں گی۔2 نشستیں مزدوروں کے لئے، 2 اینگلوانڈین کے لئے اور 12 یورپینوں کے لئے ہوں گی۔یورپینوں کی ان نشستوں میں سے 6 نشستیں بنگال چیمبرآف کامرس کے لئے اور 4 نشستیں کلکتہ پورٹ کمشنر کے لئے ہوں گی۔ 10 ممبروں کی نامزدگی لوکل گورنمنٹ کرے گی اور 5 آلڈرمین ہوں گے جن کا انتخاب کونسلر کرے گا۔

اس مسودہ قانون کی اشاعت سے دو دن قبل سوبھاش چندر بوس، گاندھی کے نامزد امیدوار ڈاکٹر پٹابھ بھائی سیتارامیہ کوکثرت رائے سے شکست دے کر، انڈین نیشنل کانگرس کا دوسری مرتبہ صدر منتخب ہوگیا تھا۔سوبھاش اپنے آپ کو کانگرس میں سوشلسٹ گروپ کا نمائندہ کہتا تھا اوراس بنا پر وہ کلکتہ کارپوریشن کے بارے میں متذکرہ مسودہ قانون کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی کارپوریشن پر سالہا سال سے اس کے خاندان کا غلبہ رہا تھا اور یہی ادارہ پورے ہندوستان میں اس کی سیاسی قوت کا سرچشمہ تھا۔چنانچہ اس نے اسے ''فرقہ پرست'' مسلم لیگیوں کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے لئے بنگال کے بعض مسلمانوں کی ایک پروگریسو پارٹی بنوائی۔اس کے بعداس سے کارپوریشن کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کروادی۔ 7 اور 8رفروری کواس نے جلپائی گوڑی میں ان کانگرسیوں کی ایک پولیٹیکل کانفرنس بلائی جنہوں نے صدارتی انتخاب میں اسے ووٹ دیئے تھے،اس کانفرنس کا اصلی مقصد تو یہ تھا کہ

کانگرس کے اندر گاندھی اور سردار پٹیل وغیرہ کے دائیں بازو کے دھڑے کے خلاف بائیں بازو کے دھڑے کو مستحکم و منظم کیا جائے مگر اس میں اس ضمنی مقصد کی بھی تکمیل کی گئی کہ حکومت بنگال کو بری طرح ہدف تنقید بنایا گیا۔ الزام یہ تھا کہ فضل الحق کی یہ حکومت عوام کی خدمت کی تمنا اور اہلیت نہیں رکھتی۔ اس نے قانون مزارعت میں جو ترمیم کی ہے وہ نہ تو دانشمندانہ ہے اور نہ ہی فائدہ مند۔ اس نے بیرونی تجارتی اداروں کے مفاد کے لئے جیوٹ آرڈیننس نافذ کیا ہے۔ یہ ملازمتوں میں بھرتی کے موقع پر اقربانوازی اور خویش پروری کی مرتکب ہوئی ہے اور یہ صوبہ میں فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دے رہی ہے۔

اس کانفرنس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 15 رفروری 1939ء کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو اس کی پروردہ مسلم پروگریسو پارٹی کا ایک رکن شمس الدین احمد وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ یہ شخص 18 رنومبر 1938ء کو وزیر بنا تھا لیکن اب اس کا کہنا یہ تھا کہ اس نے جن شرائط کے تحت یہ عہدہ قبول کیا تھا وہ پوری نہیں ہوئیں۔ 18 رفروری کو اس پارٹی نے البرٹ ہال میں ایک جلسہ کا انتظام کیا جس کا مقصد کارپوریشن کے لئے مجوزہ جداگانہ طریقہ انتخاب کی مخالفت کرنا تھا مگر جب 4 بجے سہ پہر جلسہ شروع ہوا تو ہال مسلم لیگی حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سٹیج پر مسلم لیگیوں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ اس جلسہ نے مسلم لیگی جلسہ کی صورت اختیار کر لی جس میں دوسرے مقررین کے علاوہ ملا جان محمد نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر سوبھاش حقیقت میں سوشلسٹ ہوتے تو دھانگڑوں اور مہتروں کے حقوق کا خیال کرتے اور مسلمانوں کو ان کا واجبی حصہ خوشی سے دیتے کیونکہ کارپوریشن تو دراصل خود سوبھاش کے قول کے مطابق گندہ اصطبل بن گیا ہے جس کو پاک صاف کرنا ضروری ہے۔ اب مسلمانان کلکتہ بیدار ہو چکے ہیں اور اس گندگی کا خاتمہ کر کے رہیں گے۔ سوبھاش بابو نے چیلنج کیا تھا کہ اگر کارپوریشن میں ان کے مقصد اور مطلب کے خلاف تبدیلی کی گئی تو وہ ایسا طوفان برپا کر دیں گے جواب تک نہیں کیا گیا ہے۔ مسلمان حق و انصاف کے علمبردار ہیں۔ ہم مسلمانان کلکتہ کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔'' جلسہ کے آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حق وزارت پر کامل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ ''مسلمانان کلکتہ کا یہ جلسہ کلکتہ میونسپل ترمیمی بل کی، جس میں جداگانہ انتخاب کے دوبارہ اجرا اور اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا سامان کیا گیا ہے، پرزور اور قلبی تائید کرتا ہے اور مزید مسلمانوں کے

اس عزم بالجزم کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک کلکتہ کارپوریشن میں جداگانہ انتخاب جاری نہیں کیا جائے گا، مسلمان ہرگز چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ایک اور قرارداد میں ''نام نہاد پروگریسو پارٹی کو دشمنان اتحاد اسلام کی ایک کھلی اور ناپاک سازش قرار دے کر اعلان کیا گیا کہ یہ نوزائیدہ ٹولی ہرگز مسلمانان کلکتہ اور بنگال کی نمائندہ جماعت نہیں ہے بلکہ محض چند خود غرضوں کی ایک خانہ ساز ٹولی ہے۔''

لیکن مسلم لیگ کے اس موقف کے بالکل برعکس 19 رفروری کو بنگال ہندو مہاسبھا کے سالانہ اجلاس میں کلکتہ میونسپل بل کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ اس اجلاس کی رائے یہ تھی کہ ''چونکہ کارپوریشن کی آمدنی میں 80 فیصدی ہندوؤں کا روپیہ ہے اور جس قدر سہولتیں اس وقت شہر میں اس میونسپل کارپوریشن کے ذریعے عام پبلک کو بہم پہنچائی گئی ہیں۔ محض ہندوؤں کی قربانی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ جداگانہ انتخاب سے جو صورت حال پیدا ہونے والی ہے اس کے نتائج پر غور کریں۔'' بنگال ہندو مہاسبھا کے اس سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے آل انڈیا ہندو مہاسبھا کا صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر 16 رفروری کو کلکتہ پہنچا تھا اور اس نے اسی دن ٹاؤن ہال میں ہندوؤں کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندو اصل قوم ہیں کیونکہ وہ اس ملک کے اصلی باشندے ہیں اور اس ملک کو ہندوستان کہا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا ملک میں رہنے پر خیر مقدم کیا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ قوم کا ایک جزو بن کر رہنا چاہیں ورنہ انہیں اسی طرح اجنبی سمجھا جائے گا جس طرح انگریزوں، فرانسیسیوں اور دوسرے یورپینوں کو اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرے لوگ ہندوستان کو اپنی اصل مادر وطن سمجھیں تو ہندوؤں کے ساتھ ان کے مساوی حقوق واستحقاق ہوں گے۔''[9]

یاد رہے کہ یہ خیالات مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر ایس۔ ستیا مورتی سے ملتے جلتے تھے۔ اس نے 29 ردسمبر 1938ء کو کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں صوبائی اسمبلی کے سپیکر خان بہادر عزیز الحق کی زیر صدارت ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے ان ہی خیالات کا اظہار بورژوا کانگرسیوں کی مخصوص منافقانہ زبان میں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ اس ملک میں ہم خواہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھیں ابتدائے زندگی سے موت تک اول میں ہندوستانی، آخر میں ہندوستانی اور ہمیشہ ہندوستانی ہی رہنے کی کوشش کریں۔ آپ

انگلستان جائیے، فرانس جائیے، جرمنی جائیے اور جس سے چاہیے پوچھیے تم کون ہو؟ جواب یہ ملے گا میں انگریز ہوں، میں فرانسیسی ہوں، میں جرمن ہوں، میں امریکن ہوں، میں چینی ہوں، میں جاپانی ہوں اور ہندوستانیوں سے پوچھئے تو آپ کو یہ جواب ملے گا میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں، میں عیسائی ہوں، میں ہریجن ہوں، میں برہمن ہوں اوراس سے بدتر یہ کہ میں بنگالی ہوں، میں مدراسی ہوں، میں پنجابی ہوں......تمام موجودہ حکومتوں میں، جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں، مذہب اور حکومت کی علیحدگی کا نظریہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ پس آپ کو یہ عقیدہ سیکھنا اوراس پر عمل کرنا چاہیے کہ یہ قوم صرف اسی صورت میں ایک نا قابل تفریق، آزاد اور خود دار قوم ہوسکتی ہے جبکہ تمام لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ ہندوستانی ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔"[10] گویا ساور کر صرف ایک مادر وطن اور صرف ایک ہندو قوم کے نام پر برصغیر کی مذہبی، ثقافتی، لسانی اور نسلی اقلیتوں کے وجود سے انکار کرتا تھا اور ستیا مورتی سیکولرزم کے نام پر یہی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گویا ہندو بورژوا مذہب اور لادینیت دونوں ہی کے نام پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو ہڑپ کرنے کے درپے تھا۔ وہ اقلیتوں کے جداگانہ ثقافتی، لسانی اور نسلی وجود کو صدق دل سے تسلیم کر کے ان سے ٹھوس مفاہمت کی بنیاد پر قومی اتحاد قائم کرنے کے حق میں نہیں تھا کیونکہ اس طرح ان اقلیتوں کو کچھ سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور لسانی رعایات دینی پڑتی تھیں۔

اسی طرح بنگال ہندومہاسبھا کی کھلنا کانفرنس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں ایک قرارداد یہ تھی کہ ہندوؤں کے بطور ایک قوم زندہ رہنے کے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ ہندو فرقہ کی مختلف شاخوں کی تنظیم کی جائے۔ لہٰذا ہندومہاسبھاؤں کی شاخوں کو متحد قوت اور جوش عمل کے ذریعے یہ مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوؤں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے کانفرنس استدعا کرتی ہے کہ (1) ہندوؤں کی تمام شاخوں اور گوتوں کے درمیان شادی کے رواج کو عام کیا جائے۔ (2) بیواؤں کی دوسری شادی کو عام پسند بنا دیا جائے۔ (3) نوعمری کی شادی کو ختم کر دیا جائے۔ (4) جہیز اور پردہ کے سسٹم کو توڑ دیا جائے۔ (5) تمام ہندوؤں کو بلا لحاظ ذات پات مندروں میں داخل ہونے اور پوجا کا حق دیا جائے۔ دوسری قرارداد میں ہندوسبھاؤں سے کہا گیا کہ ہر بستی میں اکھاڑے قائم کریں۔ جہاں ہندوؤں کی جسمانی تربیت کی جائے اور تیسری قرارداد میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ "جن ہندوؤں نے دوسرے مذاہب کو اختیار کرلیا ہے ان کو

دوبارہ اپنے مذہب میں لینے اور غیر ہندوؤں کو ہندو مذہب میں لینے کا رواج جاری کرنا بہت ہی ضروری ہے تاکہ ہندو سوسائٹی کو زندہ اور متحرک بنایا جا سکے۔ لہٰذا بنگال ہندو سبھا کی تمام شاخوں کو چاہیے کہ وہ اس غرض سے زبردست پروپیگنڈا کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ جو نئے لوگ اس مذہب میں آئیں ان کا خیر مقدم کیا جائے۔"[11]

اس فرقہ وارانہ تلخی کے پس منظر میں 28 رفروری کو وزیر بلدیات نواب ڈھاکہ نے صوبائی اسمبلی میں کلکتہ میونسپل بل پیش کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس بل کو ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس موقع پر نواب کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ "1933ء میں مخلوط طریقۂ انتخاب کے تحت کلکتہ کارپوریشن کے جو نئے انتخابات ہوئے تھے ان سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ جو مسلمان منتخب ہوئے تھے وہ مسلمانوں کی رائے کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اکثریتی قوم کے ٹیکس دہندگان کے زاویۂ نگاہ کے نمائندے تھے۔" لیکن 29 رفروری کو جب ایوان میں نواب ڈھاکہ کی یہ تجویز زیر بحث آئی تو ایوان میں اس قدر ہنگامہ ہوا کہ سپیکر کو اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ یکم مارچ کو پروگریسو پارٹی نے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ بلایا جس کا مقصد کلکتہ میونسپل ترمیمی ایکٹ کی مخالفت کرنا تھا مگر یہ جلسہ ہنگامہ آرائی کا شکار ہو گیا۔ کرسیاں اور لاٹھیاں چلائی گئیں۔ متعدد افراد زخمی ہوئے۔ 5 کو ہسپتال داخل کیا گیا۔ پولیس نے مداخلت کی اور تقریباً 60 افراد گرفتار کر لئے۔ اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھی تو 5 رمارچ کو ہولی کے تہوار کے موقع پر ہندو۔ مسلم فساد ہو گیا۔ 30 افراد زخمی ہوئے اور بہت سی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ یہ فساد 6 رمارچ کو بھی جاری رہا جس میں ایک شخص ہلاک اور 21 زخمی ہوئے۔ تاہم اس سے صوبائی اسمبلی کی کاروائی متاثر نہ ہوئی۔ اسی دن وزیر بلدیات نواب بہادر ڈھاکہ کی یہ تحریک منظور کر لی گئی کہ کلکتہ میونسپل ترمیمی ایکٹ سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ کانگرس پارٹی کے ارکان نے مختلف معاملات پر تحریک التوا پیش کر کے بڑی رکاوٹ پیدا کی مگر اس کے باوجود نواب ڈھاکہ کی تحریک رائے شماری کے بغیر ہی منظور ہو گئی۔ قبل ازیں حزب اختلاف کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ میونسپل بل رائے عامہ معلوم کرنے کی غرض سے شائع کر دیا جائے۔ یہ تجویز 79 کے مقابلے میں 131 ووٹوں سے ناکام ہو گئی اور اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ شمس الدین احمد کے 18 رفروری کے استعفیٰ سے فضل الحق کی وزارت کے استحکام میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اس صورت حال میں فضل الحق نے میونسپل بل کے

نکتہ چینوں کو مسکت جواب دیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''میں جانتا تھا کہ اس بل کی مخالفت کی جائے گی لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا اس پر اتنی زیادہ فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہو جائے گی جس کا مظاہرہ بحث کے دوران ہوا ہے۔ جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ پہلے پہل لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی استدعا پر جداگانہ انتخاب کا سسٹم جاری کیا تھا۔ جداگانہ انتخاب کا اصول دراصل لارڈ ڈفرن (Dufferin) کے زمانے میں ہی تسلیم کر لیا گیا تھا اور متعدد سر برآوردہ ہندوستانی لیڈروں نے اس کی تائید کی تھی۔ یہ غلط ہے کہ جداگانہ انتخاب دونوں فرقوں میں علیحدگی کا باعث بنے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے پہلے ہی الگ الگ ہیں۔ یہ علیحدگی جداگانہ انتخاب کا نتیجہ نہیں بلکہ جداگانہ انتخاب علیحدگی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنا فضول ہے کہ یہ پھوٹ یورپینوں نے ڈالی۔ یورپینوں کے ہندوستان میں آنے سے بہت پہلے یہ منقسم فرقے موجود تھے۔''[12]

15 مارچ کو سرکاری پارٹی کے ایک رکن خواجہ نورالدین نے بھی اس بحث میں بڑی مدلل تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ایک ایسے شخص کے لئے جو ہمیشہ سے قومیت کا مداح اور مخلوط انتخاب کا سرگرم حامی رہا ہو، جس نے اس سلسلے میں خدمات بھی انجام دی ہوں، کلکتہ کارپوریشن میں جداگانہ انتخاب کے داخلے سے متعلق ترمیم کی حمایت کے لئے کھڑا ہونا بلاشبہ ایک تکلیف دہ فریضہ کی انجام دہی سے کم نہیں۔ میرے خیالات میں یہ تبدیلی غالباً نتیجہ ہے میرے ذاتی تجربے کا جو کچھ تو اس صوبے کے نام نہاد قومی کانگرس پارٹی سے اشتراک عمل کے بعد حاصل ہوا ہے اور کچھ کانگرس پارٹی کے اندرونی کاموں سے قریبی تعلقات نے جو کئی سال تک قائم رہے مجھ کو یقین دلا دیا ہے کہ قومیت کے جو معنی میرے احباب سمجھتے، اس پر عمل کرتے اور لوگوں کے سامنے جس طرح اس کو پیش کرتے تھے وہ دراصل ایک سیاسی چالبازی پر مبنی تھا اور وہ ایک ذریعہ تھا سیاسی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے کر مسلمانان بنگال کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے کا۔ مخلوط انتخاب، جس کو میرے احباب قومیت کی پہلی کڑی بتاتے ہیں، دراصل موجودہ صورت حال میں مسلم قوم کے لئے حد سے سوا مضر ہے.....کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کے اظہار کے لئے طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف کارپوریشن کے چھوٹے بڑے اہلکاروں کی فہرست سے ہی صورت حال بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یہ فہرست اس طرح ہے:

مسلمان	تعداد اسامی	موجودہ تنخواہ کا گریڈ
1	12	1000 سے 3000 روپے تک
1	33	500 سے 1000 روپے تک
2	82	300 سے 500 روپے تک
11	289	150 سے 300 روپے تک
72	937	75 سے 150 روپے تک
136	840	40 سے 75 روپے تک
164	740	14 سے 40 روپے تک
387	2933	

میزان سے یہ ظاہر ہے کہ 300 روپیہ سے 3000 روپیہ تک کی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب صرف 3 فیصدی ہے۔ قومیت اور حب وطن کی چیخ وپکار آج کل فیشن ہے جیسے یہ چیزیں صرف قوم پروری کی ملکیت ہیں۔ حقیقی قوم پروری تو روزمرہ کی زندگی میں عملدرآمد کرنے کی چیز ہے۔ محض عقیدہ یا فارمولے کا نام قوم پروری نہیں ہے۔ قومیت کو ایک نظریہ کی حیثیت سے ماننا تو بہت درست ہے مگر جب تک تم اس کو عملی جامہ نہ پہناؤ یہ تمہیں کسی منزل مقصود کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ جداگانہ انتخاب سے ہندو ذہنیت کو بدلنا مقصود ہے۔ یہ دراصل صرف قوم پروروں کے بے جا اقتدار کے مقابلہ اور کمزور کی حفاظت کے لئے ہے کہ آج ہم جداگانہ انتخاب کے خواہاں ہیں اور میں اس ایوان کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم بنگال بے چینی سے ہندو ذہنیت کی تبدیلی کا منتظر ہے۔ جس دن یہ تبدیلی پیدا ہوگئی اور مسلمان یہ سمجھ لیں کہ ان کے حقوق پامال نہیں کئے جاتے، جداگانہ انتخاب ختم ہوجائے گا اور یہ سب کچھ گئی گزری باتوں میں شمار ہوگا۔''[13]

وزیر داخلہ خواجہ ناظم الدین کو بھی خواجہ نورالدین کی طرح کانگرسیوں کی تنگ نظری پر سخت اعتراض تھا۔ اسکی تقریر یہ تھی کہ ''میں اور 99 فیصدی مسلمان اور پست اقوام کے لوگ اپنے کانگرسی دوستوں کے بیان کردہ نیشنلزم کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں کئی سال کے تلخ تجربات سے یقین ہوگیا ہے کہ ان کی خواہش مجموعی طور سے ہندوستانیوں کے لئے آزادی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا خاص مقصد برطانوی راج کی جگہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا راج قائم کرنا ہے۔''[14]

وزیر محنت حسین شہید سہروردی کی رائے یہ تھی کہ چونکہ کانگرس مختلف فرقوں کے علیحدہ وجود کو ماننے سے انکار کرنا پسند کرتی ہے اور چونکہ وہ سب کو ہندوانڈیا میں نگل لینا چاہتی ہے اس لئے مسلم لیگ اس کے سامنے کھڑے ہونے پر مجبور ہوگئی ہے اور صوبہ مسلم لیگ کا حکومت ہند سے مطالبہ یہ تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کو ''قومی'' جمعیت تسلیم نہ کرے اس لئے کہ ''تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اطمینان ہوگیا ہے کہ کانگرس ایک سخت ترین قسم کی فرقہ وارانہ تنظیم ہے اور حد سے زیادہ مسلم مفاد کی مخالف ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے من حیث الجماعت کانگرس میں شریک ہونے سے انکار کردیا ہے۔ کانگرس ہندوستان کے مختلف فرقوں کی نمائندہ نہیں ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد اور متحد جماعت ہے اس لئے جن معاملات کا اثر مسلمانوں پر پڑتا ہو اس میں حکومت اپنی رہنمائی مسلم لیگ کی رائے سے حاصل کرے۔''[15]

15 ر مارچ کو روزنامہ عصر جدید نے فضل الحق، خواجہ نورالدین، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کے اس موقف کی تائید کے لئے ہندو۔ مسلم معاشرتی تضاد کے ایک شرمناک مظاہرے کا اچھا واقعہ بیان کیا جس کے جواب میں کوئی صفائی پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ واقعہ یکم اکتوبر 1934ء کا تھا۔ اس دن سیٹھ ہری داس گوردھ داس اور اس کی سیٹھانی جی۔ آئی۔ پی ریلوے سے سفر کر رہے تھے۔ سیٹھ نے سیکنڈ کلاس کے چار برتھ ریزرو کرائے تھے۔ راستہ میں ایک جنکشن پر جگہ ہونے کی وجہ سے سٹیشن ماسٹر نے اس ڈبہ میں ایک مسلمان کو جگہ دے دی۔ چنانچہ سیٹھ صاحب بگڑ گئے اور تمام سفر منہ بنائے بیٹھے رہے۔ کھانا پینا بھی غصہ کے سبب چھوڑ دیا اور پھر گھر پہنچ کر ریلوے کے خلاف پانچ ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا۔ بالآخر یہ مقدمہ بمبئی ہائی کورٹ کے سامنے آیا۔ سیٹھ نے بیان کیا کہ وہ راسخ العقیدہ ہندو ہے۔ ایک مسلمان کے ریل کے ڈبے میں آجانے کی وجہ سے اس کا کھانا پینا سب بھرشٹ ہوگیا۔ چنانچہ وہ راستے بھر بھوکا رہا۔ ریلوے نے جواب دیا کہ سیٹھ نے صرف چار برتھ ریزرو کرائے تھے سارا ڈبہ ریزرو نہیں کروایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیٹھ کے بھوکے پیاسے رہنے پر ریلوے نے اظہار افسوس کیا اور سیٹھ نے مقدمہ واپس لے لیا۔ عصر جدید نے اس واقعہ کا حوالہ دینے کے بعد اپنے مختصر تبصرے میں لکھا کہ ''اس کے باوجود کانگرس کے حضرت مولاناؤں کا ارشاد یہی ہے کہ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں اور کانگرس کے ہندو لیڈر یہ شور کریں گے کہ جداگانہ انتخاب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر رکھا ہے۔ کوئی

ان مہا پرشوں سے پوچھے کہ یہ جو سیٹھ کا کھانا مسلمان کے آنے سے بھرشٹ ہو گیا، کیا یہ بھی جداگانہ انتخاب کا نتیجہ ہے۔''[16]

عصر جدید نے جنوری 1939ء میں بھی ہندو۔ مسلم مسئلہ پر ایک ادارتی تبصرے میں کانگرس کے ان حضرت مولاناؤں کو''ہمارے فریب خوردہ اور سحر زدہ بھائی' قرار دے کر لکھا تھا کہ ''ہمارے ان بھائیوں کے نزدیک فرقہ وارانہ جماعت وہی ہے جو کسی ایک فرقہ اور جماعت کی حمایت میں آواز بلند کرے حالانکہ اگر کسی جماعت کے جائز حقوق کے لئے آواز بلند کرنا جماعت پسندی ہے اور فرقہ پروری ہے تو کسی جماعت اور فرقہ کے حقوق کو غصب ہوتے یا اس پر ظلم و زیادتی ہوتے دیکھ کر خاموش رہنا یا کسی فرقہ اور جماعت کے کسی حق کے مطالبے کی حمایت نہ کرنا یا کسی زبردست اور طاقتور فرقہ کے غصب و استبداد سے آنکھیں بند کر لینا اور اس کے خلاف آواز بلند نہ کرنا بھی ٹھیک اسی طرح کی فرقہ پروری ہے۔ کانگرس کی گزشتہ 53 سالہ تاریخ اس بدترین قسم کی فرقہ پروری اور جماعت پسندی سے ایسی داغدار ہے کہ کوئی قوت اس کے دامن سے وہ دھبے نہیں چھڑا سکتی۔ کانگرس حق کے لئے کھڑے ہوئے کمزوروں کی حمایت کرنے اور زبردستوں سے زیردستوں کے حقوق منوانے کی جدوجہد کا دعویٰ کرتی ہے مگر اس کا یہ حال ہے کہ سب سے پہلے گھر کے اندر جو اکثریت اقلیتوں پر مظالم دن دہاڑے برپا کر رہی ہے اور جس طرح ملک کے نظم و نسق اور ملکی اختیارات پر اپنا اجارہ مکمل کرنے اور اقلیتوں کو مغلوب اور مقہور بنا کر سارے ملک کے اندر اکثریت اپنا غیر مسئول راج قائم کرنے کے لئے خفیہ اور اعلانیہ جدوجہد کر رہی ہے۔ کانگرس صرف یہی نہیں کہ اکثریت کے اس جارحانہ اقدام سے کمزور اقلیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اقلیتوں کی پشت پناہی نہیں کر رہی ہے بلکہ اس کے برعکس اپنی خاموشی سے اکثریت کے ان عزائم و مقاصد کی کھلی حمایت اور پشت پناہی کر کے اقلیتوں کو یہ مشورہ دے رہی ہے کہ تم سب اپنی ہستی کو اور اپنی زندگی کو اکثریت کے رحم و کرم کے حوالہ کر دو۔ اندھیر دیکھئے کہ جب اقلیتیں اکثریت کی اس جارحانہ دستبرد کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں تو کمزوروں کی یہ پشت پناہ اور زیردستوں کی یہ حامی کانگرس، بے انصاف اکثریت سے لڑنے کی بجائے اقلیتوں ہی سے جنگ کرنے اور زبردستی ان کی ہی آواز کو روکنے کے لئے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے...... کانگرس اگر سچ مچ ملکی آزادی کی علمبردار ہوتی، اگر کمزوروں کی حمایت اس کا مطمع نظر ہوتا تو سب سے پہلے ملک کی

اقلیتوں کو بلاتی اور اکثریت سے اقلیتوں کے واجبی حق اور واجبی سیاسی پوزیشن کو تسلیم کراتی۔ جب اقلیتیں مطمئن ہو جاتیں اور گھر کا جھگڑا اور نفاق ختم ہو جاتا تب مشترکہ ملکی مقاصد کی راہ میں کامیابی سے قدم رکھتی۔ مگر اے تعجب! کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے بلکہ خود اقلیتیں جب اپنی زندگی کے لئے اور اپنی ہستی اور بقا کے لئے اور اپنے پیدائشی حقوق کے لئے خود آواز بلند کرتی ہیں تو کانگرس اس وقت اکثریت کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی اقلیتوں کو فرقہ پرست، جماعت پرور، تنگ نظر اور دشمن ملک وملت کہہ کر اکثریت کے جارحانہ اصولوں کی ہمت افزائی کرتی ہے اور پھر اپنی اس شرمناک فرقہ پروری اور بدترین جماعت پسندی کا نام ''وطن پسندی'' رکھتی ہے اور ہمارے چند سحر زدہ بھائی اس کی اکثریت نواز فرقہ پروری کو آزادی کی خالص جدو جہد قرار دے کر خوش ہوتے، بغلیں بجاتے اور دنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہی وطن کے سچے فدائی اور دلدادہ ہیں۔'' [17] لیکن آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر وی۔ ڈی۔ ساور کر اور مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے لیڈر ستیا مورتی جیسے لوگوں پر عصر جدید جیسے عناصر کے اس واویلا اور آہ وبکا کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ساور کر کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں اکثریت میں ہونا کوئی بڑا جرم ہے۔ ہر جگہ ہم یہی سنتے ہیں چونکہ تم اکثریت میں ہو اس لئے اقلیت کو مطمئن کرو۔ ہندو اگر اکثریت میں ہیں تو دوسروں کی قیمت پر نہیں ہیں بلکہ اس لئے اکثریت میں ہیں کہ انہوں نے مناقشہ للبقاء (Struggle of Survival) میں اپنے کو موزوں ترین ثابت کر دکھایا ہے۔ میں ہندوؤں سے اصرار کرتا ہوں کہ دوسروں کے سامنے ایک انچ بھی نہ جھکیں اور اپنے جائز حقوق پر اڑے رہیں۔'' [18] اور ستیا مورتی کی خواہش یہ تھی کہ ''اس ملک میں ہم خواہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھیں ابتدائے زندگی سے موت تک اول میں ہندوستانی، آخر میں ہندوستانی اور ہمیشہ ہندوستانی ہی رہنے کی کوشش کریں...... یہ قوم صرف اسی صورت میں ایک نا قابل تفریق، آزاد اور خوددار ہو سکتی ہے جبکہ تمام لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ ہندوستانی ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔'' [19]

31 / مارچ کو اسمبلی کی طرف سے 6 / مارچ کو مقرر کردہ سیلیکٹ کمیٹی نے ایوان کو اپنی رپورٹ پیش کر دی جس میں مجوزہ بل میں معمولی ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔ لیکن اچھوت ارکان اسمبلی اس رپورٹ سے مطمئن نہیں تھے کیونکہ اس میں ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا کہ 99 ارکان کی کارپوریشن میں اچھوتوں کے لئے سات کی بجائے 12 نشستیں مخصوص کی جائیں۔ ان کا

دعویٰ یہ تھا کہ شہر میں ان کی آبادی 12 فیصدی سے کم نہیں ہے۔ 10 / اپریل کو کلکتہ شیڈول کاسٹ ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں جداگانہ طریقۂ انتخاب کی پرزور حمایت کرتے ہوئے اچھوتوں کے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ انہیں کارپوریشن میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نشستیں دی جائیں۔ اچھوتوں کی یہ قرارداد اخبارات میں شائع ہوئی تو شہر کے اونچی ذات کے ہندو آپے سے باہر ہو گئے اور کارپوریشن کے باپو، سوبھاش چندر بوس کی نیند حرام ہو گئی۔ اس نے 17 / اپریل کو جاماودیا کے صحت افزا مقام سے اخبارات کے نام ایک طویل بیان میں بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ ''کلکتہ میونسپل ایکٹ میں ترمیم کرنے کے متعلق ''حق وزارت'' کے تازہ رجعت پسندانہ اقدام نے بنگال کے تمام آزادی پسند لوگوں کی طرح مجھے بھی سخت پریشان کر دیا ہے...... میری اکثر راتیں بے چینی میں گزر رہی ہیں۔ میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا ہے کہ میں کس طرح جمہوریت اور ترقی کے خلاف اس غداری کو روک سکتا ہوں جو سر سریندر ناتھ کے کارناموں کو خاک میں ملا رہی ہے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا میں نے حکومت بنگال کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اس نے کلکتہ میونسپل ایکٹ میں مداخلت کی کوشش کی تو میں خاص جنگ شروع کروں گا۔ میں اس انتباہ کو بھولا نہیں ہوں۔ اس عرصے میں اس سوال پر غور کرتا رہا ہوں کہ دفاع کا صحیح طریق کار کیا ہوگا؟ آیا ہمیں سارے ہندوستان میں پورن سوراج کے لئے جنگ شروع کر دینی چاہیے؟ جس سے موجودہ دستور اساسی اور صوبائی حکومت معرض التوا میں پڑ جائے یا ہمیں موجودہ وزارت کا تختہ الٹ دینا چاہیے؟ جس سے تمام برائیاں دب جائیں یا ہمیں اس سیاہ بل کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے ''براہ راست'' کاروائی کرنی چاہیے؟ ان سوالات کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوتا رہا کہ آیا ہمیں جنگ کی تیاری کے لئے اولین اقدام کے طور پر کارپوریشن سے نکل جانا چاہیے؟...... پبلک کے تمام افراد جو اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہیں مجھے مشورہ دیں...... سب سے زیادہ تشویشناک یہ چیز ہے کہ موجودہ بل میں، جس کا تعلق کارپوریشن کے آئین اور تشکیل سے ہے، دوسرے بلوں کا پیش خیمہ ہے جو عوام کے نمائندوں کو ان اختیارات سے محروم کریں گے جو انہیں حاصل ہیں۔ مختصر یہ کہ حق وزارت کی قانون سازی کی مذکور الصدر کوشش جمہوریت اور ترقی کے خلاف ایک جرم ہے۔''[20] اگرچہ سوبھاش چندر بوس کے اس بیان میں جنگ اور ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکیاں موجود تھیں لیکن اس میں اس امر کا زیادہ امکان نظر نہیں

آتا تھا کہ میونسپل بل کی منظوری کی صورت میں ہندو کونسلرز کارپوریشن سے مستعفی ہو جائیں گے۔
سوبھاش بابو کو دوسرے جن بلوں کے بارے میں سخت تشویش تھی ان میں ایک مہاجنی بل تھا۔ جس کے خلاف بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس، دی انڈین چیمبر آف کامرس اور مارواڑی ایسوسی ایشن کی طرف سے سخت احتجاج کیا جا رہا تھا۔ ہندوؤں کی ان کاروباری تنظیموں کے ایک وفد نے اس سلسلے میں فروری کے تیسرے ہفتے میں وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق اور وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار سے ملاقات کی تھی۔ وفد کی رائے یہ تھی کہ اگر مہاجنی کاروبار پر ناروا پابندیاں لگائی گئیں تو زرعی اور صنعتی ضرورتوں کے لئے روپے کی مانگ پوری نہیں ہو سکے گی۔ وفد نے ایک یادداشت بھی پیش کی تھی جس کے اندر یہ کہا گیا تھا کہ اس بل میں سیلیکٹ کمیٹی نے جو ترمیم کی ہے اس سے مجوزہ قانون بالکل یک طرفہ ہو گیا ہے جس سے دیہی اور شہری علاقوں میں قرض روپے ملنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس بل میں بینک، انشورنس کمپنی، تجارتی کمپنی اور مالی کارپورشن اور پرامیزری (Promisery) نوٹ وغیرہ کو بھی حلقہ کے اندر لے لیا گیا ہے حالانکہ ان اداروں کے متعلق قوانین بنانا صوبوں کے اختیار سے باہر ہے۔ اگر یہ بل پاس ہو گیا تو جو بینک اس کے حلقہ میں آئیں گے وہ آسانی سے اپنے قرض وصول نہیں کر سکیں گے لہٰذا جو واجبات ان پر عائد ہوتے ہیں مطالبہ کے وقت وہ اسے پورا نہیں کر سکیں گے۔''[21]

تاہم سوبھاش بابو کی ان دھمکیوں کے باوجود 19/اپریل 1939ء کو صوبائی اسمبلی میں کلکتہ میونسپل ترمیمی بل پر بحث شروع ہو گئی۔ حزب اختلاف نے اس بل کو دوبارہ سیلیکٹ کمیٹی کے پاس بھیجنے کے لئے تقریباً نصف درجن ترامیم پیش کیں جو سب کی سب مسترد ہو گئیں۔ صرف ایک ترمیم پر رائے شماری ہوئی اور وہ بھی 83 کے مقابلے میں 123 ووٹوں سے مسترد ہو گئی۔ رائے شماری کی خصوصیت یہ تھی کہ ایوان کے تقریباً سارے ہندو ارکان نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیئے۔ اسمبلی کی اس کاروائی کے پیش نظر سوبھاش چندر بوس نے شردھانند پارک میں ایک جلسہ عام کر کے حاضرین کو تلقین کی کہ وہ سر سریندر ناتھ بینر جی کی یہ یادگار اور ان کے ایثار سے حاصل کردہ یہ نتائج گرانمایہ یعنی مخلوط انتخاب ضائع نہ ہونے دیں۔'' اس تقریر پر روزنامہ عصر جدید نے تبصرہ کرتے ہوئے بڑے افسوس کا اظہار کیا۔ اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ'' آج وہ شخص جو کانگرس کی صدارت کا مدعی ہے اور کانگرس کا اصول پیش کرتا ہے اور اپنے آپ کو سی۔ آر۔ داس کا

پیرو کہتا ہے یعنی سوبھاش چندر بوس، وہ لوگوں کو آج سر سریندر ناتھ بنیر جی کی مثال کی پیروی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور بنگال میں جس چیز کو سی۔ آر۔ داس نے ختم کر دیا تھا آج یہ شخص اس کو زندہ کر رہا ہے۔ کیا بوس کو معلوم ہے کہ آنجہانی سی۔ آر۔ داس نے بنگال اور بالخصوص کلکتہ کارپوریشن کے مسئلہ کا دائمی حل کیا تجویز کیا تھا؟ کیا میثاق بنگال (Bengal Pact) کی کوئی کاپی بوس کے پاس موجود ہے۔ اگر نہیں تو وہ کسی قریبی کتب خانے میں جا کر سی۔ آر۔ داس کی کوئی انگریزی یا بنگلہ زبان کی سوانح عمری خرید کر پڑھ لیں۔ آنجہانی سی۔ آر۔ داس نے کلکتہ کارپوریشن میں ہی نہیں بلکہ پورے بنگال کے لئے جداگانہ انتخاب تسلیم کر لیا تھا۔ کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ نشستیں مخصوص کر دی تھیں اور آج جو چند سینیئر مسلمان افسر نظر آ رہے ہیں یہ اسی زمانے کی یادگار ہیں جب بوس اس گراں پایہ لیڈر کی بدولت کارپوریشن کا چیف ایگزیکٹو آفیسر بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی بوس اور اس کے دوستوں نے کیا کیا؟ ان کی تمام تجاویز کو، ان کے تمام حل کردہ مسائل کو پس پشت ڈال دیا اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ پیسنے کی پالیسی پر گامزن ہو گئے اور آج تک اسی پر قائم ہیں۔ سر سریندر ناتھ بینر جی کبھی بھی بنگال کا متفقہ لیڈر نہیں تسلیم کیا گیا اور نہ اس نے کبھی اس کا اعادہ کیا۔ لیکن آنجہانی سی۔ آر۔ داس بنگال کے متفقہ لیڈر تھے۔ ان سے مسلمان اتنا ہی محبت و پیار رکھتے تھے جتنا کہ ہندو۔ ان کی ہر بات پر بے چون و چرا بنگال کی پوری آبادی اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ ہم سوبھاش چندر بوس اور اس کے دوستوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور آنجہانی سی۔ آر۔ داس کے مرتب کردہ میثاق بنگال پر عملدرآمد کرنے پر رضا مند ہوں۔ مسلمان بے چون و چرا ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔ یہ بالکل کھلاڑیوں جیسی پیشکش ہے۔ کیا بوس اس کے لئے تیار ہے۔ بوس اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ اس میثاق بنگال پر عمل شروع کرے تو پھر اس کے اور اس کے اونچی ذات والوں کے مفاد جو غریب اور اقلیت والوں کے حقوق غصب کرنے میں ہیں، حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ بوس نے اسی لئے سی۔ آر۔ داس کی بجائے سر سریندر ناتھ بینر جی کا نام لینا شروع کر دیا ہے...... بوس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اب دنیا کے لوگ اتنے بے وقوف نہیں رہے جو ان کی اس قسم کی ریاکارانہ باتوں کو نہ سمجھ سکتے ہوں۔ مسلمان، اچھوت اور عام لوگ بیدار ہو چکے ہیں۔ وہ اونچی ذات کے چند سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کے ختم کر دیئے جانے کا مطالبہ کر چکے ہیں اور اس پر اڑے ہوئے

ہیں۔ اگر بوس ایک مظاہرہ کرے گا تو مسلمان، اچھوت اور عام لوگ دس مظاہرے کریں گے۔ اگر وہ کوئی تحریک اٹھائے گا تو دوسرے اس کے مقابلے کے لئے دس تحریکیں اٹھائیں گے۔ بوس نے ابھی عوام کے جذبات کا اندازہ نہیں کیا ہے اسی لئے وہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ ہم عام شہریوں کی طرف سے بوس کے ہر چیلنج کو قبول کرتے ہیں اور تیار ہیں۔"[22] عصر جدید کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ فضل الحق کی حکومت کلکتہ میونسپل ترمیمی بل منظور کروانے کا پختہ عزم کئے ہوئے ہے اور وہ سوبھاش اور ساورکر وغیرہ کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوگا۔ چنانچہ 4رمئی 1939ء کو اس بل پر شق وار بحث ہوئی جو تین چار دن جاری رہی اور بالآخر 11رمئی کو یہ مسودہ قانون 65 کے مقابلے میں 128 ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہو گیا اور پھر 13رجولائی 1939ء کو بنگال کونسل نے بھی اس کی توثیق کر دی۔

صوبائی اسمبلی میں اتنی اکثریت سے اس انتہائی متنازعہ مسودہ قانون کے منظور ہو جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں بنگال کی مسلم رائے عامہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر اس قدر متحد و منظم ہو چکی تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور اس بنا پر حق وزارت کو اپنی سیاسی قوت پر بھروسہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یورپین گروپ اور متعدد اچھوت ارکان اس بل کے حق میں تھے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ سوبھاش چندر بوس کانگرس کے اندر دھڑے بندی کی سیاست میں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ اسے صوبائی حکومت کے خلاف یکسوئی کے ساتھ مؤثر مورچہ بنانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

سوبھاش بوس اور گاندھی کا تضاد...... بوس کی کانگرس کی صدارت سے علیحدگی

سوبھاش چندر بوس کی کانگرس کے اندر دھڑے بندی کی ابتدا جنوری 1939ء کے اواخر میں ہوئی تھی جبکہ اس نے برصغیر کے سارے صوبوں میں کانگرس کے صدارتی انتخاب میں گاندھی کے نامزد امیدوار ڈاکٹر پتابھ بھائی سیتا رامیہ کو 1377 کے مقابلے میں 1580 ووٹوں سے شکست دی تھی۔ اسے بنگال کے 404 ووٹ ملے تھے جبکہ ڈاکٹر رامیہ صرف 79 ووٹ حاصل کر سکا تھا۔ گاندھی نے بوس کے اس انتخاب کو پسند نہیں کیا تھا اور کھلم کھلا یہ کہا تھا کہ اس انتخاب میں دراصل میری شکست ہوئی ہے۔ بوس کو گاندھی کی اس مخالفت کی سنگینی کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے

اپنا سارا سیاسی مستقبل داؤ پر لگا کر فروری کے وسط میں جلپائی گوڑی میں ایک پولیٹیکل کانفرنس کی تھی جس میں اس نے کانگرس کے نام نہاد سوشلسٹ گروپ کو متحد و منظم کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس نے اسی مقصد کے لئے اپریل کے تیسرے ہفتے میں بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کا اجلاس بلایا اور دوسری مرتبہ صوبائی کانگرس کا صدر بھی منتخب ہو گیا۔ اس نے یہ کاروائی اس امید میں کی تھی کہ چند دنوں کے بعد کلکتہ آل انڈیا کانگرس کا جو اجلاس ہونے والا تھا اس میں اس کے جنوری کے صدارتی انتخاب کی توثیق کر دی جائے گی۔ گاندھی اس اجلاس میں شرکت کے لئے 27 اپریل کو کلکتہ پہنچا اور اس نے سوبھاش چندر بوس کے ساتھ طویل ملاقات کی جس میں جواہر لال نہرو بھی موجود تھا۔ اب جھگڑا کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان کی نامزدگی کا تھا۔ گاندھی کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ عاملہ میں اس کے پسندیدہ ارکان کی اکثریت ہو جبکہ بوس چاہتا تھا کہ عاملہ میں ایسے ارکان ہوں جو اس سے کسی مسئلہ پر اختلاف رائے یا محاذ آرائی نہ کریں۔ بالفاظ دیگر کلکتہ کا بنگالی بابو، احمد آباد کے بنیے کو نیچا دکھا کر پورے ہندوستان کی سیاست میں از سر نو بنگالی ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کا متمنی تھا مگر اس نے بنیے کی مکاری، عیاری اور ریاکاری کی قوت کا غلط اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ جب 29 اپریل کو ویلنگٹن اسکوائر میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو زبردست گالی گلوچ ہوئی۔ جب سوبھاش چندر بوس نے اس ہنگامے میں گاندھی کے حامیوں کی برتری کا مظاہرہ دیکھا تو اس نے صدارت کے عہدے سے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں جواہر لال نہرو نے بوس سے اپنا استعفیٰ واپس لینے کی اپیل کی لیکن جب بوس نے یہ اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا تو گاندھی کے پسندیدہ امیدوار ڈاکٹر راجندر پرشاد کو کانگرس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس پر اجلاس میں زبردست فساد ہوا۔ جس میں 12 افراد زخمی ہوئے اور پولیس نے کئی افراد کو گرفتار کر لیا۔ یکم مئی کو تیسرا اجلاس ہوا تو حاضرین نے لیڈروں پر پتھراؤ کیا۔ نہرو کی پیشانی پر چوٹ آئی اور ایک شخص نے راجندر پرشاد کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔ چونکہ راجندر پرشاد بہار کا رہنے والا تھا اس لئے بہاری مندوبین بہت مشتعل ہو گئے۔ اس موقع پر بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان خونریز فساد ہونے ہی والا تھا کہ پولیس نے لاٹھی چارج کر کے ہجوم کو منتشر کر دیا اور اس طرح بنگالی بابو، احمد آباد کے بنیے کے ہاتھوں بری طرح مات کھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ احمد آباد کے بنیے کو مغربی

ہندوستان کے سرمایہ داروں کے علاوہ کلکتہ میں مقیم مارواڑیوں کی بھی زبردست تائید وحمایت حاصل تھی۔ مالدار معاشی قوت کا بے مایہ سیاسی قوت پر غلبہ پانا ناگزیر تھا۔

5 رمئی کو بنگال کونسل میں سرکاری پارٹی کے ایک رکن قادر بخش نے راجندر پرشاد پر کانگرسی غنڈوں کے حملے پر بحث کرنے کے لئے تحریک التوا پیش کی تو وزیر داخلہ خواجہ سر ناظم الدین نے کہا کہ ''دل چاہتا ہے کہ اس معاملے کے سیاسی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے پولیس کی مداخلت سے الگ گفتگو کروں لیکن میرے لئے ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بہرحال میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بنگال کانگرس کے ساتھ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جو سلوک کیا ہے وہ ان مسلمانوں کی آنکھیں کھول دے گا جو برابر یہی کہتے رہتے ہیں کہ کانگرس میں شامل ہو جاؤ اور کانگرس والوں کے منصفانہ اور صاف خیالات پر بھروسہ کرو۔ آل انڈیا لیڈر کلکتہ آئے تھے کہ صلح کرائیں گے۔ بہرحال ویلنگٹن اسکوائر کے حادثہ کی مذمت کرنی چاہیے خواہ بنگال کے نقطۂ نگاہ سے اشتعال کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔''[23] ظاہر ہے کہ کونسل میں یہ تحریک التوا حکومت نے خود ہی پیش کروائی تھی کیونکہ خواجہ ناظم الدین اس بحث میں بنگالی بابوؤں کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ آئندہ غیر بنگالی لیڈروں کے اکسانے پر صوبہ میں کوئی سیاسی بحران پیدا نہ کریں۔

صوبائی حکومت کی تمام سروسز میں مسلمانوں کے لئے بلحاظ آبادی کوٹا مقرر کرنے کی تحریک اور ہندو۔ مسلم تضاد کی شدت میں اضافہ

صوبائی اسمبلی میں کلکتہ میونسپل بل کے تصفیے سے فارغ ہونے کے بعد مسلمانان بنگال کے اس دیرینہ مطالبے کی طرف توجہ کی گئی کہ صوبائی حکومت کی ساری سروسز میں مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے لحاظ سے کوٹا مخصوص کیا جائے۔ اگرچہ صوبائی اسمبلی 25 راگست 1938ء کو سرکاری کولیشن پارٹی کے ایک رکن عبدالحفیظ کی یہ قرارداد منظور کر چکی تھی کہ پبلک سروسز میں 60 فیصدی اسامیاں مسلمانوں کے لئے، 20 فیصدی پست اقوام کے لئے اور 20 فیصدی دوسرے فرقوں کے لئے مخصوص کی جائیں۔ تاہم مولوی فضل الحق نے 15 رمئی 1939ء کو اس سلسلے میں اپنی کابینہ کے ارکان کے نام جو نوٹ بھیجا، اس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ صوبائی حکومت میں مسلمانوں کے لئے تمام اسامیوں میں سے 55 فیصدی نشستیں مخصوص ہوں اور نیچ ذاتوں کے لئے

15 فیصدی اسامیاں الگ کر دی جائیں۔ فضل الحق کی رائے یہ تھی کہ ''سروسوں میں بھرتی کے لئے بلاتفریق ذات پات ایک کھلے مقابلہ کا نظریہ اس ملک میں بہتر سمجھا جا سکتا ہے جہاں کی آبادی کم مختلف الخیال اور زیادہ ہموار ہو نہ کہ ہندوستان میں جہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں (جیسا کہ اس کا وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار کہتا تھا) کہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ کھلے مقابلے کے امتحانوں کے سسٹم میں جب تک خاص تبدیلیاں نہ ہوں اس وقت تک مسلمانوں کی بھرتی کا سلسلہ پبلک سروسوں میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بہرحال نتیجہ ان تمام باتوں کا یہ نکلا کہ اعلیٰ ترین ڈگریوں کے اصول میں تغیر و تبدل کرنا پڑا اور یہ طے پایا کہ مسلمان کم سے کم قابلیت پر بھی، جو سروس کے لئے ضروری ہو، اس مقرر کردہ مسلمانوں کے کوٹا میں لئے جائیں گے۔''[24]

16 رمئی کو دار جیلنگ میں اس مسئلہ پر کابینہ میں غور ہوا تو فضل الحق اور اس کے وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار میں اس تجویز پر پوری طرح اتفاق نہ ہوسکا اور یہ طے ہوا کہ کابینہ کی آئندہ میٹنگ میں اس مسئلہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ چونکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لئے وزیر اعلیٰ فضل الحق کی یہ تجویز کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ اس لئے ان کی سربرآوردہ شخصیتوں نے اس مسئلہ پر کابینہ کے فیصلہ کے التوا سے فائدہ اٹھا کر صوبائی گورنر سے بذریعہ تار ملاقات کی درخواست کی اور یہ لکھا کہ سرکاری ملازمتوں میں کوٹا مقرر کر کے دراصل ہندوؤں کو دبایا جا رہا ہے اور ان کے مفاد کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ لہٰذا گورنر کو چاہیے کہ وہ مداخلت کر کے کابینہ کو اس قسم کا فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دے۔ گورنر سے یہ استدعا کرنے والوں میں ڈاکٹر ٹیگور، مہاراجہ بہادر بردوان، سر پی۔ سی۔ رائے، لارڈ سنہا، مہاراجہ سر پروینڈت کمار ٹیگور، سر منمناتھ مکرجی اور سر نیل رتن سرکار شامل تھے۔''[25]

جب صوبائی گورنر سر رابرٹ ریڈ (Robert Reed) نے ان درخواست دہندگان سے 27 رمئی کو ملاقات پر آمادگی ظاہر کی تو صوبائی حکومت نے گورنر کے نام ایک نوٹ میں اسے مطلع کیا کہ ''گورنر کو سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ کوٹا مقرر کئے جانے کے معاملہ میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے'' اور 22 رمئی کو اخبارات میں وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار کا یہ ایک طویل بیان شائع ہوا جس میں اس نے ہندو مفاد پرستوں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے اس مسئلہ پر اپنے مصالحتی رویے کا جواز پیش کیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے سرکاری

ملازمتوں میں کوٹا مقرر کرنے کا سوال نیا نہیں ہے۔ 1924ء میں آنجہانی سی۔آر۔داس نے جو مشہور معاہدہ کیا تھا اس وقت سے سرکاری ملازمتوں میں دونوں فرقوں کے لئے کوٹا مقرر کئے جانے پر سخت اصرار رہا ہے اور سر عبدالرحیم نے اس سلسلے میں ابتدا کی تھی۔ بعد میں 1934ء کے اندر اس وقت کی حکومت نے طویل بحث کے بعد ایک پالیسی متعین کی تھی۔ ہم لوگوں کے وزارت قبول کرنے کے بعد ہی اس سوال کو پھر سامنے لایا گیا اور وزرا میں بحث ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے کہا گیا کہ مسلمان اپنی آبادی کی بنا پر 55 فیصدی ملازمتوں کے حقدار ہیں۔ لیکن ہندو وزرا نے سابق گورنر سر جان اینڈرسن (Anderson) کی مدد سے مسلم وزرا کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مسلمانوں کے لئے 45 فیصدی ملازمتیں محفوظ کر دی جائیں۔ لیکن اس سے نہ تو کولیشن پارٹی کے ممبر مطمئن ہوئے اور نہ ہی مخالف پارٹی کے مسلمان مطمئن ہوئے اور ان لوگوں نے آبادی ہی کے مطابق نہیں بلکہ اس سے زیادہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اگست 1938ء میں اسمبلی نے عبدالحفیظ کی یہ قرارداد منظور کر دی کہ مسلمانوں کے لئے 60 فیصدی اسامیاں مخصوص کی جائیں۔ اس وقت کانگرس نے کسی مصلحت کی بنا پر اس قرارداد کی مخالفت نہیں کی تھی۔ 25 مئی کو مہاراج بردوان کی زیر قیادت ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، این۔آر۔باسو (کانگرس)، ایس۔این۔ چیٹر جی (کانگرس)، سر ہری سنگھ پال (کانگرس)، این۔سی۔ چیٹر جی (ہندو مہاسبھا) اور مہاراجہ میمن سنگھ (زمیندار) پر مشتمل ایک وفد گورنر سے ملاقات کے لئے دارجیلنگ روانہ ہوا تو مہاراجہ بردوان نے بنگالی ہندوؤں کے نام ایک پیغام میں کہا کہ ''ہم لوگ اس امید میں دارجیلنگ جا رہے ہیں کہ بنگال کی ملازمتوں کے اندر عام طور سے ہندوؤں کے ساتھ مجوزہ حصہ رسدی کے ذریعہ جو بے انصافی کی گئی ہے اس کی تلافی ہو سکے۔ یہ ایک غیر جماعتی سوال ہے اور ہر ہندو کو لازم اور ضروری ہے کہ اس میں شریک ہو۔ ہر منصف دماغ خواہ ہندو یا کوئی اور ہو، ضرور اس کھلی بے انصافی کو تسلیم کرلے گا جو اس کے ساتھ اقلیت کا درجہ دے کر کیا جا رہا ہے لیکن چونکہ ہندو بنگال کے پڑھے لکھوں کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، اس لئے ہندوؤں کو چاہیے کہ جتنا تحمل کر سکتے ہیں کریں۔ ہم کسی دوسرے کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتے ہیں مگر اپنے ساتھ انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔''[26] اس وفد کے ارکان کے ناموں پر اور چند دن قبل جن لوگوں نے گورنر سے بذریعہ تار ملاقات کی استدعا کی تھی، ان کے ناموں پر

ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک مسلم اکثریتی صوبہ بنگال کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق تھا اس کے خلاف ہر مکتب فکر کے ہندو نمائندے متحد و متفق تھے لیکن سوبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس نے بھی ایک بیان میں ہندوؤں کے اس موقف کی پرزور حمایت کرتے ہوئے صوبائی حکومت کی ''فرقہ پرستی'' کی مذمت کی تھی۔ لیکن یہ امر بھی اہمیت سے خالی نہیں تھا کہ ان ناموں میں کسی اچھوت لیڈر کا نام شامل نہیں تھا۔ صوبہ کی حکومت کے سارے محکموں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور وہ اپنی اس پوزیشن کو بہر قیمت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

مسلم لیگی اخبار سٹار آف انڈیا نے ہندوؤں کے ان عزائم کے پیش نظر صوبائی گورنر کو متنبہ کیا کہ ''چونکہ صوبائی اسمبلی اس مسئلہ کے بارے میں قرارداد منظور کر چکی ہے اس لئے وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے پیراگراف 10 سیکشن 2 (بی) کے تحت اس سلسلہ میں مداخلت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر اس معاملے میں کوئی مداخلت ہوئی تو مسلم وزرا فی الفور وزارت سے استعفیٰ دے دیں گے اور بنگال کے اندر آئینی تعطل پیدا ہو جائے گا اور ہمیں یہ کہنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر کوئی وزارت نہیں بنائی جا سکتی۔''[27]

27 رمئی کو بنگال کے وزیر داخلہ خواجہ ناظم الدین نے شملہ میں ایک انٹرویو میں سرکاری ملازمتوں میں کوٹا سسٹم کے خلاف بنگالی ہندوؤں کی ایجی ٹیشن کو بے جواز قرار دیا۔ اس نے کہا کہ ''حکومت بنگال کی اس سلسلے میں پالیسی کوئی انوکھی نہیں ہے۔ قبل ازیں حکومت ہند مرکزی سروسز میں مختلف فرقوں کے لئے ان کی آبادی کے لحاظ سے کوٹے مقرر کر چکی ہے۔ برطانیہ میں جب انڈین سول سروس کا امتحان ہوتا ہے تو اس میں محض قابلیت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بہت سے ہندوستانی امیدواروں کو ان کی قابلیت کے باوجود نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا بنگالی مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے لحاظ سے ملازمتوں کا کوٹا مقرر کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے 55 فیصدی ملازمتوں کا مطالبہ بالکل جائز ہے'' اسی دن ہندوؤں کے وفد نے دارجیلنگ میں گورنر سے ملاقات کر کے اس سے بذریعہ یادداشت استدعا کی کہ بنگال کے ہندو اقلیت میں ہیں لہٰذا ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ ہندو کسی قسم کی رعایت نہیں چاہتے بلکہ مساویانہ اور منصفانہ سلوک چاہتے ہیں۔ ہندوؤں پر کسی جانب سے کوئی پابندی ملازمت میں نہیں

ہونی چاہیے بلکہ آزاد اور منصفانہ مقابلہ سے ملازمت میں بھرتی ہونے کا دروازہ ان کے لئے کھلا رہنا چاہیے۔ اس یادداشت میں ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ ''حضور اعلیٰ سے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اکثریت کی طرف سے اقلیت پر جو ظلم ہو اس سے اقلیت کو بچائیں بلکہ خاص طور سے یہ دیکھنا بھی آپ کا فرض ہے کہ موجودہ پالیسی اگر جاری رہی تو اس صوبہ کے امان وامان پر اس کا ردعمل کیا ہوگا اور جس کو بچانا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت آپ کا ضروری فرض ہے۔''[28] وفد کی یہ معروضات اس لحاظ سے مضحکہ خیز تھیں کہ جب 1935ء میں حکومت برطانیہ نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی روشنی میں نیا گورنمنٹ آف آنڈیا ایکٹ نافذ کیا تھا تو کانگرس، ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ اور برصغیر کی دوسری سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی ان دفعات پر سخت اعتراض کیا تھا جن کے تحت صوبائی گورنروں کو خصوصی اختیارات دیئے گئے تھے اور کانگرس نے 1937ء کے اوائل میں ملک کے سات صوبوں میں انتخابی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود کئی ماہ تک صوبائی وزارتیں نہیں بنائی تھیں کیونکہ وہ گورنروں کو اقلیتوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لئے وزارتوں کے کام میں مداخلت کرنے کا حق دینے کے خلاف تھی اس نے جولائی 1937ء میں صوبائی وزارتیں محض وائسرائے کی اس یقین دہانی کے بعد ہی قبول کی تھیں کہ گورنر بالعموم نمائندہ وزارتوں کی کسی کاروائی میں دخل نہیں دے گا۔ مگر اب بنگال کانگرس کے لیڈروں کا وفد صوبائی گورنر سے دست بستہ استدعا کر رہا تھا کہ وہ سرکاری ملازمتوں میں کوٹا سسٹم کے بارے میں صوبائی حکومت کے متوقع فیصلے کا اس حقیقت کے باوجود سدباب کرے کہ صوبائی اسمبلی کسی اختلاف رائے کے بغیر یہ قرارداد منظور کر چکی تھی کہ آئندہ پبلک سروسز میں 60 فیصدی اسامیاں مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں گی۔

بنگالی کانگرسیوں کی طرف سے یہ غیر اصولی اور فرقہ پرستانہ موقف بظاہر اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ ان کی صوبائی تنظیم اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے ایک خالص ہندو تنظیم تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ انہی دنوں بنگال کانگرس کمیٹی کے 128 ارکان کے جو نام شائع کئے گئے تھے ان میں مسلمانوں کی تعداد صرف گیارہ تھی۔ گویا صوبائی کمیٹی میں مسلمانوں کو تقریباً 8 فیصدی نمائندگی حاصل ہوئی تھی حالانکہ صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تقریباً 57 فیصدی تھا۔ کمیٹی میں جو گیارہ مسلمان تھے وہ سب ایسے تھے کہ جن کا صوبائی سیاست میں کوئی مقام نہیں تھا۔ لہٰذا یہ

کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ اس وفد نے گورنر سے ملاقات کے بعد ایک بیان میں اعلانیہ طور پر شکوہ کیا کہ ''آج اس صوبہ کے ہندوؤں میں یہ احساس ہر طرف پھیلا ہوا ہے کہ گزشتہ سال سے ہندوؤں کے واجبی حقوق کو سلسلہ وار گھٹایا جا رہا ہے اور آج کل ایسی طاقتوں کا غلبہ ہو گیا ہے جو ہندوؤں کو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنے والی ہیں۔''

ہندوؤں کے اس وفد کی گورنر سے ملاقات کے موقع پر وزیر اعلیٰ فضل الحق بھی دارجیلنگ میں تھا۔ چنانچہ اس نے وہیں سے ایک بیان میں سرت چندر بوس کے متذکرہ الزام کی تردید کی اور اس سے کہا کہ ''آؤ! اس مسئلہ کو باہم مل جل کر حل کریں...... ہندو مسلم اتحاد یا متحدہ بنگال کا امکان اس وقت تک پیدا نہیں ہو گا جب تک کہ مسلمانوں، اچھوتوں اور دیگر اقلیتوں کے متعلق بنیادی مسائل کا اس طرح حل نہ ہو کہ سب فرقے اس سے مطمئن ہو جائیں۔'' اس سے اگلے دن فضل الحق نے کلکتہ میں اس خط کا متن اخبارات کے نام جاری کر دیا جو اس نے اس مسئلہ کے بارے میں سرت چندر بوس کو لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے ملازمتوں میں کوٹا سسٹم کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ ''آپ اس امر سے کبھی انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں اور پست اقوام کو سرکاری ملازمتوں میں ٹھیک اور واجب حصہ نہیں دیا گیا۔ آج کل 73 فیصدی ملازمتوں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کا قبضہ ہے اور مسلمان اور پست اقوام صرف 14 فیصدی ملازمتوں پر قناعت کر رہے ہیں۔ دولت کی یہ بالکل ہی غیر مساویانہ اور نا منصفانہ تقسیم ہے لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ اگر صدیوں کی نہیں تو برسوں کی ہی غلط کاریاں دور کی جائیں اور جہاں تک اس کا جلد مداوا کیا جائے وہیں تک تمام متعلقہ لوگوں کے لئے بہتر ہو گا۔'' فضل الحق نے اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کے وفد کے اس مشترکہ الزام کی بھی تردید کی کہ ''گزشتہ ایک سال سے ہندوؤں کے واجبی حقوق کو سلسلہ وار گھٹایا جا رہا ہے۔'' اور کہا ''کوئی ایسی مثال بتاؤ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ بنگال کے ہندوؤں کی سیاست، معاشرت اور اقتصادیات کو کمزور کیا گیا ہے۔'' اس نے کہا کہ ''ہندو وفد کے اس مشترکہ بیان کو کسی ایسے پکے فرقہ پرست ہندو نے لکھا ہے جو مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق وسیع النظری سے کام لینے کو ہرگز تیار نہیں...... یہ ہندو لیڈر بنگال کے مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچانے اور ان میں لڑائی کرانے کے لئے اس قسم کی باتیں ان اخبارات سے لے کر لکھ رہے ہیں جو دن رات جھوٹی باتیں میری حکومت کے متعلق مشہور کرتے رہتے ہیں۔''[29]

لاہور کے روزنامہ انقلاب نے اپنی 31 رمئی کی اشاعت میں بنگال میں ملازمتوں کے سوال پر اس فرقہ وارانہ تنازعہ کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کی حکومت کی پرزور حمایت کی۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ”ہندو اخبارات میں بار بار لکھا جارہا ہے کہ زیر دفعہ 52 گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، گورنر پر ”اقلیتوں کے جائز حقوق کی حفاظت“ کے لئے خاص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے اسے چاہیے کہ ہندوؤں کی حفاظت کرے حالانکہ حکومت بنگال کسی اقلیت کے جائز حق کو تلف کرنے کی نیت نہیں رکھتی۔ البتہ وہ مسلمانوں کو تناسب آبادی کے مطابق حقوق دینے کا ارادہ ضرور رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ گورنر کی خاص ذمہ داریوں کا جو ذکر ”ہدایت نامے“ میں کیا گیا ہے اس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ملازمتوں میں مختلف قوموں کا تناسب معین کرنے کے لئے گورنر کو اپنے صوبے کی مُسلّم پالیسی کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ملازمتوں میں قوموں کے تناسب کا تعین صوبہ بنگال کی مُسلّم پالیسی ہے اور گزشتہ چند سال کے اندر اگرچہ اس پالیسی پر کماحقہ عمل نہیں ہوا، بہرحال پہلے کی نسبت ملازمتوں میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہے اور اس حالت کی ذمہ دار وہی مُسلّم پالیسی ہے جس کے ماتحت اقوام کا تناسب مدنظر رکھا جاتا ہے۔“

انقلاب کی طرف سے فضل الحق کی اس حمایت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ اخبار پنجاب میں سر سکندر حیات خان کی حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے پبلک سروسز میں مختلف فرقوں کا تناسب معین کرنے کے حق میں تھا۔ اس اخبار کا اولین سرپرست پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں کا لیڈر سر فضل حسین تھا۔ جب سر فضل 1921ء میں صوبہ کا وزیر تعلیم و بلدیات مقرر ہوا تھا، اس نے جو کام سب سے پہلے کئے تھے ان میں ایک یہ تھا کہ اس نے صوبہ کے تعلیمی و بلدیاتی اداروں میں مسلمانوں کے داخلے اور نمائندگی کا تناسب مقرر کر دیا تھا۔ اس پر راجہ نریندر ناتھ، لالہ لاجپت رائے اور دوسرے ہندو لیڈروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ حتیٰ کہ لالہ لاجپت رائے 1924ء میں اسی تنازعہ کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے اور ہندو۔ مسلم تنازعہ کے تصفیہ کے لئے ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی صورت میں برصغیر کی تقسیم ضروری ہے۔ اس نے اس سلسلے میں نہ صرف بنگال کے ایک وسیع المشرب لیڈر سی۔ آر۔ داس کو جو مسلمانوں سے ٹھوس مفاہمت کا علمبردار تھا، ایک خط لکھا تھا بلکہ اس نے لاہور کے روزنامہ ٹربیون میں ایک مضمون کے ذریعے برصغیر کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن شہری

ہندوؤں کی اس ایجی ٹیشن نے سرفضل حسین کواور بھی قائل کر دیا تھا کہ سرکاری اداروں میں مختلف فرقوں کوان کے تناسب آبادی کے مطابق حقوق دینا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر مسلمان اور دوسرے پسماندہ فرقے کبھی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکیں گے۔ چنانچہ نومبر 1929ء میں سرفضل حسین کی ہی تحریک پراس اخبار نے پنجابی مسلمانوں کے لئے چھپن فیصدی نمائندگی کے حصول کے لئے تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک تھوڑے ہی عرصہ میں پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں اتنی مقبول ہوئی تھی کہ کانگرس کواس کی مخالفت کے لئے اپنے مسلمان مولویوں کو استعمال کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ایک احراری خلافتی مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی کا 26/نومبر کو مقامی روزنامہ زمیندار میں بیان یہ تھا کہ ''چھپن فیصدی حقوق کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کو اپنے حقوق منوانے کے لئے یہی موقع نصیب ہونا تھا۔ وہ کھل کر یہ بات کیوں نہیں کرتے کہ کانگرس مکمل آزادی کے لئے جو جدوجہد شروع کرنے والی ہے اس میں انتشار واختلاف پیدا کرنے کے لئے یہی موقع ہے اوراس موقع پر مسلمانوں کے حقوق کا سوال اٹھایا جانا چاہیے۔''
مولوی حبیب الرحمٰن کا یہ بیان کانگرس کی طے شدہ پالیسی کے عین مطابق تھا اور وہ پالیسی یہ تھی کہ جب بھی کبھی مسلمانوں کے کسی حلقے کی طرف سے فرقہ وارانہ حقوق کا مطالبہ کیا جائے تو اس پر فی الفور فرقہ پرست، ملک وقوم کا دشمن، آزادی کا دشمن اور برطانوی سامراج کے پٹھو کا لیبل لگا دیا جائے اور اگر یہ لیبل کسی مولوی سے لگوایا جائے تو اس کی حیثیت ایک فتوے کی ہو جائے گی۔

مسلمانوں کوآبادی کے تناسب سے رعایتیں دینے پر کانگرسی مولویوں نے حق وزارت کی مخالفت کی

چنانچہ 1939ء میں بنگال میں بھی کانگرس نے اسی پالیسی پر عمل کیا۔ جب کلکتہ میونسپل بل کی اسمبلی میں منظوری کے بعد وسط مئی میں وزیر اعلیٰ فضل الحق نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا سوال اٹھایا تو اس کے چند دن بعد کلکتہ کے بازاروں میں اس مضمون کے پوسٹر دکھائی دیئے کہ جمیعت العلمائے بنگال کی ایک سہ روزہ کانفرنس 3، 4 اور 5/جون کو منعقد ہو گی۔ یہ پوسٹر پڑھ کر مقامی مسلم لیگیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ان کی تحریک پر 28/مئی کو کلکتہ میں تقریباً 25 ہزار مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا اور اس کانفرنس سے اپنی بیزاری کا اعلان

کیا۔ اس جلوس کے بعد رپن پارک میں حافظ شمشاد احمد کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ ''علما کے نام سے جو کانفرنس 3/جون سے کلکتہ میں ہونے والی ہے وہ علما کی کانفرنس نہیں ہے بلکہ کانگرسی گماشتوں کی کانفرنس ہے تا کہ بنگال کے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑ دیا جائے اور ان میں پھوٹ ڈال کر کانگرس اور مہا سبھا کے ہاتھوں کو مضبوط کیا جائے جو اس وقت کلکتہ میونسپل ترمیمی بل اور سرکاری ملازمت کے حصہ رسدی کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہی ہے۔''[30] تاہم 3/جون کو ہندوؤں کے محلوں کے اندر کالج اسکوائر کے یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں بنگال کے کانگرسی مولویوں کی کانفرنس شروع ہوئی۔ کانفرنس ہال کے باہر دو اڑھائی سو پولیس والوں کا پہرہ تھا۔ ''عصر جدید'' کی رپورٹ کے مطابق ''اس کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر خان بہادر محمد جان غائب تھا۔ اس کی بجائے قائمقام صدر نے خطبہ استقبالیہ پڑھا مگر اس کا خطبہ اللہ کی حمد اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور دعائیہ کلمات سے شروع نہیں ہوا جو علما کی اصل شان ہے بلکہ اس نے خطبہ مادر وطن زندہ باد اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے شروع کیا۔ مادر وطن زندہ باد، لفظی تو نہیں مگر عملاً اور واقعتاً بندے ماترم کے مفہوم کو ادا کرتا ہے اور غالباً بندے ماترم کے ترجمہ کی حیثیت سے یہ نعرہ بلند کیا گیا۔ صدر کانفرنس نے جب اپنی تقریر میں یہ کہا کہ تمام دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کے بعد دوسری طاقت کانگرس ہے اور یہ کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو کانگرس کے اندر مدغم ہو جانا چاہیے اور کانگرس کو ایک مرکزی سیاسی حیثیت دینا چاہیے تو حاضرین نے ہرگز نہیں، ہرگز نہیں کی آوازیں بلند کیں۔ کانفرنس کے دوسرے دن کے اجلاس میں بہت ہنگامہ ہوا۔ کانفرنس میں داخلہ ٹکٹوں کے ذریعہ تھا۔ چونکہ سارے کے سارے ٹکٹ مسلم لیگیوں نے خرید لئے تھے اور وہ جلسہ کو ناکام کرنے کے لئے مسلسل شور مچا رہے تھے اس لئے ڈپٹی کمشنر نے آکر مجمع کو غیر قانونی قرار دے کر ہال خالی کروا لیا۔ 3/جون کو تیسرے دن کی کاروائی بند کمرے میں ہوئی جس میں منتظمین نے صرف اپنے آدمیوں کو داخلہ کی اجازت دی تھی۔''[31]

بنگال کے کانگرسی مولویوں کی اس کانفرنس میں سرت چندر بوس کو مسلمانوں کا عظیم دوست، خیر خواہ، خادم اور حامی قرار دیا گیا تھا حالانکہ اس شخص نے گزشتہ دو سال میں صوبائی حکومت کی ہر اس کاروائی کی سخت مخالفت کی تھی جو ذرا سی بھی مسلمانوں کے مفاد میں ہو سکتی تھی۔ وہ

کلکتہ میونسپل ترمیمی بل کے اس لئے خلاف تھا کہ اس کے تحت کارپوریشن میں مسلمانان کلکتہ کو ان کے تناسب آبادی کے مطابق نمائندگی دی گئی تھی۔ وہ پبلک سروسز میں مسلمانوں کے لئے تناسب مقرر کرنے کی اس موقف کی بنا پر مخالفت کرتا تھا کہ ''محکموں کی ملازمتوں کے متعلق جو تناسب فیصدی تجویز کیا گیا ہے وہ اس دوسرے فرقے (یعنی اونچی ذات کے ہندوؤں) کے ساتھ کھلم کھلا بے انصافی ہے جو اپنی مقداری قوت، تعلیمی پیش روی اور انتظامی تجربات کی وجہ سے پبلک ملازمتوں میں زیادہ حصہ کی حقدار ہے۔''[32]

مسلمانوں کو ملازمتوں میں 50 فیصد حصہ دینے کے فیصلہ کا اعلان

اور ہندوؤں کا واویلا

13 رجون کو حکومت بنگال کے ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات نے یہ اعلان کر دیا کہ ''حکومت بنگال نے فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ رسدی 50 فیصدی براہ راست بھرتی کے اصول پر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے آئندہ تمام سرکاری ملازمتوں کے اندر بھرتی میں صوبہ کے مسلم اور غیر مسلم فرقوں کے درمیان یکساں اور برابر کا سلوک کیا جائے گا۔ اچھوتوں کا تناسب 15 فیصدی ہوگا اور باقی 35 فیصدی دوسرے فرقے کے لوگ یعنی اونچی ذات کے ہندو ہوں گے۔'' وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اس سرکاری اعلان کے ساتھ اپنا ایک بیان بھی جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''مجھ کو غیر مسلم نوجوانوں سے کوئی تعصب نہیں ہے۔ جس طرح مسلمان نوجوانوں کو میں عزیز رکھتا ہوں اسی طرح میں غیر مسلم نوجوانوں کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ میری دلی خواہش یہ ہے کہ وہ سب بھی یکساں طور سے شاد و آباد رہیں اور میری شفقت کے زیر سایہ جوان ہو کر پھلیں پھولیں۔'' اگرچہ ملازمتوں میں یہ فرقہ وارانہ تناسب نلنی رنجن سرکار اور بعض دوسرے ممتاز ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتے کی بنیاد پر اور صوبائی گورنر کی باقاعدہ منظوری حاصل کرنے کے بعد مقرر کیا گیا تھا لیکن تعلیم یافتہ ہندوؤں کے بیشتر عناصر اس سے مطمئن نہ ہوئے اور ان کا احتجاج پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ اس احتجاج کے جواب میں جون کے تیسرے ہفتے میں حکومت بنگال کے انگریزی ہفت روزہ ''بنگال ویکلی'' میں وزیر اعلیٰ فضل الحق نے بتایا کہ سیکرٹریٹ کی مستقل اسامیوں کی فہرست میں 1100 آدمی ہیں جن میں 667 غیر مسلم اور 443 مسلمان ہیں۔

ان 667 تقرریوں میں جن پر عملاً ہندو قابض ہیں 46 فیصدی گریجوایٹ ہیں جبکہ 443 مسلمان ملازمین میں 48 فیصدی گریجوایٹ ہیں۔ غیر مسلم ملازمین میں 15 فیصدی ایسے ہیں جو میٹرک پاس بھی نہیں ہیں لیکن کل مسلم ملازمین میں ایسے لوگ جو میٹرک پاس نہیں ہیں صرف 10 فیصدی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم استعداد والے اہلکار مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو زیادہ ہیں۔ عارضی اسامیوں پر کل 261 اہلکار ہیں۔ ان میں سے 152 غیر مسلم ہیں جو زیادہ تر ہندو ہیں۔ ان 152 غیر مسلم اہلکاروں میں 46 فیصدی گریجوایٹ ہیں جبکہ 109 مسلم ملازمین میں 54 فیصدی گریجوایٹ ہیں۔ ان عارضی ملازمین میں 15 فیصدی ایسے ہیں جو میٹرک پاس بھی نہیں ہیں جبکہ ایسے مسلمان جو میٹرک پاس نہیں ہیں صرف سات فیصدی ہیں۔ سیکرٹریٹ سے ملحقہ دفاتر میں 854 غیر مسلم ہیں اور 359 مسلمان ہیں۔ غیر مسلموں میں صرف 22 فیصد گریجوایٹ ہیں جبکہ مسلمانوں میں 27 فیصدی گریجوایٹ ہیں۔ ان دفاتر میں عارضی اسامیوں پر 190 اہلکاروں میں سے 130 غیر مسلم ہیں۔ ان میں سے صرف 22 فیصدی غیر مسلم گریجوایٹ ہیں جبکہ 60 عارضی مسلمان ملازمین میں سے 31 فیصدی گریجوایٹ ہیں۔ 33 فیصدی غیر مسلم اہلکار ایسے ہیں جو میٹرک پاس نہیں ہیں جبکہ میٹرک سے کم استعداد رکھنے والے مسلمان ملازمین کا تناسب 20 فیصدی ہے۔ فضل الحق نے ان اعداد و شمار کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ ''مسلمانوں کے خلاف یہ الزام کہ وہ نا اہل ہیں بالکل ہی بے بنیاد ہے اور یہ الزام بھی صحیح نہیں کہ نا اہل مسلمانوں کو محض فرقہ پرستی کی بنا پر ملازمتیں دی گئی ہیں۔'' لیکن ہندو لیڈر فضل الحق کے ان دلائل سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہیں فضل الحق سے زیادہ نلنی رنجن سرکار وغیرہ پر غصہ تھا جو ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب مقرر کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ وہ نلنی رنجن سرکار جیسے ہندوؤں کو مسلمانوں کا پٹھو قرار دیتے تھے۔

3 / جولائی کو اس سلسلے میں صوبائی اسمبلی کے ایک رکن پی۔ آر۔ ٹھاکر نے ہندوستان سٹینڈرڈ کو ایک بیان میں ایسے ہندوؤں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان کی زمین کو ہندو مذہب، آئیڈیل، کلچر اور تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق ہے اور کوئی غیر ہندو طاقت ہندو دماغ و ذہن کو مستعار لئے بغیر ہندوستان کے کسی حصے میں حکومت نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی مثالوں کی بھر مار ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر جیسی بھی

حکومت رہی ہندو دماغ کے بغیر نہ چل سکی۔ اکبرِاعظم کی وسیع سلطنت ہندو حامیوں کی بدولت قائم تھی۔ اگر ہم ہندوستان میں برطانوی نظم ونسق کے اوائل کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہیسٹنگز (Hastings)، کارنوالس (Cornwalis) اوران کے دوسرے جانشینوں نے حکومت کے نظم ونسق کو چلانے کے کام میں ہمیشہ ہندو برہمن پر بھروسہ کیا ہے۔ موجودہ عہد میں بھی ملک معظم کی حکومت ہندوستان میں برطانوی سلطنت کو باقی رکھنے کے لئے سر برآوردہ ہندو اہل فکروتدبر سے مشورہ لیا کرتی ہے۔ آنریبل منسٹر اے۔ کے فضل الحق وزیراعلیٰ بنگال بھی اسی پرانے رواج سے کام لے رہے ہیں جو اکبرِاعظم کے وقت سے اب تک چلا آرہا ہے۔ اگر بنگال میں ہندوؤں پر مسلمان حکمرانی کررہے ہیں تو اس میں مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور دراصل ان خودغرض ہندوؤں کا ہے جو ہندو قوم کی عملاً بربادی میں مسلمانوں کی حمایت کررہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آئندہ سال بنگال کے تمام ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایسے ہندو بھی ہیں جو اپنی ہندو قوم کے خلاف اس قسم کی سخت کاروائی کو عمل میں لانے کے لئے وزارت کا ہاتھ بٹانے کو ہروقت تیار رہتے ہیں۔ ہندوؤں کو جو کچھ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ منظم ہوں اور مسلمانوں کو ہندو قوم کی تباہی میں مدد پہنچانے سے باز رہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تنہا ہندو تحریک صورت حال کو بہتر کرے گی۔"[33] ٹھاکر کے اس بیان کی تعبیر یہ تھی کہ اس قسم کے بنگالی ہندو مسلم اکثریتی صوبہ کے کاروبار حکومت میں بھی مسلمانوں کو کوئی حصہ دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ہندوؤں کی ''اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت'' کے زور پر صرف ہندوؤں کا راج ہی نافذ کرنے کے متمنی تھے۔ اس قسم کے ہندوؤں کی کانگرس میں بھی کمی نہیں تھی بلکہ ان کا کانگرس پر پوری طرح غلبہ تھا۔ یہ لوگ بظاہر تو سیکولر جمہوریت کا نعرہ بلند کرتے تھے لیکن عملاً ہندو راج کے نفاذ کے حق میں تھے۔ گاندھی، راجندر پرشاد اور سردار پٹیل جیسے لیڈر تو اپنے آپ کو کھلم کھلا سناتنی ہندو کہتے ہی تھے اور رام راج کا پرچار کرتے ہی تھے، بنگال کے بوس برادران بھی سوشلزم کے علمبردار ہونے کے باوجود بنگال کے ہندو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے مفادات پر چھوٹی سی ضرب کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ سرت چندر بوس ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''ہندو اپنی تعلیمی پیش روی اور انتظامی تجربات کی وجہ سے پبلک ملازمتوں میں زیادہ حصہ کے حقدار ہیں۔''

کمیونل ایوارڈ کے خلاف ہندوؤں کی بھرپور ایجی ٹیشن اور مسلم لیگی اخبار ''عصر جدید'' کی جوابی مہم

13 رجولائی 1939ء کو صوبائی اسمبلی نے کلکتہ میونسپل ترمیمی بل کی قطعی منظوری دے دی تو کلکتہ کے مراعات یافتہ اور مفاد پرست ہندوؤں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اب فضل الحق کی مخلوط حکومت صوبہ کے تعلیمی شعبہ میں ہندوؤں کی بالادستی کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس مقصد کے لئے بعض مسلم لیگی لیڈر کچھ عرصہ سے کلکتہ یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم اور سیکنڈری ایجوکیشن بل کی منظوری کی باتیں کر رہے تھے۔ مفاد پرست ہندوؤں کے لئے یہ دونوں باتیں بالکل ہی ناقابل برداشت تھیں۔ شعبۂ تعلیم میں تقریباً دوسو سال سے ان کی بالادستی تھی اور وہ اپنی اس پوزیشن کو بہر قیمت برقرار رکھنا چاہتے تھے کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ ہندوؤں کی تعلیمی ترقی ہی ان کی ہمہ گیر ترقی کا باعث تھی اور مسلمانوں کی ہمہ گیر پسماندگی کی بڑی وجہ ان کی تعلیمی پسماندگی میں پنہاں تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو ہندوؤں کے لئے اس متوقع خطرے کا شدید ترین احساس تھا۔ چنانچہ اس نے بھوانی پور کے آشوتوش میموریل ہال میں آشوتوش کالج کے یوم تاسیس کے موقع پر نہایت اشتعال انگیز اور آتش فشاں تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''آج ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جو بنگال کی تاریخ میں سب سے زیادہ خطرناک دور ہے۔ درحقیقت جب ہم بنگال کی موجودہ صورت حال پر غور کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ انسانی یاد کے اندر بنگال کی تاریخ میں سب سے زیادہ نازک دور ہے۔ اس صورت حال میں ہمیں مردانہ طاقت کو مجتمع کرنا ہوگا۔ اس صورت میں ہم سے ہر شخص کو، خواہ اس کا ذریعۂ زندگی کچھ ہی ہو، آگے آنے والی جدوجہد کرنے کے لئے قلب وروح کے ساتھ تیار ہو جانا چاہیے۔ میں طلبا سے کہوں گا کہ صوبے میں پیش آنے والے حالات کا مطالعہ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب دن آ جائے گا اور وقت آ جائے گا تو بنگال کے طلبا کی جماعت اس انداز میں لبیک کہے گی جو ان کے یا ان کے اداروں کے لئے جن سے ان کا تعلق ہے یا صوبہ کے لئے جس کا مفاد ہم سب کے دلوں میں ہے، باعث عار نہیں ہوگا۔ میرا مقصد اس تحریک سے ہے جو یونیورسٹی کے خلاف شروع کی گئی ہے اور جس سے کلکتہ یونیورسٹی کے لئے خطرہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ قانون سازی کی صورت میں، جو

یونیورسٹی کی ''ثانوی تعلیم'' کے سلسلہ میں بہت جلد اسمبلی میں پیش ہونے والی ہے، ایک ناگزیر خطرہ ہمارے سامنے ہے۔ اگر اس قسم کا قانون بنایا گیا اور اس کو نافذ کیا گیا تو یونیورسٹی جس موثر انداز میں سر آشوتوش کے وقت میں چل رہی تھی کام کرنے سے ختم ہو جائے گی۔''[34] شیاما پرشاد مکرجی کی یہ تقریر اس قسم کی تھی جس قسم کی کہ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے 1921ء کے بعد وزیر تعلیم سر فضل حسین کے خلاف کیا کرتا تھا۔

مکرجی کے یہ مشتعل جذبات صرف اس کی ذات تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ بنگال کے تقریباً سارے سربرآوردہ ہندو لیڈر ایسے ہی جذبات کے حامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اگست 1939ء کے اوائل میں یہ فیصلہ کیا کہ 17 راگست کو اینٹی کمیونل ایوارڈ ڈے (Anti-Communal Award Day) منایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جو استقبالیہ کمیٹی بنائی گئی اس میں سر منمناتھ مکرجی، سر بی۔ سی۔ رائے، این۔ سی۔ سین، اکھیل چندر دت، سر نیل رتن سرکار، بی۔ سی۔ چیٹر جی، شیاما پرشاد مکرجی اور سنت رائے چودھری کے نام بھی شامل تھے۔ اس فیصلے کا مقصد یہ تھا کہ اگست 1933ء کے کمیونل ایوارڈ کے خلاف اتنی زوردار تحریک چلائی جائے کہ حکومت برطانیہ کو اپنا یہ فیصلہ اسی طرح واپس لینا پڑے جس طرح اس نے 1911ء میں بنگال کی تقسیم کا فیصلہ واپس لیا تھا۔ ان لیڈروں کا خیال تھا کہ اسی کمیونل ایوراڈ کے نتیجے میں بنگال میں مسلمانوں کو سیاسی بالادستی نصیب ہوئی ہے۔ اگر یہ ایوارڈ نہیں رہے گا تو ان کی یہ بالادستی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ گویا نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ یہ فیصلہ کرنے والوں میں بوس برادران کے نام نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جب اپریل 1939ء کے اواخر میں سوبھاش چندر بوس گاندھی کی مخالفت کے باعث کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہوا تھا تو اس کے دو تین دن بعد اس نے اپنی ایک الگ جماعت کے، فارورڈ بلاک کے نام سے، قیام کا اعلان کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ کانگرس ہائی کمان کے ساتھ مسلسل کشمکش میں مبتلا رہا تھا۔ یہ کشمکش اتنی شدید تھی کہ بوس برادران کو دوسرے مسائل کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ 9 رجولائی کو سوبھاش چندر بوس نے کانگرس کی ہائی کمان کے خلاف احتجاجی جلسوں کا انتظام کر کے اس تنازعہ کو اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اگست کے اوائل میں یہ بات یقینی ہوگئی تھی کہ بنگالی بابو کو احمد آباد کا بنیا کانگرس سے خارج کروا دے گا اور ہفتہ عشرہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔

9 راگست کو شیاما پرشاد مکرجی نے 3 راگست کے فیصلے کی وضاحت کے لئے البرٹ ہال میں ایک جلسہ کیا جس میں حاضرین نے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں اپیل کی کہ نوجوانوں کو ہندو سنگھٹن کی اس نئی تحریک کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا چاہیے کیونکہ ''ہمیں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہر گروہ اور ہر ذات سے ایسے کارکن چاہئیں جو قابل اور تربیت یافتہ ہوں اور ہندو قوم کی وحدت وترقی کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے پر آمادہ ہوں۔'' اس نے ایک سنٹرل انفرمیشن بیورو قائم کرنے کی بھی اپیل کی ''جو ہر قسم کی بے انصافیوں اور مظالم کا ریکارڈ رکھے۔'' کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا نے اپنی 11 راگست کی اشاعت میں شیاما پرشاد مکرجی کی اس تقریر پر بہت زوردار اداریہ لکھا۔ اخبار کی رائے یہ تھی کہ ''اگر ہندوؤں نے زندہ رہنا ہے اور تاریخ میں اپنا حصہ لینا ہے جو کہ یقیناً ان کا مقدر ہے تو پھر انہیں اپنی موجودہ ذہنیت کو تبدیل کر دینا ہوگا۔ وہ غلط فلاسفی جو انہیں بتلاتی ہے کہ ملک وقوم کی نجات وآزادی کے نام پر وہ اپنے مذہب وتہذیب کو چھوڑ کر اپنے دشمنوں کے ساتھ ایک ہو جائیں اور ان کے بھائی بن جائیں فوراً ترک کر دینی چاہیے۔ ہندوؤں کو فی الفور اپنا دامن سمیٹ لینا چاہیے اور ان حملوں کے بالمقابل جوابی حملے کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیے جو انہیں اپاہج بنائے جا رہے ہیں۔ کمیونل ایوارڈ کا نئے سرے سے دہرانا یا بنگال کی حدود کو زبان کی وحدت کی بنا پر از سر نو تقسیم اور قائم کرنا ایسے مسائل نہیں کہ آسانی سے حل ہو جائیں۔ اس کے لئے تو ساری قوم کی قوت اور فعالیت درکار ہوگی۔ ہر ایک ضلع، ہر ایک قصبہ حتیٰ کہ ہر ایک گاؤں میں ہندوؤں کو مؤثر طور پر اور مضبوطی سے منظم ہو جانا چاہیے اور ہر اس جماعت یا گروہ کی سرگرمیوں کا سدباب کرنا چاہیے۔ جہاں سے ہندوؤں کے مفاد پر کسی قسم کا حملہ ہو سکتا ہو...... بنگالی ہندو لیڈروں کو اس مقصد کے لئے غیر بنگالی ہندو لیڈروں کی بھی حمایت حاصل کرنی چاہیے کیونکہ بنگالی ہندوؤں میں ایک قسم کی شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے۔ جب تک انہیں کوئی باہر سے آ کر جوش وہمت نہیں دلائے گا ان میں عمل کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔'' امرت بازار پتریکا کا یہ اداریہ ولولہ انگیز تھا۔

17 راگست کو جب اینٹی کمیونل ایوارڈ ڈے منایا گیا تو آشوتوش میموریل ہال اور یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں جلسے منعقد کئے گئے۔ جن میں ہونے والی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ ''اس ایوارڈ کی وجہ سے بنگال میں ''نواب راج'' قائم ہو گیا ہے جو شب وروز ہندوؤں کو مٹانے پر

تلا ہوا ہے۔ مثلاً کلکتہ کارپوریشن کے قانون میں ترمیم کردی گئی ہے، مہاجنی بل پاس کردیا گیا ہے تاکہ مسلم کسانوں کو بنگال کے مہاجنوں کے ہاتھوں سے بچایا جائے۔ مندروں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ ہندوؤں پر حملہ کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی جو خالص ہندو دماغوں کی تعمیر کی ہوئی چیز ہے، اس میں مسلمانوں کو داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے ذریعے اسلامک کلچر پھیلانے پر زور دیا جارہا ہے۔ بنگال کی ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے حصہ مقرر کردیا گیا ہے۔ بنگلہ زبان میں دوغلی زبان داخل کی جارہی ہے تاکہ ہندوؤں کا کلچر تباہ ہوجائے۔'' ان جلسوں کے آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے الفاظ یہ تھے کہ ''یہ جلسہ کمیونل ایوارڈ کی پرزور مذمت کو قلمبند کرتا ہے جو قومیت اور جمہوریت کے خلاف ہے اور جس کو خاص طور پر بنگال کے ہندوؤں کو مفلوج کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ جلسہ مزید اپنا یہ عزم قلمبند کرتا ہے کہ تمام ذرائع سے کمیونل ایوارڈ کا مقابلہ کرے گا تاآنکہ کتاب آئین سے اس کے دفعات محو کردیئے جائیں اور تمام طبقوں کے لوگوں کو یہ جلسہ آواز دیتا ہے کہ وہ اس قومی جنگ میں شریک ہوں۔''

مسلم لیگی اخبار ''عصر جدید'' نے ان دونوں جلسوں کی اس کاروائی کا یہ مطلب سمجھا کہ ہندو لیڈر یہ چاہتے ہیں کہ :

1۔ کلکتہ کارپوریشن میں اونچی ذات کے ہندوؤں کا اجارہ قائم رہے اور مسلمانوں کا اس میں کوئی اثر نہ ہو۔
2۔ بنگال کے 99 فیصدی مسلمان کسان ہندو زمینداروں اور مہاجنوں کے پنجوں میں جکڑے رہیں۔
3۔ کلکتہ یونیورسٹی محض ہندو ادارہ رہے۔
4۔ بنگلہ زبان میں کوئی اسلامی بات نہ لکھی جائے۔
5۔ بنگال کی ملازمتوں پر ہندوؤں کا اجارہ باقی رہے۔

عصر جدید نے متذکرہ قرارداد پر یہ تبصرہ کیا کہ ''آپ نے سنا یہ کمیونل ایوارڈ قومیت اور جمہوریت کے منافی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مہاجنی بل پاس ہوگیا ہے جس سے مسلمان کسانوں کو فائدہ ہوا اور ہندو مہاجنوں کی لوٹ مار کو روک دیا گیا۔ یہ کمیونل ایوارڈ قومیت اور جمہوریت کے خلاف ہے اس لئے کہ کلکتہ کارپوریشن کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے جو خود ہندو لیڈروں کے بیان

کے مطابق ''گندہ اصطبل'' ہے اور جہاں اس وقت کلکتہ کی پوری آبادی اونچی ذات کے ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہے۔کمیونل ایوارڈ اس لئے جمہوریت اور قومیت کے خلاف ہے کہ بنگال کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔کمیونل ایوارڈ اس لئے آزادی کی راہ میں روڑا ہے کہ اس کی وجہ سے بنگلہ زبان کی عربی اور فارسی والی کتابیں داخل نصاب کی جارہی ہیں۔اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے بنگالی ہندو دوستوں کے نزدیک جمہوریت اور قومیت کے معنی کیا ہیں۔''[35]

28 /اگست کو امرت بازار پتریکا نے اینٹی کمیونل ایوارڈ کانفرنس کے صدر ایم۔ایس۔ اینی کی افتتاحی تقریر کا مکمل متن شائع کیا جس میں کمیونل ایوارڈ کے بارے میں بنگالی ہندوؤں کے موقف کی پوری طرح وضاحت کی گئی تھی۔اینی نے اپنی تقریر کی ابتدا اس طرح کی تھی کہ کمیونل ایوارڈ کی مخالفت صرف ہندوؤں ہی نے نہیں کی مسلمانوں کے معتدبہ حصہ نے بھی اس کی مخالفت و مذمت کی ہے۔سر علی امام مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مسٹر ٹی۔اے۔کے۔شیروانی یہ سب غیر مبہم الفاظ میں اس کی مخالفت کر چکے ہیں۔مولانا ابو الکلام آزاد نے اسے ہندوستانی قومیت کے لئے ایک خطرہ بتلایا ہے اور بیان کیا ہے کہ ''میرے محسوسات اس بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کمیونل ایوارڈ جس کی بنیاد علیحدہ حق انتخاب، اقلیتوں کی رعایت اور اکثریتوں کی مداخلت کے اصولوں پر رکھی گئی ہے ملک کے اندر منافرت اور بے ترتیبی پھیلانے کا پیش خیمہ ہے۔انگلستان کے وزیر اعظم کا عائد کردہ کمیونل ایوارڈ ہندوستانی نیشنلزم کے لئے ایک نہایت ہی شدید خطرہ ہے۔'' اینی نے ابوالکلام آزاد کے اس بیان کا حوالہ دینے کے بعد الزام عائد کیا کہ کمیونل ایوارڈ سامراج نواز مسلمان لیڈروں اور برطانوی سامراجیوں کے خفیہ گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ اس نے کہا کہ ''فرقہ وارنشستوں کے تحفظ نے، جسے علیحدہ انتخاب کے اصول کے ماتحت کر دیا گیا ہے، پچھلے پانچ سالوں میں مذہبی جنون کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا ہے کہ اس سے ہندوستان کے اندر نیشنلزم کو سخت نقصان پہنچا ہے۔مسلمان اب اپنے آپ کو ہندوستان کی اسٹیٹ میں ایک اقلیت خیال نہیں کرتے بلکہ ان کے لیڈر اپنے جاہل پیروؤں کو ہمیشہ یہی سمجھاتے ہیں کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔وہ لوگ جنہوں نے مسٹر جناح، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی تقریروں کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہو اس بات کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہے گا کہ یہ سب کے سب نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مسلمان ہندوستان کے اندر ایک

جداگانہ قوم ہیں۔ حتیٰ کہ پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعلیٰ نے بھی گزشتہ چند مہینوں میں جو تقریریں کی ہیں وہ بھی اسی بات کی مؤید نظر آتی ہیں۔ اس نظریے کی بڑے زور شور کے ساتھ تبلیغ کی جارہی ہے اور مختلف مسلمان رہنماؤں کی طرف سے مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے وفاق پر کئی اسکیمیں بحث و تمحیص کے لئے معرض وجود میں آرہی ہیں۔ یہ نظریہ کہ ہندوستان ایک ناقابل تقسیم قوم کا گہوارہ ہے، پس پشت ڈالا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل کو جرأت دلائی جارہی ہے کہ ''انڈین نیشن کے مختلف حصوں مثلاً سندھ، صوبہ سرحد، پنجاب وغیرہ کو باقی ہندوستان سے علیحدہ ریاستیں شمار کریں اور وہاں اپنا غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں...... بنگال میں جس پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے وہ صاف طور پر ہندوؤں کو بے دست و پابنا کر رکھ دینے والی ہے۔ کلکتہ میونسپل بل ایک جارحانہ فرقہ وارانہ اقدام ہے جس کا کھلے طور پر منشا ہے کہ اس عظیم شہر کے ہندو شہریوں کو کلکتہ میونسپلٹی کے نظم و نسق میں واجبی حصہ لینے سے معذور رکھا جائے۔ موجودہ وزارت بنگال کی پالیسی میں ناشکر گزاری اور فرقہ واری ایک نہ مٹنے والے نقش کی طرح شامل ہے، جو کچھ وہ کر رہے ہیں اگر وہ کبھی اس پر غور کریں تو انہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ بنگال کی شہری زندگی میں ایک بہت بڑی برائی پیدا کر رہے ہیں اور ان لوگوں کے حق میں ستم کشی کر رہے ہیں جنہوں نے گزشتہ 50 سالوں سے ہندوستان کی آزادی کے لئے ہراول کے طور پر خدمت انجام دی ہے۔ بنگال میں آج جو کچھ نظر آتا ہے اسے کس نے بنایا ہے؟ سیاسی ارتقا کے لئے کس نے تکلیفیں اٹھائی ہیں؟ کس نے آگ کا چشمہ حاصل کرنے کے لئے قربانیاں کی ہیں اور کون سارے ہندوستان میں آزادی کے لئے شدید آگ سے گزرا ہے؟ کس نے تقسیم بنگال کے دوران سارے ہندوستان میں اجاگرت پھیلائی تھی؟ اور وہ کون ہے جس نے خود مختار زیست کا ایک نیا نظریہ اور ایک نیا ولولہ ہندوستان بھر میں پیدا کر دیا تھا اور وہ کون تھا جس نے قدیم رشیوں کے امن کے تخیل کو ہندوستان کی طرف سے امریکہ اور دوسرے ممالک کے کانوں تک پہنچایا۔ کس نے سائنس کی ترقیات کا ایک نیا دروازہ کھولا اور دنیا کو بتا دیا کہ ماحول کتنا ہی ناسازگار کیوں نہ ہو ابھی تک قدیم رشیوں کی سرزمین ایسے داناؤں سے خالی نہیں جو تہذیب انسان کے کمال کے لئے اپنا حصہ پیش کر سکیں۔ کس نے وہ پرانے اور دلربا گیت گائے جو دنیا کی شاعری اور فلسفہ میں اس درجہ مقبول ہوئے کہ مادر وطن کے لئے نوبل پرائز کا تحفہ لائے اور وہ مادر وطن جو ویاس، والمیکی، کالی داس اور بھاوا بھوتی کی جنم

بھومی ہے۔ بنگال کے ہندوؤں نے صرف بنگال ہی کے لئے تکالیف نہیں اٹھائیں بلکہ انہوں نے سارے ہندوستان کے لئے جدو جہد کی ہے۔ آج کا بنگال راجہ رام موہن رائے سے لے کر میرے معزز دوست سوبھاش چندر بوس جیسے محبان وطن کا پیدا کردہ ہے۔ میں اس بات کا تصور نہیں کرسکتا کہ وہ لوگ جو اس قدر بلند جذبات رکھتے ہوں، بہادر اور ایثار پیشہ ہوں، زیادہ دیر تک اپنی ہی سرزمین پر دوسروں کے محکوم رہ سکیں۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ بنگال ان غیر قدرتی حالات کے خلاف انقلاب برپا کرے گا اور اس وقت تک لڑائی لڑتا رہے گا جب تک غلط صحیح نہ ہو جائے اور جب تک کمیونل ایوارڈ ایک بے معنی چیز نہ بن کر رہ جائے۔ اس نے ایک دفعہ پہلے بھی ایک طے شدہ بات کو نا طے شدہ کر دکھایا تھا۔ اس مہم کی کامیابی کا سہرا بنگال کے سر ہی بندھا تھا۔ تقسیم بنگال منسوخ ہوگئی تھی۔ کمیونل ایوارڈ کی قسمت میں جلد یا بدیر یہی بات لکھی ہے...... ایوارڈ کے ماتحت اور بہت سے نادیدہ خطرات ہیں جو گھات میں لگے بیٹھے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی یقیناً توہین ہے کہ ان اقلیتوں کے متعلق، جو اس ملک کے اندر رہتی ہیں، یہ کہا جائے کہ ان کی سیاسی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ وہ ہندوؤں سے بھی بڑھ کر شہریت کے حقوق و رعایت کے مستحق ہیں۔ کوئی ہندو قوم کسی اجنبی اور خارجی کو اپنا شہری تسلیم نہیں کرتی۔ قبل اس کے کہ ایسا اجنبی شہری حقوق و مراعات کا دعویٰ کرے اسے اس آئین کو اپنانا چاہیے جس میں وہ بس رہا ہے۔"[36]

ایم۔ ایس۔ اینی کی یہ تقریر اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس میں فی الحقیقت بنگال کے مراعات یافتہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی بہت بھاری اکثریت کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کی گئی تھی۔ یہ تنگ دل اور تنگ نظر عناصر بنگال کو صرف ان تقریباً 30 فیصدی ہندوؤں کی ملکیت تصور کرتے تھے جنہوں نے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں کے زیر سایہ ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی تھی۔ یہ ان مسلمانوں کو بنگال کی اجتماعی زندگی میں کوئی مقام دینے پر آمادہ نہیں تھے جن کی آبادی تقریباً 57 فیصدی تھی اور جنہوں نے تاریخی وجوہ کی بنا پر برطانوی سامراج کے دوسو سالہ عہد اقتدار میں ان گنت مظالم برداشت کئے تھے اور جوان سامراجی مظالم کی بنا پر ہر شعبہ زندگی میں بہت ہی پیچھے رہ گئے تھے۔ بعض شعبوں میں تو وہ اتنے پسماندہ تھے کہ وہاں ان کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ عناصر ان مسلمانوں کو عملاً غیر ملکی، اجنبی اور ملیچھ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ان اجنبی عناصر کو ہندوستان کی سرزمین میں

رہنا ہے تو انہیں اپنی جداگانہ تہذیب وثقافت کو ترک کر کے ہندوؤں کی پراچین تہذیب وثقافت کو اپنانا پڑے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر حکومت برطانیہ 17 /اگست 1933ء کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعے جداگانہ طریق انتخاب رائج نہ کرتی تو بنگال پر سے ہندوؤں کی سیاسی بالادستی کبھی ختم نہ ہوتی اور 1937ء کے اوائل سے ان ملیچھ مسلمانوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی جو گزشتہ تقریباً اڑھائی سال سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ صوبہ میں اونچی ذات کے ہندوؤں کو جو بے پناہ مراعات حاصل ہیں ان میں سے تھوڑا سا حصہ مسلمانوں کو بھی مل جائے تاکہ ان میں بھی تھوڑی سی عزت نفس پیدا ہو اور وہ بھی اللہ کی اس سرزمین پر تھوڑا سا سر اٹھا کر چل سکیں۔

کمیونل ایوارڈ کا تصور کوئی نیا تصور نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تصور کی جڑیں بنگال کی تقریباً آٹھ سو سالہ تاریخ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حاکمیت قائم ہونے سے پہلے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں کے عہد اقتدار میں مسلمان بحیثیت مجموعی مراعات یافتہ تھے اور ہندوؤں کی حیثیت ثانوی درجہ کے شہریوں کی تھی۔ قدرتی طور پر اس نامنصفانہ صورت حال سے دونوں فرقوں میں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تضاد کی بہت وسیع خلیج حائل ہو گئی تھی جو انگریزوں کو تاریخی ورثے کے طور پر ملی اور انہوں نے اس ورثہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ 1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد ان دونوں فرقوں کے باہمی رشتوں میں ایسی بنیادی تبدیلی ہوئی کہ مراعات یافتہ مسلمانوں کی حیثیت مظلوموں کی ہو گئی اور مظلوم ہندوؤں کی حیثیت مراعات یافتہ طبقہ کی ہو گئی۔ مسلمان آسمان سے قعر مذلت میں گر گئے اور ہندو قعر مذلت سے آسمان پر پہنچ گئے۔ برطانوی سامراجیوں نے اپنے سامراجی مفاد کے تحت انیسویں صدی کے اواخر میں اس صورت حال کو قدرے بدلنے کی ضرورت محسوس کی جبکہ روسی سامراج وسطی ایشیا کو روندتا ہوا ہندوستان کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر برصغیر کے کاروبار حکومت میں مقامی باشندوں کو کچھ حصہ دیا جائے گا تو اس ''سونے کی چڑیا'' کا اچھی طرح دفاع ہو سکے گا۔ لیکن جب انہوں نے اس مقصد کے لئے آئینی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا تو سرسید احمد خان، سید امیر علی اور بعض دوسری مسلمان شخصیتوں نے ہندوستان میں یورپی طرز کی قومی وحدت کے نظریے کی سخت مخالفت کی اور مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت جداگانہ ہے اور وہ اٹھارہویں صدی کے بعد ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لئے وہ جداگانہ سلوک کے

مستحق ہیں۔ چنانچہ 1885ء میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانفرنس کے انعقاد اور پھر 1886ء میں کلکتہ میں اس کے انڈین نیشنل کانگرس میں انضمام کے وقت مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس میں دلچسپی نہیں لی تھی اور پھر جب 1892ء کی اصلاحات نافذ ہوئی تھیں تو ان کے تحت عملاً سر سید احمد خان کے موقف کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو اگرچہ اس کی سرکاری وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ایسا انتظامی مصلحت کی بنا پر کیا گیا ہے لیکن ایک وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ حکومت برطانیہ مسلم اکثریتی علاقوں کو الگ کر کے بنگال میں ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کو گھٹانا چاہتی تھی۔ اس پر ہندوؤں نے پر تشدد ایجی ٹیشن شروع کی تو 1906ء میں مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سر آغا خان کی قیادت میں مسلمان لیڈروں کا جو وفد وائسرائے منٹو سے ملا تھا اس نے دوسری باتوں کے علاوہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ 1909ء کی اصلاحات میں یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور پھر 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگرس نے بھی یہ اصول مان لیا تھا۔ 1924ء میں ممتاز بنگالی لیڈر سی۔ آر۔ داس نے جو معاہدۂ بنگال کیا تھا اس میں بھی اس نے جداگانہ طریق انتخاب منظور کر لیا تھا۔ 1926ء میں پنجاب کا لالہ لاجپت رائے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور سیاسی طور پر ان کا یکجا رہنا ممکن نہیں ہے۔ ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی اصلاحات اس نے استعمال کی تھیں اور پھر 17 /اگست 1933ء میں حکومت برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ کے تحت جداگانہ طریق انتخاب رائج رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تو کانگرس نے قدرے پس و پیش کے بعد اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ لیکن اب ایم۔ ایس۔ اینی اور دوسرے بنگالی ہندو لیڈران سارے تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے صرف 1933ء کے کمیونل ایوارڈ کو ہی ساری برائیوں کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ بنگال کے وہ مسلمان جنہیں وہ کل تک ہر لحاظ سے حقیر اور ملیچھ سمجھتے تھے یکا یک صوبہ میں سیاسی بالادستی حاصل کر کے اپنے حقوق و مفادات کے لئے مؤثر طریقے سے کوشش کرنے لگے تھے۔ 1937ء کے بعد ہندو لیڈروں نے کئی مرتبہ یہ کوشش کی کہ مسلمان ارکان اسمبلی میں پھوٹ ڈلوا کر ان کے ایسے عناصر کے ساتھ مل کر حکومت بنائی جائے جن کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں کی ہو مگر جب انہیں اس مقصد میں ناکامی ہوئی اور فضل الحق کی پرجا۔ لیگ کولیشن وزارت مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے فروغ و تحفظ کے لئے کچھ عملی

اقدامات کرنے لگی تو سارے ہندو طبقے بلبلا اٹھے اور انہوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جو بالآخر بنگال اور برصغیر کی تقسیم کا باعث بنا۔ اگر 39-1938ء میں بنگال کے ہندو لیڈر 24-1923ء کے سی۔ آر۔ داس کی طرح دور اندیشی، وسیع المشربی، کشادہ دلی اور رواداری کا مظاہرہ کرتے تو اس امر کا امکان ہو سکتا تھا کہ کم از کم صوبہ بنگال تقسیم نہ ہوتا اور اس طرح صوبہ کے ہر شعبۂ زندگی میں ہندوؤں کی کسی نہ کسی حد تک بالادستی ضرور قائم رہتی۔ بنگالی مسلمانوں کی صدیوں پرانی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی پسماندگی آناً فاناً دور نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں بہت دیر تک ہندوؤں کی امداد و رہنمائی کی ضرورت ہوتی۔

مسجدوں کے سامنے ہندوؤں کی طرف سے بینڈ باجے بجانے کے خلاف مسلم لیگ کونسل میں فضل الحق کی قرارداد

قدرتی طور پر وزیر اعلیٰ فضل الحق ہندو لیڈروں کی اس قسم کی تنگ دلی، تنگ نظری، مکاری، عیاری اور ریاکاری سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ وہ خود بھی کوئی با اصول آدمی نہیں تھا اور اپنی سیاسی مصلحت کے تحت سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ تاہم ہندوؤں کی اینٹی کیمونل ایوارڈ تحریک نے اس کے لئے کوئی راستہ نہ چھوڑا سوائے اس کے کہ وہ اپنی وزارت کو برقرار رکھنے کے لئے مسلم لیگ اور بنگال کے مسلمانوں کی حمایت پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرے۔ چنانچہ جب 28/اگست 1939ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اس نے مسجدوں کے سامنے ہندوؤں کی جانب سے بینڈ باجے بجانے کے مسئلہ کو ایک بہت بڑا قومی مسئلہ قرار دیا۔ اس کی کونسل میں قرارداد یہ تھی کہ ”لیگ کونسل فرقہ وارانہ فسادات کو، جو سارے ملک میں مساجد کے سامنے باجے بجانے کے سوال پر رونما ہو رہے ہیں اور بعض حالات میں مسلمانوں کے لئے تباہ کن نتائج لا چکے ہیں، بہت ہی تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور حکومت ہند سے اصرار کرتی ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے بالخصوص ایسی صورت میں کہ متعلقہ فرقے کسی سمجھوتے تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں، کوئی ایسی کارروائی کرے جو ضروری ہو۔ اگر اس مسئلہ کا کوئی حل، جو متعلقہ فرقوں کے لئے قابل قبول ہو، تلاش نہ کیا گیا تو امن عامہ کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا اور ہندوستان میں کوئی قانونی حکومت قائم نہیں رہ سکے گی۔“ فضل الحق کے درجہ کے لیڈر کو بینڈ باجے کے مسئلہ کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے تھی لیکن بظاہر اس نے ایسا اس لئے کیا کہ بنگال میں فرقہ وارانہ

تضاد اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اس مسئلہ کی بنا پر آئے دن کسی نہ کسی جگہ خونریزی ہوتی رہتی تھی اور فضل الحق کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس مسئلہ کو اہمیت دے کر مسلمانان بنگال کی حمایت کا حقدار بنے۔ وہ ہندو لیڈروں کی اینٹی کمیونل ایوارڈ تحریک کے پیش نظر بھی یہ رویہ اپنانے پر مجبور تھا۔

لیگ کونسل کے اس اجلاس کے پانچ چھ دن بعد 3 ستمبر 1939ء کو برطانیہ اور فرانس کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ سے عالمی جنگ کی ابتدا ہوئی۔ اور جب اسی دن ہندوستان کے وائسرائے نے بھی اپنی حکومت کی پیروی میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو بنگال کے ہندو لیڈروں کی اس تحریک نے اور بھی زور پکڑ لیا کیونکہ کانگرس ہائی کمان کی طرح بنگال کے کانگرسی اور مہاسبھائی لیڈروں کا بھی یہ خیال تھا کہ انگریزوں کو اس جنگ میں ہندوستان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے کانگرس کی شرائط پر ہندوؤں سے مفاہمت کرنا پڑے گی۔ اس صورتحال میں 15 ستمبر کو عصر جدید نے ہندوؤں کے اس ایجی ٹیشن کا بھرپور نوٹس لیا۔ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "کمیونل ایوارڈ کے خلاف بنگال ہندو مہا سبھا کی باسی کڑھی میں جو ابال پیدا ہو گیا ہے اس کا مظاہرہ آج کل ہر ہفتہ کلکتہ میں کسی نہ کسی سبھائی لیڈر کی پرلے درجے کی فرقہ پرستانہ بلکہ بسا اوقات اشتعال انگیز تقریروں میں ہو رہا ہے۔ ان تمام تقریروں کو پڑھا جائے تو اس کے ایک ایک جملے سے فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ تعصب کی بدبو آ رہی ہے۔ ایک طرف تو یہ بڑے بڑے سبھائی لیڈر ہندو حقوق کے لئے یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چیخ رہے ہیں اور صوبہ کے نظم و نسق میں مسلمانوں کا گونہ اثر اور اقتدار دیکھ کر "ہندو خطرے" میں پکار رہے ہیں جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ان سبھائی لیڈروں کے نزدیک بھی ہندو قوم الگ اور مسلم قوم الگ ہے اور ہندوؤں کا قومی مفاد مسلمانوں کے قومی مفاد سے بالکل جدا اور الگ بلکہ ان کے بیان کے مطابق متضاد ہے اور پھر یہ بوالعجبی ملاحظہ ہو تو اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف پرلے درجے کی خیرہ چشمی کے ساتھ متحدہ قومیت کے نام پر مخلوط انتخاب کا بھی شور مچا رہے ہیں۔ کوئی ان سیاسی بازیگروں سے پوچھے کہ جب بنگال میں مسلمانوں کے گونہ اثر اقتدار کی وجہ سے تم، ہندو خطرہ میں ہیں، اور ہندو تباہ ہو رہے ہیں، اور ہندوؤں پر نازک وقت آ گیا ہے، چیخ رہے ہو تو پھر اس منہ سے اور اس زبان سے تم کس طرح ہندو اور مسلمان کو ایک قوم بنا کر متحدہ قومیت کا ڈھول پیٹ رہے ہو اور پھر کس طرح تم دونوں کے مخلوط انتخاب کے لئے دہائی دے رہے ہو۔"

باب: 6

بنگالی مسلمانوں کی طرف سے قرارداد پاکستان کی بھرپور حمایت اور بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد کی شدید صورت حال

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر مسلمانوں کا یوم نجات

جب 14 ستمبر 1939ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے عالمی جنگ میں برطانیہ سے غیر مشروط تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے بعد وائسرائے کی صدر کانگرس ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح سے تقریباً دو ماہ تک اس مسئلہ پر خط و کتابت ہوتی رہی کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے اقلیتوں کے مسئلے کو طے کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ گاندھی کا اصرار یہ تھا کہ حکومت برطانیہ آزادی کے مسئلہ کو اقلیتوں کے غیر اہم و غیر متعلق مسئلہ سے وابستہ کر کے بے انصافی کر رہی ہے۔ اس نے اس بے انصافی کے ازالہ کے لئے کانگرس کی مجلس عاملہ کی وساطت سے مختلف صوبوں کی کانگرسی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نومبر 1939ء کے اواخر میں سات آٹھ صوبوں کی کانگرسی حکومتیں مستعفی ہو گئیں۔ اس پر 29 نومبر کو عصر جدید کا تبصرہ یہ تھا کہ "انگریزوں سے گاندھی جی ناراض ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی آئندہ سیاسی پوزیشن کی توضیح کو ہندو۔ مسلم سمجھوتہ سے وابستہ کر کے بے انصافی کی ہے۔ مگر ہمارا سوال گاندھی جی سے یہ ہے کہ اچھا انہوں نے بے انصافی کی ہے تو آپ خود کیوں نہیں انصاف کرتے اور مسلمانوں کی صحیح اور باعزت سیاسی پوزیشن کا اعتراف

کر کے انگریزوں کا منہ بند کر دیتے۔ ہم آپ کا کہنا مان لیتے ہیں کہ انگریزوں کو ضد ہے اور وہ ہندو۔ مسلم مسئلہ کا بہانہ بنا رہے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آپ کو کیوں ضد ہے۔ آپ کیوں نہیں ہندو۔ مسلم معاملہ کو طے کر دیتے تا کہ انگریزوں کو ضد کرنے اور بہانہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ جب آپ آسانی کے ساتھ انگریزوں کے اس بہانہ اور عذر کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور ان کے باوجود آپ بچوں کی طرح ہٹ دھرمی کر رہے ہیں اور اس مسئلہ کا نام سنتے ہی آگ بگولا ہو جاتے ہیں تو کیا دنیا اتنی احمق ہے کہ وہ آپ کی اس ضد سے اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ آپ درحقیقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد و بااختیار پوزیشن ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ورنہ اگر آپ کے دل میں یہ ہوتا کہ آپ مسلمانوں کی واجبی پوزیشن تسلیم کر لیں گے تو آپ آج سے پندرہ بیس سال پہلے ہی اس کام کو انجام دے کر انگریزوں کا عذر ختم کر دیتے۔''

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر ہندو مہا سبھا کے لیڈر ڈاکٹر مونجے، ساورکر، شیاما پرشاد مکرجی اور بھائی پر مانند وغیرہ بہت ناخوش تھے کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ اس طرح پورے ہندوستان کی عنان اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ ان کا یہ خدشہ سراسر بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ 17 رنومبر کو آسام میں سر محمد سعد اللہ کی وزارت بن چکی تھی۔ یو۔ پی۔ میں نواب چھتاری کی حکومت بننے کا امکان تھا اور بنگال میں فضل الحق کی مخلوط وزارت پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گئی تھی۔ چنانچہ 10 ردسمبر کو کلکتہ میں فضل الحق کی زیر صدارت صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو یہ تجویز بلا تامل منظور کر لی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی 5 ردسمبر کی ہدایت کے مطابق کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے کی خوشی میں 22 ردسمبر کو ''یوم نجات وتشکر'' منایا جائے گا۔ 13 ردسمبر کو فضل الحق نے بطور وزیر اعلیٰ صوبائی اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی کہ حکومت بنگال جنگی مساعی میں حکومت برطانیہ سے پوری طرح تعاون کرے گی۔ اس قرارداد کی سرت چندر بوس اور دوسرے کانگرسی ارکان کے علاوہ صوبائی وزیر خزانہ نلنی رنجن سرکار نے بھی مخالفت کی۔ تاہم 18 ردسمبر کو یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور کر لی گئی اور اس کے بعد نلنی رنجن سرکار کو وزارتی عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ 22 ردسمبر کو کلکتہ میں یوم نجات کے سلسلے میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں تقریباً 50 ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی اہم قرارداد کے الفاظ یہ تھے:

''ہرگاہ کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اصلاً قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور یہ براعظم

ہند حقیقتاً ایسی عظیم تاریخی قومیتوں کا وطن ہے جن کو یورپین ممالک کی کورانہ تقلید میں اکثریتوں اور اقلیتوں کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی غلط تعبیر موجودہ دستور ہند کی تمام اصولی خرابیوں اور خام خیالیوں کی بنیاد ہے"۔اور:۔

"ہرگاہ کہ ہندوستان میں جبراً یورپ کی متحدہ قومی سلطنتوں کی متحدہ قومیت کے اصول اور سنگل پارٹی گورنمنٹ (یعنی وحدانی حکومت) کے اصول کے مطابق دستور تھوپنے اور جبراً جاری کرنے کی کوشش کانگرسی صوبوں میں بالکل ناکام ہو چکی ہے اور اس ناکامی سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء ہندوستان کے حقیقی اجتماعی اور سیاسی حالات کے بالکل ناموزوں اور ناموافق ہے"۔اور:۔

"ہرگاہ کہ ملت اسلامی اور دوسری غیر کانگرسی پارٹیاں اور غیر سبھائی جماعتیں جن کو غلط طور پر اقلیتیں بیان کیا جاتا ہے اور حقیقت میں سب مل کر مجموعی حیثیت سے تعداد میں ساری آبادی ہند کے نصف حصہ سے بھی زائد ہیں، اپنے اس عزم بالجزم کا اعلان کر چکی ہیں کہ وہ کانگرس کی سنگل پارٹی وزارت کے استبداد کی واپسی کا پوری کوشش سے مقابلہ کریں گے"۔

"لہٰذا مسلمانان کلکتہ کا یہ جلسہ عام آل انڈیا مسلم لیگ کے اس بنیادی نکتہ کی تائید کرتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے سوال پر کلی طور پر از سر نو غور کیا جائے اور ہندوستان کا جو بھی دستور اساسی مرتب کیا جائے اس کے لئے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ملت اسلامیہ ہند اور دوسری غیر کانگرسی ملتوں، جماعتوں اور مفادوں کی آزادانہ مکمل رضامندی پر مبنی ہو۔"

اس جلسہ میں عصر جدید کے ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی، مولانا راغب احسن، مولوی محمد عثمان اور مولانا عبدالرؤف کے علاوہ ایک اچھوت لیڈر این۔سی۔ دھوسیا نے بھی تقریر کی۔ مولوی محمد عثمان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ "اس ملک میں یا تو مسلمان اور ہندو دونوں کی پوزیشن کو مساوی اور برابر تسلیم کرنا ہوگا یا پھر مسلمان اور ہندو دو علیحدہ علاقوں میں بٹ جائیں گے۔ مسلمان ہرگز یورپ کی اقلیت کی پوزیشن کو گوارا نہیں کر سکتے ہیں۔"[1]

اس جلسہ کی کاروائی نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ کی اس وقت کی پالیسی کے عین مطابق تھی بلکہ یہ مسلمانان بنگال کے جذبات سے بھی پوری طرح مطابقت رکھتی تھی۔ گزشتہ دو اڑھائی سال کے تجربہ نے بنگالی مسلمانوں کو احساس دلا دیا تھا کہ ان کے صوبہ کے ہندو مفاد پرستوں سے

کشادہ دلی اور رواداری کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ وہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بھی مسلمانوں کے بارے میں ہندو مفاد پرستوں کی تھڑدلی سے بہت برہم ہوئے تھے۔ بالخصوص آسام کی کانگرسی حکومت نے بنگالی مسلمان کسانوں کی آبادکاری کے خلاف جو جابرانہ پالیسی اختیار کی تھی اس سے اس عام تاثر نے یقین کی صورت اختیار کرلی تھی کہ کانگرس کے سیکولر جمہوریت اور ایک ہندوستانی قومیت کے نعرے منافقت پر مبنی ہیں۔ یہ جماعت عملاً ہندوؤں اور مسلمانوں کو دوالگ الگ قومیں تصور کرتی ہے۔

وزیراعلیٰ فضل الحق نے اکتوبر 1939ء میں یو۔پی، سی۔پی اور بہار کی مسلم اقلیتوں پر کانگرسی وزارتوں کے مبینہ مظالم کے بارے میں دوتین بیانات جاری کرکے بنگالی مسلمانوں کے اس یقین کو اور بھی پختہ کردیا تھا۔ چنانچہ یوم نجات کلکتہ کے علاوہ پورے بنگال کے چھوٹے بڑے قصبوں، شہروں اور یہاں تک کہ دیہات میں بھی منایا گیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس دن بنگال میں مسلمانوں کے دوہزار جلسے ہوئے تھے۔ صرف ضلع تپرہ کے ایک تھانے کے علاقے میں جلسوں کی تعداد 95 تھی۔ ان جلسوں میں فضل الحق کی طرح کانگرسی وزارتوں کے مسلم اقلیت پر مبینہ مظالم کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو ان ظالم حکمرانوں سے نجات ملی۔ فضل الحق کو ان الزامات کی صحت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ ان الزامات کی تحقیقات کے لئے رائل کمیشن مقرر کیا جائے اور اگر وہ ان الزامات کو صحیح ثابت نہ کرسکا تو وہ بنگال کی وزارت اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی ہوجائے گا۔ اس نے اپنے اس موقف کی بناپر دسمبر میں ایک پمفلٹ بعنوان ''کانگرس راج میں مسلمانوں پر مصائب'' شائع کیا تھا۔ جس میں اس نے کانگرسی صوبوں میں ہندوؤں کی سینکڑوں تشدد آمیز کاروائیوں کی تفصیل بتائی تھی اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ کانگرسی سام راج میں مسلم عوام ہمہ وقت دہشت زدہ رہتے تھے اور انہیں شب و روز ہندوؤں کے مظالم برداشت کرنے پڑتے تھے جبکہ قانون یا تو بہت ہی آہستگی سے حرکت میں آتا تھا یا وہ بالکل ہی حرکت نہیں کرتا تھا۔''[2] یہ پمفلٹ کہاں تک صداقت پر مبنی تھا اور اس میں کس حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی تھی بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس زمانے میں اس سوال کے صحیح جواب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہندو۔ مسلم تضاد سے اس قدر مغلوب تھے کہ وہ ہندوؤں کے خلاف ہر قسم کے الزامات کو بلاتحقیق صحیح تصور کرتے تھے۔

ہندو مہا سبھا کی طرف سے ہندو ملیشیا کا قیام،
فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ اور فسادات

دوسری طرف بنگالی تعلیم یافتہ ہندوؤں کا فرقہ وارانہ رویہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ حق وزارت کو بدترین قسم کی فرقہ پرست وزارت تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کو اپنا ایسا دشمن تصور کرتے تھے جس سے کوئی مصالحت ممکن ہی نہیں تھی۔ بنگالی ہندوؤں کے مسلمانوں کے خلاف اس دشمنانہ رویے کا بھرپور مظاہرہ 30 دسمبر 1939ء کو کلکتہ میں ہوا جبکہ آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے دو روزہ سالانہ اجلاس کی پہلی نشست میں ڈاکٹر ساورکر اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال میں ہندوؤں کے رضا کار جتھے قائم کئے جائیں گے جن کا نام ہندو ملیشیا ہوگا۔ اس ملیشیا میں 18 سے لے کر 45 سال تک کے ہندو بھرتی کئے جائیں گے۔ یہ قرارداد ڈاکٹر مونجے نے پیش کی اور بھائی پرمانند نے اس کی تائید کی۔ ڈاکٹر مونجے کی اس سلسلے میں تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''اگر انگلستان جرمنی کو شکست دینے میں ناکام رہا تو کیا ہوگا؟ یہ امر بعید از امکان نہیں کہ مسلم اقوام شمال مغربی سرحد سے ہو کر ہندوستان پر حملہ کر دیں گی اور یہاں کے مسلمان ان حملہ آوروں کی امداد کریں گے۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوؤں کا کیا حشر ہوگا؟ خطرہ کھلا ہے۔ ان حالات میں واحد علاج یہ ہے کہ ہندو خود اپنی ملیشیا قائم کریں۔''[3] اس سے اگلے دن کے اجلاس میں عالمی جنگ، ہندوستان کی آزادی، شدھی اور سنگھٹن تحاریک، یوم نجات، حق وزارت کی پالیسی اور بعض دوسرے مسائل کے بارے میں 14 قراردادیں پیش کی گئیں۔ یوم نجات سے متعلقہ قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مونجے نے اعلان کیا کہ ''میرے مسلمان دوستوں کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں ہندو راج کے سوا کوئی راج نہیں ہو سکتا۔'' اس نے ہندو ملیشیا کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''میں ہندو والدین سے جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنے لڑکے کو سکول نہ بھیجیں تو نہ بھیجیں، کالج نہ بھیجیں تو نہ بھیجیں لیکن فوجی سکول ضرور بھیجیں۔'' بھائی پرمانند نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''اصل نکتہ یہ ہے کہ آیا عدم تشدد کا فلسفہ جس کی تعلیم گاندھی جی دے رہے ہیں اور جس کو کانگرس نے قبول کر لیا ہے، قومی زندگی کا صحیح فلسفہ ہے؟ مہا سبھا میں ہمارا نظریہ اس نظریۂ عدم تشدد کے قطعی مخالف ہے۔''[4] اس قسم کی تقریروں کا حاضرین پر بہت اثر ہوا

اورانہوں نے مجوزہ ہندوملیشیا کے قیام کے لئے اڑھائی لاکھ روپیہ چندہ دیا۔

ہندو مہاسبھا کے اس انتہائی اشتعال انگیز سالانہ جلسہ کے موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا جس میں وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے کلکتہ یونیورسٹی کے ہندو ارباب اختیار کی فرقہ پرستانہ پالیسی کی پرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ''مسلمانان بنگال کی تعلیمی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کلکتہ یونیورسٹی کا نامناسب، غیر منصفانہ اور غیر جمہوری دستور ہے۔ یہ یونیورسٹی کہنے کو تو سارے بنگال کی یونیورسٹی ہے، اس کو سارے بنگال کے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق، معائنہ، کنٹرول اور نصاب کے اختیارات حاصل ہیں لیکن درحقیقت اس میں بنگال کے 55 فیصد مسلمانوں اور 30 فیصد اچھوتوں اور دوسری پسماندہ اقوام کو مطلق کوئی نیابت اور کوئی آواز حاصل نہیں ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس میں پندرہ فیصد اونچی ہندو جاتیوں کو بھی کسی اصول نمائندگی کے مطابق کوئی قانونی اور باضابطہ نیابت حاصل نہیں ہے...... یہ یونیورسٹی ایک خودساختہ اور خود پرداختہ مجلس ہے جو ملک معظم کے چارٹر اور حکومت برطانیہ کی تائید سے مسلمانوں اور دوسری پسماندہ اقوام پر برہمنیت کی تعلیمی اجارہ داری قائم رکھنے پر مصر ہے۔ یہ یونیورسٹی صوبہ میں ثانوی تعلیمی بورڈ کی بھی مخالفت کر رہی ہے۔ ہم جب یہ بورڈ قائم کریں گے تو بنگال کے اسکولوں میں اردو کو مسلمانوں کے لئے ایک لازمی مضمون کی حیثیت دیں گے۔ کلکتہ یونیورسٹی نہیں چاہتی کہ مسلمانوں کی یہ خواہش پوری ہو حالانکہ اس سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے ان کا کوئی تعلق ہوگا کیونکہ ہماری حکومت اردو کو لوگوں پر اس طرح ٹھونسنا نہیں چاہتی جس طرح کہ مدراس کی کانگرسی وزارت نے ہندی کو کریمینل ایکٹ (CriminalAct) کے نفاذ کے ذریعے جبراً لوگوں پر ٹھونسا تھا...... مسلمانان بنگال اسلامی ہند کے سب سے بڑے حصے کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن (1) ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کے دیوانی کی بخشیش (1765ء)۔ (2) لارڈ کارنوالس کا بندوبست دوامی (1793ء)۔ (3) موقوفہ زمینوں، ملکیتوں، معافیوں اور معاشیوں پر قبضہ کرنے کی تحریک (1793ء)۔ (4) لارڈ میکالے کی خالص مغربی تعلیم پھیلانے اور مشرقی علوم کی تعلیم کی سرپرستی کی موقوفی (1835ء)۔ (5) عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی اور اردو کی موقوفی (1837ء) اور جنگ پلاسی (1757ء) کے بعد سے آج تک حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کی تعلیم سے غفلت، بلکہ مسلمانوں کی بربادی، تباہی وخرابی کی بنیاد پر دیگر فرقوں کی ترقی

کی عمارت کھڑا کرنے کی پالیسی نے مسلمانان بنگال کو آسمان حکومت وریاست سے گرا کر خاک ذلت ومسکنت میں ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ آج تک مسلمانان بنگال اپنے آپ میں نہیں آسکے اور اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکے۔ موجودہ وزارت باوجود انتہائی مشکلات میں مبتلا ہونے کے، انتہائی کوشش کر رہی ہے کہ پبلک کی اس بڑی آبادی کو، جو ہندوستان کی گزشتہ دو صدیوں کے انقلاب حکومت اور انقلاب تعلیم وتمدن کی تباہ کاریوں کا سب سے اول اور سب سے زیادہ شکار اور آماجگاہ ہوئی ہے، انتہائی غربت اور جہالت کی پستی سے نکالے اور اسے اسلامی ہند کا ایک زندہ اور قابل فخر عضو بنا دے۔''[5] مولوی فضل الحق کی اس تقریر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بنگالی قوم پرستی سے بالاتر ہو کر بنگال میں بنگالی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی رائج کرنے کا واقعی حامی تھا۔ اس نے اس مضمون کی تقریر محض اس لئے کی تھی کہ یہ کانفرنس علی گڑھ مکتب فکر کے حامیوں کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی اور اس کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ اس قسم کے اجتماع میں اسی قسم کی تقریر کی جائے۔ البتہ اگر اس کانفرنس کی اس تجویز پر عمل ہوتا تو شاید بنگالی مسلمان اردو زبان کی اس طرح مخالفت نہ کرتے جس طرح کہ صوبہ مدراس میں تامل بولنے والے عوام ہندی زبان کی مخالفت کر رہے تھے۔ شاید بنگالی مسلمان محض اونچی ذات کے ہندوؤں کی مخالفت کرنے کے لئے اردو زبان کو اسکولوں میں بطور لازمی مضمون رائج کرنے پر آمادہ ہو جاتے، شاید وہ اس کانفرنس میں منظور کردہ ایک قرارداد کے مطابق بنگلہ رسم الخط کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط کو بنگلہ زبان کی تحریر کے لئے رواج دینے پر اعتراض نہ کرتے اور اس تجویز سے بھی اتفاق کر لیتے کہ اردو زبان کو بنگلہ رسم الخط میں لکھ کر اس زبان کو فروغ دینے میں آسانی پیدا کی جائے۔

آل انڈیا ہندو مہا سبھا اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ان اجتماعات کے بعد قدرتی طور پر صوبہ کے فرقہ وارانہ تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ان دنوں کلکتہ کارپوریشن کے نئے انتخابات بھی ہونے والے تھے۔ اگرچہ اس مقصد کے لئے مخلوط طریقۂ انتخاب رائج تھا لیکن ہندو اور مسلمان امیدواروں کی جانب سے انتخابی مہم فرقہ وارانہ بنیاد پر چلائی جا رہی تھی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلا فساد 20 رجنوری 1940ء کو عید الاضحیٰ کے موقع پر کلکتہ کے نواحی علاقے میں ہوا جس میں پندرہ افراد زخمی ہوئے اور حکومت کو امن وامان بحال کرنے کے لئے شام سے صبح تک کا کرفیو لگانا پڑا۔ تاہم یہ فرقہ وارانہ

خونریزی بہت جلد ضلع فرید پور اور صوبہ کے بعض دوسرے علاقوں میں پھیل گئی جبکہ سوبھاش چندر بوس اپنے فارورڈ بلاک کے پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کے خلاف پرتشدد تحریک چلانے کے لئے پروپیگنڈا کر رہا تھا اور وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق کو ہندو یوتھ لیگ کی طرف سے قتل کی تحریری دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں۔

بوس برادران کی گاندھی سے بغاوت اور سرت بوس کی فضل الحق کی گول میز کانفرنس میں شرکت سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں عارضی کمی

فضل الحق نے اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے 24 رفروری 1940ء کو ہندو اور مسلمان لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جس میں دوسرے ممتاز لیڈروں کے علاوہ سرت چندر بوس، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، سرناظم الدین اور نواب بہادر ڈھاکہ نے شرکت کی۔ سرت چندر بوس نے انہی دنوں اپنے بھائی سوبھاش چندر بوس کی پیروی کرتے ہوئے گاندھی اور اس کے رجعت پسند حواریوں کی قیادت سے بغاوت کی تھی۔ یہ کانفرنس خاصی حد تک کامیاب رہی اور اس بنا پر سارے صوبہ میں فرقہ وارانہ تعلقات نمایاں طور پر قدرے بہتر ہو گئے۔

2 رمارچ کو جب کلکتہ یونیورسٹی کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تو اس کی فضا بھی فرقہ وارانہ تلخی سے مکدر نہیں تھی۔ اس جلسہ میں 473 طلبا کو ایم۔اے۔ کی ڈگریاں دی گئیں جن میں مسلمان طلبا کی تعداد صرف 28 تھی۔ ایم۔اے۔ پاس کرنے والی طالبات کی تعداد 33 تھی، جن میں مسلمان لڑکی کوئی ایک بھی نہیں تھی۔ ایم۔ایس۔سی۔ کی ڈگریاں لینے والے 106 طلبا میں صرف ایک مسلمان تھا اور بی۔ایس۔سی۔ پاس کرنے والے 660 طلبا میں مسلمان طلبا کی تعداد صرف 15 تھی۔ اس جلسہ کے دو تین روز کے بعد صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو اس میں بھی وہ تلخی نہیں تھی جس کا مظاہرہ 1939ء کے بجٹ سیشن میں ہوا تھا۔

23 رمارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں مولوی فضل الحق نے ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل خودمختار ریاستوں کے قیام کی مشہور و معروف قرارداد پیش کی اور اس قرارداد کے حق میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”اگر کوئی دستور اساسی مسلمانوں کی مرضی اور رضامندی کے

بغیر بنایا گیا تو ہم خدا کے فضل و کرم سے اس کو نا قابل عمل بنا دیں گے۔'' مسلم لیگ کے اس دو روزہ اجلاس کے اختتام پر فضل الحق اپنے 77 ساتھیوں کے ہمراہ واپس کلکتہ پہنچا تو مقامی کارپوریشن کے انتخابات کے نتائج سے یہ ظاہر ہوا کہ شہر کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کا طوطی بول رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے مخصوص 22 نشستوں میں سے 18 نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ کامیاب مسلم لیگیوں میں عبدالرحمان صدیقی، مرزا ابوالحسن اصفہانی اور حمودالرحمان بارایٹ لاء کے نام شامل تھے۔

دوسری طرف کلکتہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں اونچی ذات کے ہندوؤں میں فرقہ پرستی اپنے عروج پر تھی چونکہ انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی مجلس عاملہ نے بوس برادران کی مخالفت کی وجہ سے بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کو 29 ر فروری سے معطل کر دیا ہوا تھا اس لئے صوبہ کے ہندوؤں کی سیاسی باگ ڈور فارورڈ بلاک کے علاوہ ہندو مہاسبھا کے ہاتھ میں تھی۔ 14 ر اپریل 1940ء کو بنگال ہندو مہاسبھا نے ''ہندو نیشن ڈے'' منایا۔ کلکتہ میں اس سلسلے میں شردھانند پارک میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں حاضرین سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ پوتر ہندوستان میں مکمل سوراج کے قیام کے لئے اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لائیں گے۔ ہندوستان کی وحدت، استقلال اور سالمیت کے تحفظ کے لئے ہر قربانی کریں گے اور ہندو مذہب و تہذیب کی حفاظت کریں گے۔ بنگالی ہندو مہاسبھا کے نائب صدر بی۔ سی۔ چیٹر جی نے ہندو جھنڈا لہرایا اور ہندوؤں سے کہا کہ ''وہ سب اس جھنڈے کے تلے جمع ہو جائیں۔''[6]

بنگالی مسلمانوں کی جانب سے مارچ 40ء کی قرارداد لاہور کی بھرپور حمایت، اور ان کا خیال تھا'' آزاد مسلم سلطنتوں اور مسلم وطنوں کا قیام عمل میں آئے گا'' اور ''تمام صوبے آزاد ہوں گے''

بنگالی مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس جلسہ کا جواب 19 ر اپریل کو دیا جبکہ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی ہدایت کے مطابق قرارداد لاہور کی تائید و حمایت کے لئے بے شمار جلسے کئے۔ کلکتہ میں محمد علی پارک میں سید بدرالدجیٰ کی زیر صدارت جلسہ میں پہلے ایک

مقامی مسلم ہائی سکول کے طلبا نے ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' کا ترانہ پڑھا۔ سید بدرالدجیٰ کے علاوہ متعدد عمائدین نے اپنی تقریروں میں ہندو۔ مسلم تنازعہ کے 150 سالہ پس منظر پر روشنی ڈالی اور پھر اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی کہ ''مسلمانان کلکتہ کا یہ جلسہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ کے متعلق آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی پرزور تائید کرتا ہے اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو یقین دلاتا ہے کہ مسلمانان بنگال فیڈرل مرکز کی ہندو اکثریت کے استبداد سے آزادی اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے لئے آزاد و خود مختار مسلم سلطنتوں کی صورت میں آزاد مسلم وطنوں کی تعمیر اور ہندو علاقوں اور صوبوں کی مسلم اقلیت کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے کافی مؤثر اور واجب التعمیل حکمی تحفظات کے حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی اور ہر جدوجہد کے لئے تیار ہیں۔ یہ غلط اور پرفریب تخیل ہے کہ ہندوستان ایک متحدہ نیشن (قومیت) ہے اور یہ کہ دستور ہند یورپ کی متحدہ قومیتوں کے وطنی اور جغرافیائی نیشنل ازم کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ براعظم ہندوستان کی تمام سیاسی خرابیوں اور بیماریوں کی جڑ اور بنیاد ہے۔ مسئلہ ہند قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور مسلم لیگ کی تقسیم ہند اسکیم اس بنیاد پر ہندوستان کے بین الاقوامی سیاسی مسئلہ کا واحد منطقی اور عاقلانہ حل ہے۔''[7]

ہندو مہا سبھا نے مسلم لیگ کے اس جواب کا جواب اگلے ہی دن یعنی 20 اپریل کو ہوڑہ کے ایک جلسہ عام کی صورت میں دے دیا۔ اس جلسہ میں مہا سبھائی لیڈر تو شار کانتی گھوش مکرجی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''موجودہ حالات میں اگر بنگال کے ہندو متحد نہیں ہوتے تو وہ فنا ہو جائیں گے۔ برطانیہ کے وزیراعظم جیمز رمزے میکڈانلڈ (James Ramsay Mcdonald) کے کمیونل ایوارڈ کے بعد بنگال کے ہندوؤں کی حالت روز بروز گرتی اور خراب ہوتی جارہی ہے۔ ناقابل عبور رکاوٹوں کے پیش نظر وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ بنگال کے ہندوؤں میں لاتعداد پارٹیاں، گروپ اور اختلاف خیال موجود ہے۔ اگر ہم فنا کے گھاٹ اترنے سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے اختلافات کو دور کر دینا چاہیے۔ اپنے حقوق کے تحفظ کے معنی دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنے کے نہیں ہیں۔ لہٰذا بنگال کی ہندو سنگھٹن کی تحریک میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر کسی دوسری جماعت کو اعتراض ہو۔''[8]

اس قسم کے جلسوں سے صوبہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی حالانکہ

سوبھاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک نے بنگالی قوم پرستی کے سہارے مختلف سطحوں پر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کر کے ہندو۔مسلم اتحاد کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی۔اس کی اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ 24/اپریل کو مہا سبھائی گروپ یورپین گروپ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ایک مسلم لیگی امیدوار عبدالرحمان صدیقی بھاری اکثریت سے کلکتہ کارپوریشن کا میئر منتخب ہو گیا۔جن چھ ''قوم پرست'' مسلمانوں نے صدیقی کے خلاف ووٹ دیئے ان میں ابوحسین سرکار اور ابوالمنصور احمد کے نام بھی شامل تھے۔تاہم صدیقی کے اس انتخاب نے شہر کی ناخوشگوار فرقہ وارانہ فضا پر کوئی خوشگوار اثر نہ ڈالا بلکہ اس سے فرقہ وارانہ جذبات اس قدر برافروختہ ہو گئے کہ ان کا دائرہ تھوڑے ہی دنوں میں کھیل کے میدان تک پہنچ گیا جبکہ انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن نے محمڈن سپورٹنگ کلب کو اپنی رکنیت سے یہ الزام عائد کر کے معطل کر دیا کہ مسلمانوں کی یہ کلب فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم ہے۔اس پر کلکتہ کے مسلم لیگی اخبار عصر جدید نے بہت احتجاج کیا اور یہ الزام عائد کیا کہ فٹ بال ایسوسی ایشن پر مہا سبھائیوں کا غلبہ ہے۔اس کا صدر مسٹر بینر جی اور سیکرٹری مسٹر گھوش ہے اور یہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے کہ مسلمان نوجوان کھیل کے میدان میں بھی کوئی ترقی کریں۔

5/مئی کو کارپوریشن کے میئر عبدالرحمان صدیقی کی زیر صدارت مسلمانان کلکتہ کا جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد 25 ہزار تھی۔جلسہ میں مولانا اکرم خان کی تجویز کے مطابق ایک پندرہ رکنی مجلس عمل کی تشکیل کی گئی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا کہ ''وہ بنگال میں فٹ بال کے نظم ونسق میں مسلمانوں کے لئے مناسب حصہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک مؤثر تحریک منظم، منضبط اور طریقۂ عدم تشدد کے مطابق جاری کرے۔اس کام کے لئے پانچ ہزار والنٹیئر زبھرتی کرے اور دیگر تدابیر اختیار کرے تاآنکہ مسلمانوں کے مطالبات مان لئے جائیں'' مولوی سید محمد عثمان نے اس تجویز کی تائید کی اور اپنی تقریر میں کہا کہ ''غدر کے بعد مسلمانوں کو ہر میدان سے نکال دیا گیا تھا۔اب مسلمان ہر میدان میں جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کا واجبی حصہ ہے لیکن اس کو اس کے واجبی حصہ سے محروم کرنے کی چالیں اختیار کی جاتی ہیں۔''[9] اس جلسہ کا مطلب یہ تھا کہ اب بنگال میں کوئی شعبہ بھی سیاست سے بالاتر نہیں رہا تھا اور اب بنگال کے ہندو اور مسلمان کھیل کے میدان میں اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔

تاہم جب اپریل میں ناروے اور ڈنمارک پر جرمنی کے قبضے کے بعد 7رمئی کو برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبرلین (Neville Chamberlian) نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ ونسٹن چرچل (Winston Churchill) قومی حکومت کا سربراہ بنا اور پھر جب اس کے تین دن بعد 10رمئی کو ہٹلر نے ہالینڈ، لکسمبرگ اور بلجیم پر حملہ کر دیا تو ہندوستان میں کانگرس، ہندو مہاسبھا اور دوسری ہندو جماعتوں کا یہ مطالبہ بہت زور پکڑ گیا کہ برطانیہ کو ہندو۔ مسلم تنازعہ کے تصفیہ کا انتظار کئے بغیر ہندوستان کی آزادی کا بلا تاخیر اعلان کر دینا چاہیے۔ کلکتہ میں اس مطالبے کی شدت بہت زیادہ تھی کیونکہ سوبھاش چندر بوس نے عوام کو یہ تاثر دیا ہوا تھا کہ اس عالمی جنگ میں برطانیہ کی شکست ناگزیر ہے۔ بنگال کے بیشتر ہندو لیڈروں کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے راستے میں صرف مسلم لیگ اور اس کا صدر محمد علی جناح حائل ہے جبکہ جناح کا کہنا یہ تھا کہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کے حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور ٹھوس تصفیہ کی بنیاد پر فرقہ وارانہ اتحاد قائم کیا جائے تو ہندوستان کی مکمل آزادی کے حصول میں تاخیر نہیں ہوگی۔

اس پر 28رمئی کو کلکتہ کے اخبار ''عصر جدید'' کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہر چیز سودیشی ہو۔ لنگوٹی سے لے کر موٹر کار اور ہوائی جہاز بھی سودیشی لیکن حکومت کا قالب اور اس کی روح سودیشی نہیں ہو بلکہ برطانوی ہو۔'' یہ ہے وہ نعرہ جو بظاہر کانگرسی اور ہندو لیڈر لگا رہے ہیں۔ وہ بار بار اور ہر دو چار جملے بولنے کے بعد لاہور کی تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا کام اس وقت صرف یہی رہ گیا ہے کہ مسلم لیگ کی تجویز لاہور کی مخالفت کرو۔ جناح صاحب نے بمبئی صوبہ مسلم لیگ کانفرنس میں جو خطبہ دیا ہے اس میں انہوں نے نہایت صفائی سے کہا ہے کہ ہندوستان کے ایک ہونے کا تصور محض دماغی عیاشی ہے، نہ ایک ملک موجود ہے اور نہ ایک قوم۔ لیکن کانگرس کے لیڈر اور اخبارات چیخ رہے ہیں کہ لاہور کی تجویز کا مقصد ایک ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور ایک قوم کو حصوں میں بانٹ دینا ہے۔ جناح صاحب نے پوچھا ہے کہ ''ایک ملک کہاں ہے جس کو بانٹا جا رہا ہے۔ ایک قوم کہاں ہے جس کی تقسیم ہو رہی ہے۔'' چھوڑ دیجیے اس بات کو کہ مسلمان اور ہندو تمام ملکی خصوصیات کے باوجود ایک قوم نہیں ہے۔ کیا مدراسی اور بنگالی، کیا اڑیہ اور بہاری، کیا مرہٹہ اور سرحدی ایک قوم ہیں؟ انصاف شرط ہے۔ بتاؤ ان میں کونسی خصوصیت مشترکہ ایسی ہے جس کی بنا پر پنجابیوں، مدراسیوں اور بنگالیوں وغیرہ کو ایک قوم بتایا جاتا ہے۔ جغرافیائی

لحاظ سے بھی ان تمام صوبوں میں اتنے اختلافات موجود ہیں کہ ان کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔ پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہر صوبہ کی تاریخ بھی دوسرے سے بہت حد تک جدا ہے اور روایات میں تو اتنا فرق ہے جتنا فرق سوئٹزرلینڈ اور انگلستان کی روایات میں ہوسکتا ہے۔ یہ ٹھوس حقیقتیں ہیں جن کی تردید ممکن نہیں ہے اور نہ اب تک ان حقیقتوں کی کوئی ایسی تردید کی گئی ہے جسے معقول کہا جائے۔''[10] عصر جدید کلکتہ میں بہاری اور دوسرے غیر بنگالی مسلمانوں کا ترجمان تھا۔ اس لئے یہ اردو اور اسلام کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کو نہ صرف مذہب کی بنا پر بلکہ جغرافیائی، تاریخی، نسلی، ثقافتی اور معاشرتی نقطۂ نگاہ سے ایک کثیر الاقوامی برصغیر سمجھتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ مدراسی، بنگالی، پنجابی، پٹھان، بہاری اور دوسرے صوبوں کے لوگ جغرافیائی، تاریخی، لسانی، نسلی اور ثقافتی لحاظ سے الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ اخبار ان دنوں صرف مسلم قومیت ہی کا علمبردار نہیں تھا بلکہ یہ لسانی، نسلی، معاشرتی اور ثقافتی بنیاد پر قومیتوں کے وجود کو بھی تسلیم کرتا تھا۔

''عصر جدید'' کی اس رائے کی تائید 30 رمئی کو مونگھیر مسلم لیگ کانفرنس میں بھی ہوئی جہاں مونگھیر مسلم لیگ کے صدر حاجی عبدالرحمان نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی تعبیر کی۔ اس نے کہا کہ اس قرارداد کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے ان میں مسلمانوں کا اقتدار ہو...... مسلم لیگ کی اس اسکیم میں تمام صوبے اپنی جگہ آزاد ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تقریباً چھ کروڑ مسلمان آزاد ہوں گے اور ان کی ترقی دوسرے صوبوں کی مسلم اقلیت کے لئے تحفظ وتقویت کا باعث ہوگی۔ جہاں دس فیصد مسلمان ہندوؤں کے زیر حکومت ہوں گے وہاں 40 فیصد ہندو بھی مسلم اکثریت کے صوبوں میں آباد ہوں گے۔ ایسی حالت میں مشترکہ مفاد کی بنا پر یقیناً ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے درمیان اقلیتوں کے متعلق ایسے معاہدے اور تحفظات عمل میں آئیں گے جن کی رو سے ہر اقلیت اپنی زندگی آزادانہ بسر کرنے کے لائق ہوگی۔ مسلم لیگ کا یہ تصور کوئی عجوبہ یا نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے قبل مسٹر سی۔ آر۔ داس آنجہانی نے ایک پمفلٹ کے ذریعے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی تھی۔''[11] گویا بنگال میں حاجی عبدالرحمان اور دوسرے اس قسم کے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ مسلم انڈیا کے تمام صوبے اپنی جگہ آزاد ہوں گے اور یہ تصور

نہیں تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کی ریاستوں میں ملائیت کا نفاذ ہوگا بلکہ وہ سی۔آر۔داس اور لالہ لاجپت رائے کی طرح اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں سیکولر نظام حکومت کے حق میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم جغرافیائی بنیاد پر ہو نہ کہ مذہبی بنیاد پر۔ وہ مسلم انڈیا میں چالیس فیصد ہندو اقلیت کی موجودگی میں ملائیت کے نفاذ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بنگال کے ہندو لیڈر، مسلم لیگی لیڈروں کے اس موقف کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کی پاکستان کی اسکیم پر سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے اور ہندوؤں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ پوری قوت سے ہندو مہا سبھا کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں تا کہ اس قسم کی ''غدارانہ اور قومیت کے خلاف اسکیم کا مقابلہ کیا جا سکے جو ہندوستان کی قومیت اور جمہوریت کو تباہ کر دے گی۔'' ہندو لیڈروں نے اپنے ان تلخ جذبات کا اظہار 3/جون کو ضلع مالدہ میں منعقدہ ایک ہندو کانفرنس میں بڑے زور و شور سے کیا۔ اس کانفرنس میں مہاراجہ کمار سنگھ اچاریہ کے خطبہ استقبالیہ کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں میں 99 فیصد وہ ہیں جو ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں اور آج کہا جاتا ہے کہ ان کے اور ہندوؤں کے درمیان کوئی مشترک چیز نہیں ہے۔ دونوں میں اتنے بنیادی اختلافات ہیں کہ دونوں ایک حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ ان کا آخری نعرہ منطقائی تقسیم ہے یعنی ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ اگر وہ ہندوستان کو اپنی مادر وطن نہیں سمجھتے ہیں تو پھر وہ یہاں اجنبی ہو کر رہیں جیسا کہ چین، جاپان اور پولینڈ میں رہتے ہیں۔ ان کو کوئی حق نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کریں جو زمانہ قدیم سے ہندوؤں کا دوامی وطن ہے۔''[12]

بنگالی مسلمانوں اور ہندوؤں کی اس قسم کی کانفرنسوں کی کاروائیوں سے ظاہر تھا کہ اس صوبہ میں دونوں فرقوں کی خواہشات اور ان کے عزائم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ کانفرنسیں انگریزوں کے کہنے پر منعقد نہیں ہوتی تھیں البتہ انگریز ان کانفرنسوں کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کے وسیع ہونے کا فائدہ ضرور اٹھاتے تھے۔ عالمی جنگ کے دوران انگریزوں کے لئے ایسی فرقہ وارانہ کانفرنسیں بہت فائدہ مند تھیں۔ چونکہ کانگرس اور ہندو مہا سبھا ہندو۔ مسلم تنازعہ کے تصفیے کے بغیر ہی ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی تھیں، اس لئے یہ کانفرنسیں ان کے اس مطالبہ کے سدباب کے لئے بہت مدد و معاون ہوتی تھیں۔ کانگرسی اور

مہاسبھائی لیڈروں کا الزام تو یہ ہوتا تھا کہ مسلم لیگ انگریزوں کی پٹھو ہے اور اس کا مطالبہ پاکستان مکمل آزادی کے راستے میں حائل ہے لیکن عملاً وہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کے منصفانہ تصفیہ سے انکار کر کے خود انگریزوں کے آلۂ کار بنتے تھے۔

بنگالی ہندوؤں میں ایسا عنصر بھی تھا جو مہاسبھا قیادت پر اعتراض کرتا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ تصفیہ کا خواہاں تھا

مذکورہ رائے کا اظہار جون کے اوائل میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے بنگالی جنرل سیکرٹری بی۔سی۔ چیٹر جی نے اپنے استعفیٰ کے اس خط میں کیا جو اس نے اپنی جماعت کے صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر کے نام لکھا تھا۔ چیٹر جی کا الزام یہ تھا کہ جو لوگ بنگال ہندو مہاسبھا پر قابض ہو گئے ہیں ان کی ذہنیت ان بنگالی ہندوؤں کی سی ہے جنہوں نے برطانیہ کو 1757ء میں بنگال آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے بعد سے کافی پانی دریائے گنگا میں بہہ چکا ہے اور اب وہی حکومت برطانیہ ہمیں دعوت دے رہی ہے کہ ہم بنگال میں اپنی حکومت قائم کریں۔ ظاہر ہے کہ ہم مسلمانان بنگال کو نظر انداز کر کے ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس صوبہ کی نصف آبادی ہیں۔ بنگال ہندو مہاسبھا کے یہ لال بجھکڑ لیڈر اس نا قابل تردید حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ بنگال میں جمہوری حکومت کی تشکیل کے لئے بنگالی مسلمانوں سے اتحاد نہیں کریں گے، جس کے ہم اتنے مشتاق ہیں، تو پھر ان کے لئے دوسرا راستہ یہی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے چرنوں میں گر جائیں اور اس سے پرارتھنا کریں کہ وہ ان کو نہ چھوڑے اور مسلمانوں کے ساتھ سیاسی بندھن میں نہ باندھ دے بلکہ وہ اپنی آقائی برقرار رکھے اور انہیں مسلمانوں سے بچاتی رہے جیسا کہ وہ 1757ء سے کر رہی ہے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو آپ کے پیروکار کہتے ہیں وہ اومی چند اور جگت سیٹھ کی صف میں کھڑے ہیں۔ دیش بندھو سی۔ آر۔ داس نے اپنے پیکٹ (Pact) کے ذریعے اس صوبہ میں صحیح جمہوریت کے قیام کے لئے قابل لحاظ کوشش کی۔ آپ کے اس حقیر خادم نے بھی اسی طرح کوشش کی اور بنگالی مسلمان لیڈروں کو نصفا نصف کی اسکیم پر راضی کر لیا لیکن جن لوگوں نے اس اسکیم کے قتل میں مدد دی وہ آج بنگال ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کی صف اول میں ہیں۔ سوبھاش چندر بوس نے بھی کلکتہ کارپوریشن میں مسلم کونسلروں سے تعاون کر

کے یہی کام شروع کیا ہے۔ انہوں نے ان کے ساتھ کوئی ایسی شرط نہیں رکھی جس سے طرفین کے ساتھ انصاف کا خیال باقی نہ رہے۔ پھر بھی آپ کے پیروکار روزانہ ان پر بلاوجہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔"[13] چیٹر جی کی یہ آواز ایسے ہندو بنگالی قوم پرستوں کی آواز تھی جو بنگالی مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کر کے مغربی ہندوستان کے مارواڑیوں کے استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر گھنشام داس برلا جیسے عناصر گاندھی اور ساورکر جیسے لیڈروں کی وساطت سے ان کی اس خواہش کی تکمیل کے راستے میں حائل تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کا الزام سراسر انگریزوں اور اس کی "پٹھو جماعت" مسلم لیگ پر عائد کرتے تھے۔

فضل الحق کی جانب سے لیگ ہائی کمان کے خلاف بغاوت کی کوشش

جن دنوں بی۔ سی۔ چیٹر جی نے ساورکر کے نام مذکورہ خط لکھا تھا ان ہی دنوں بنگال کا وزیر اعلیٰ فضل الحق بھی بنگالی نیشنلزم کے سہارے کانگرسی اور دوسرے ہندوؤں سے اتحاد کرنے کی طرف مائل تھا۔ اس نے اس سلسلے میں لیگ ہائی کمان سے مشورہ کئے بغیر کلکتہ میں ابوالکلام آزاد، جو 1940ء میں کانگرس کا صدر منتخب ہو چکا تھا، سے ملاقات کر کے ہندو۔ مسلم مسئلہ کے حل کے متعلق گفتگو کی اور یہ تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے لئے مسلم لیگی اور کانگرسی وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس بلائی جائے لیکن جواباً ابوالکلام آزاد کی تجویز یہ تھی کہ "چونکہ کانگرس اپنے 17ر اکتوبر 1939ء کے فیصلے کے مطابق دوبارہ وزارتیں قبول نہیں کر سکتی تاہم اگر بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلم اکثریتی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ آئندہ کسی موقع پر اس سے ملاقات کریں تو اس مسئلہ کے حل پر غور کیا جا سکتا ہے۔"[14]

11ر جون 1940ء کو جبکہ جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم کے علاوہ فرانس کو بھی اپنے زیر نگیں کر لیا ہوا تھا اور اٹلی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، مولوی فضل الحق نے ایک بڑے جذباتی بیان میں بنگال کے ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں سے اپیل کی کہ وہ "متحد ہو کر ایک مشترکہ ملیشیا قائم کریں جو مادر وطن کی خدمت کے واحد مقصد کے ساتھ ایک ہی جھنڈے کے نیچے دوش بدوش کام کریں۔"[15] بظاہر فضل الحق کے اس بیان کے پیچھے صوبہ کے انگریز گورنر کی کارفرمائی تھی کیونکہ یورپ میں جرمنی اور اٹلی کی پیش قدمی کے پیش نظر برطانیہ کی خواہش تھی کہ

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان وسیع ترین متحدہ محاذ قائم کر کے اس کی جنگی مساعی میں مدد و معاون ثابت ہوں۔ وائسرائے چاہتا تھا کہ اس مقصد کے لئے نہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ اپنی رام گڑھ اور لاہور کی قراردادوں کے باوجود اس کی ایگزیکٹو کونسل میں شریک ہوں بلکہ ہندو اور مسلمان ہر سطح پر متحد ہو کر انگریزوں کے ایک ہی جھنڈے تلے دوش بدوش کام کریں۔ فضل الحق کا یہ بیان لیگ ہائی کمان کی پالیسی کے منافی تھا کیونکہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کا موقف یہ تھا کہ جب تک مسلم اقلیت کے مستقبل کے بارے میں ہندوؤں اور انگریزوں سے کوئی تصفیہ نہیں ہوتا اس وقت تک مسلم لیگ کسی سطح پر بھی جنگی کمیٹیوں میں شریک نہیں ہوگی۔ اگرچہ وہ جنگی مساعی کی مخالفت بھی نہیں کرے گی۔ مسلم لیگ کی یہ پالیسی بالکل واضح تھی اور صدر مسلم لیگ محمد علی جناح اس سلسلے میں وائسرائے اور کانگرسی لیڈروں سے گفت وشنید کر رہے تھے لیکن فضل الحق پنجاب کے سر سکندر حیات خان اور مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل نوابزادہ لیاقت علی خان کی طرح لیگ ہائی کمان کو نظر انداز کر کے انگریزوں اور کانگرسیوں سے اتحاد کی ایک الگ راہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ بنگال میں ''قومی حکومت'' بنانے کے لئے بوس برادران سے کئی ماہ سے بات چیت کر رہا تھا اور صدر کانگرس ابوالکلام آزاد سے بھی اس کی بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔

فضل الحق نے جون کے اوائل میں کلکتہ میں ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے دوران جو پروگرام طے کیا تھا اس کے مطابق وہ نئی دہلی پہنچا۔ وہاں صدر کانگرس نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان اور سندھ کے وزیر اعلیٰ میر بندے علی تالپور سے ملاقات کی مگر فضل الحق دھرمپور میں اپنی بیٹی کی علالت کی وجہ سے اس بات چیت میں شریک نہ ہو سکا۔ تاہم بنگال اسمبلی کے تین مسلم لیگی ارکان اسمبلی عبدالرحمان صدیقی، خواجہ نورالدین اور ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی نے اسی دن ایک بیان میں بنگال اور پنجاب کے وزرائے اعلیٰ کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے بالاتر کانگرس سے کوئی سمجھوتہ کیا تو مسلم لیگ اس کی تائید نہیں کرے گی۔ فضل الحق نے اس وارننگ کا جواب شملہ سے دیا جہاں وہ 15 رجون کو وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچا تھا۔ اس کا بیان یہ تھا کہ ''اگر میں نے محسوس کیا کہ کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے بہتر ہے تو بنگال کے مسلمانوں سے استصواب رائے عامہ کئے بغیر یہ سمجھوتہ کرلوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان کے دلوں میں میری کیا جگہ ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں

کہ وہ میرے ساتھ ہیں اور جو کچھ میں کروں گا اس میں وہ میرے ساتھ رہیں گے...... اگر بوس برادران کے ساتھ میرا معاہدہ ہو جائے تو اب بھی بنگال پورے ہندوستان کی رہنمائی کرے گا۔،،16 فضل الحق کے اس بیان کا مطلب صاف تھا یعنی یہ کہ بنگال کی حد تک وہ مطلق العنان ہے اور وہ مرکزی مسلم لیگ کی کسی پالیسی کا پابند نہیں ہوگا۔ یہ وہی فضل الحق تھا جو اکتوبر 1937ء کے بعد مسلم لیگ اور اس کے صدر محمد علی جناح کے ساتھ اپنی وفاداری کے اظہار کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ اور یہ وہی فضل الحق تھا جس نے 23 رمارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ابوالکلام آزاد نے 16 رمارچ 1940ء کو رام گڑھ میں انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کی مسلم اقلیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے غیر اسلامی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور یہ کہ قرارداد لاہور کو تسلیم کئے بغیر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہوسکتا۔'' تاہم مسلم لیگ ہائی کمان نے اعلانیہ طور پر تو فضل الحق کی اس قلابازی کا نوٹس نہ لیا البتہ اس کی مرکزی مجلس عاملہ نے 16 رجون کو بمبئی میں ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ آئندہ مجلس عاملہ کا کوئی رکن ہندو۔ مسلم تصفیہ کے لئے انفرادی طور پر کانگرسی لیڈروں سے بات چیت کرنے کا مجاز نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی مسلم لیگی کسی سطح پر جنگی کمیٹی میں شرکت کرے گا۔ عاملہ کے اس اجلاس میں بنگال سے سر ناظم الدین، عبدالمتین اور مولانا اکرم خان نے شرکت کی۔ فضل الحق غیر حاضر تھا کیونکہ وہ وائسرائے سے ملاقات کے لئے شملہ میں مقیم تھا۔

16 رجون کو اس نے وائسرائے سے ملاقات کی اور پھر جب وہ واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے 20 رجون کو صوبائی گورنر کی زیر صدارت عمائدین شہر کے ایک جلسہ میں ایک قرارداد کے ذریعے یقین دلایا کہ ہندوستان کے کروڑوں عوام اس جنگ میں برطانیہ کی امداد کے لئے اپنا خون بہانے پر آمادہ ہیں۔ اس جلسہ میں بنگالیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور صوبہ میں جنگی مساعی کو تیز تر کرنے کے لئے صوبائی سطح کی ایک جنگی کمیٹی بنائی گئی جس میں وزیر اعلیٰ فضل الحق بھی شامل تھا۔ اس جلسہ کی اطلاع بمبئی پہنچی تو مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک سرکلر جاری کر کے فضل الحق کو بتایا کہ مسلم لیگ نے جنگی کمیٹیوں میں شرکت نہ کرنے کا جو فیصلہ کر رکھا ہے اس سے مسلم لیگی وزرا مستثنیٰ نہیں۔ قبل ازیں 18 رجون کو صدر مسلم لیگ محمد علی

جناح بھی اس مضمون کا بیان دے چکے تھے۔ مگر جب فضل الحق پر کوئی اثر نہ ہوا تو یکم جولائی 1940ء کو مولانا راغب احسن، سید محمد عثمان، حافظ شمشاد احمد، مرزا ابوالحسن اصفہانی، خواجہ نورالدین، سید بدرالدجیٰ اور کئی دوسرے ممتاز مسلم لیگی لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان میں اسے ایک مرتبہ پھر متنبہ کیا کہ ''اگر مسلمانان بنگال نے سارے اسلامی ہند سے اپنی علیحدہ روش اختیار کی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ متحد نہ رہے تو وہ مسلم قومیت کی ہستی اور استقلال کو معرض خطر میں ڈالنے اور سخت ترین نقصان پہنچانے کے مجرم ثابت ہوں گے۔'' کلکتہ کے مسلم لیگی لیڈروں کا یہ انتباہ بروقت اور صحیح تھا۔

جون 1940ء میں بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں میں صرف صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کا طوطی بولتا تھا اور جو مسلمان لیڈر ان کی حکم عدولی کرنے کی جرأت کرتا تھا اس کا سیاسی جنازہ نکلنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ فضل الحق کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب اس نے قائداعظم کی پالیسی کے خلاف انگریزوں کی جنگی مساعی میں غیر مشروط امداد و تعاون کے عملی مظاہرہ پر اصرار کیا تو نہ صرف کلکتہ کے بلکہ پورے بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نظروں میں اس کا سیاسی زوال شروع ہو گیا۔ دوسری طرف وہ سوبھاش چندر بوس اور ان کانگرسیوں کی حمایت بھی کھو بیٹھا جن کے ساتھ مل کر وہ صوبہ میں ''قومی حکومت'' اور ''قومی ملیشیا'' کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ہال ویل یادگار مسمار کرنے کی تحریک اور یوم سراج الدولہ منانے پر فضل الحق کا دوغلا کردار

سوبھاش چندر بوس ستمبر 1939ء میں عالمی جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد سے ہی انگریزوں کے خلاف پرتشدد ایجی ٹیشن بلکہ بغاوت کا پرچار کرتا رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس جنگ میں انگریزوں کو شکست ہو گی۔ وہ گاندھی کی زیر قیادت انڈین نیشنل کانگرس کی ڈھل مل پالیسی کے خلاف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت بلند کرے اور اس طرح برصغیر کی سیاست پر ایک مرتبہ پھر بنگال کی بالادستی قائم کرے۔ اس نے اس مقصد کے لئے پہلے تو مولوی فضل الحق سے گفت وشنید کا سلسلہ

شروع کیا مگر جب اسے اپنی اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو اس نے کلکتہ کے درمیانہ طبقہ کے مسلمانوں میں فضل الحق کے خلاف روز افزوں مخالفانہ جذبات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے یکم جولائی 1940ء کو ایک بیان میں اپنے بھائی سرت چندر بوس اور بنگال کانگرس کمیٹی کے صدر راجندر چندر دیو کی اس اپیل کی تائید کی کہ 3ر جولائی 1940ء کو پورے بنگال میں یوم سراج الدولہ منایا جائے کیونکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا متحدہ محاذ بنا کر انگریزوں سے نبرد آزما ہوا تھا۔ اس کا مزید بیان یہ تھا کہ کلکتہ میں ہال ویل کی یادگار (مونومنٹ) کو مسمار کروانے کے لئے بھی تحریک شروع کی جائے کیونکہ یہ ہماری قومی غلامی کی علامت ہے اور اس سے نواب سراج الدولہ کی توہین ہوتی ہے۔ انگریزوں نے وہ یادگار ''بلیک ہول'' کے ایک مبینہ واقعہ کی یاد میں تعمیر کروائی تھی اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ سراج الدولہ ایک ظالم وسفاک حکمران تھا جس نے ایک تنگ وتاریک کمرے میں انگریزوں کے بہت سے فوجیوں کو بند کر کے ہلاک کر دیا تھا۔

سوبھاش چندر بوس کا یہ بیان مؤثر ثابت ہوا چنانچہ اسی دن البرٹ ہال میں بنگال کونسل کے ایک مسلمان رکن معظم علی چودھری (لال میاں) کی زیر صدارت ایک جلسہ عام ہوا جس میں سوبھاش چندر بوس اور آل بنگال مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے صدر محمد عبدالواثق اور دوسرے مقررین نے مطالبہ کیا کہ ہال ویل یادگار کو مسمار کیا جائے اور درسی کتابوں میں سے ایسے مواد کو حذف کر دیا جائے جس کی صحت کے بارے میں کوئی واضح تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔ اس جلسہ کے اگلے دن 2ر جولائی 1940ء کو سوبھاش چندر بوس کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ 129 کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اعلان کیا کہ اس کی حکومت ہال ویل یادگار کو ہٹانے کے مسئلے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر دے گی۔ اس نے عوام سے اپیل کی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو صوبہ کے امن وامان میں خلل کا باعث ہو۔ مگر اس کی یہ اپیل رائیگاں گئی۔ 3ر جولائی کو سوبھاش چندر بوس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے کارپوریشن کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ التوا کی تحریک ایک مسلم لیگی کونسلر مرزا ابوالحسن اصفہانی نے پیش کی اور ہندو مہاسبھا کے این۔ سی۔ چیٹر جی نے اس کی تائید کی تھی۔

اسی دن کلکتہ اور اس کے مضافات میں متعدد جلسوں کے ذریعے یوم سراج الدولہ منایا

گیا۔ سب سے بڑا جلسہ ٹاؤن ہال میں ہوا جس کی صدارت سید بدرالدجیٰ (مسلم لیگ) نے کی اور بہت سے مسلم لیگی اور کانگرسی لیڈروں نے نواب سراج الدولہ کو خراج عقیدت پیش کر کے مطالبہ کیا کہ درسی کتب میں سے ایسا مواد حذف کر دیا جائے جس میں نواب سراج الدولہ کے خلاف دروغ بیانی کی گئی ہے۔ اس کا مزید مطالبہ یہ تھا کہ سراج الدولہ کے شایان شان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس جلسہ سے پہلے ہندو اور مسلمان طلبا نے ہال ویل یادگار کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی تھی اور ارباب اختیار نے اس سلسلے میں کئی ایک افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ یہ تحریک 4/جولائی اور پھر اس کے بعد بھی جاری رہی۔ 15/جولائی کو جب صوبائی اسمبلی کا گرمائی سیشن شروع ہوا تو اس وقت تک اس تحریک کے سلسلے میں 174 افراد گرفتار ہو چکے تھے جن میں مرزا ابوالحسن اصفہانی بھی شامل تھا اور یہ بات اس حقیقت کی مظہر تھی کہ نہ صرف مسلم لیگ ہائی کمان بلکہ بنگال کی مسلم رائے عامہ فضل الحق سے بیزار ہو گئی تھی۔ 16/جولائی کو آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے زیر اہتمام مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ 22/جولائی کو طلبا پورے بنگال میں ہڑتال کر کے ہال ویل یادگار تحریک کے بارے میں صوبائی حکومت کے رویے کے خلاف احتجاج کریں گے۔ جلسہ میں فضل الحق کو بھی مدعو کیا گیا تھا مگر وہ اسمبلی میں ''مصروفیت'' کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ تاہم عبدالواثق، عبدالحلیم، نورالہدیٰ، فضل القادر اور دوسرے سٹوڈنٹ لیڈروں نے اپنی تقریروں میں اعلان کیا کہ آئندہ وہ فضل الحق کی حمایت نہیں کریں گے۔ فضل القادر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''فضل الحق اور اس کے دوستوں نے بار بار ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ بلند کیا لیکن آج جبکہ اسلام کو واقعی دھمکی دی گئی ہے تو یہ لوگ اپنی چھوٹی انگلی اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ میں وزیروں سے کہتا ہوں کہ جب تک ہال ویل یادگار رہے گی، اسلام خطرے میں رہے گا۔'' اس جلسہ کے بعد ہال ویل تحریک کے سلسلے میں مزید گرفتاریاں ہوئیں اور اس طرح گرفتار شدگان کی کل تعداد 236 ہو گئی۔

17/جولائی 1940ء کو اس تحریک نے اور زور پکڑا تو صوبائی حکومت نے اخبارات کے نام یہ حکم صادر کر دیا کہ وہ آئندہ اس تحریک کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ کریں۔ اس پر 18/جولائی کو اسمبلی میں پرجا پارٹی کے ایک رکن بلال الدین ہاشمی نے اس حکم کی مذمت کرنے کے لئے ایک تحریک التوا پیش کی جو 74 کے مقابلے میں 115 ووٹوں سے مسترد کر دی گئی۔

وزیر داخلہ سر ناظم الدین نے اس سلسلے میں حزب مخالف کے قائد سرت چندر بوس اور دوسرے ارکان اسمبلی کی تقریروں کے جواب میں بتایا کہ 3 رجولائی کو سو بھاش چندر بوس کی گرفتاری اس لئے عمل میں آئی تھی کہ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ جلوس نکال کر ہال ویل یادگار کو مسمار کر دے گا۔ سر ناظم الدین نے کہا کہ سو بھاش چندر بوس کچھ دیر سے نہ صرف حکومت بلکہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو بھی یہ دھمکی دیتا رہا تھا کہ وہ کوئی تحریک شروع کرے گا۔ مگر جب اسے اپنے اس منصوبے کے بارے میں کسی جماعت کی طرف سے تائید حاصل نہ ہوئی تو اس نے ہال ویل یادگار کی تحریک محض اس لئے شروع کر دی کہ مسلم طلبا نے پہلے ہی اس کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔ مگر سر ناظم الدین کے اس بیان صفائی سے مسلم طلبا کی تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے حسب اعلان 22 رجولائی کو پورے صوبہ میں ہڑتال کر کے صوبائی حکومت کے رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ کلکتہ میں طلبا کا احتجاجی جلسہ اسلامیہ کالج میں ہوا جسے گورکھوں اور اینگلو انڈین سارجنٹوں نے بزور قوت منتشر کرنے کی کوشش کی تو متعدد طلبا زخمی ہو گئے اور آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے صدر عبدالواثق کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ سے وزیر اعلیٰ فضل الحق کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی۔ وہ اب تک آل انڈیا مسلم لیگ اور بنگال کی مسلم رائے عامہ کے زور پر حکومت چلاتا رہا تھا۔ اب جبکہ اس کے یہ دونوں سہارے متزلزل ہو گئے تو اس نے 23 رجولائی کو اسلامیہ کالج میں جا کر طلبا کی شکائتیں سنیں اور 24 رجولائی کو جبکہ شہر میں ہندو اور مسلمان طلبا کا کانگرسی اور مسلم لیگی جھنڈوں کے ساتھ زبردست مظاہرہ جاری تھا، اسمبلی میں یہ اعلان کیا کہ ''حکومت اسلامیہ کالج میں مسلم طلبا پر تشدد کے واقعہ کی تحقیقات کروائے گی اور ہال ویل یادگار کو ہٹانے کے لئے بہت جلد مطلوبہ کاروائی کرے گی۔'' اس پر حزب مخالف کے قائد سرت چندر بوس نے ایک بیان میں عوام سے اپیل کی کہ وہ وزیر اعلیٰ کی اس یقین دہانی کے پیش نظر ہال ویل ستیہ گرہ تحریک عارضی طور پر بند کر دیں۔ اگلے دن 25 رجولائی کو اسلامیہ کالج کے دو سٹوڈنٹ لیڈروں شمس العالم اور عبدالحق نے وزیر اعلیٰ کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کیا اور یقین دلایا کہ 23 رجولائی کو اسلامیہ کالج میں جو پر تشدد واقعہ ہوا تھا اس کی وجہ سے اس احترام میں کوئی فرق نہیں آیا جو مسلم طلبا کے دلوں میں وزیر اعلیٰ کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ اسلامیہ کالج کے طلبا کو فخر ہے کہ وہ مسلمانان بنگال کے سچے لیڈر کے وفادار ہیں اور ان کے حکم پر ہر کام کرتے ہیں۔

فضل الحق نے مسلم رائے عامہ میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کیلئے ساہوکارہ بل، کلکتہ میونسپل ترمیمی بل اور ثانوی تعلیمی بل کا سہارا لیا

ہال ویل تحریک کے اس طرح ختم ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اس دوران کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ مل کر بنگال میں ''قومی حکومت'' بنانے کا خیال ترک کر دیا تھا اور اس نے اپنی وزارت کو برقرار رکھنے کے لئے پھر اس مسلم رائے عامہ کی حمایت پر انحصار شروع کر دیا تھا جو آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ تھی۔ اس نے اس تحریک کے دوران صوبائی اسمبلی سے ساہوکارہ بل منظور کرایا جس کا مقصد غریب کسانوں کو، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، ان مہاجنوں کے چنگل سے کسی حد تک آزاد کرانا تھا جو 25 سے لے کر 75 فیصد تک سود لیتے تھے اور اپنے سود و قرضہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں مقروضوں کی زمینیں ہتھیا لیتے تھے۔ یہ مہاجن غریب مقروضوں سے نسل در نسل اپنا قرضہ وصول کرتے تھے کیونکہ جب کوئی مقروض مر جاتا تھا تو اس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ داری خود بخود اس کے وارثوں کو منتقل ہو جاتی تھی۔ کانگرس اور مہاسبھا کی ہندو لیڈرشپ اس بل کی منظوری سے بہت سیخ پا ہوئی کیونکہ اس بل کی رو سے ساہوکار نہ صرف غریب کسانوں کی زمین ہتھیانے کے حق سے محروم ہو گئے تھے بلکہ ان کے مہاجنی استبداد پر مزید کئی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ مگر فضل الحق نے مفاد پرست ہندوؤں کے اس شور و غوغا کی پرواہ نہ کی اور مزید نوٹس دے دیا کہ اسمبلی کے اس اجلاس میں کلکتہ میونسپل ترمیمی بل اور بنگال ثانوی تعلیمی بل پیش کئے جائیں گے۔ اس نے یہ نوٹس اس حقیقت کے باوجود دیئے تھے کہ جب اکتوبر 1937ء اور اپریل 1938ء میں اس نے اسمبلی میں اس مضمون کے بل پیش کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تو سوبھاش چندر بوس، امرت بازار پتریکا اور ہندوستان سٹینڈرڈ وغیرہ نے اس کی وزارت کے خلاف اعلان جنگ کر کے بنگال کے ہندو نوجوانوں کو کھلم کھلا پر تشدد ایجی ٹیشن جاری کرنے پر اکسایا تھا۔ اب جولائی میں جب یہ بل اسمبلی میں پیش کئے گئے تو ہندو لیڈروں اور اخبارات نے اس سلسلے میں وہی اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا۔

4/اگست کو ہندو مہاسبھا کے زیر اہتمام کلکتہ میں یوم احتجاج منایا گیا۔ اس مقصد کے لئے شردھانند پارک میں جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے

کہا کہ ''آج کل جبکہ یورپ میں جنگ ہو رہی ہے اور ساری مہذب دنیا میں خلفشار ہے، یہاں فضل الحق کی حکومت نے بنگالی ہندوؤں کے خلاف رجعت پسندانہ کاروائی شروع کر دی ہے۔ صوبائی حکومت کی عام پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کو کمزور کر دیا جائے۔ اس نے کہا کہ ثانوی تعلیمی بل کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کی تعلیم پر گورنمنٹ کی گرفت مضبوط ہو جائے اور اس کا انتظام ایک ایسی مجلس کے سپرد کیا جائے جو جماعتی لائن پر قائم کی جائے گی۔ اس سے ہندوؤں کو نقصان پہنچے گا کیونکہ 99 فیصد ہائی اسکول جو اس بل کی زد میں آئیں گے ہندوؤں کی امداد سے قائم ہیں اور جو تین لاکھ طلبا زیر تعلیم ہیں ان میں 75 فیصد ہندو فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔''[17]

ہندو مہا سبھا کا یہ ''یوم احتجاج'' عملاً حق وزارت کے لئے ''یوم حمایت'' کی حیثیت رکھتا تھا کہ ہندوؤں کے اس فرقہ پرستانہ واویلا کے پیش نظر، بنگال کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت اسی طرح حق وزارت کی حمایت میں متحد ہو گئی جس طرح وہ 1937ء، 1938ء اور 1939ء میں تھی۔ کلکتہ کا مسلم لیگی اخبار عصر جدید بھی جو کہ جون 1940ء میں مسلم لیگ ہائی کمان سے بار بار مطالبہ کرتا تھا کہ فضل الحق کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے، اب پھر ''شیر بنگال'' کا پرزور حامی بن گیا تھا۔ اس اخبار کا 7/اگست کو ہندو مہا سبھا کے ''یوم احتجاج'' پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''ہندو لیڈروں کے نزدیک مسلمان تنگ نظر ہیں، متعصب اور جماعت پرور ہیں۔ وطنیت کے دشمن ہیں۔ نیشنلزم سے ان کو دور کا واسطہ نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس ملک میں اپنا حصہ مانگتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اس ملک کے ویسے ہی باشندے ہیں جیسے دوسرے ہیں۔ لہٰذا یہاں کی حکومت، یہاں کی دولت اور یہاں کے سرمایہ میں ہمارا حصہ بھی ہونا چاہیے۔ کچھ ہمارے حقوق بھی ہیں جو ہم کو ملنے چاہئیں لیکن اگر ہندو یہی سب کچھ کہیں تو بھی وہ نیشنلسٹ ہیں۔ ہندو لیڈروں کی منطق یہی ہے۔ کانگرس، مہا سبھا اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی دوسری جماعتوں کی منطق یہی ہے، بنگال کے تمام مراکز پر اونچی ذات کے ہندو قابض ہیں۔ سرکاری ملازمتیں ان کی، تجارتی ادارے ان کے، زمینداری ان کی، یونیورسٹی ان کی، کارپوریشن ان کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ملک کی دولت سے استفادے کے جتنے وسائل ہیں ان پر اونچی ذات کے ہندو قابض ہیں اور مسلمانوں کو ہر طرح ان وسائل سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کو بھی ان سے استفادہ کرنے کی اجازت دی جائے تو تمام ہندو اخبارات اور لیڈر بیک زبان شور کر

دیتے ہیں کہ یہ کمیونل ازم ہے، یہ جماعت پروری ہے اور یہ نیشنل ازم کے خلاف ہے۔ کچھ دن ہوئے بنگال کے کسانوں کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے ایسے قوانین بنائے گئے جن سے ان کو قدرے آرام ملا تو بنگال کی ہندو دنیا برہم ہوگئی۔ کلکتہ کارپوریشن میں مسلم حقوق کی پامالی کو دور کرنے کے لئے اس ادارہ کی اصلاح کی خاطر ایک مسودہ تیار کیا گیا تو ہندوؤں نے آسمان وزمین سر پر اٹھالیا۔ مہاجنی بل پیش کیا گیا تو ایک طوفان کھڑا کیا گیا اور مہاجنوں کی حمایت میں یورپین گروپ سے مدد لینے کی کوشش کی گئی۔ اس بل کو کمیونل قرار دیا گیا۔ مجوزہ ثانوی تعلیمی بل میں ہندو۔ مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے لیکن اس بل کی بھی مخالفت کی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ یہ نیشنل ازم کے خلاف ہے۔ نیشنل ازم کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں کسی مذہبی فرقے، طبقے کی بجائے ملک کے تمام باشندوں کے مفاد کا یکساں خیال کیا جائے۔ مگر ہندو لغت میں نیشنل ازم کے معنی صرف ہندو مفاد کی نگرانی اور دوسرے فرقوں کے مفاد کی پامالی ہے۔ اگر اس کے خلاف ہو تو کمیونل ازم ہے۔ ہمیں واضح الفاظ میں اعلان کردینا چاہیے کہ کلکتہ یونیورسٹی ایک ہندو ادارہ ہے۔ اس کے ملازمین اور اس کے ممتحنوں کی فہرستیں دیکھئے۔ اس کی تالیفات سے نفع حاصل کرنے والوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں مسلمان دال میں نمک سے بھی کم ہیں۔ ہم اس کو بھی برداشت کر لیتے لیکن اس یونیورسٹی نے اپنی تالیفات میں مسلم کلچر اور مسلم خصوصیات کو ضائع کرنے، مسلم طلبا میں ہندو ذہنیت پھیلانے اور انہیں اسلام سے دور رکھنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ یہ حالت ناقابل برداشت ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ ہم کسی کے حق پر غاصبانہ قبضہ نہیں کرنا چاہتے لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی اولاد کو ہندو تعلیم دلوانا نہیں چاہتے اور اپنے کلچر کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم اس حالت کو بدل ڈالنا چاہتے ہیں اور اس تبدیلی کے لئے ثانوی تعلیمی بل کم از کم پہلی کوشش ضرور ہے جس کی مخالفت خود غرض اشخاص کر رہے ہیں۔''[18]

کلکتہ میونسپل ترمیمی بل اور ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کے خلاف کانگرس اور ہندو مہاسبھا کا سخت احتجاج .... ہندو۔ مسلم تنازعہ میں شدت

ہندو مہاسبھا کے یوم احتجاج اور عصر جدید کے اس اداریے سے ظاہر تھا کہ سوبھاش چندر بوس کی ہال ویل تحریک نے ہندو۔ مسلم اتحاد اور رواداری کی جو فضا پیدا کی تھی وہ بالکل

عارضی تھی۔ بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد کی جڑیں بہت ہی گہری تھیں۔ یہ فرقہ وارانہ تضاد ہال ویل تحریک جیسی کھوکھلی سیاسی شعبدہ بازی سے حل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس تضاد کی اصل بنیاد یہ تھی کہ مسلمانان بنگال تاریخی وجوہ کی بنا پر اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق سے بری طرح محروم ہو چکے تھے۔ انہیں اس سلسلے میں کچھ ٹھوس رعایتیں دیئے بغیر ہندو۔ مسلم اتحاد کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا تھا لیکن اونچی ذات کے مراعات یافتہ ہندو عناصر اپنے مفادات سے رتی بھر بھی دست کش ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے اور وہ نیشنل ازم، سیکولرزم، سامراج دشمنی، مکمل آزادی اور جمہوریت کے نعرے لگا کر مفلوک الحال مسلمانوں کے ہر مطالبہ کو رجعت پسندانہ اور فرقہ پرستانہ قرار دیتے تھے۔ ان کے اسی مفاد پرستانہ، متکبرانہ اور جاہلانہ رویے نے جولائی 1937ء کے بعد مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنا دیا تھا، ان کے اسی رویے نے بمبئی کے ایک خلوت پسند اسماعیلی خوجہ وکیل محمد علی جناح کو مسلمانان ہند کے قائد اعظم کی شاندار عوامی مسند پر بٹھا دیا تھا، ان کے اسی رویے نے مارچ 1940ء میں قرارداد لاہور منظور کرائی تھی اور اب ان کا یہی رویہ اس قرارداد کی تکمیل کے لئے بڑی تیزی سے راستہ ہموار کر رہا تھا۔

10/اگست 1940ء کو بنگال کانگرس پارٹی نے بھی ہندو مہا سبھا کی طرح متذکرہ مسودات بل یعنی کلکتہ میونسپلٹی کا دوسرا ترمیمی بل اور بنگال ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کے خلاف یوم احتجاج منایا۔ بنگال کانگرس اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر سنتوش کمار باسو کی زیر صدارت دیش بندھو پارک میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں قرارداد کے ذریعے صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ دونوں مسودات بل کو واپس لے لے کیونکہ یہ رجعت پسندانہ پالیسی پر مبنی ہیں۔ یہ قوم پرستی اور جمہوریت کے منافی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ میونسپل اور تعلیمی اداروں کو سرکاری کنٹرول میں لے لیا جائے۔ بنگال کانگرس اسمبلی پارٹی کے قائد سرت چندر بوس نے اس قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''صوبائی حکومت'' ان مسائل سے نمٹنے کی بجائے جو آج کل قوم کو درپیش ہیں، مجلس قانون ساز میں ایسے بل پیش کر رہی ہے جو قوم پروری کے خلاف ہیں۔ یہ وزارت صوبہ کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کام نہیں کر رہی بلکہ وہ ایسے کام کر رہی ہے جس سے صوبہ کی نیشنل ازم کے مفاد کو لازمی طور پر نقصان پہنچے گا۔''[19] سرت چندر بوس کی تقریر کا مطلب یہ تھا کہ صوبہ کے مفلوک الحال مسلمانوں اور دوسرے غریب لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام قوم کی

فلاح وبہبود کا کام نہیں ہے کیونکہ عصر جدید کے بقول ہندو لغت میں نیشنل ازم کا مطلب صرف 15 فیصدی اونچی ذات کے ہندوؤں کے مفادات کی نگرانی اور دوسرے فرقوں کے مفادات کی پامالی تھی۔ بوس کی رائے میں مہاجنی بل بھی رجعت پسندانہ تھا کیونکہ اس کے ذریعے غریب کسانوں کو اونچی ذات کے ہندو ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلانے کی تھوڑی سی کوشش کی گئی تھی۔ وہ ثانوی تعلیمی بورڈ کے بل کو رجعت پسند اور قوم دشمن سمجھتا تھا کہ اس کے ذریعے صوبہ کی ثانوی تعلیم پر سے کلکتہ یونیورسٹی کے مٹھی بھر اونچی ذات کے ہندوؤں کے کنٹرول کو ختم کرنے کے ارادے کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ کلکتہ میونسپل ایکٹ کے ترمیمی بل کو قوم پروری کے منافی کہتا تھا کیونکہ اس بل کے تحت کارپوریشن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دینے کی تجویز تھی۔ یہ سرت چندر بوس اس سوبھاش چندر بوس کا بھائی تھا جس نے کارپوریشن کے میئر کے انتخاب کے سلسلے میں مسلمان کونسلروں سے سمجھوتہ کر کے اور پھر ہال ویل تحریک چلا کر خود ہی یہ باور کر لیا تھا کہ اس طرح وہ بنگال میں ہندو۔ مسلم تنازعہ کو ختم کر دے گا۔ مگر ان دنوں اس فرقہ وارانہ تضاد کی شدت کی حالت یہ تھی کہ شاید ہی کوئی ہندو یا مسلمان لیڈر عملاً فرقہ واریت سے بالاتر تھا۔ کانگرس میں سردار پٹیل جیسے بے شمار ہندو لیڈر ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی جیسے ''قوم پرستوں'' کو بھی ''فرقہ پرست'' قرار دیتے تھے اور مسلم لیگ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو یہ کہتے تھے کہ ہندوؤں کی نیشنل ازم کا مطلب صرف ہندو فرقہ پرستی ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کا مطلب ہر شعبۂ زندگی میں ہندو غلبہ ہے اور بوس برادران سمیت ہر ہندو، زبان سے خواہ کچھ ہی کہے، عملاً وہ نہایت متعصب فرقہ پرست ہی ہوتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو سوشلسٹ یا ہندو کمیونسٹ بھی پہلے ہندو اور پھر سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہوتا ہے اور اس قسم کی ساری باتیں صداقت سے سراسر خالی نہیں ہوتی تھیں۔

17 راگست کو کانگرس اور ہندو مہا سبھا نے پھر پورے بنگال میں یوم احتجاج منایا اور جلسوں میں یہ اعلان کیا کہ تعلیمی بل کا مسئلہ بنگالی ہندوؤں کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے اس لئے وہ اس بل کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ امرت بازار پتریکا نے اس یوم احتجاج پر اسی لب ولہجہ میں تبصرہ کیا۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''اگر ہندو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اپنی الگ تھلگ تہذیب، تمدن اور روایات کو مستحکم و برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں نہ صرف رجعت

پسند اور فرقہ وارانہ ذہنیت والی وزارت کی سرگرمیوں کے خلاف ایک آواز ہو کر احتجاج کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے بلکہ ان کو اس برائی کی جڑ تک جانا چاہیے جس نے وزارت کو یہ اختیارات دیئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کو حلف لینا چاہیے کہ وہ کمیونل ایوارڈ کو منسوخ کر کے یا اس میں بنیادی ترمیم و تنسیخ کرا کے دم لیں گے۔ شریرانہ آئینی نو ایجاد تدبیر جس نے محمڈن کمیونٹی کو نمائندگی میں بہت زیادہ حصہ دیا ہے اور ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم لوگوں میں غیر منصفانہ، معاندانہ اور ذلت آمیز فرق پیدا کر دیا ہے اسے واپس لینا ہوگا۔''[20] تاہم 22/اگست کو وزیر اعلیٰ فضل الحق نے صوبائی اسمبلی میں ثانوی تعلیمی ترمیمی بل پیش کر کے اس کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی پیش کی کہ یہ بل ایک 12 رکنی منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو 30/نومبر 1940ء کو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ چونکہ کانگرس پارٹی اور ہندو نیشنلسٹ پارٹی نے اس کمیٹی میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لئے اس میں ان پارٹیوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہوگا۔ اس نے بتایا کہ ''مجوزہ تعلیمی بورڈ کے ارکان کی تعداد پچاس ہوگی جن میں صدر کے علاوہ 22 ہندو، 20 مسلمان اور 7 یورپین ہوں گے۔ اس طرح ہندوؤں کو مسلمانوں سے زیادہ نمائندگی دی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں سے بے انصافی ہو رہی ہے۔'' وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کے بعد متعدد ہندو ارکان نے اس بل کو فرقہ پرستانہ اور رجعت پسندانہ قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے اسے اہل الرائے کے پاس بھیجا جائے۔ مولوی ابوالہاشم نے ہندوؤں کی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر رائے عامہ کے معنی صرف ان درباریوں کی رائے نہیں ہے جو کلکتہ یونیورسٹی پر کنٹرول کرتے ہیں یا ان کے مؤید اور سیاسی حلیف ہیں تو بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت اس دعویٰ میں قطعاً حق بجانب ہے کہ رائے عامہ اس کے ساتھ ہے۔ کانگرس اور مہا سبھائی پارٹی نے منتخب کمیٹی کا بائیکاٹ کر کے کوئی دانائی نہیں کی ہے۔ بعض حلقوں میں اس بل کو قوم پرستی اور جمہوریت کے منافی کہا گیا ہے اور یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد حکومت کو ثانوی تعلیم کی نگرانی کا آخری اختیار دے دینا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلقے ثانوی تعلیم کی نگرانی کے اختیارات صرف کلکتہ یونیورسٹی کو دینا چاہتے ہیں حکومت کو نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان دونوں میں کس کو ''قومی'' ہونے کا دعویٰ کرنے کا زیادہ حق حاصل ہے۔ کیا کلکتہ یونیورسٹی کے قومی ہونے کا دعویٰ صحیح ہے جو ایک ہندو واڑہ

ہے اور چند درباری جس پر قابض ہیں؟ یا حکومت کو یہ دعویٰ زیب دیتا ہے جو عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔'' [21] لیکن ابوالہاشم کی یہ دلیل صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اسمبلی میں کانگرس اور مہا سبھا نے منتخب کمیٹی کا بائیکاٹ جاری رکھا اور اسمبلی کے باہر تعلیم یافتہ ہندوؤں کی جانب سے اس بل کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور بنگال ہندو مہا سبھا کے نائب صدر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا اعلان یہ تھا کہ ''اگر اسمبلی نے ثانوی تعلیمی بل کی منظوری دے دی تو صوبہ کے ڈیڑھ ہزار ثانوی اسکولوں میں سے سارے ہندو طلبا کو نکال لیا جائے گا اور ان کی تعلیم کی نگرانی کے لئے ایک نئی ہندو یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔'' [22] ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا یہ اعلان پنجاب کے راجہ نریندر ناتھ، گنگا رام اور دوسرے سرمایہ دار ہندوؤں کے اس رویے کے عین مطابق تھا جس کے تحت انہوں نے لاہور میں ایک نیا ہندو میڈیکل کالج محض اس لئے قائم کیا تھا کہ سر فضل حسین نے بطور وزیر تعلیم سرکاری کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں مسلمان طلبا کے لئے 56 فیصد نشستیں مخصوص کر دی تھیں۔ گویا مسلم اکثریتی بنگال کے ہندوؤں کے تعلیم یافتہ اور مراعات یافتہ طبقے مسلم اکثریتی پنجاب کے تنگ نظر سرمایہ دار ہندوؤں کی طرح پسماندہ مسلمانوں کو تعلیمی ترقی کا کوئی موقع فراہم کرنا نہیں چاہتے تھے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے باوجود فرقہ پرستی کا الزام صرف مسلمانوں پر عائد کیا جاتا تھا۔

4 ستمبر کو صوبائی وزیر بلدیات نواب بہادر ڈھاکہ نے اسمبلی میں کلکتہ مونسپل ترمیمی بل پیش کر کے اسے بھی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کرنے کی تحریک پیش کی تو کانگرس پارٹی اور ہندو مہا سبھا نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ الزام وہی تھا کہ یہ بل رجعت پسندانہ اور حکومت کی فرقہ پرستی کا مظہر ہے۔ تاہم 82 کے مقابلے میں 127 ووٹوں کی اکثریت سے یہ بل بھی منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ کانگرس پارٹی اور مہا سبھا نے حسب سابق اس کمیٹی کا بھی بائیکاٹ کیا۔ اس بل کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کارپوریشن کے مختلف شعبوں اور کمیٹیوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی دی جائے۔ بالخصوص کارپوریشن کی ملازمتوں میں مسلمانوں کی عدم نمائندگی کا مسئلہ بہت شدید تھا اور مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے تحت صوبائی حکومت کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی اس شکایت کا کچھ ازالہ ہو جائے۔ بوس برادران، بالخصوص سوبھاش چندر بوس کلکتہ کارپوریشن کو اپنا نجی ادارہ تصور کرتے تھے کیونکہ سالہا سال سے اس پر ان کے گروپ کا غلبہ

تھا اور اس بنا پر شہر میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکتوبر 1937ء میں وزیر اعلیٰ فضل الحق نے کارپوریشن بل میں ترمیم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو سوبھاش چندر بوس نے ڈلہوزی سے یہ اعلان کیا تھا کہ ''اگر فضل الحق نے ایسا کیا تو ایسی ایجی ٹیشن اٹھاؤں گا جس کی نظیر اس نے اپنی عمر بھر میں بنگال میں نہیں دیکھی ہے۔'' سوبھاش چندر بوس کی رائے یہ تھی کہ ''مسلمانوں کی جانب سے کلکتہ کارپوریشن میں ملازمتوں کے کوٹے کے بارے میں جو مطالبہ کیا جاتا ہے اس کی بنیاد فرقہ پرستی پر ہے۔''

تاہم جب بوس کے اس اعلان جنگ کے باوجود 6 رستمبر 1940ء کو جبکہ وہ ڈیفنس آف آل انڈیا رولز کے تحت نظر بند تھا، صوبائی حکومت نے یہ بل پیش کر ہی دیا تو کلکتہ کے مسلمانوں کی ایک دیرینہ شکایت کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر آنے لگی۔ عصر جدید کا اس بل پر تبصرہ یہ تھا کہ ''سالہا سال سے کارپوریشن کے خلاف مسلمانوں کو شکایت ہے کہ انہیں اپنے حصہ رسدی کے مطابق ملازمتیں نہیں مل رہی ہیں۔ مسلمانوں نے بہت ہی زیادہ احتجاج کیا مگر کارپوریشن نے پرکاہ برابر توجہ نہیں کی۔ لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ایک آزاد ادارہ قائم کیا جائے جو ملازمتوں کے مسئلہ کو قانون اور اصول کے مطابق طے کر سکے۔ فی الحال اس مشکل کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک سروس کمیشن قائم کر دیا جائے جو کونسلروں سے آزاد ہو۔ جب تک کونسلروں سے یہ کمیشن آزاد نہ ہوگا اس سے ہرگز انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ مسلمانوں کا تجربہ یہی کہتا ہے۔''[23]

مسلمانوں کے اس تلخ تجربے کا ایک اور ثبوت 15 رنومبر 1940ء کو مل گیا جبکہ امپروومنٹ ٹریبونل کے ایک اسیسر (Assessor) کے تقرر کے مسئلہ پر کارپوریشن میں بوس گروپ اور مسلم لیگ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ سوبھاش چندر بوس جو اس زمانے میں نظر بند تھا اور 29 راکتوبر کو ڈھاکہ ڈویژن کے ایک ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا، اس عہدے کے لئے خود امیدوار تھا۔ مگر جب رائے شماری ہوئی تو مسلم لیگی امیدوار عبدالستار کو کثرت رائے سے یہ عہدہ دے دیا گیا۔ ٹریبونل کا اجلاس مہینہ میں پندرہ بیس دن ہوتا تھا اور فی اجلاس اسیسر کو 75 روپے یومیہ ملا کرتا تھا۔ عبدالستار کی یہ کامیابی یورپین گروپ کی حمایت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ یہ گروپ جنگ کے زمانے میں بوس کی تشدد پسندی کے خلاف تھا۔

کارپوریشن میں مسلم لیگ اور یورپین گروپ کے اس اتحاد سے بنگال ہندو مہا سبھائی لیڈروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اگر اس اتحاد کا دائرہ وسیع اور پائیدار ہو گیا تو بنگالی ہندوؤں کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ چنانچہ 16 نومبر کو کرشن نگر میں بنگال ہندو مہا سبھا کا نواں سالانہ اجلاس ہوا تو سبھا کے صدر سر منمتھا نند مکر جی اور دوسرے لیڈروں نے بنگالی ہندوؤں کی حالت زار کا بہت واویلا کیا۔ مکر جی کا موقف یہ تھا کہ ''جب 1905ء میں ہندوؤں کی سیاست کی باگ ڈور بنگالی ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل کر مغربی ہندوستان کے ہندوؤں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی تو اس کے بعد سے بنگالی ہندوؤں کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی ہے۔ بنگال کے ہندوؤں میں اتنی طاقت نہیں رہی ہے کہ وہ اپنے مفاد کی حفاظت کر سکیں۔ وہ آزادی سے مذہبی رسوم بھی ادا نہیں کر سکتے ہیں اور ہندو عورتیں آزادی کے ساتھ ان بستیوں میں چل پھر بھی نہیں سکتی ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ بنگال کے ہندوؤں کے لئے سرکاری ملازمت حاصل کرنا دشوار ہو گیا ہے حتیٰ کہ تعلیمی مرکزوں میں فرقہ وارانہ اثرات داخل ہو رہے ہیں۔ ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی مراکز کو آباد کریں، جسمانی قوت پیدا کریں اور غیر فوجی قوم کی پوزیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیں کیونکہ جب کبھی بھی اور جہاں بھی بنگالی ہندوؤں کو موقع دیا گیا انہوں نے میدان جنگ میں سپاہیانہ صلاحیت کو ثابت کر دیا ہے۔'' مکر جی کا مزید موقف یہ تھا کہ ''بنگالی ہندوؤں کی اس زبوں حالی کی ذمہ داری کانگرس پر عائد ہوتی ہے۔ جس نے پہلے 1916ء میں مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے میثاق لکھنو پر دستخط کئے اور پھر اب ایسا کمیونل ایوارڈ منظور کیا ہے جس کے تحت بنگالی اچھوتوں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی گئی ہیں اور اس نے بنگالی ہندوؤں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔'' اس اجلاس کے لئے آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر ساورکر کا پیغام یہ تھا کہ ''بنگال کے ہندوؤں کو چاہیے کہ بنگال میں جو عملاً سارے ہندوستان کا ذہنی لیڈر رہا ہے، متحد و منظم ہو کر رہیں اور ہندومت اور ہندو کلچر کو برقرار رکھیں لیکن ایسا مؤثر طور سے نہیں ہو سکتا جب تک ہندو مہا سبھا صوبائی حکومت پر قبضہ نہ کرے اور جب تک پبلک زندگی کو مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے نظریے سے نجات نہ دلا دی جائے۔ اب بھی بہت وقت ہے کہ ہندو مسلح ہو اور اپنے ملک کے دفاع کے لئے تیار ہو جائے۔''[24]

جب بنگال ہندو مہا سبھا کا یہ اجلاس ہوا، اس سے دو ماہ قبل جرمنی، اٹلی اور جاپان کے

درمیان دس سالہ معاہدہ ہو چکا تھا جو اس امر کی علامت تھا کہ جاپان عالمی جنگ میں شریک ہونے ہی والا ہے جبکہ جرمنی کی ہوائی فوج ہر روز برطانیہ پر بمباری کر رہی تھی۔ انڈین نیشنل کانگرس نے برطانیہ کی جنگی مساعی میں امداد کی شرط کے طور پر جولائی 1940ء میں ایک ذمہ دار مرکزی قومی حکومت کے قیام کا جو مطالبہ کیا تھا وہ اس سے دستبردار ہو کر اکتوبر میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کر چکی تھی اور حکومت ہند اس صورت حال کے پیش نظر بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق، وزیر خزانہ حسین شہید سہروردی اور وزیر داخلہ سر ناظم الدین سے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ صوبائی حکومت صوبہ میں پٹ سن کی خود خریداری کرے گی کیونکہ اس نقد آور فصل کا بھاؤ بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے صوبہ کے کسانوں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ بنگال کے ہندو مہاسبھا کے لیڈر اس قومی اور بین الاقوامی صورت حال سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ انہیں بجا طور پر خطرہ تھا کہ اگر کانگرس کی محاذ آرائی کی پالیسی کی وجہ سے مسلم لیگ اور انگریزوں میں کوئی مفاہمت ہو گئی تو بنگال کے ہندو ان بے پناہ مراعات سے بتدریج محروم ہو جائیں گے جو انہیں 1757ء کے بعد سے حاصل تھیں۔ پھر جب 5/دسمبر کو سوبھاش چندر بوس کو رہا کر کے اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا تو مہا سبھائی لیڈروں کا یہ خطرہ اور بھی سنگین ہو گیا۔ مگر 17/جنوری 1941ء کو یہ خطرہ ٹل گیا جبکہ بوس اپنے گھر سے فرار ہو کر براستہ افغانستان پہلے برلن اور پھر ٹوکیو پہنچ گیا۔ بوس تشدد پسند تھا۔ اسے جولائی 1940ء میں ہال ویل تحریک کے دوران سازش کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اس پر فروری 1941ء میں مقدمہ چلنے والا تھا۔ اس نے 29/نومبر سے جیل میں بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ انگریزوں نے اسے رہا تو اس لئے کیا تھا کہ اس کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے صوبہ میں کوئی بدامنی نہ ہو لیکن مہاسبھائی لیڈروں کا خیال تھا کہ کہیں اس کی رہائی بنگالی ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان پر تشدد محاذ آرائی کا باعث نہ بن جائے۔

باب: 7

فضل الحق کی جناح سے بغاوت اور لیگ پرجا مخلوط حکومت کے چار سالہ دور کا خاتمہ

فضل الحق نے جناح کو تجویز پیش کی کہ کانگرس کے ساتھ مصالحت کی بات چیت کی جائے

عالمی جنگ میں جاپان کی شمولیت کا خطرہ پیدا ہوتے ہی 1940ء کے اواخر میں جبکہ کانگرس اس صورتحال میں انگریزوں پر مزید دباؤ بڑھانے کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی چکی تھی، انگریزوں نے بنگال میں امن عامہ کی صورت حال بہتر بنانے کی خاطر سوبھاش بوس کو 5ر دسمبر کو رہا کر کے گھر میں نظر بند کیا تھا اور غالباً انگریزوں ہی کے اشارہ پر اسی روز (5ر دسمبر 1940ء) کو بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے ایک بیان میں صدر مسلم لیگ قائد اعظم محمد علی جناح سے اپیل کی کہ وہ کانگرس کے ساتھ مصالحت کی بات چیت کی تجویز پر غور کرنے کے لئے مرکزی مجلس عاملہ کا بلا تاخیر اجلاس بلائیں۔ جناح نے فضل الحق کے اس بیان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ البتہ انہوں نے 6ر دسمبر کو بمبئی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”اگر کانگرس آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کا راستہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دونوں فرقے دو علیحدہ وحدتوں کی حیثیت میں زندہ رہنے پر اتفاق کر لیں۔ پاکستان ہی آزادی کا واحد راستہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جن منطقوں میں مسلمانوں کی حکومت ہوگی، وہاں کی اقلیتوں کو کسی طرح مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ان کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی زبان، اپنا طرز معاشرت اور اپنا مذہب برقرار رکھیں۔ ہندو منطقوں میں بھی مسلم اقلیت کی حالت پاکستان اسکیم کے تحت بہتر ہو

جائے گی کیونکہ ایسی صورت میں ہندوا کثریت میں جوابی تعاون ہوگا۔نو کروڑ مسلمان آج جس چیز کے لئے شور کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور شمال مشرقی ہندوستان میں ان کی علیحدہ حکومتیں ہونی چاہئیں جہاں وہ خود اپنے امور کا انتظام کر سکیں۔ مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے لیکن جب تک کانگرس ہائی کمان کے دماغ میں سے اکثریت کی حکومت کا خیال نہیں جائے گا، جماعتی مسائل کا تصفیہ نہیں ہوسکتا ہے۔''[1]

لیکن جناح کی اس تقریر سے فضل الحق متاثر نہ ہوا حالانکہ وہ خود قرارداد پاکستان کا محرک تھا۔ اس نے صدر مسلم لیگ کی اس تقریر کے اگلے دن 7 دسمبر کو ایک اور بیان میں مرکزی مسلم لیگ کونسل کے ممبروں سے درخواست کی کہ'' وہ لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے لئے جناح پر زور ڈالیں کیونکہ موجودہ حالات میں دو اہم نکات کے بارے میں فیصلہ ضروری ہے۔ اول یہ کہ کس طرح جنگ جیتنے کے لئے ہندوستان کے تمام ذرائع کو بروئے کار لایا جائے اور دوم یہ کہ ہندوستان کے باشندوں کی خواہش کی تکمیل کی غرض سے ہندوستان کے دستور اساسی میں بڑی تبدیلی ہونی چاہیے۔ ان دونوں مقاصد میں سے کوئی ایک بھی حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مختلف جماعتیں نہ صرف دائرۂ عمل کے لئے بلکہ اسکیم کی تفصیلات کے متعلق کسی سمجھوتہ پر نہ آ جائیں۔''
فضل الحق کے ان بیانات کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت تک مطالبہ پاکستان کو حتمی نہیں سمجھتا تھا بلکہ وہ اسے کانگرس سے سیاسی سودابازی کے لئے ایک تدبیری حربہ خیال کرتا تھا۔ اس کے ان بیانات سے قبل پنجاب کا وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان بھی 29 ستمبر کو ایک بیان میں اعلان کر چکا تھا کہ ''پاکستان کی اسکیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس سلسلے میں اس کے خلاف ''غلط، بے جواز اور شرانگیز'' الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔''

فضل الحق نے جون 1940ء میں شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کرنے کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد کے حق میں بیانات دینے شروع کئے تھے اور اب بھی اس نے دہلی میں وائسرائے سے ملاقات کے بعد مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سمجھوتے کی باتیں کرنا شروع کی تھیں۔ دونوں مواقع پر اس کے اس رویے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انگریز، صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کو ہندوستان کی ایک اہم مسلم شخصیت تو تسلیم کرتے تھے لیکن وہ انہیں مسلمانان

ہند کا واحد اور مطلق العنان لیڈر ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ سے براہ راست رابطہ قائم کر کے جناح کو احساس دلاتے تھے کہ اگر وہ جنگی مساعی میں بھرپور تعاون نہ بھی کریں تو بھی انہیں دونوں صوبوں کے مسلمانوں کا تعاون حاصل رہے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جاپان کی عالمی جنگ میں شرکت کے امکان کے پیش نظر بنگال کا علاقہ جنگی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ ان کی جنگی مصلحت یہ تھی کہ اس علاقے میں کم از کم جنگ کے دوران کوئی فرقہ وارانہ بدامنی نہ ہو اور یہاں کے ہندو اور مسلمان متحد ہو کر ان کی جنگی تیاریوں میں بھرپور امداد و تعاون کریں اور فضل الحق پنجاب کے سر سکندر حیات خان کی طرح ان کی اس مصلحت کا تقاضا بہر صورت پورا کرنے پر آمادہ تھا۔

انگریز اس زمانے میں بنگال میں ہندو۔ مسلم اتحاد کے اس قدر متمنی تھے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک مشہور و معروف کمیونسٹ لیڈر ایم۔ این۔ رائے کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ رائے نے 1940ء کے اواخر اور 1941ء کے اوائل میں صوبہ میں کئی پبلک جلسوں میں تقریریں کر کے کانگرس کی سول نافرمانی کی پالیسی کی مذمت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر فاشزم کا مقابلہ کریں۔ مگر جب فروری 1941ء صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو انگریزوں کی اس تمنا پر پھر ضرب کاری لگی جبکہ ہندو ارکان اسمبلی نے ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کے مسئلہ کو ہندو۔ مسلم مسئلہ بنانے پر اصرار کیا۔ اسمبلی کا یہ سیشن شروع ہونے سے چند دن قبل 25 جنوری 1941ء کو کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ کثرت رائے سے مطالبہ کر چکی تھی کہ اس بل کو واپس لے لیا جائے کیونکہ یہ رجعت پسندانہ ہے۔ سینیٹ کی رائے یہ تھی کہ اگر تعلیم کے شعبے کو جماعتی سیاسیات کے اثر سے محفوظ نہ رکھا گیا تو اس میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ صوبہ میں ثانوی تعلیم کی ترقی زیادہ تر غیر سرکاری کوششوں کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔ حکومت اس شعبہ کا صرف 15 فیصد خرچ برداشت کرتی ہے لہٰذا وہ اس کی اصلاح کے لئے رائے عامہ کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی مجاز نہیں۔ مجوزہ ثانوی تعلیمی بورڈ کو عوام کے ایک بڑے حصے کا اعتماد حاصل نہیں ہو گا۔ اس کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں ہو گی اور یہ آزادی سے اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکے گا۔"

جب یونیورسٹی سینیٹ نے یہ قرارداد منظور کی تھی اس وقت اس بل کا مسودہ اسمبلی کی منتخب کمیٹی کے سپرد تھا جسے 30 نومبر 1940ء تک اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی مگر وہ بااثر ہندوؤں

کے دباؤ کے تحت ایسا نہیں کر سکی تھی اور اب تجویز یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق، کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، سر بیجائے پرشاد سنگھ رائے اور ڈاکٹر بی۔سی۔رائے سے گفت و شنید کر کے مفاہمت کی کوئی راہ تلاش کرے گا۔مگر 7رفروری 1941ء کو آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ کے رکن این۔سی۔چیٹر جی نے اس امر کا امکان ختم کر دیا جبکہ اس نے باریسال ڈسٹرکٹ ہندو کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ثانوی تعلیمی ترمیمی بل اور کلکتہ میونسپل ترمیمی بل کے مسودات کو ''رجعت پسندانہ، قوم دشمن اور شر انگیز'' قرار دے کر کہا کہ اگر بنگال کے ہندو اپنی سیاسی ثقافتی اور معاشی زندگی کو محفوظ رکھنے کا عزم رکھتے ہیں تو انہیں سامراجیت اور کمیونزم دونوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیے۔اس نے کہا کہ بنگال کی وزارت کی اس پالیسی کی مہذب دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ یہاں کے ہندوؤں کو بالجبر کمزور کیا جائے۔اس کی یہ پالیسی حقیقتاً طبقاتی جنگ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔''[2] اس کانفرنس کے دن باریسال میں محرم کے جلوس کے دوران ہندو۔مسلم فساد ہو گیا جس میں ایک مسلمان اور چار ہندو زخمی ہو گئے۔ فریقین کی طرف سے لاٹھیاں اور ڈنڈے استعمال کئے گئے اور رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ 10رفروری کو کلکتہ کے راجہ بازار میں بھی محرم کے جلوس میں ہنگامہ ہوا اور پولیس کو مشتعل ہجوم پر قابو پانے کے لئے لاٹھی چارج کرنا پڑا۔

مردم شماری کے موقع پر ہندو۔مسلم فسادات اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ

ان فرقہ وارانہ اشتعال انگیزیوں اور جھگڑوں کو مردم شماری کے کام نے بھی خاصی ہوا دی جس کی بنا پر ڈھاکہ اور کھلنا کے اضلاع میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔مردم شماری کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی فرقوں کے مقامی لیڈروں کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ وہ سیاسی مقاصد کے تحت اپنے اپنے فرقہ کی آبادی کا جتنا ہو سکے جعلی اندراج کرائیں۔شریمتی ہیما پراوا موزمدار اور دوسرے لیڈروں کا الزام یہ تھا کہ حق وزارت کے بعض مسلمان وزرا مردم شماری میں جعل سازی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس الزام کے جواب میں فضل الحق کا کہنا یہ تھا کہ مردم شماری کے بارے میں ہندو لیڈروں کی تحریک ان کی فرقہ پرستی کی مظہر ہے۔''میرے پاس اس امر کی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ یہ لوگ اپنے فرقہ کی آبادی کے اندراج میں مبالغہ آمیزی

کرتے ہیں۔ انہیں احساس نہیں کہ یہ کھیل کس قدر خطرناک ہے۔ پبلک ریکارڈ کو اس طرح خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہندوؤں کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں گے تو کمیونل ایوارڈ کو ختم کرا سکیں گے۔ ان کی یہ تحریک احمقانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کمیونل ایوارڈ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائی کر کے اس ملک کو تباہ و برباد کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔''[3]

''مردم شماری کی یہ لڑائی'' فضل الحق کی اس تقریر کے بعد بھی کئی دن تک جاری رہی۔ دونوں فرقوں کے لیڈر تقریروں اور بیانات کے ذریعے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہے۔ فضل الحق نے یکم مارچ 1941ء کو اپنی ایک تقریر میں اپنے اس الزام کا اعادہ کیا کہ ہندو وکلا اور دوسرے تعلیم یافتہ عناصر مردم شماری کے کام میں بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ''اگر بنگال میں بددیانتی کی کامیابی ہوگئی تو میں یقیناً پاکستان کے حق میں فیصلہ کروں گا۔ اس پر 6/مارچ کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ہندوؤں کا ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس کے کنوینرز سر پنیری پیندرا ناتھ سرکار، سر بی۔ سی۔ رائے، سر منمتھا ناتھ مکرجی، سر نیل رتن سرکار، سرت چندر بوس، ڈاکٹر بدھان چندر رائے، نلنی رنجن سرکار، کرن شنکر رائے، ڈاکٹر میگھ نند سنہا اور ٹی۔ سی۔ گوسوامی تھے۔ جلسہ میں سر نری پیندر ناتھ سرکار نے اپنی صدارتی تقریر میں مردم شماری کے بارے میں وزیر اعلیٰ فضل الحق کے مبینہ فرقہ پرستانہ رویے پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ اگر فضل الحق ہندوؤں کے خلاف مردم شماری کے بارے میں بے بنیاد الزام تراشی سے باز نہیں رہ سکتا تو اسے اپنے عہدے سے علیحدہ ہونا چاہیے۔[4]

ڈھاکہ اور کھلنا میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ اس جلسے کے بعد بھی جاری رہا۔ ڈھاکہ کی 21/مارچ 1941ء کی اطلاع کے مطابق وہاں 20 افراد ہلاک ہوئے اور 125 زخمی ہوئے تھے۔ 22/مارچ کو بھی شہر میں اکا دکا وارداتیں ہوئیں تو مقامی مسلم لیگ نے حکومت کے کہنے پر 23/مارچ کو یوم پاکستان منانے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ 24/مارچ کو مزید دو زخمی افراد کو ہسپتال میں داخل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک ہلاک شدگان کی تعداد 28 اور زخمیوں کی تعداد 157 تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے اس فساد کی خبروں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پورے شہر میں منادی کرا کر لوگوں کو متنبہ کیا کہ اگر

آئندہ کسی علاقہ میں فساد کی واردات ہوگی تو اس علاقے کے لوگوں پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا اعلان یہ تھا کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے نومبر میں وائسرائے سے ملاقات کے بعد فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کی جو دوسری مرتبہ تجویز پیش کی تھی وہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے برعکس فرقہ وارانہ کشیدگی وخونریزی بڑھتی ہی چلی گئی اور اپریل میں چٹا گانگ، نواکھلی اور میمن سنگھ کے اضلاع بھی فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آ گئے جبکہ ڈھاکہ اور نارائن گنج میں چھرا گھونپنے کی وارداتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

8/اپریل 1941ء کو بنگال کونسل (ایوان بالا) کے ایک کانگرسی رکن کامنی کمار دتہ نے ڈھاکہ کے فرقہ وارانہ فسادات پر بحث کرنے کے لئے تحریک التواء پیش کی۔ اس نے اپنی تقریر میں الزام عائد کیا کہ ڈھاکہ اور اس کے گردونواح میں ہندوؤں پر مظالم کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے بہت سے ہندوتری پورہ ریاست میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ”یکم اپریل کو ہندوؤں کے تین دیہات لوٹے گئے اور ان کو آگ لگا دی گئی۔ دو اپریل کو رات کے وقت دو دیہات پر حملہ کیا گیا اور انہیں آگ لگا دی گئی۔ یہ ڈھاکہ جنگل کے علاقے نہیں ہیں جیسا کہ حکومت نے اپنے سرکاری اعلان میں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ علاقے ضلع کے سب سے خوشحال علاقے ہیں اور ڈھاکہ سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے تری پورہ ریاست میں بے شمار ہندو شرنارتھیوں کی حالت زار کا خود معائنہ کیا ہے۔ ان شرنارتھیوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے گریجوایٹ اور معاشرے کے دیگر باعزت افراد مثلاً یونین بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اراکین، تاجر، زمیندار اور بڑے کاشتکار بھی شامل ہیں۔“ کونسل کے ایک کانگرسی رکن للت چندرداس نے اس تحریک کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”جو کچھ ہوا وہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کے لئے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ موجودہ وزارت کو توڑ دیا جائے اور نیشنلسٹ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک نئی حکومت تشکیل دی جائے۔“ وزیر مال سربیجائے پرشاد سنگھ رائے نے جوابی تقریر میں اس الزام کی تردید کی کہ ان فسادات کا سبب یہ تھا کہ حکومت نے ملاؤں اور دوسرے شرانگیز عناصر کو اشتعال انگیز کاروائیاں کرنے کی چھٹی دے رکھی تھی...... حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے اس سلسلے

میں کوئی غفلت نہیں کی۔ جونہی حکومت کو ہنگاموں کی خبر ملی ان کے فرو کرنے کے اقدامات میں کوئی تاخیر نہیں کی گئی۔ اس نے کہا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ گورنر کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بعض دفعات کے تحت مداخلت کرنی چاہیے لیکن یہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب کانگرسی صوبوں میں ایسی ہی صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ کیا انہوں نے اس وقت یہ تجویز پیش کی تھی کہ گورنر کو خود ان صوبوں کی انتظامیہ کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہیے۔ وزیر مال کی اس تقریر کے بعد تحریک التوا 12 کے مقابلے میں 22 ووٹوں سے مسترد کر دی گئی۔[5] لیکن کونسل کی اس کاروائی سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ اسی دن یعنی 8/اپریل کو کلکتہ شہر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہ ہنگامہ مہابیر جھنڈے کے جلوس کے دوران ہوا اور دو تین دن تک لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔

9/اپریل کو بنگال اسمبلی میں بھی ڈھاکہ اور نارائن گنج کے فسادات کے بارے میں کانگرس پارٹی کی ایک تحریک التوا پیش ہوئی جو دو گھنٹے کی بحث کے بعد 67 کے مقابلے میں 107 ووٹوں کی اکثریت سے مسترد ہو گئی۔ اس بحث میں بھی متعدد ہندو ارکان اسمبلی نے حکومت پر مجرمانہ غفلت کا الزام عائد کر کے صوبائی گورنر سے مطالبہ کیا کہ وہ حق وزارت کو برطرف کر کے صوبہ میں فرقہ وارانہ امن و امان قائم کرے۔ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے کانگرس پر ان فسادات کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے کہا کہ ''کانگرس گزشتہ چار سال سے میری وزارت اور مسلم کمیونٹی کے خلاف زہر اگل رہی ہے...... کانگرسیوں نے آئے دن لوگوں کو حکومت کے خلاف اشتعال دلایا اور احکامات کی خلاف ورزی کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ مہا سبھائی لیڈر شیاما پرشاد مکر جی نے اپنی تقریر میں لوگوں سے کہا کہ انتظامیہ کا کام ناممکن بنا دیا جائے۔'' وزیر اعلیٰ نے مزید کہا کہ ''ڈھاکہ میں گڑبڑ کی ابتدا 17/مارچ کو نہیں بلکہ 14/مارچ کو اس وقت ہوئی جب کچھ ہندو لڑکوں نے ہولی کے تہوار کے موقع پر کچھ بزرگ مسلمانوں کے اوپر رنگ پھینکا۔ ان کی داڑھیاں نوچی گئیں اور پورے جسم پر رنگ پھینکا گیا...... چھرا مار کر مسلمانوں کو قتل کرنے کی وارداتیں تو پہلے ہی ہو رہی تھیں۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دو دن بعد صورت حال قابو سے باہر ہو گئی۔ مسجدوں میں گھس کر قرآن پھاڑے اور جلائے گئے...... اس کے بعد بہت سے ہندوؤں نے لنگیاں اور سرخ ٹوپیاں پہن کر مسلمانوں کا روپ دھارا اور پھر انہوں نے گاؤں گاؤں جا کر

مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکایا...... یہ سب سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے کیونکہ کانگرس پارٹی بہر قیمت میری وزارت کو برطرف کرانے کا عزم کئے ہوئے ہے''۔ فضل الحق کی یہ تقریر قطع نظر اس کے کہ اس میں کتنا جھوٹ تھا اور کتنا سچ، اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ اگرچہ انگریز جاپانیوں کی عالمی جنگ میں شرکت کے امکان کے پیش نظر اس امر کے خواہاں تھے کہ بنگال میں فرقہ وارانہ امان وامان قائم رہے اور اگرچہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے انگریزوں کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے دو مرتبہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی تجاویز پیش کی تھیں لیکن فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خون بہاتے ہی چلے گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انڈین نیشنل کانگرس اکتوبر 1939ء میں وزارتوں سے الگ ہونے کے بعد مسلسل یہ کوشش کرتی رہی تھی کہ بنگال، پنجاب اور سندھ میں بھی وزارتیں قائم نہ رہیں اور اس کوشش کو ناکام کرنے کے لئے فضل الحق وزارت کو پھر مجبوراً فرقہ واریت پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر کانگرس کی انگریزوں سے محاذ آرائی کی پالیسی کے پیش نظر بنگال میں مسلمانوں کی قیادت اور انگریزوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا تو ہندوؤں کی مراعات پر کاری ضرب لگے گی۔ ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کی منظوری ہندوؤں کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی بالادستی کے خاتمہ کی ابتدا ثابت ہو سکتی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ بعض مسلم لیگی لیڈر فضل الحق اور بوس برادران میں امکانی گٹھ جوڑ کے سدباب کے لئے فرقہ پرستی کو ہوا دیتے رہے تھے۔

فضل الحق کی اس تقریر کے بعد ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ 12 اپریل کو شہر میں چھرا گھونپنے کی دو وارداتیں ہوئیں۔ 14 اپریل کو 13 افراد ہلاک وزخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان میں یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی تھا۔ فرید آباد میں لوٹ مار اور آتشزدگی کی وارداتیں ہوئیں اور ریاست تری پورہ میں ہندو شرنارتھیوں کی تعداد 9 ہزار تک پہنچ گئی۔ 16 اپریل کو ڈھاکہ میں فسادات جاری رہے اور گرفتار شدگان کی تعداد 776 تک پہنچ گئی جبکہ وزیر بلدیات نواب ڈھاکہ، امن کمیٹی کے ذریعے شہر میں امن قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ 17 اپریل کو فسادات جاری تھے کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق اور کانگرسی لیڈر این۔ سی۔ چیٹر جی نے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ 21 اپریل کو فضل الحق ڈھاکہ سے واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے ہر فرقہ کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ڈھاکہ کے فسادات کو کلکتہ تک نہ پھیلنے دیں۔ اسی دن بنگال نیشنل

چیمبر آف کامرس نے چیف سیکرٹری کے نام ایک خط میں اس خدشہ کا اظہار کیا کہ ڈھاکہ کے فسادات کے پورے صوبہ کی تجارت پر تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ صوبائی گورنر نے اس خط کا فوراً نوٹس لیا اور اس نے 22/اپریل کو صوبہ کی ساری سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی کانفرنس میں ان سے اپیل کی کہ وہ صوبہ میں امن بحال کرنے کے لئے مشترکہ طور پر مناسب اقدامات کریں۔ اس کانفرنس کے فیصلے کے مطابق 29/اپریل کو ڈھاکہ فسادات کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی اور ہر ضلع، سب ڈویژن اور میونسپل کمیٹی کی سطح پر فرقہ وارانہ خیر سگالی کی کمیٹیاں مقرر کی گئیں مگر اس کارروائی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

یکم مئی 1941ء کو ہندو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے نارائن گنج کا دورہ کیا اور پھر اس نے 2/مئی کو واپس کلکتہ پہنچ کر ایک نہایت اشتعال انگیز بیان جاری کیا جسے کلکتہ کی پولیس نے اسی دن امرت بازار پتریکا اور دوسرے مقامی اخبارات کے دفتر پر چھاپے مار کر ضبط کر لیا۔ 5/مئی کو سرت چندر بوس ڈھاکہ پہنچا اور پھر 14/مئی کو وزیر مال سر بی۔ پی۔ سنگھ رائے نے اسمبلی میں سرکاری پارٹی کے چیف وہپ خواجہ شہاب الدین کے ہمراہ ڈھاکہ جا کر وہاں کے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی اپنا کاروبار شروع کر سکیں گے۔ انہوں نے نارائن گنج کے دیہات کا بھی دورہ کیا جہاں گرفتار شدگان کی تعداد 1765 تک پہنچ چکی تھی۔ چونکہ نارائن گنج کا علاقہ ہندوؤں کے پٹ سن کے کاروبار کا مرکز تھا۔ وہاں پٹ سن کے کئی گودام نذر آتش کر دیئے گئے تھے۔ اس بنا پر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور دوسرے مہا سبھائی لیڈر بہت مشتعل تھے اور وزیر اعلیٰ فضل الحق خاصا پریشان تھا۔ ڈھاکہ، نارائن گنج اور صوبہ کے بعض دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تھے۔

انگریزوں کے اشارے پر فضل الحق کی جانب سے مرکز اور صوبوں میں قومی حکومتیں بنانے کی تجویز

فضل الحق کی اس پریشانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی جانب سے اس پر زبردست دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ صوبہ میں بہر صورت فرقہ وارانہ امن و امان قائم کرے۔ ان کے اس دباؤ کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت عراق نے جرمنی سے ساز باز کرنے کے بعد 2/مئی 1941ء

کو برطانوی فوجوں کو اپنے ملک سے نکل جانے کا جو حکم دیا تھا اس نے عالمی جنگ کے برصغیر کی شمال مغربی سرحد تک پہنچنے کا زبردست خدشہ پیدا کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اپریل 1941ء میں سوویت یونین اور جاپان کے درمیان معاہدہ غیر جانبداری کے بعد چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں جاپانیوں کی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئی تھیں اور اس امر کی صاف علامتیں نظر آتی تھیں کہ جاپان ہند چینی پر حملہ کرنے ہی والا ہے جس کے بعد وہ بلا تاخیر برصغیر کی مشرقی سرحد کی طرف توجہ کرے گا۔ انہی علامتوں کے پیش نظر کلکتہ میں شہریوں کو ہوائی حملے سے دفاع کی تربیت دی جا رہی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ صوبہ میں مسلسل فسادات کے باعث کلکتہ میں مقیم کاروباری انگریزوں کے مفادات کو نقصان پہنچ رہا تھا اور چائے کے باغات کے انگریز مالکان کے منافع میں بھی کمی ہو رہی تھی اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ کانگرس نے اکتوبر 1940ء میں انفرادی سول نافرمانی کی جو تحریک شروع کی تھی وہ روز بروز زور پکڑ رہی تھی۔ مئی کے اوائل تک 14000 کانگرسی گرفتار ہو چکے تھے جن میں بنگالیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔

فضل الحق نے ان ساری وجوہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر ایک مرتبہ پھر یہ فیصلہ کیا کہ وہ یو۔ پی کے نواب چھتاری اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان کی طرح آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی کو نظر انداز کر کے انگریزوں کی پالیسی پر عمل کرے گا۔ چنانچہ اس نے مئی کے دوسرے ہفتے میں شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی۔ وہاں سے واپسی پر اس نے پہلے میرٹھ میں ایک انٹرویو میں اور پھر 14 ر مئی کو کلکتہ میں ایک بیان کے ذریعے مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں ردوبدل کی تجاویز پیش کیں تاکہ برصغیر میں ایسی پر امن فرقہ وارانہ فضا پیدا ہو جو برطانیہ کی جنگی مساعی کی کامیابی کے لئے درکار ہے۔ قدرتی طور پر بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بالعموم اور مسلم لیگیوں کو بالخصوص فضل الحق کی یہ تجاویز قابل قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ کلکتہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 16 ر مئی کو ان پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''فضل الحق کی یہ تحریک مسلمانوں کی یکجہتی اور مفادات کے لئے نقصان دہ ہے۔ مسلمانان بنگال فضل الحق، سر سکندر حیات خان اور اسی قسم کے دوسرے افراد کی طرف سے کئے گئے ایسے وعدوں کے پابند نہیں ہوں گے۔''[6] فضل الحق نے مسلم لیگیوں کے اس مخالفانہ ردعمل پر صرف اس حد تک توجہ دی کہ اس نے 21 ر مئی کو دارجیلنگ میں ایک بیان میں یہ موقف پیش کیا کہ اس نے ملک کے سیاسی بحران پر قابو پانے کے لئے جو

تجاویز پیش کی ہیں وہ مسلم لیگ کی پالیسی اور نصب العین کے منافی نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ ''میں نے اپنی ذاتی حیثیت میں وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Linlithgo) کو یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہندوستان کی قومی زندگی کے مختلف عناصر کے لیڈروں کی ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلائی جائے تا کہ ملک کے آئندہ آئین کے بارے میں اتفاق رائے ہو سکے یا کم از کم جنگ کے دوران کوئی عارضی سمجھوتہ ہو سکے یا پھر ساری دنیا پر آخری مرتبہ یہ واضح ہو جائے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی...... میں اب بھی امید کرتا ہوں کہ اس مجوزہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے نتیجے میں مرکز اور صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہو سکیں گی اور اس طرح ہندوستان جنگی مساعی میں بھر پور حصہ لے سکے گا...... میری اس تجویز میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مسلم لیگ کے موقف کے منافی ہو...... میں اپنے اس موقف پر قائم رہوں گا کہ مادر وطن کے دفاع کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ''ورکنگ پیکٹ (Working Pact) ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان کو لاحق شدہ فوری خطرے کا احساس کریں اور ایک دوسرے کے خلاف احمقانہ محاذ آرائی کر کے یہ ثابت نہ کریں کہ ہم اپنے مشترکہ دشمن کے خطرے سے بے خبر اور بے پرواہیں۔''[7] فضل الحق نے اس بیان کے اگلے دن صوبائی گورنر سے ملاقات کر کے اس سے ملک کی سیاسی صورت حال کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا لیکن اس نے بعد میں یہ نہ بتایا کہ اس تبادلۂ خیالات کا کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟

فضل الحق کی اس خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ بنگال میں اس کی مجوزہ ''قومی حکومت'' کے قیام کا فوری امکان نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی بنگال ہندو مہا سبھا اور سرت چندر بوس کی معطل شدہ کانگرس کمیٹی نے اس کے مصالحانہ رویے سے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا اور وہ بدستور اس کی حکومت کا بہر قیمت تختہ الٹنے کے درپے تھیں۔ 29رمئی 1941ء کو ان دونوں پارٹیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈھاکہ کے فسادات کے بارے میں مقرر شدہ تحقیقاتی کمیٹی کے روبرو اپنا موقف پیش کریں گی۔ 2رجون 1941ء کو فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں پر عائد شدہ سنسر شپ کی پابندیاں ختم کر دی گئیں اور 3رجون کو تحقیقاتی کمیٹی کی کاروائی شروع ہو گئی۔ 5رجون کو تقریباً ایک درجن کانگرسی اور مزدور کارکنوں کی نقل و حرکت پر ڈیفنس آف آل انڈیا رولز کے تحت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ کلکتہ شہر چھوڑ دیں اور ان اضلاع میں رہیں جن

سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ مزید برآں ان کی طرف سے شائع کردہ بنگالی اشتہار بعنوان ''عوامی حکومت کے لئے آگے بڑھو'' کی فروخت اور تقسیم کی بھی ممانعت کردی گئی۔

ہندومہاسبھا کی تشویش کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت کا ہندوؤں کو نقصان ہوگا اس لئے ہندوراج کے قیام کے لئے انگریزوں کے ساتھ جنگی مساعی میں تعاون کیا جائے

14رجون 1941ء کو کلکتہ میں ہندومہاسبھا کی آل انڈیا کمیٹی کا وی۔ڈی۔ساورکر کی زیر صدارت دوروزہ اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ''راست اقدام'' سے متعلقہ مدورا میں منظور کردہ ایک سابقہ قرارداد کو معطل کردیا گیا کیونکہ ساورکر اور دوسرے لیڈروں کی، کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک کی ناکامی کے تجربہ کی روشنی میں، رائے یہ تھی کہ موجودہ حالات میں جیل یاترا ہندوؤں کے لئے فائدہ مند نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''مدورا قرارداد کی منظوری کے بعد اور بالخصوص گزشتہ تین ماہ میں غیر معمولی نوعیت کے کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں۔ ان فسادات کو لاقانونیت کی اکا دکا وارداتیں قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ہندوؤں کے خلاف جبروتشدد کی منظم مہم کا نتیجہ ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کو دہشت زدہ کرکے ان سے پاکستان کی اسکیم منظور کروائی جائے...... ہندوؤں کو اپنے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے محض حکومت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں خود منظم ہوکر اپنے اندر مزاحمت کی قوت پیدا کرنی چاہیے۔''

16رجون کو ساورکر نے کلکتہ کے آشوتوش میموریل ہال میں ہندوؤں کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے پوری ہندوقوم کو مشورہ دیا کہ وہ فوجی تربیت حاصل کرے۔ اس نے کہا کہ چونکہ کانگرس کی پالیسی برطانیہ کے خلاف ہے اس لئے انگریز اپنے مفاد کی خاطر اپنی فوج میں مسلمانوں، گورکھوں اور سکھوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی فوج اوپر سے لے کر نیچے تک مسلمانوں سے بھری ہوئی ہے۔ تاہم اس نے امید ظاہر کی کہ انگریزوں کی ہمدردیوں کا رخ بہت جلد مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کی طرف ہوجائے گا کیونکہ موجودہ جنگ میں برصغیر کے 75 فیصد ہندو والیان ریاست انگلینڈ کی بہت امداد کررہے ہیں۔ 18رجون

1941ء کو ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی زیر صدارت آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی ڈھاکہ، احمد آباد، بمبئی، کانپور، بہار شریف اور بھوانی میں فرقہ وارانہ فسادات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ہندوؤں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات میں اپنا تحفظ خود کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ اس قرارداد میں حکومت بنگال پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ صوبہ میں امن وامان قائم رکھنے میں ناکام رہی ہے۔

تاہم جب 24 ر جون کو ڈھاکہ میں فسادات کے بارے میں تحقیقاتی کمیٹی کی کارروائی شروع ہوئی تو سرکاری وکیل جے۔ این۔ موزمدار نے ان فسادات کے پس پردہ مسلمانوں یا ہندوؤں کی کسی منظم سازش کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس نے فسادات کی جو وجوہ بیان کیں ان میں پہلی وجہ یہ تھی کہ صوبہ میں جو وزارت قائم ہے اس میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس حکومت نے جو قانون سازی کی ہے اس کے بارے میں یہ غلط پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ وہ محض ہندوؤں کے مفادات کے خلاف ہیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی رواداری میں بڑی تیزی سے کمی ہو رہی تھی جبکہ کمیونسٹوں نے اپنا تخریبی پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان اور ہندو مہا سبھا کا پروپیگنڈا بھی جاری تھا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ مردم شماری کے باعث دونوں فرقوں میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔[8] گویا اس ہندو وکیل کے بیان کے مطابق بنگال میں ہندو۔ مسلم تنازعہ انگریزوں کا پیدا کردہ نہیں تھا بلکہ اس کی ذمہ داری خود ہندوستانیوں پر ہی عائد ہوتی تھی۔ صوبہ میں مفلوک الحال اور پسماندہ مسلم اکثریت کی سیاسی بالادستی مراعات یافتہ ہندوؤں کے لئے ناقابل برداشت تھی اور وہ قانون مزارعت میں ترمیم، ثانوی تعلیمی بورڈ کے بل، کلکتہ میونسپل ایکٹ میں ترمیم اور مہاجن ایکٹ کو محض ہندوؤں کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی مفادات کے منافی سمجھتے تھے۔ ہندو مہا سبھا نے حق وزارت کی اس ''ہندو کش'' پالیسی کے توڑ کے لئے اپنی مدورا کی قرارداد کو معطل کیا تھا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہندو راج کے قیام کے لئے کوئی ''راست اقدام'' کرنے کی بجائے جنگی مساعی میں حکومت برطانیہ سے بھرپور تعاون کرے گی۔ جبکہ کانگرس ہائی کمان میں گاندھی، پٹیل، راجندر پرشاد اور اچاریہ کرپلانی وغیرہ یہی مقصد دھمکیوں اور بلیک میل کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے اور بوس برادران ''مکمل آزادی'' پر پرتشدد ایجی ٹیشن کے حق میں تھے۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا جون 1941ء کے تیسرے ہفتے

تک بوس برادران کے اس موقف سے متفق تھی اور ملک میں ''عوامی حکومت'' کے فوری قیام کا پرچار کرتی تھی مگر جب 22؍جون کو جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو اس کے دو ایک ماہ بعد وہ عملاً ہندو مہا سبھا سے متفق ہو گئی۔

فضل الحق کی قائداعظم جناح سے بغاوت اور وائسرائے کی دعوت پر ڈیفنس کونسل میں شمولیت

وزیر اعلیٰ فضل الحق بھی جولائی 1941ء کے اوائل میں مسلم لیگ ہائی کمان کی پالیسی کے خلاف بالاصرار اس رائے سے متفق رہا کہ جنگی مساعی میں برطانیہ سے غیر مشروط طور پر بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں جب جاپان نے ہند چینی میں شکست خوردہ حکومت فرانس کے فوجی اڈوں پر اپنا دعویٰ جتایا تو اس کی یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی۔ چنانچہ 21؍جولائی کو جب وائسرائے نے اسے نیشنل ڈیفنس کونسل میں شمولیت کی دعوت دی تو اس نے سر سکندر حیات خان، سر سعداللہ، نواب چھتاری اور بیگم شاہ نواز کی طرح لیگ کی قیادت سے پوچھے بغیر یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح نے اس کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا۔ چنانچہ انہوں نے ہند چینی پر جاپانیوں کے حملے کے دو تین دن بعد 30؍جولائی کو ایک بیان میں متنبہ کیا کہ اگر فضل الحق وغیرہ نیشنل ڈیفنس کونسل سے فوری طور پر الگ نہ ہوئے تو ان کے خلاف انضباطی کاروائی کی جا سکتی ہے کیونکہ وائسرائے نے اس کونسل کے قیام کے سلسلے میں مسلم لیگ سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ جناح کے اس بیان کے بعد بنگال کی مسلم رائے عامہ فضل الحق سے بہت برہم ہو گئی۔ بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو دیرینہ شکایت تھی کہ فضل الحق سیاسی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنا رخ موڑ لیتا تھا اور وہ جماعتی نظم وضبط کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ قبل ازیں دو تین مرتبہ کانگرس اور ہندو مہا سبھائیوں کے ساتھ مل کر قومی حکومتیں بنانے کی تجویزیں پیش کر چکا تھا جبکہ صدر مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے انگریزوں اور کانگرسیوں سے گفت وشنید میں مصروف تھے اور اب وہ غیر مشروط طور پر وائسرائے کی ڈیفنس کونسل میں شامل ہو گیا تھا۔ حالانکہ جناح مسلمانوں کے لئے بعض شرائط منوائے بغیر برطانیہ کی جنگی مساعی میں بھرپور تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی بہت بھاری

اکثریت کو جناح کی قیادت پر مکمل اعتماد تھا کیونکہ ان کی رائے میں انہوں نے 1937ء کے بعد اپنے قول وفعل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ برصغیر میں پسماندہ مسلمانوں کے حقوق کے عظیم ترین علمبردار ہیں جبکہ کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے قائدین مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں تھے اور وہ جمہوریت، قوم پرستی اور سیکولرزم کے نام پر عملاً ''ہندو راج'' قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ بنگال میں کانگرسیوں اور ہندو مہا سبھائیوں کی جانب سے مزارعت بل، ثانوی تعلیمی بل، کلکتہ کارپوریشن بل اور مہاجن بل کی مخالفت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ جناح ہندو راج کے خطرے کا جو نعرہ لگاتے ہیں وہ سراسر کھوکھلا اور بے بنیاد نہیں ہے۔ چنانچہ اگست کے اوائل میں کلکتہ اور صوبہ کے دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے بہت سے جلسے ہوئے جن میں فضل الحق کی موقع پرستی اور انفرادیت پسندی کی مذمت کی گئی اور قائداعظم جناح کو حمایت کا یقین دلایا گیا۔

فضل الحق نے اس صورت حال میں 15 راگست کو ایک بیان میں مسلمانان بنگال سے اپیل کی کہ وہ اس کی مذمت نہ کریں اور کھلے ذہن سے متنازعہ مسئلہ کا جائزہ لیں۔ اس نے کہا کہ ''جناح نے میرے خلاف انضباطی کاروائی کا جو فیصلہ کیا ہے وہ سراسر غیر آئینی ہے اور ان کے پاس اس قسم کے آمرانہ اختیارات کے استعمال کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کے بارے میں میرے بیانات نہیں سنے اور ان کا فیصلہ بالکل یکطرفہ ہے۔ اس مسئلہ پر لیگ کی مجلس عاملہ میں غور ہوگا اور میں لیگ کے کھلے اجلاس میں بھی اسے زیر بحث لانے کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ اس سوال سے بہت سے معاملات وابستہ ہیں جن پر بحث اور فیصلہ ضروری ہے۔''[9]

فضل الحق کا یہ بیان باغیانہ تھا اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لیگ ہائی کمان کو اس کے خلاف تادیبی کاروائی کرنا ہی پڑے گی۔ چنانچہ 18 راگست کو صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح نے بمبئی سے ایک بیان میں فضل الحق کے اس موقف کو غلط قرار دیا کہ اس کے خلاف کوئی غیر آئینی کاروائی کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''اگرچہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مدراس سیشن میں منظور کردہ قرارداد کے مطابق میں از خود اس کے خلاف انضباطی کاروائی کرنے کا اختیار رکھتا ہوں تاہم میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ مجلس عاملہ کے روبرو پیش کیا جائے گا اور عاملہ کے اس فیصلہ کے خلاف آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے روبرو اپیل ہوسکتی ہے۔'' آل انڈیا مسلم لیگ کے آنریری سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے بھی مسوری سے ایک بیان میں فضل الحق کے اس بیان کی تردید کی کہ صدر مسلم لیگ نے اس کے خلاف

انضباطی کاروائی کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ غیر آئینی ہے۔ اس نے کہا کہ ''مسلم لیگ کے آئین وقواعد اور کئی ایک قراردادوں کے مطابق صدر مسلم لیگ کا فرض ہے کہ جماعت میں نظم وضبط قائم رکھے اور اس امر کا دھیان رکھے کہ لیگ کے ارکان جماعت کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ اگر کوئی رکن جماعت کے نظم وضبط کی خلاف ورزی کرے اور اس کے فیصلوں اور پالیسی کے منافی اقدامات کرے تو صدر مسلم لیگ اس کے معاملے کو مناسب ایگزیکٹو اتھارٹی کے روبرو پیش کرنے کا پابند ہے اور مجلس عاملہ کو پورا آئینی اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے شخص کے خلاف انضباطی کاروائی کرے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر فیصلہ کرنے کے لئے 24 راگست کو عاملہ کا اجلاس بلایا گیا ہے۔'' فضل الحق نے اسی دن قائداعظم اور نوابزادہ کے ان بیانات کے جواب میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''چونکہ صدر مسلم لیگ جناح نے پہلے ہی میرے خلاف فیصلہ صادر کر دیا ہے اس لئے مجلس عاملہ کے اجلاس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس کی حیثیت محض اشک شوئی کی ہو گی۔ ملزم کو سزا سنائی جا چکی ہے اس لئے اب اس کے خلاف مقدمہ کی سماعت بے سود ہو گی۔''

فضل الحق کا یہ بیان واقعیت کے اعتبار سے بالکل صحیح تھا۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح اس کے خلاف جو فیصلہ کر چکے تھے وہ قطعی تھا۔ عملی طور پر مجلس عاملہ کی حیثیت محض ایک ربڑ سٹیمپ کی تھی اور وہ اس فیصلے میں کوئی ردوبدل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ قائداعظم کی شخصیت مجلس عاملہ سے بہت بھاری تھی۔ اگرچہ وہ پیشہ ور وکیل ہونے کی وجہ سے اپنی ہر کاروائی لیگ کے آئین وقواعد اور قراردادوں کے عین مطابق کرتے تھے لیکن ان کی کاروائی کی حیثیت آمرانہ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1941ء میں ان کا سیاسی ستارہ عروج پر تھا۔ انہیں 9 کروڑ مسلمانان ہند کی پرزور حمایت حاصل تھی جو 1938ء کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں اپنا قائداعظم تصور کرتے تھے۔ بالخصوص مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ قائداعظم کا شیدائی ہو چکا تھا اور وہ کسی دوسری مسلمان سیاسی شخصیت کو اپنے قائداعظم کی حکم عدولی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جریدے ''منشور'' نے اپنے 18 راگست 1941ء کے شمارے میں ان افراد کی مذمت کی تھی جو جناح پر یہ دباؤ ڈالتے رہتے تھے کہ فضل الحق اور دوسرے غلط کار لوگوں کے خلاف انضباطی کاروائی نہ کی جائے۔ منشور کا تبصرہ یہ تھا کہ ''بعض لوگوں نے مسلم لیگ کے انتشار کا واویلا شروع کر دیا ہے اور وہ مسٹر جناح پر یہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ

جماعت کے غلط کار ارکان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ وہ اس سلسلے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ لیگ کے اہم ارکان کے خلاف انضباطی کاروائی سے لیگ کی موت واقع ہو جائے گی۔ ان کی یہ باتیں لغو اور بے ہودہ ہیں۔ مسلمانوں کی قومی یکجہتی لیگ کو خود غرض عناصر سے پاک کرنے میں مضمر ہے۔ اگر مسلم لیگ کی موت تین مسلمان وزرائے اعلیٰ کے اخراج سے واقعی ہونی ہے تو اس کی جتنی جلدی موت واقع ہو جائے گی اتنی ہی مسلمانوں کی بہتری ہو گی۔ مسلم لیگ کی زندگی کا انحصار 9 کروڑ مسلمانوں کی حمایت پر ہے، تین مسلمان وزرائے اعلیٰ پر نہیں۔"[10]

19 راگست کو وزیر ہند ایمری (Amery) نے لندن سے اس معاملہ میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ جن صوبوں میں آئین معطل نہیں ہوا وائسرائے نے ان کے وزارئے اعلیٰ کو بحیثیت عہدہ نیشنل ڈیفنس کونسل میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔ وائسرائے نے اس سلسلے میں ان کے ذاتی، جماعتی یا فرقہ وارانہ تعلقات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ ان وزرائے اعلیٰ کو نہ صرف وزرائے اعلیٰ کی حیثیت سے دعوت دی گئی ہے بلکہ انہوں نے بھی آئینی تقاضوں اور اپنے عوام اور بحیثیت مجموعی صوبوں کی ذمہ داری کے پیش نظر یہ دعوت قبول کی ہے۔[11] مگر وزیر ہند کی یہ حمایت فضل الحق وغیرہ کے کام نہ آئی کیونکہ جناح کا 20 راگست کو بیان یہ تھا کہ "ایمری کا یہ بیان گمراہ کن ہے۔ میں ابھی اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ مجلس عاملہ اس سارے معاملے پر غور کرے گی۔"

عام خیال یہ تھا کہ چونکہ مولوی فضل الحق ایک عوامی لیڈر ہے اس لئے وہ بنگال کی مسلم رائے عامہ کو پیش نظر رکھ کر قائداعظم جناح سے مزید سرکشی نہیں کرے گا اور 24 راگست کو بمبئی پہنچ کر مجلس عاملہ کے روبرو اپنی صفائی پیش کرے گا مگر اس مرتبہ بھی اس نے مسلمانان بنگال کی رائے کا احترام کرنے کی بجائے انگریزوں کی حمایت پر انحصار کیا۔ وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کی بنیاد پر "قومی حکومتوں" کے قیام کی تجاویز پیش کر کے ایسا ہی کر چکا تھا اور اب بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے 23 راگست کو مسلم لیگ کے سیکرٹری کے نام ایک تار میں مجلس عاملہ کے اجلاس میں بعض ناقابل گریز حالات کی بنا پر شرکت سے معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ "میں نے نیشنل ڈیفنس کونسل میں نامزدگی کے بارے میں وائسرائے سے کبھی کوئی خط و کتابت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس سے کوئی بات چیت کی تھی۔ مجھے گورنر نے بتایا تھا کہ میں

بحیثیت وزیر اعلیٰ ڈیفنس کونسل میں نامزد کیا جا رہا ہوں اور میں نے اس پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔ میں نے اس طرح مسلم لیگ سے کوئی بے وفائی نہیں کی اور نہ ہی اس کا نظم وضبط توڑا ہے۔ اس لئے میرے خلاف انضباطی کاروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ مجلس عاملہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ہماری سرکاری ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھے گی۔''

تاہم 24/اگست 1941ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو صدر مسلم لیگ قائد اعظم جناح نے عاملہ کو اس بات چیت سے آگاہ کیا جو چند دن قبل اس کے اور وائسرائے کے درمیان ڈیفنس کونسل کی تکمیل اور ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے بارے میں ہوئی تھی اور پھر ان کے اس بیان کے بعد عاملہ نے متفقہ طور پر ایک قرارداد کے ذریعے بنگال، پنجاب اور آسام کے تینوں وزرائے اعلیٰ...... فضل الحق، سر سکندر حیات خان اور سر سعد اللہ خان...... کو ہدایت کی کہ وہ 5/ستمبر تک ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ بنگال سے سر ناظم الدین اور مولانا اکرم خان عاملہ کے اجلاس میں موجود تھے اور پنجاب سے سر سکندر حیات خان وہیں موجود تھا۔ چونکہ فضل الحق اور سر سعد اللہ غیر حاضر تھے۔ اس لئے انہیں بذریعہ ٹیلیفون اس فیصلہ سے آگاہ کر دیا گیا۔ مگر فضل الحق نے عاملہ کے اس فیصلے کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ''میں کسی ٹھوس وجہ کے بغیر کونسل سے استعفیٰ نہیں دوں گا۔'' 27/اگست کو حکومت ہند نے فضل الحق وغیرہ کی صفائی میں ایک بیان جاری کیا جس میں وزیر ہند ایمری کے 19/اگست کے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ بنگال، آسام، پنجاب اور سندھ کے وزرائے اعلیٰ کو ان کے عہدوں کی حیثیت سے ڈیفنس کونسل میں نامزد کیا گیا ہے'' لیکن حکومت ہند کا یہ بیان سر سکندر حیات خان اور سعد اللہ کو کونسل سے مستعفی ہونے کے اعلانات سے نہ روک سکا کیونکہ یہ دونوں اپنے صوبوں کی مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ فضل الحق نے فوری طور پر اس سلسلہ میں کوئی اعلان نہ کیا اور نہ ہی اس نے مجلس عاملہ کے اس فیصلہ پر کوئی مخالفانہ تبصرہ کیا۔ 28/اگست کو قائد اعظم جناح نے حکومت ہند کے متذکرہ بیان کا جواب دیا اور اس کے ساتھ وہ خط و کتابت بھی شائع کر دی جو ڈیفنس کونسل کی تشکیل اور ایگزیکٹو کونسل کی توسیع کے بارے میں ان کے اور گورنر بمبئی کے درمیان ہوئی تھی۔ جناح کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگ کے ان تینوں مسلمان وزرائے اعلیٰ کو ڈیفنس کونسل میں شمولیت کی دعوت ان کو بطور وزرائے اعلیٰ نہیں بلکہ مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے دی گئی تھی۔

فضل الحق کا ڈیفنس کونسل کے ساتھ ساتھ لیگ مجلس عاملہ سے بھی استعفیٰ...... اس کا بیان کہ ''غیر بنگالی جناح کو بنگال کے معاملات میں مداخلت کا کوئی اختیار نہیں''

چونکہ ستمبر کے اوائل تک فضل الحق نے ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رسمی طور پر کوئی اعلان نہیں کیا تھا اس لئے قائد اعظم جناح نے اسے ٹیلیفون کر کے بمبئی طلب کیا تا کہ اسے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے فیصلے کی تعمیل کی قومی اہمیت کا احساس دلایا جائے مگر اس نے 5 ستمبر کو گورنر بنگال سے ملاقات کرنے کے بعد بمبئی جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا عذر یہ تھا کہ چونکہ آج کل صوبائی اسمبلی کا سیشن جاری ہے اور ثانوی تعلیمی بل کے بارے میں اس کی اسمبلی میں مختلف گروپوں کے نمائندوں سے میٹنگیں ہو رہی ہیں اس لئے اس کے لئے فی الوقت بمبئی جانا ممکن نہیں۔ اس کا یہ عذر سیاسی لیڈروں کے روایتی جھوٹ پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے گورنر سے ملاقات کے بعد ڈیفنس کونسل کے علاوہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے بھی مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ 10 ستمبر کو اس کے اس فیصلے کی خبر شائع ہوئی اور اس کے ساتھ اس کا ایک طویل احتجاجی خط بھی شائع ہوا جو اس نے اس سلسلے میں 8 ستمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ ''صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے میرے خلاف جو فیصلہ کیا ہے وہ سراسر یکطرفہ، غیر آئینی، غیر جمہوری اور آمرانہ ہے۔ میں نے ڈیفنس کونسل کی رکنیت قبول کر کے مسلم لیگ سے کوئی بے وفائی نہیں کی ہے اور نہ ہی اس کے نظم وضبط کو توڑا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ میں جمہوریت اور خودمختاری کے اصولوں کو فرد واحد کی آمرانہ خواہشات پر قربان کیا جا رہا ہے۔ یہ شخص آمر مطلق کی حیثیت سے بنگال کے ان 33 ملین مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتا ہے جو مسلم انڈیا کی سیاسیات میں کلیدی پوزیشن کے حامل ہیں۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے لیڈر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے مفادات کو جس طریقے سے نقصان پہنچا رہے ہیں، میں اس کے خلاف احتجاج کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غالباً انہیں پنجاب اور بنگال کی انتظامیہ پر مسلمانوں کے غلبہ کے فوائد کا احساس نہیں ہے۔ ان لیڈروں کو چاہیے کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں کی سیاست میں خواہ مخواہ دخل اندازی کر کے

پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان نہ پہنچائیں۔ میں بنگال کے 33 ملین مسلمانوں کے مفادات کو کسی بھی غیر بنگالی کی تحویل میں نہیں دے سکتا۔ میرے ڈیفنس کونسل میں شمولیت کے فیصلے کو مسلمانانِ ہند کی اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ بنگال میں مٹھی بھر غیر بنگالی مزدوروں کے سوا مسلمانوں نے میرے اس اقدام کی مذمت نہیں کی۔ ملک میں بہت سے اردو اخبار ایسے ہیں جو جناح کی آمرانہ پالیسی کے خلاف ہیں اور انہیں قائداعظم پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ مجھے جمعیت العلمائے ہند کے بنگالی اور غیر بنگالی ارکان کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں انہوں نے میری پر زور حمایت کی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ میں ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ نہ دوں۔ تاہم میں نے ڈیفنس کونسل کے علاوہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے بھی مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سیاسی ڈکٹیٹرز آئندہ ذرا زیادہ دور اندیشی، دانشمندی اور احتیاط سے کام کریں گے تاکہ پھر ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔"[12]

فضل الحق کا یہ رویہ پنجاب کے سر سکندر حیات خان سے صرف اس حد تک مختلف تھا کہ سر سکندر نے اپنی غلطی کو تسلیم کر کے ڈیفنس کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دیا تھا لیکن اس کے برعکس فضل الحق اپنے اقدام کی صحت پر مصر تھا اور محض بطور احتجاج مستعفی ہوا تھا۔ لیکن جہاں تک پنجاب اور بنگال کے سیاسی معاملات میں اقلیتی صوبوں کے لیڈروں کی دخل اندازی کا تعلق تھا اس کے بارے میں دونوں کا رویہ یکساں تھا۔ سر سکندر نے اسی مقصد کے تحت اکتوبر 1937ء میں جناح سے معاہدہ کیا تھا اور پھر بعد میں وہ کئی مرتبہ اعلان کر چکا تھا کہ پنجاب پنجاب ہے اس میں کسی بھی غیر پنجابی کو سیاسی مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح فضل الحق نے بھی لیگ کے اکتوبر 1937ء کے سیشن کے بعد دو تین مرتبہ بنگالی نیشنلزم کی بنیاد پر بوس گروپ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنانے کی کوشش کی تھی اور اب بھی وہ بنگال کے 33 ملین مسلمانوں کے مفادات کی باگ ڈور کسی بھی غیر بنگالی کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ گویا دونوں ہی مسلم لیگ کی سیاست میں صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرتے تھے اور دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کی قیادت محض کل ہند سطح کی سیاست تک محدود رہے۔ ڈیفنس کونسل کا معاملہ اگرچہ کل ہند سیاست سے تعلق رکھتا تھا اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ انگریزوں کی اس سکیم کو ستمبر 1940ء میں مسترد کر چکی تھی لیکن فضل الحق اسے صوبائی معاملہ تصور کرتا تھا اور اس بنا پر جناح کی مداخلت کو غیر آئینی اور

غیر جمہوری قرار دیتا تھا۔ اس کا یہ موقف منافقانہ تھا۔ اس نے ڈیفنس کونسل کی رکنیت صوبائی گورنر کے کہنے پر مسلم لیگ کی مرکزی قیادت سے مشورہ کئے بغیر قبول کی تھی اور اب اس نے اس معاملے کو اپنی ذاتی انا کا معاملہ بنالیا تھا۔ اسے بنگال میں اپنی مقبولیت کے بارے میں غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے ماضی میں مسلمانان ہند کی بالعموم اور مسلمانان بنگال کی بالخصوص جو خدمات انجام دی ہیں ان کے پیش نظر اس کا سیاسی درجہ محمد علی جناح سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ اسے اس کے ماضی کے سیاسی ''کارناموں'' نے اس احساس وشعور سے محروم کر دیا تھا کہ 1941ء میں قائداعظم جناح کے مقابلے میں اس کی سیاسی حیثیت ایک تنکے کے برابر بھی نہیں تھی۔ بلاشبہ مسلم لیگ میں جناح کی حیثیت ایک آمر مطلق کی تھی۔ کوئی چھوٹا یا بڑا مسلم لیگی لیڈر ان کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا لیکن ان کو یہ حیثیت کسی سازش یا ہیر پھیر کی وجہ سے نہیں ملی تھی بلکہ ڈاکٹر امبید کر کے بقول انہیں یہ مرتبہ کانگرسی لیڈروں کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے ملا تھا۔ اگر جولائی 1937ء میں ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کے قیام کے بعد تین چار سال کے عرصے میں مسلمانان ہند کے درمیانہ طبقہ کی پر جوش حمایت نے محمد علی جناح کی سیاسی شخصیت کو دیو قامت نہ بنا دیا ہوتا تو پنجاب کے سر سکندر حیات خان کو اپنی غلطی کا کبھی احساس نہ ہوتا اور وہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے حکم کی تعمیل میں ڈیفنس کونسل سے کبھی مستعفی نہ ہوتا۔ وہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ تھا جسے برطانوی سامراج اپنی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن کہتا تھا۔ جن دنوں وہ قائداعظم کے حکم کے مطابق طوعاً وکرہاً ڈیفنس کونسل سے الگ ہوا، ان دنوں عراق اور ایران میں جرمنی کے جاسوسوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے برصغیر کی شمال مغربی سرحد کو سخت خطرہ لاحق تھا اور انگریزوں کو اس خطرے کا سدباب کرنے کے لئے اپنے اس بازوئے شمشیر زن کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی ضرورت تھی۔

جناح سے سرکشی کی بنا پر بنگال کی مسلم رائے عامہ فضل الحق کے سخت خلاف ہوگئی......احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے

فضل الحق کی قائداعظم جناح کے خلاف اس محاذ آرائی سے بنگال کی مسلم رائے عامہ بہت برہم ہوئی۔ جب 11 ستمبر کو کلکتہ کے اخبارات میں فضل الحق کا متذکرہ خط شائع ہوا تو اسی دن شہر کے اسلامیہ کالج کے طلبا نے اس کے مکان کے سامنے مظاہرہ کیا اور پھر انہوں نے اعلان

کیا کہ 14 ستمبر کو سیاہ جھنڈوں سے مظاہرہ کیا جائے گا۔ 12 ستمبر کو فضل الحق نے اس مظاہرے کے سدباب کے لئے بنگالی اور غیر بنگالی کا مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا اس سلسلے میں اخباری بیان یہ تھا کہ ''بنگالی نسل کا مزاج آمریت اور مطلق العنانیت کے خلاف بغاوت کرتا ہے اس لئے میں مسلم لیگ میں فرد واحد کی مطلق العنانیت کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اب میرے اس احتجاج کے خلاف سازشی نوعیت کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کلکتہ میں چند غیر بنگالی مسلمان 14 ستمبر کو میرے خلاف مظاہرے کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس شہر میں تقریباً 3 لاکھ غیر بنگالی مسلمان رہتے ہیں۔ اس لئے ان سے کوئی مظاہرہ کروانا مشکل نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی بنگالی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوگا۔ اس صورت حال میں میری جانب سے کلکتہ کے غیر بنگالی مسلمانوں میں سے مٹھی بھر شرپسندوں کو متنبہ کرنا ضروری ہے کہ اگر انہوں نے میرے خلاف کوئی قابل اعتراض حربہ استعمال کیا تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔ میں اس سازش کے سرغنوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''[13] گویا فضل الحق یکا یک مسلم قوم پرستی کی بجائے بنگالی قوم پرستی کا علمبردار بن گیا تھا۔

فضل الحق میں یہ رجحان بیسوی صدی کے دوسرے عشرے کے اوائل میں ہی پایا جاتا تھا جب وہ ڈھاکہ ڈویژن کے ایک ضمنی انتخاب میں رائے بہادر کمار مہندر ناتھ مترا کو شکست دے کر بنگال لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب ہوا تھا اور پھر 1929ء میں جب اس نے کانگرس اور مسلم لیگ سے قطع تعلق کر کے اپنی کرشک پرجا پارٹی بنائی تھی۔ وہ 1924ء میں جب بنگال کا وزیر تعلیم بنا تھا تو پنجاب کے سر فضل حسین کی طرح وہ مقامی قوم پرستی کا نقیب تھا۔ پھر جب 1937ء میں مسلم لیگ سے الگ ہو کر اپنی کرشک پرجا پارٹی کے ایک گروپ کو ساتھ لے کر بنگال اسمبلی میں آیا تھا تو اس کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ بنگالی نیشنلزم کی بنیاد پر کانگرس کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنائے۔ رام گوپال کے بیان کے مطابق فضل الحق نے صوبہ میں وزارت سازی کے لئے ابتدا میں مسلم لیگ کی بجائے کانگرس سے رابطہ پیدا کیا تھا مگر جب کانگرس نے وزارت کی ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا تو اس نے اپنے بیشتر ساتھیوں سمیت لیگ کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ یہ واقعہ بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اگر کانگرس اور پرجا پارٹی کی مخلوط وزارت بن جاتی تو ہندو۔ مسلم مفاہمت کا راستہ کھل جاتا لیکن پرجا پارٹی کے لیگ کے ساتھ ادغام نے وزارت کو کلی طور پر

فرقہ واریت کا رنگ دے دیا اور اس طرح فرقہ پرستی کا دائرہ وسیع ہو گیا۔[14] فضل الحق کی اس کوشش کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انڈین نیشنل کانگرس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کے تحت سات ہندو اکثریتی صوبوں میں انتخابی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اسے صوبائی گورنروں کے خصوصی اختیارات پر اعتراض تھا لیکن چند ماہ بعد جب جولائی 1937ء میں وائسرائے اور گاندھی کے درمیان اس سلسلے میں ''شریفانہ مفاہمت'' ہو گئی تو کانگرس نے وزارتیں قبول کر لیں جبکہ بنگال میں فضل الحق پہلے ہی اپنی پارٹی کو مسلم لیگ میں مدغم کر کے وزارت چلا رہا تھا۔ جولائی 1937ء کے بعد فضل الحق نے بوس گروپ کے ساتھ مل کر صوبہ میں ''قومی حکومت'' بنانے کی کئی کوششیں کیں مگر اس کی ہر کوشش کی کامیابی کے راستے میں ہندو۔ مسلم تضاد کا پہاڑ حائل رہا۔ اسے بار بار اپنی وزارت کو برقرار رکھنے کے لئے صوبہ کی مسلم رائے عامہ کی حمایت پر انحصار کرنا پڑا اور یہی بات رام گوپال جیسے ہندو مؤرخین کی رائے میں بنگال میں فرقہ پرستی کے فروغ کا باعث بنی تھی۔ اس قسم کے متعصّب اور تنگ نظر ہندو مؤرخین اس سلسلے میں کانگرسیوں اور مہا سبھائیوں کی جانب سے مزارعت بل، مہاجن بل، ثانوی تعلیمی بل اور کلکتہ میونسپل ترمیمی بل کی مخالفت کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ اس حقیقت کا بھی ذکر نہیں کرتے کہ جب فضل الحق نے کلکتہ کارپوریشن بل منظور کروانے کے عندیہ کا اظہار کیا تھا تو سوبھاش چندر بوس نے ڈلہوزی سے حق وزارت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ جب فضل الحق نے ثانوی تعلیمی بل کا مسودہ تیار کیا تھا تو ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اپنی الگ ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کی دھمکی دی تھی۔ جب فضل الحق نے اسمبلی سے مزارعت بل منظور کرایا تھا تو سرت چندر بوس، مہاراجہ بردوان اور دوسرے ہندو لیڈروں نے صوبائی گورنر پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اس کی منظوری نہ دے اور پھر انہی ہندو لیڈروں نے مہاجن بل کو رجعت پسندانہ اور فرقہ پرستانہ قرار دے کر اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ اس سے ہندو ساہوکاروں کے مفادات پر قدرے زد پڑتی تھی۔ فضل الحق ہندو لیڈروں کے اسی رویے کے پیش نظر مسلم رائے عامہ کی حمایت پر مجبوراً انحصار کرتا رہا تھا۔

کلکتہ مسلم لیگ کے 11 ستمبر کے اعلان کے مطابق 14 ستمبر کو بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں، جس میں سر ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی بھی موجود تھے، فضل الحق کے خلاف مذمت کی قرارداد منظور کی گئی اور پھر فضل الحق کے خلاف خان بہادر عبدالمومن کی

زیر صدارت ایک جلسہ اور مظاہرہ ہوا۔ جلسہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح پر مکمل اعتماد کا اظہار کر کے فضل الحق کو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور الزام عائد کیا گیا کہ فضل الحق نے بنگالی اور غیر بنگالی اور مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں جیسے بے بنیاد مسائل کھڑے کر کے تفرقہ بازی کی ہے...... جلسہ میں فضل الحق کے اس دعویٰ کی تردید کی گئی کہ وہ بنگال کے 33 ملین مسلمانوں کا نمائندہ ہے۔ حاضرین کی رائے یہ تھی کہ ''مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔''

مذکورہ جلسہ کے جواب میں فضل الحق نے سر عبدالحلیم غزنوی کی زیر صدارت جلسہ کرایا۔ یہ سر عبدالحلیم غزنوی وہی شخص تھا جس نے سرت چندر بوس اور مہاراجہ بردوان کے ساتھ مل کر صوبائی گورنر سے تحریری مطالبہ کیا تھا کہ مزارعت بل کی منظوری نہ دی جائے کیونکہ اس سے زمینداروں کے حق ملکیت پر زد پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں فضل الحق کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ''وہ گزشتہ نصف صدی کا اسلام اور مسلم انڈیا کا سب سے جلیل القدر رہنما ہے...... اس کا یہ انتباہ قابل ستائش ہے کہ بنگال کے 33 ملین مسلمانوں پر کسی باہر کی ''ایجنسی'' کا غلبہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔'' جلسہ میں ایک اور قرارداد کے ذریعے فضل الحق سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ''موجودہ کابینہ کو توڑ کر نئی کابینہ کی تشکیل کرے اور اس طرح کم از کم ایک وزیر کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر دے۔''[15] یہ ناپسندیدہ وزیر حسین شہید سہروردی تھا جو بنگال میں مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے فضل الحق کے خلاف احتجاجی جلسوں اور مظاہروں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

فضل الحق نے وزیر خزانہ حسین شہید سہروردی کے خلاف اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پاس کرانے کی ناکام کوشش کی

فضل الحق کا پروگرام یہ تھا کہ وہ 16 ستمبر 1941ء کو اسمبلی میں سہروردی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کروائے گا لیکن وہ ایسا نہ کروا سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی اپنی مخلوط پارٹی میں اس تجویز کے بارے میں اتفاق رائے نہیں تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ 16 ستمبر کو اسمبلی کے اجلاس سے نصف گھنٹہ قبل اسمبلی کے سپیکر سر عزیز الحق نے یہ اطلاع دے دی کہ وہ شدید علالت کی وجہ سے آج کے اجلاس کی صدارت نہ کر سکے گا...... ڈاکٹروں نے اس کو مسلسل درجہ حرارت رہنے کی

وجہ سے تین ماہ کے لئے آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب سہ پہر کو پونے پانچ بجے اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو ڈپٹی سپیکر اشرف علی نے یہ رولنگ دے دیا کہ آج جو مسئلہ زیر بحث آنا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ سپیکر کی موجودگی میں ہی زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ اجلاس 18 ستمبر تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس پر حزب مخالف کے قائد سرت چندر بوس کو بہت غصہ آیا کیونکہ اسمبلی کے 220 ارکان میں سے 115 ارکان سہروردی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کر چکے تھے۔ بوس نے اپنے اس غصے کے اظہار کے لئے اسی دن ایک اخباری بیان میں ڈپٹی سپیکر پر سخت نکتہ چینی کی اور الزام عائد کیا کہ ''اس نے اسمبلی کا اجلاس برخاست کرنے کی کاروائی قائد ایوان فضل الحق اور دوسری پارٹیوں کے لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر کی ہے۔ اس نے یہ کاروائی خواجہ سر ناظم الدین کی ہدایت کے مطابق کی ہے جس سے اس نے ایوان میں آنے سے پہلے بند کمرے میں ملاقات کی تھی۔ اس کی اس غیر جمہوری اور غیر آئینی کاروائی سے ایوان کی توہین اور ارکان اسمبلی کی حق تلفی ہوئی ہے۔''

تاہم صوبائی گورنر نے اسی دن شام کو اسمبلی کے ممتاز مسلمان اور ہندو ارکان کو اپنے ہاں بلا کر انہیں مطلع کیا کہ 18 ستمبر 1941ء کو اسمبلی کا اجلاس برخاست کر دیا جائے گا اور آئندہ اجلاس نومبر میں ہوگا۔ گورنر کے اس فیصلے سے حسین شہید سہروردی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک سے پیدا ہونے والا وزارتی بحران وقتی طور پر ٹل گیا اور 18 ستمبر کو سپیکر سر عزیز الحق نے اسمبلی میں آ کر گورنر کا یہ حکم رسمی طور پر پڑھ کر سنایا کہ اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ صوبائی گورنر نے یہ فیصلہ بظاہر اس وجہ سے کیا تھا کہ مسلم لیگ اور پرجا پارٹی کے درمیان قائم شدہ اتحاد ٹوٹ جانے کے بعد صوبہ میں کوئی نمائندہ وزارت نہیں رہے گی کیونکہ اس وقت تک فضل الحق، بوس گروپ یا ہندو نیشنلسٹ پارٹی سے کوئی اتحاد قائم نہیں کر پایا تھا۔ شاید گورنر کا خیال یہ تھا کہ وہ نومبر تک کوئی نہ کوئی نیا گٹھ جوڑ کر لے گا۔

شملہ میں وائسرائے اور فضل الحق کے مابین وزارت کی تشکیل نو کے بارے میں مشورے

صوبائی اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی ہوا تو فضل الحق شملہ پہنچا جہاں مقامی مسلم لیگ نے اس کا کالی جھنڈیوں سے ''استقبال'' کیا۔ پنجاب کا وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات

خان پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ چنانچہ 22 ستمبر 1941ء کو ان دونوں کی طویل ملاقات ہوئی جس کے دوران سر سکندر نے فضل الحق کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی تاریخی کاروائی کی تفصیل سے آگاہ کیا اور فضل الحق نے اسے بنگال کی صورت حال سے مطلع کیا یعنی اس نے بتایا کہ اگر اس نے مسلم لیگ سے اپنا وزارتی ناطہ توڑ لیا تو وہ کانگرس کے بوس گروپ، کانگرس کے رائے گروپ، کرشک پرجا پارٹی کے باغی ارکان، آزاد شیڈول کاسٹ پارٹی اور ہندو نیشنلسٹ پارٹی کے تعاون سے نئی وزارت کی تشکیل کر سکے گا۔ 17 ستمبر کو جن 115 ارکان اسمبلی نے حسین شہید سہروردی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کئے تھے ان کا تعلق انہی پارٹیوں سے تھا۔ فضل الحق شملہ میں پانچ دن ٹھہرا اور اس عرصے میں اس نے وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہونے کے علاوہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے دو نئے مسلمان ارکان سر سلطان احمد اور سر اکبر حیدری سے بھی ملاقاتیں کیں۔

لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ کے مطابق ”فضل الحق نے وائسرائے سے ملاقات کے دوران بنگال میں نئی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں بات چیت کی اور استدعا کی کہ اسے اس سلسلے میں یورپین گروپ کی حمایت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کی اس کوشش کے نتائج کے بارے میں دو قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ اول یہ کہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسی نئی کابینہ کی تشکیل کرے جس میں مسلم لیگ کے ارکان یعنی خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی شامل نہ ہوں اور ان کی بجائے ہندو مہا سبھا اور سرت چندر بوس کے فارورڈ بلاک کے نمائندوں کو کابینہ میں شامل کیا جائے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ فضل الحق کو موجودہ کابینہ کے ساتھ ہی کام کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے کیونکہ نئی مخلوط وزارت کے مستحکم نہ ہو سکنے کی صورت میں بنگال میں آئین کے معطل ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔“[16] سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ وائسرائے کو سرت چندر بوس کے فارورڈ بلاک کے تعاون سے بنگال میں نئی وزارت کی تشکیل پر تامل تھا کیونکہ ہند چینی پر قبضہ کے بعد جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک کے بارے میں جاپانیوں کے عزائم کے پیش نظر بنگال میں ایسے عناصر کو اقتدار میں شریک کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا جن کی وفاداری مشکوک تھی۔ سرت چندر بوس کا بھائی سوبھاش چندر بوس پہلے ہی اپنے گھر سے فرار ہو کر برلن پہنچ چکا تھا۔ لیکن دوسری طرف فضل الحق کی قائد اعظم جناح کے خلاف محاذ آرائی کے پیش نظر مسلم لیگ اور اس کی پرجا پارٹی کے درمیان اتحاد قائم

رہنا بھی محال نظر آتا تھا کیونکہ 11 ر ستمبر 1941ء کے بعد کلکتہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں مسلم لیگ کے جلسوں میں فضل الحق کی مذمت جاری تھی اور برصغیر کے بعض دوسرے علاقوں کی مسلم رائے عامہ بھی اس پر لعنت بھیج رہی تھی۔

ہندو مسلم فسادات اور فضل الحق کی مسلم لیگی وزیروں کے ساتھ عارضی مفاہمت

فضل الحق شملہ سے کلکتہ واپس پہنچا تو شہر کے ہندوؤں نے راجشاہی ڈویژن میں درگا پوجا کے جلوسوں پر عائد شدہ پابندیوں کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی۔ 5ر اکتوبر 1941ء کو ہندو مہاسبھا نے پورے بنگال میں یوم ماتم منایا۔ کلکتہ میں سارا دن ہندوؤں کی دوکانیں بند رہیں اور شام کو مختلف مقامات پر احتجاجی جلسے ہوئے جن میں حکومت بنگال کی جانب سے مذہبی جلوسوں پر پابندی عائد کرنے کی پالیسی پر مذمت کی گئی اور صوبائی کابینہ کے ہندو ارکان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے عہدوں سے بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں۔ اس یوم ماتم کے نتیجے میں 7ر اکتوبر کو ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ پھر بھڑک اٹھی جس میں سات افراد ہلاک اور 13 زخمی ہوئے۔ 8ر اکتوبر کو بھی قتل و غارت اور لوٹ مار کی وارداتیں ہوئیں اور 9ر اکتوبر کو اس خونی پس منظر میں صوبائی گورنر نے دارجیلنگ میں فضل الحق اور مسلم لیگی وزرا کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی۔ جس کا مثبت نتیجہ 18ر اکتوبر کو ظاہر ہوا جبکہ اخبارات میں وہ خط و کتابت شائع ہوئی جو 11ر اکتوبر کے بعد فضل الحق کی تین مسلم لیگی وزیروں سر ناظم الدین، حسین شہید سہروردی اور مولوی تمیز الدین کے درمیان ہوئی تھی۔ مؤخر الذکر تینوں وزیروں نے اپنے خط میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ”بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 13ر ستمبر کو جو قرارداد منظور کی تھی اس سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے اور تم نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ہم نے اس قرارداد کی تائید کر کے تمہارے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم نے عاملہ کے اجلاس میں اس نوعیت کی قرارداد کی مخالفت کی تھی مگر ہمارے موقف کو سرسری طور پر مسترد کر دیا گیا تھا۔“ فضل الحق نے 17ر اکتوبر کو اس خط کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ ”اب اس معاملے کو ختم سمجھنا چاہیے۔ میں مسلمانان ہند میں پھوٹ ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور میں نے اس

سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کو مطلع کر دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمانان ہند پوری یکجہتی اور اتحاد کے ساتھ ایک ہی تنظیم کے تحت اپنی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ترقی کے حصول کے لئے کام کریں۔ میں نے مسلم لیگ کی اتھارٹی کی مخالفت نہیں کی۔ مسلم لیگ کو ایسے کل ہند مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے جن کا تعلق ہندوستان بشمول بنگال، کے مسلمانوں سے ہو۔''[17] گویا تینوں مسلم لیگی وزرا اور وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اپنے سابقہ موقف سے انحراف کر کے باہمی مصالحت کی راہ اختیار کی تھی بظاہر اس لئے کہ وائسرائے اور گورنر کی خواہش یہی تھی۔ وہ بنگال میں فضل الحق کے سرت چندر بوس کے ساتھ گٹھ جوڑ کو اپنی جنگی مصلحت کے منافی سمجھتے تھے۔ تینوں مسلم لیگی وزرا کی جانب سے فضل الحق کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت بھی اس مرحلہ پر بنگال کی حکومت سے علیحدگی مناسب خیال نہیں کرتی تھی۔ قائد اعظم جناح نے تینوں مسلم لیگی وزرائے اعلیٰ کو ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے پر مجبور کر کے اپنی اتھارٹی کا لوہا منوالیا تھا لہٰذا اس معاملے کو خواہ مخواہ مزید طول دینا سیاسی مصلحت کے منافی تھا۔

20 اکتوبر 1941ء کو فضل الحق کی زیر صدارت بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں فضل الحق نے عاملہ کو یقین دلایا کہ اس نے 8 ستمبر کو نوابزادہ لیاقت علی خان کو جو خط لکھا تھا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جناح کا ذاتی طور پر احترام نہیں کرتا۔ مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے بنگالی کونسلروں سے اپیل کی کہ وہ 26 اکتوبر کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں ضرور شرکت کریں کیونکہ اس اجلاس میں اہم معاملات زیر بحث آئیں گے۔

23 اکتوبر 1941ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقابلے میں فضل الحق کی پوزیشن اور بھی کمزور ہو گئی جبکہ ڈھاکہ میں عید الفطر کے جلوس کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست تصادم ہوا جس میں 50 افراد زخمی ہوئے اور بہت سی دکانیں لوٹی گئیں۔ 25 اکتوبر کو شہر کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گروہوں نے ایک دوسرے پر زبردست پتھراؤ کیا۔ چھرا گھونپنے کی متعدد وارداتیں ہوئیں۔ 6 افراد مارے گئے اور 148 زخمی ہوئے۔ چنانچہ مقامی انتظامیہ کو امن و امان بحال کرنے کے لئے شہر میں 48 گھنٹے کا کرفیو لگانا پڑا۔ جب 26 اکتوبر کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا دو روزہ اجلاس شروع ہوا تو اس وقت بھی ڈھاکہ

میں کرفیو کے باوجود آگ وخون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اور انتظامیہ نے کرفیو کے اوقات میں مزید 24 گھنٹے کی توسیع کردی تھی۔

فضل الحق کی سیاسی قلابازیاں اور جوڑ توڑ ...... کبھی لیگ کے خلاف، کبھی موافق، کبھی جناح کا احترام، کبھی توہین!

27/اکتوبر کو مسلم لیگ کونسل کے آخری اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے فضل الحق سے مطالبہ کیا گیا کہ اس نے اپنے 8/ستمبر کے خط میں صدر مسلم لیگ کے خلاف جو بے بنیاد اور توہین آمیز الزامات عائد کئے تھے وہ دس دن کے اندر واپس لے۔ یہ قرارداد منظور ہوچکی تو جناح نے کونسل کو بتایا کہ ''فضل الحق نے آج تین بجے سہ پہر مجھ سے ملاقات کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں خط لکھے گا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط لکھا ہے جو خواجہ نے مجھے بھیج دیا ہے۔ اس خط میں لکھا ہے کہ میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے اپنا استعفیٰ واپس لینے پر رضامند ہوں لیکن میں جناح کے خلاف عائد کردہ الزامات فی الحال واپس نہیں لے سکتا۔ میں غلط اور توہین آمیز الزامات واپس لینے پر تیار ہوجاؤں گا لیکن اس مقصد کے لئے سکون سے غور وفکر کی ضرورت ہے جو اس وقت ممکن نہیں کیونکہ مجھے 102 درجے کا بخار ہے۔ مزید برآں مجھے اپنے ان دوستوں سے بھی مشورہ کرنا ہے جو کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں اور اب تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں بہت بیمار ہوں اور کمزور ہوں اس لئے مزید کچھ نہیں لکھ سکتا۔''[18] فضل الحق کا یہ خط غلط بیانی پر مبنی تھا۔ وہ بیمار نہیں تھا اور نہ ہی اسے اپنے کلکتہ کے دوستوں سے مشورہ کرنا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ جناح کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے پہلے وائسرائے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ایسا کروں یا نہ کروں۔ چنانچہ اس نے 29/اکتوبر کو وائسرائے سے ملاقات کی جس نے اسے اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی قطعی مشورہ نہ دیا۔

فضل الحق نے 30/اکتوبر 1941ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ سے خصوصی انٹرویو میں کہا کہ ''اگر مجھے (جناح کے خلاف عائد کردہ) الزامات واپس لینے ہوتے تو میں نے وہ خط نہ لکھا ہوتا۔'' سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اس کے اس موقف کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ ''اگر اسے مسلم لیگ میں رہنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ مسلم لیگ سے قطع تعلق کرلے گا۔ اگر لیگ سے علیحدگی کے بعد

وہ اپنی کابینہ میں لیگ کی حمایت سے محروم ہو گیا تو وہ نہ صرف اپنی کابینہ میں ردو بدل کر کے ترقی پسند عناصر کو اس میں شامل کر لے گا بلکہ وہ دوسرے صوبوں کو بھی یہی مشورہ دے گا۔ فضل الحق اس مقصد کے لئے ممتاز کانگرسی لیڈروں اور کانگرس کی مجلس عاملہ کے سابق رکن بی۔سی۔رائے سے گفت وشنید کر رہا ہے۔ بی۔سی۔رائے آج کل دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے نئے ممبر نلنی رنجن سرکار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔[19] اس کی اس گفت وشنید کا پس منظر یہ تھا کہ بنگال اسمبلی کے کانگرسی ارکان کے ایک پارلیمانی گروپ نے جو کرن شنکر رائے، جے۔سی۔گپتا، ڈی۔این۔مکرجی اور کرشن گھوش پر مشتمل تھا، 23/اکتوبر کو گاندھی سے ملاقات کر کے اس سے استدعا کی تھی کہ اس نے کانگرسی ارکان اسمبلی کو ستمبر 1939ء سے اسمبلیوں کی کاروائی میں حصہ لینے کی جو ممانعت کر رکھی ہے اس سے بنگال کے کانگرسیوں کو مستثنیٰ قرار دے دیا جائے اور 28/اکتوبر کو کرشن شنکر رائے نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ ''کانگرس کی پارلیمانی سب کمیٹی ہماری اس درخواست پر تقریباً دو ہفتے میں فیصلہ کر دے گی۔ یہ فیصلہ آسام، سندھ اور پنجاب کے کانگرسی ارکان اسمبلی پر بھی لاگو ہوگا'' اور فضل الحق کو امید تھی کہ کانگرس ہائی کمان کا یہ فیصلہ بنگالی کانگرسیوں کے حق میں ہوگا تو وہ مسلم لیگ کے بغیر اپنی نئی ''ترقی پسند'' کابینہ بنا سکے گا۔

فضل الحق کی اس امید کی بنیاد صوبہ کے سیاسی حقائق پر نہیں تھی۔ یہ حقائق ایسے تھے کہ مسلمان ارکان اسمبلی کے کسی گروپ کے لئے ہندو ارکان اسمبلی کے ایک یا ایک سے زیادہ گروہوں سے اتحاد کر کے برسر اقتدار آنا آسان نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں 23/اکتوبر کو عید الفطر کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کرفیو کی پابندیوں اور چار پانچ افراد کی گرفتاریوں کے باوجود بدستور جاری تھا۔ روزانہ لوٹ مار، قتل وغارت اور آتشزنی کی وارداتیں ہوتی تھیں جن کی وجہ سے ڈھاکہ شہر، نارائن گنج اور گردونواح کے دوسرے علاقوں کی زندگی مفلوج ہو چکی تھی۔

5/نومبر 1941ء کو بنگال ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ نے ڈھاکہ کی صورت حال پر غور کرنے کے بعد مقامی انتظامیہ کی اس بنا پر مذمت کی کہ ''اس نے عید کے موقع پر جلوس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف لوٹ مار اور قتل وغارت کا موقع فراہم کیا تھا۔'' 7/نومبر کو انڈین چیمبر آف کامرس نے حکومت بنگال کے چیف سیکرٹری کے نام ایک مراسلے میں اسے مطلع کیا تھا کہ ڈھاکہ کے فسادات میں نہ صرف جان ومال کا بہت نقصان ہوا ہے بلکہ شہر اور گردونواح

کے علاقوں میں تجارتی اور صنعتی سرگرمیاں بالکل معطل ہوگئی ہیں۔'' چیمبر آف کامرس کا بیان غلط نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے آئے دن کے فسادات کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔ پٹ سن کے کئی گودام نذر آتش ہوگئے تھے اور بہت سی دوکانیں لوٹی گئی تھیں۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، سرت چندر بوس، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اچاریہ کرپلانی نے اسی وجہ سے چند ماہ قبل اس علاقے کا دورہ کر کے حق وزارت کی برطرفی کا مطالبہ کیا تھا۔ ہندوؤں کے سیاسی، تجارتی اور صنعتی شعبوں کے عمائدین کا یہ واویلا اس تلخ حقیقت کا مظہر تھا کہ جنگ کے دوران انگریزوں کی جانب سے ہندو۔ مسلم اتحاد کی کوششوں کے باوجود اور انڈین نیشنل کانگرس کے سیکولر نیشنلزم کے نعروں کے باوجود بنگال میں عوامی سطح پر ہندو۔ مسلم تعلقات میں عناد و عداوت کا زہر کم نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ کانگرسی اور مہا سبھائی لیڈر اس کی ذمہ داری مسلم لیگ کی فرقہ پرستی اور اس کے مطالبہ پاکستان پر عائد کرتے تھے۔

بنگال کے مسلم لیگی وزیر خزانہ حسین شہید سہروردی نے 5/نومبر کو علی گڑھ مسلم لیگ کانفرنس میں اس الزام کا جواب دیا۔ اس نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''ہمارا اولین نصب العین یہ ہے کہ یونٹوں کی رضامندی کے بغیر کوئی مرکزی وفاقی حکومت قائم نہ ہو۔ یہ ضروری ہے کہ صوبوں کو ترقی دی جائے اور انہیں زیادہ اختیارات دیئے جائیں تا آنکہ وہ مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ہو جائیں۔ پاکستان کی اسکیم کا لب لباب یہی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اس اسکیم کے بارے میں وسیع پیمانے پر غلط بیانی کی گئی ہے کہ اس سے ہندوستان کے ٹکڑے ہو جائیں گے...... ہماری اس اسکیم کو ناکام کرنے کے لئے ہماری صفوں میں پھوٹ ڈلوانے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں لیکن یہ ساری کوششیں مسلمانوں کے عزم کی وجہ سے ناکام ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ناکام ہوں گی۔''[20] سہروردی کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ نومبر 1941ء تک مسلم لیگی لیڈروں کے مطالبہ پاکستان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات کی ضمانت دی جائے۔

لیکن سہروردی کی اس تقریر کا کانگرسی ہائی کمان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ چند دن بعد بنگال اسمبلی کے کانگرسی ارکان کو یہ اجازت دے دی گئی کہ جب مسلم لیگی وزرا کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہو یا جب ثانوی تعلیمی ترمیمی بل پیش ہو تو وہ اسمبلی کی کاروائی میں حصہ لے سکتے

ہیں۔ تاہم مولوی فضل الحق نے 14 نومبر کو مسلم لیگ ہائی کمان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے نوبزادہ لیاقت علی خان کے نام ایک خط لکھا کہ ''میں نے 8 ستمبر کو جو خط لکھا تھا اس سے صدر مسلم لیگ اور بعض دوسرے دوستوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ آپ کی وساطت سے میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت کسی کے جذبات کو مجروح کرنے یا اس پر الزام تراشی کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے امید ہے میری یہ یقین دہانی قبول کر لی جائے گی اور اب اس معاملے کو ختم تصور کیا جائے گا۔'' 17 نومبر کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے فضل الحق کے اس خط پر غور کرنے کے بعد اس وضاحت کو قبول کر لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اب اس کے خلاف مزید کسی کاروائی کی ضرورت نہیں ہے۔[21]

جب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا یہ فیصلہ اخبارات میں شائع ہوا تو کلکتہ میں کانگرسی حلقوں کو وہ منصوبہ ناکام ہوتا ہوا نظر آیا جس کے تحت انہوں نے امید لگا رکھی تھی کہ صوبائی کابینہ سے مسلم لیگی وزرا کے اخراج کے بعد یہاں فضل الحق کی زیر قیادت ان کی من پسند وزارت بن جائے گی اور جس کے تحت وہ 17 نومبر کو شمس الدین احمد کی زیر قیادت پرجا پارٹی کے ''ترقی پسندوں'' کے گروپ کے ایک ''ترقیاتی'' پروگرام کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ لیکن جب دو تین دن کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ فضل الحق نے صوبہ میں ''ترقی پسندوں'' کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا دوبارہ رکن بننے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی امید پھر تازہ ہو گئی۔ چنانچہ فضل الحق کی اس نئی قلابازی کے پیش نظر انہوں نے 24 نومبر کو کلکتہ کارپوریشن کے سابق میئر اے۔ کے۔ ایم ذکریا کی زیر صدارت یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک جلسہ عام کر کے صوبائی گورنر سے یہ مطالبہ کیا کہ ''موجودہ وزارت کو برطرف کر کے فضل الحق سے کہے کہ وہ بنگالی عوام کے سچے اور صحیح نمائندوں پر مشتمل نئی کابینہ بنائے۔'' اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ وزیر داخلہ سر ناظم الدین اور وزیر خزانہ حسین شہید سہروردی کو کابینہ سے نکال دیا جائے کیونکہ وہ غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے صوبہ کے عوام کے سچے اور صحیح نمائندے نہیں ہیں۔

26 نومبر کو ان ''ترقی پسندوں'' کی طرف سے ان دونوں مسلم لیگی وزرا کے خلاف عدم اعتماد کی تحریکوں کے نوٹس دیئے گئے اور ان کے ساتھ ہی اخبارات کو یہ اطلاع بھی دی گئی کہ ان تحریکوں پر بحث کے دوران کانگرسی ارکان ایوان میں حاضر ہوں گے۔ تاہم 27 نومبر کو جب اسمبلی کا اجلاس ہوا تو کوئی ''تماشا'' نہ ہوا حالانکہ اسمبلی کی پبلک گیلری تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری

ہوئی تھی۔ متوقع ''تماشا'' نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتے ہی وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اعلان کر دیا کہ ''چونکہ اسمبلی کی مقرر کردہ منتخب کمیٹی ابھی تک ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کا کوئی متفقہ مسودہ تیار نہیں کر سکی اس لئے کمیٹی کو مزید مہلت دینے کے لئے اسمبلی کا اجلاس 8 ردسمبر تک ملتوی کر دیا جائے۔'' فضل الحق کے اس اعلان پر سپیکر نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا تو پرجا پارٹی کے ''ترقی پسندوں'' کے لیڈر شمس الدین احمد نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اب اس کا گروپ متذکرہ عدم اعتماد کی تحریکیں 8 ردسمبر کو پیش کرے گا۔ اسمبلی کی سٹیج پر اس مختصر ڈرامے کے پس پردہ حقیقت یہ نہیں تھی کہ ایوان کی منتخب کمیٹی کو ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کے مسودہ کی تیاری کے لئے مہلت درکار تھی بلکہ یہ تھی کہ فضل الحق کو ''ترقی پسند'' گروپ کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے مہلت درکار تھی۔

28 رنومبر کی شام کو اسمبلی کے ممتاز ہندو رکن جے۔ سی۔ گپتا کے مکان پر شمس الدین احمد کے ترقی پسند گروپ اور دوسرے اپوزیشن گروپوں کا ایک اجلاس ہوا جس میں فضل الحق نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں سرت چندر بوس نے فارورڈ بلاک کی جانب سے، شمس الدین احمد نے کرشک پرجا پارٹی کی جانب سے، خان بہادر ہاشم علی خان نے پروگریسو پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے اور ہیم چندر ناسکر نے انڈیپنڈنٹ شیڈولڈ کاسٹ (Independent Scheduled Cast) کی جانب سے مشترکہ طور پر ایک دستاویز پر دستخط کر کے پروگریسو کولیشن پارٹی کو جنم دیا اور پھر یہ اعلان کیا کہ فضل الحق اس اکثریتی پارٹی کا باپو یعنی قائد ہوگا۔ لیکن جب 29 رنومبر کو صوبائی گورنر کی زیر صدارت کابینہ کا اجلاس ہوا تو فضل الحق نے گزشتہ شام کے اجلاس کے بارے میں ہر بات کی تردید کر کے مسلم لیگی وزرا کو حیران و پریشان کر دیا۔ گورنر کے چلے جانے کے بعد فضل الحق نے یہ موقف پیش کیا کہ میں ایسی کسی پارٹی کا آئینی طور پر سربراہ نہیں ہو سکتا جو اسمبلی میں اپوزیشن سے تعلق رکھتی ہو۔

ابوالقاسم فضل الحق، جو پورے برصغیر کے مسلمانوں میں ''مولوی'' کے علاوہ ''شیر بنگال'' کے لقب سے بھی معروف تھا، جھوٹ بولنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں جھوٹوں کا بادشاہ تھا اور اسے کسی بات سے بھی مکر جانے میں ذرا سی بھی جھجھک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے اس تازہ ترین جھوٹ کی قلعی اگلے ہی دن 30 رنومبر کو کھل گئی جبکہ اس کی زیر صدارت پروگریسو

کولیشن پارٹی کا اجلاس ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ 8 ر دسمبر کو اسمبلی میں صوبائی کابینہ کے چھ وزیروں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جائے گی۔ لیکن فضل الحق نے 8 ر دسمبر تک انتظار نہ کیا اور اس نے یکم دسمبر کو صوبائی گورنر کے روبرو اپنی دس رکنی کابینہ کا استعفیٰ پیش کر دیا اور اسی دن کرشک پرجا پارٹی کے چیف وہپ نے ایک اخباری بیان میں دعویٰ کیا کہ ''پروگریسو کولیشن پارٹی'' وجود میں آ چکی ہے۔ فضل الحق اس پارٹی کا سربراہ ہے اور اس کا مقصد صوبائی کابینہ سے ''رجعت پسند'' وزیروں کو نکال باہر پھینکنا ہے''

فضل الحق کا بوس برادران، کانگرس، ہندو مہا سبھا اور کئی چھوٹے گروپوں کے ساتھ نیا سیاسی اتحاد...... پرجا۔ لیگ مخلوط حکومت کا خاتمہ

2 ر دسمبر 1941ء کو سرت چندر بوس نے ایک بیان میں دعویٰ کیا کہ پروگریسو کولیشن پارٹی کو اسمبلی میں قطعی اکثریت حاصل ہے۔ 200 ارکان کے ایوان میں اس پارٹی کے ارکان کی تعداد 150 سے کم نہیں ہوگی۔ اس پارٹی کو جن عناصر کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی ان میں کانگرس پارٹی، ہندو نیشنلسٹ پارٹی، انڈیپنڈنٹ شیڈولڈ کاسٹس پارٹی، لیبر گروپ، زمیندار گروپ، انڈین کرسچین گروپ اور اینگلو انڈین گروپ کے ارکان شامل ہوں گے۔ مزید برآں فضل الحق کی اپنی پروگریسو پارٹی کے ارکان کی تعداد 47 ہوگی۔ سرت چندر بوس نے ان اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا کہ ''سہروردی گروپ گورنر کو یہ ترغیب دے رہا ہے کہ اسمبلی کا اجلاس نئی کابینہ کی تشکیل سے پہلے یا اس کی تشکیل کے فوراً ہی بعد غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔'' اس نے کہا کہ ''ایسی کوششیں صرف ایسے افراد ہی کر سکتے ہیں جنہیں اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ یہ اسمبلی کے اجلاس کو معرض التوا میں ڈلوا کر اپنی قوت میں اضافہ کرنے کا موقع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر گورنر نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی تو صوبہ میں شدید بے اطمینانی پھیلے گی اور وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن ہوگی۔''[22]

سرت چندر بوس کے اس بیان اور صوبائی اسمبلی میں سارے مکاتیب فکر کے ہندو گروپوں کے متذکرہ رویے کے پیش نظر بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے مسلمانوں کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ کانگرس، مہا سبھا، فارورڈ بلاک اور

ہندوؤں کی دوسری ساری چھوٹی بڑی سیاسی تنظیمیں خواہ کچھ ہی نعرے لگائیں ان کا نصب العین مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوا کر مسلم لیگ کا سیاسی وجود ختم کیا جائے اور پھر چند مسلمان پٹھوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر پورے برصغیر میں ''ہندو راج'' نافذ کیا جائے۔ مسلمانوں میں یہ تاثر 1937ء میں کانگرس وزارتوں کے قیام کے بعد پیدا ہونا شروع ہوا تھا اور دسمبر 1941ء تک اس تاثر نے ایک مستحکم یقینی صورت اختیار کر لی تھی۔ خود مولوی فضل الحق نے بھی گزشتہ تین چار سال کے دوران بارہا کانگرس اور دوسری ہندو جماعتوں پر یہی اعتراضات کئے تھے مگر اب وہ خود ہی اس تفرقہ انگیزی کا شکار ہو گیا جسے بے نقاب کرنا وہ اپنا فرض سمجھا کرتا تھا۔ اس کے اس دوغلے رویے سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس پر غور کرنے کے لئے 3 دسمبر کو بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کے معتمد خاص مرزا ابوالحسن اصفہانی کی تحریک پر بلایا گیا تھا اور اس میں مولانا اکرم خان کے علاوہ وزیر داخلہ سر ناظم الدین، وزیر خزانہ حسین شہید سہروردی، وزیر زراعت وصنعت تمیز الدین خان، چیف وہپ خواجہ شہاب الدین اور عبدالرحمان صدیقی نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس سے پہلے سر ناظم الدین نے صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح سے ٹیلیفون پر بات چیت کی تھی اور پھر غالباً ان کی ہدایت کے مطابق مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے سارے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کو ہدایت کی تھی کہ وہ 4 دسمبر 1941ء سے اپنا تعلق پروگریسو پارٹی اور پروگریسو کولیشن پارٹی سے منقطع کر لیں۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''ان دونوں پارٹیوں کے قیام سے مسلم یکجہتی کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ مسلم لیگ کے نصب العین پر کاری ضرب لگائی گئی ہے اور بنگال کی انتظامیہ پر کانگرس، ہندو مہاسبھا اور فارورڈ بلاک کے غلبہ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔'' مجلس عاملہ نے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کو مزید ہدایت کی کہ وہ اسمبلی میں اپنی ایک الگ اسمبلی پارٹی بنالیں۔''[23]

4 دسمبر کو وزیر اعلیٰ ابوالقاسم فضل الحق کے مکان پر پروگریسو کولیشن پارٹی کی رسمی میٹنگ ہوئی جس میں فضل الحق کو قائد منتخب کرنے کی تجویز بنگال کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر سرت چندر بوس نے پیش کی اور کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر شمس الدین احمد کے علاوہ ہندو نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی، وزیر انصاف وقانون سازی نواب مشرف حسین، پروگریسو اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر خان بہادر ہاشم علی خان، انڈیپنڈنٹ شیڈولڈ کاسٹس پارٹی کے لیڈر ہیم چندر ناسکر

(Nasker) اور اینگلو انڈین گروپ کے نمائندہ جے۔ڈبلیو۔چپن ڈیل(Chippendale) نے اس کی تائید کی۔فضل الحق نے اس انتخاب کے بعد اپنی مختصر تقریر میں توقع ظاہر کی کہ اس پارٹی کی تشکیل کے نتیجے میں بنگال میں بہت کچھ ہوگا۔اس پارٹی کا پیغام بنگال کے ہر گاؤں میں پہنچے گا اور بنگال اپنے معاشی اور دوسرے مسائل حل کرنے کے لئے متحد رہے گا۔''[24] اسی دن مسلم لیگ اور پرجا پارٹی پر مشتمل کولیشن پارٹی کا جس کی تشکیل 1937ء میں ہوئی تھی، اجلاس ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ آئندہ اس پارٹی کے 72 ارکان کے گروپ کا نام مسلم لیگ اسمبلی پارٹی ہوگا اور ایم۔بی۔ملک کی زیر قیادت بعض اچھوت ارکان اسمبلی اس پارٹی کی حمایت کریں گے۔''

5 دسمبر 1941ء کو قائد اعظم جناح نے ایک بیان میں بنگال اسمبلی کے مسلم لیگی ارکان کو اس بنا پر مبارک باد دی کہ انہوں نے سر ناظم الدین کی زیر قیادت اپنی ایک الگ اسمبلی پارٹی بنالی ہے۔''میں صوبائی اسمبلی کے سارے مسلم ارکان سے بالعموم اور مسلم لیگی ارکان سے بالخصوص اپیل کرتا ہوں کہ وہ تقریباً نصف درجن مختلف النوع گروپوں کی سازشوں کے سد باب اور مسلم بنگال کی یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لئے اس پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ان مختلف النوع گروپوں نے کولیشن پارٹی محض مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بنائی ہے۔مجھے افسوس ہے کہ فضل الحق ان گروپوں کی سازشوں میں شریک رہا ہے اور اب وہ مسلم لیگ سے الگ ہو گیا ہے۔وہ کافی عرصہ سے مسلم لیگ کی کمر میں چھرا گھونپنے کی کوشش کر رہا تھا۔مجھے امید ہے کہ اب جبکہ وہ کھلم کھلا لیگ سے الگ ہو گیا ہے تو مسلم لیگ پارٹی صحت مند اور باعزت خطوط پر کام کرے گی۔'' فضل الحق نے اسی دن جناح کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے صدر مسلم لیگ کو یقین دلایا کہ ''پروگریسو کولیشن پارٹی کے مسلمان ارکان ابھی تک مسلم لیگ کے وفادار ہیں۔میں نے کبھی بھی مسلم لیگ کی کمر میں چھرا گھونپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میری کابینہ کا ایک گروپ کچھ عرصہ سے کھلم کھلا میری مخالفت کر کے میری کمر میں چھرا گھونپنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔''[25] فضل الحق کے اس بیان سے ظاہر تھا کہ وہ بنگال کی مسلم رائے عامہ سے خوفزدہ تھا اور وہ اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس نے مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے غداری نہیں کی بلکہ اس نے حسین شہید سہروردی اور بعض دوسرے غیر بنگالی مسلمانوں کی سازشوں کی وجہ سے پروگریسو کولیشن بنائی ہے۔بالفاظ دیگر وہ بیک وقت مطالبہ پاکستان اور بنگال نیشنلزم کی دو کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے خلاف مسلم

رائے عامہ کے طوفان کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

7 ردسمبر کو صوبائی گورنر سر جان ہر برٹ (John Herbert) نئی صوبائی کابینہ کی تشکیل کے لئے فضل الحق، سر ناظم الدین اور بعض دوسرے لیڈروں سے صلاح مشورہ کر رہا تھا کہ جاپانیوں نے یکا یک پرل ہاربر، ہوائی اور ملایا پر حملہ کر کے بنگال کی جنگی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ جاپانیوں کے اس حملے سے جنوب مشرقی ایشیا اور بحر الکاہل کا پورا علاقہ عالمی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ برصغیر اس تباہ کن جنگ سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ 8 ردسمبر کو برطانیہ اور امریکہ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو اسی دن سر جان ہر برٹ کے دفتر سے یہ اعلان ہوا کہ یکم دسمبر کو صوبائی کابینہ کے جن دس ارکان نے استعفے دیئے تھے وہ منظور کر لئے گئے ہیں۔

باب: 8

بوس برادران، کانگرس اور ہندومہا سبھا کے تعاون سے فضل الحق کی دوسری حکومت (1941ء تا 1943ء)

قائداعظم نے فضل الحق کو پروگریسو کولیشن پارٹی کے قائد کے طور پر وزیراعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہی لیگ سے خارج کردیا

11/دسمبر 1941ء کو فضل الحق نے صوبائی گورنر سے ملاقات کی۔ اس موقع پر مہاسبھائی لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی بھی اس کے ساتھ تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب وہ گورنر ہاؤس سے باہر آیا تو اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ اسے نئی کابینہ بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس کی یہ کابینہ 15 ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور نواب حبیب اللہ بہادر آف ڈھاکہ بھی شامل ہوں گے۔ اسمبلی میں پروگریسو کولیشن پارٹی کے ارکان کی تعداد 134 ہوگی۔ مسلم لیگ پارٹی کے ارکان کی تعداد 55 سے 60 تک ہوگی اور یورپین گروپ کی تعداد 25 ہوگی۔

فضل الحق کے اس اعلان کے چند گھنٹے بعد صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کی جانب سے ''شیر بنگال'' کو مسلم لیگ سے خارج کردیا گیا اور حکومت ہند کے حکم کے مطابق سرت چندر بوس کو، جس کی کوششوں سے پروگریسو کولیشن پارٹی بنی تھی اور جس کی تجویز پر فضل الحق کو اس پارٹی کا قائد منتخب کیا گیا تھا، اس الزام کے تحت گرفتار کرلیا گیا کہ ''اس نے جاپانیوں کے ساتھ رابطے قائم کر رکھے ہیں۔'' بوس کی گرفتاری سے کچھ دیر قبل نئے وزیراعلیٰ فضل الحق اور مہاسبھائی لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اس سے ملاقات کی تھی جبکہ پروگریسو کولیشن پارٹی کے

تقریباً 50 ارکان اس کے مکان کے باہر نئی کابینہ کے ارکان کی حتمی فہرست کا انتظار کر رہے تھے۔ بظاہر ان سب کو اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ بنگال کا نیا ''بادشاہ گر'' تھوڑی ہی دیر بعد کلکتہ کے جیل خانے میں قید ہوگا۔

12 / دسمبر کی صبح کو فضل الحق نے اپنے رفقا ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی اور نواب بہادر ڈھاکہ کے ہمراہ حلف اٹھایا۔ نواب ڈھاکہ، چند دن پہلے جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی بنی تھی، اس کا بھی رکن تھا اور اس نے 4 / دسمبر کو 72 مسلم ارکان اسمبلی کی اس میٹنگ کی صدارت کی تھی جس میں اس وزارتی کولیشن پارٹی کو توڑنے کا اعلان کیا گیا تھا جو 1937ء میں بنی تھی اور جس میں مولوی فضل الحق کی غداری کی زوردار الفاظ میں مذمت کی گئی تھی لیکن اس میٹنگ کے بعد جب ''ترقی پسندوں'' نے اسے وزارت کا لالچ دیا تھا تو بڑی بے شرمی سے اپنے چند ساتھیوں سمیت مسلم لیگ کو چھوڑ کر پروگریسو کولیشن پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس کا صدر ابوالکلام آزاد ان دنوں کلکتہ میں ہی تھا اور عام تاثر یہ تھا کہ نواب ڈھاکہ کی قلابازی میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ آزاد نے 7 / دسمبر کو بنگال کانگرس (سرکاری) پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر کرن شنکر رائے سے طویل ملاقات کر کے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ نئی پروگریسو پارٹی میں شامل ہوئے بغیر اسمبلی میں اس کی غیر مشروط حمایت کرے۔

مسلمانوں کے حقوق سے انحراف کرنے والا فضل الحق، بوس برادران اور مہاسبھا کے نزدیک قابل ستائش ٹھہرا

12 / دسمبر کو حلف وفاداری اٹھانے کے بعد وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اسمبلی کی عمارت میں پروگریسو کولیشن پارٹی کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے سرت چندر بوس کو خراج تحسین پیش کر کے اعلان کیا کہ ''جو نیک کام بوس ادھورا چھوڑ گیا ہے اسے ہم انجام دیں گے۔ ہم ایک بہتر اور خوشحال بنگال کی تعمیر کریں گے۔ ایک زمانہ تھا جب بنگال پورے انڈیا کی قیادت کیا کرتا تھا لیکن اب اندرونی اختلافات کے سبب بنگال نے حالیہ سالوں میں اپنا یہ قابل فخر مقام کھو دیا ہے۔ ہم بنگال کو اس کا یہ مقام دلائیں گے۔''[1] فضل الحق کی یہ تقریر پالیسی تقریر تھی اور اس سے ظاہر تھا کہ وہ آئندہ محض بنگالی نیشنلزم کے زور پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اب اس کی نظر میں مسلمانوں

کے حقوق ومفادات نے ثانوی درجہ اختیار کرلیا تھا۔ چنانچہ جب اس شام کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو ایوان نے متفقہ طور پر ایک قرارداد میں حکومت بنگال پر زور دیا کہ وہ سرت چندر بوس کی رہائی کے لئے فوری طور پر مناسب اقدام کرے۔ حزب اختلاف کے قائد سر ناظم الدین نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر صوبائی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ مرکزی حکومت نے جن وجوہ کی بنا پر سرت چندر بوس کو گرفتار کیا ہے وہ درست ہیں تو پھر اسے بوس کی حمایت سے دستبردار ہوکر اس سے بے تعلقی کا اظہار کرنا چاہیے اور اگر صوبائی حکومت مرکزی حکومت کے اس اقدام کو غلط سمجھتی ہے تو اسے بوس کے ساتھ کئے گئے تعاون کے معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے مستعفی ہوجانا چاہیے۔'' وزیر اعلیٰ فضل الحق نے سر ناظم الدین کے اس بیان کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس نے ایوان کو یقین دلایا کہ سرت چندر بوس کی رہائی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔''
فضل الحق کی جانب سے اس یقین دہانی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بوس نے 11 دسمبر کو اپنی گرفتاری کے وقت ارکان اسمبلی کے نام جو الوداعی پیغام لکھا تھا اس میں اس نے اپیل کی تھی کہ انہوں نے 27 نومبر کو جو نیک کام شروع کیا تھا اسے جاری رکھیں۔ پروگریسو کولیشن پارٹی کی یکجہتی کو قائم رکھیں اور اس پارٹی کے لیڈر اے۔ کے۔ فضل الحق کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اگر ہندو اور مسلمان متحد رہیں تو مجھے یقین ہے کہ آئندہ بنگال میں کبھی بھی رجعت پسند وزارت قائم نہیں ہوسکے گی۔''[2] سرت چندر بوس کا یہ پیغام اونچے درجے کے بورژوا ہندو لیڈروں کے اس عمومی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا تھا کہ اگر اسمبلی میں ہندوؤں کا چند مسلمان پٹھوؤں سے گٹھ جوڑ ہوجائے تو معاشرے کی ہر سطح پر فرقہ وارانہ اتحاد ہوجائے گا۔ وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کو ہندو۔ مسلم اتحاد کی بنیاد تصور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے جولائی 1937ء سے لے کر مارچ 1940ء کے اوائل تک بڑی کوششیں کی تھیں کہ کسی طرح کانگرسی لیڈر اس بنیاد پر ہندو۔ مسلم اتحاد کی پائیدار عمارت بنانے پر تیار ہوجائیں مگر جب ان کے دست تعاون کو ہر مرتبہ بہ حقارت ٹھکرا دیا گیا اور پھر 16 مارچ 1940ء کو کانگرس کے رام گڑھ سیشن میں مکمل آزادی کے حصول کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے بعد 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور سیشن میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی۔
بورژوا ہندو لیڈروں کے اس قسم کے مکارانہ رویے کا ایک اور مظاہرہ سرت چندر بوس

کے الوداعی پیغام کے دو ایک دن بعد بھی ہوا جبکہ آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کو اس لئے مبارکباد دی کہ اس نے بنگال کابینہ میں وزارت کا عہدہ قبول کر لیا ہے اور فضل الحق کو اس لئے ہدیۂ تبریک پیش کیا کہ ''اس نے اپنی قیادت میں ایک ''قومی کولیشن'' کی تشکیل کی ہے۔ مجلس عاملہ نے حق وزارت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا اور امید ظاہر کی کہ اس وزارت کے قیام سے صوبہ میں فرقہ وارانہ امن وامان ہو گا۔ ہندوؤں کی جائز شکایات کا ازالہ ہو گا اور ماضی میں ان کے ساتھ جو بے انصافیاں ہوئی ہیں ان کی اصلاح ہو گی۔''[3] ہندو مہا سبھا کی یہ قرارداد بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے درمیانہ طبقہ کے مسلمانوں کی نظروں میں فضل الحق کو مردود قرار دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کی رائے میں یہ قرارداد اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ فضل الحق ہندو راج کے علمبردار ہندو لیڈروں کا پٹھو تھا اور اس نے محض اقتدار کی خاطر مسلمانان بنگال میں پھوٹ ڈالی۔ اس رائے کا اظہار 17 ردسمبر کو صوبہ سرحد کی مسلم لیگ نے فضل الحق کے خلاف ایک قرارداد مذمت کی صورت میں کیا۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''فضل الحق نے مسلم لیگ کو دھوکا دیا ہے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوائی ہے اس لئے صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح نے اس کے خلاف جو انضباطی کاروائی کی وہ بالکل صحیح ہے۔'' 24 ردسمبر کو باقر گنج ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس میں بھی اسی مضمون کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس کانفرنس کے لئے صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کا پیغام یہ تھا کہ ''ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی جماعت میں غداروں اور بھگوڑوں کی بیخ کنی کریں۔ تطہیر کے اس عمل سے ہم زیادہ طاقتور ہوں گے۔'' خواجہ ناظم الدین کی کانفرنس میں تقریر یہ تھی کہ ''ہم نے مسلمانان بنگال میں اتحاد کو برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ ہم نے فضل الحق سے کہا کہ وہ لیگ کے صدر سے معافی مانگ لے لیکن اس نے بنگال میں مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور انہیں واپس چار سال قبل کی حالت میں پہنچا دیا ہے'' اور مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے صدر فضل القادر چودھری کا اعلان یہ تھا کہ ''باریسال کے مسلمان ایسی تحریک چلائیں گے کہ فضل الحق کے عزائم ناکام ہو کر رہ جائیں گے اور یہ تحریک پاکستان کی اسکیم کی کامیابی کے لئے ممد ومعاون ہو گی۔''

تاہم فضل الحق نے بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے جلسوں کی اس قسم کی قراردادوں اور تقریروں کو قابل توجہ نہ سمجھا اور وہ اپنی کابینہ کی توسیع و استحکام میں

مصروف رہا۔ 15 دسمبر کو اس نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے ہمراہ جیل میں سرت چندر بوس سے ملاقات کی اور 17 دسمبر کو اس نے اپنی کابینہ میں مزید چھ ارکان کا اضافہ کیا اور اس طرح اس کی 9 رکنی کابینہ میں پروگریسو کولیشن پارٹی کے مختلف گروپوں کی نمائندگی اس طرح ہوگئی۔ دو کانگرس (بوس گروپ)، ایک مہا سبھائی، ایک اچھوت اور پانچ مسلمان۔ ان وزرا میں محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔ اے۔ کے۔ فضل الحق (وزیر اعلیٰ)	داخلہ اور نشریات
2۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی	خزانہ
3۔ نواب خواجہ حبیب اللہ بہادر آف ڈھاکہ	زراعت وصنعت
4۔ سنتوش کمار باسو	پبلک ہیلتھ، لوکل سیلف گورنمنٹ
5۔ خان بہادر عبدالکریم	تعلیم، تجارت اور محنت
6۔ پرماتھاناتھ بینر جی	ریونیو، انصاف و لیجسلیٹو معاملات
7۔ خان بہادر مولوی ہاشم علی خان	کوآپریٹو، کریڈٹ اور دیہاتی قرضہ جات۔
8۔ شمس الدین احمد	مواصلات و تعمیرات
9۔ رابندر ناتھ برمن	جنگلات اور ایکسائز

اس توسیع شدہ کابینہ کے حلف اٹھانے کے بعد اسمبلی کا اجلاس ہوا تو فضل الحق نے اس کے استحکام کا بندوبست اس طرح کیا کہ اس نے ایوان کے ہندو ارکان کو یقین دلایا کہ اس کی حکومت ثانوی تعلیمی ترمیمی بل کی منظوری کے لئے فی الحال کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔ یہ وہی تعلیمی بل تھا جو 1937ء کے بعد اس کی حکومت کے پروگرام کا اہم ترین جزو بنا رہا تھا۔ اس نے گزشتہ تین چار سال میں سرت چندر بوس، سو بھاش چندر بوس اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی کے ہندو ارباب اختیار، ہندوستان سٹینڈرڈ اور امرت بازار پتریکا کی سرتوڑ مخالفت و خون خرابے کی دھمکیوں کے باوجود کئی مرتبہ اس مسودۂ بل کو منظور کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں 27 نومبر 1941ء کو اسمبلی میں اس کا آخری اعلان یہ تھا کہ ''اسمبلی کا یہ سرمائی سیشن صرف تعلیمی بل منظور کرانے کی غرض سے بلایا گیا ہے۔'' مگر اب وہ اپنی روایت کے مطابق اپنے

اس اعلان سے بھی منحرف ہو گیا کیونکہ جن ہندو گروپوں کے تعاون سے اس کی نئی حکومت قائم ہوئی تھی ان کے لئے یہ بل کسی صورت بھی قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی اس تازہ ترین قلابازی کے فوراً ہی بعد اسمبلی کا اجلاس کسی کاروائی کے بغیر غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

بنگال میں چاول کی قلت......قحط کا پیش خیمہ

18 ردسمبر کو انگریزوں نے ملایا میں پنیانگ کی بندرگاہ خالی کر دی اور پھر 25 ردسمبر کو انہوں نے ہانگ کانگ میں صرف دو دن کی مزاحمت کے بعد جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو کلکتہ کے شہریوں میں خوف و ہراس کی ابتدا ہو گئی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ہوم ممبر ان دنوں کلکتہ میں تھا اور اس کے حکم کے تحت 26 ردسمبر کو سرت چندر بوس کو کلکتہ جیل سے منتقل کر کے مدراس جیل میں بھجوا دیا گیا۔ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے کوشش کی کہ بوس کی مدراس جیل کے لئے روانگی ایک دن کے لئے ملتوی کر دی جائے مگر ہوم ممبر نہ مانا اور سرت چندر بوس کو فوراً ہی مدراس پہنچا دیا گیا جبکہ اس کا بھائی سوبھاش چندر بوس جاپانیوں کی امداد سے ہندوستان کو ''آزاد'' کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کلکتہ کے شہریوں میں خوف و ہراس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عالمی جنگ کے دوران اس شہر اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں چاول کی قیمتوں میں بتدریج خاصا اضافہ ہوا تھا۔ دسمبر 1941ء میں صوبہ میں چاول کا بھاؤ 1939ء کے مقابلے میں 72 فیصد زیادہ تھا۔ اس سال پورے بنگال میں چاول کی کل پیداوار 7 لاکھ 47 ہزار ٹن تھی جبکہ صوبہ کی 60.3 ملین آبادی کو سال بھر کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دس لاکھ 31 ہزار ٹن چاول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ 2,84,000 ٹن کی کمی کو پورا کرنے کے لئے 3,23,000 ٹن چاول درآمد کیا گیا۔ درآمد شدہ چاول کی بڑی مقدار برما سے آئی تھی جس کا اب جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف ممالک سے انگریزوں کی ذلت آمیز پسپائی کے پیش نظر جاپانیوں کے زیر تسلط چلے جانا صاف نظر آتا تھا۔ 23 رجنوری 1942ء کو جاپانیوں نے رنگون پر پہلی مرتبہ بمباری کی تو کلکتہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ چونکہ شہر چھوڑ کر جانے والوں میں اناج کے تھوک اور پرچون بیوپاری بھی شامل تھے، اس لئے شہر میں ضروریات زندگی کی سپلائی کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا اور صنعتی علاقوں میں بے چینی پھیل گئی۔ حکومت نے مزدوروں کی

بے چینی کے سد باب کے لئے کارخانہ داروں سے اناج کی دکانیں کھلوائیں مگر اس سے شہر کی سراسیمگی بڑھ گئی کیونکہ کارخانہ داروں نے ایمپلائرز گرین شاپس کے لئے چاول کی خریداری شروع کی تو اس کی قیمت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ اضافہ اس لئے بھی ہوا کہ دسمبر کے اواخر میں ہندوستان کے بچے بچے کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان جنگ کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ آج نہیں تو کل جاپانی جہاز کلکتہ پر بمباری کریں گے اور ان کی ہوائی فوج خلیج بنگال میں بمباری کر کے کلکتہ اور چٹاگانگ میں بحری جہازوں کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع کر سکتی ہے۔ چنانچہ ذخیرہ اندوزوں، چور بازاری کرنے والوں اور سٹہ بازوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور وہ اناج کے بھاؤ میں روز بروز اضافہ کرتے ہی چلے گئے اور اسی رفتار سے کلکتہ سے عام شہریوں کا انخلا جاری رہا۔

جناح کی طرف سے جنگی مساعی میں تعاون کی پیشکش بشرطیکہ مسلم لیگ کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات دیئے جائیں

صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کو بھی اس سنگین صورت حال کا اچھی طرح احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے 2رجنوری 1942ء کو بمبئی سے اپنے ایک بیان میں انڈین نیشنل کانگرس کے ہندوراج کے نصب العین کی مذمت کرتے ہوئے اپنی اس پیشکش کا اعادہ کیا کہ مسلم لیگ ملکی دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہے بشرطیکہ اسے موجودہ آئین کی حد میں رہ کر مرکزی اور صوبائی حکومت میں حقیقی اختیارات دے دیئے جائیں۔ انہوں نے حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا کہ اگر اس نے 8راگست 1940ء کے اعلان سے انحراف کیا اور ہندوستان کے آئین میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی یا کوئی ایسی تجویز یا سکیم پیش کی جس سے مسلمانوں کے مطالبات کو نقصان پہنچا تو مسلمان اسے وعدہ خلافی تصور کریں گے۔ یاد رہے کہ حکومت برطانیہ کی جانب سے 8راگست 1940ء کو بذریعہ قرطاس ابیض اعلان کا لب لباب یہ تھا کہ ''ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور مستقبل کے لئے آئینی ڈھانچے کی اس طرح کی تشکیل نہیں ہو گی جس سے اس ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ یعنی مسلمان رضامند نہیں ہوں گے۔''[4] برطانیہ نے یہ اعلان ایسے موقع پر کیا تھا جبکہ جاپانیوں کی طرف سے ہندوستان کو فوری خطرہ لاحق نہیں تھا البتہ اس وقت وہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو جرمنی کے حملے سے محفوظ تصور نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب جناح

نے یہ بیان ایسے موقع پر دیا تھا جبکہ جاپان بنگال کی جانب برق رفتاری سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ ان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ اگر بنگال اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں 1935ء کے ایکٹ کے تحت عنان اقتدار مسلم لیگ کے سپرد کر دی جائے تو مسلمانان ہند جاپانیوں کے خلاف جنگی مساعی میں بھرپور تعاون کریں گے۔ جناح کے اس بیان کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جب 25ر دسمبر 1941ء کو ہانگ کانگ میں انگریزوں نے جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے تو اس کے دو ایک دن بعد فضل الحق کی وزارت کے مہاسبھائی وزیر خزانہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے صوبہ بہار کے شہر بھاگل پور میں خلاف قانون اجتماع میں انگریزوں کے خلاف نہایت زہریلی تقریر کی تھی جس کے بعد اسے سر گوکل چند نارنگ اور رائے بہادر مہر چند کھنہ کے ساتھ ایک دن کے لئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

بنگال کی مسلم رائے عامہ فضل الحق کے سخت خلاف ہو گئی...... مسلم لیگ کی ایجی ٹیشن اور طاقت کے مظاہرے

جناح کے اس بیان کے دو دن بعد 4ر جنوری 1942ء کو بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری حسین شہید سہروردی نے ایک بیان میں مسلمانان بنگال کو ہدایت کی کہ وہ جگہ جگہ جلسے کر کے فضل الحق اور نواب ڈھاکہ کی مذمت کریں جنہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی ہے اور گورنر سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ صوبائی اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کرائے کیونکہ اس کے ارکان عوام کے صحیح نمائندے نہیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ ''مولانا اکرم خان، سر ناظم الدین، خان بہادر عبدالمومن، خان بہادر سید معظم حسین 5ر جنوری سے 22ر جنوری تک پورے صوبے کا دورہ کریں گے۔ بلاشبہ مسلم لیگ کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب بنگال کے مسلمان متحد و منظم ہوں گے اور غداروں کو منہ کی کھانی پڑے گی۔''

سہروردی کے اس بیان کے مطابق 12ر جنوری 1942ء کو یعنی ملایا کے دارالحکومت کوالالمپور پر جاپانیوں کے قبضہ کے ایک دن بعد، مسلم لیگ نے کلکتہ میں اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کیا جبکہ سر ناظم الدین کی زیر صدارت اس کے ایک جلسہ عام میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس جلسہ میں فضل الحق اور نواب ڈھاکہ کے خلاف مذمت کی قراردادیں منظور کی گئیں۔ لیگ کی قوت کا دوسرا مظاہرہ 14ر جنوری کو باریسال میں ہوا جبکہ سینکڑوں مسلم طلبا نے

وزیر اعلیٰ فضل الحق کا کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا۔ مقامی پولیس نے طلبا کے اس مظاہرے کے بعد دو طلبا شمس عالم اور عبدالمفیض کو گرفتار کر لیا۔ پھر 15 رجنوری کو نواکھلی میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو ہزاروں مسلمانوں نے اس میں شرکت کر کے فضل الحق کے خلاف پر جوش نعرے لگائے۔ فضل الحق اور اس کے وزرا کے خلاف نعرے صرف مسلم لیگ کے جلسوں میں ہی نہیں لگتے تھے بلکہ ان مقامات پر ایسے نعروں کا زور زیادہ ہوتا تھا جہاں کہیں وہ خود رابطہ عوام کے لئے جاتے تھے۔

17 رجنوری 1942ء کو سر ناظم الدین، خان بہادر عبدالمومن، حسین شہید سہروردی، مولوی تمیز الدین خان اور عبدالرحمان صدیقی پر مشتمل ایک مسلم لیگی وفد نے صوبائی گورنر سے ملاقات کر کے ایک یادداشت میں یہ الزام عائد کیا کہ موجودہ حکومت نواکھلی، فینی اور صوبہ کے بہت سے دوسرے علاقوں پر مسلم لیگی کارکنوں اور مسلمان طلبا پر جبر و تشدد کر رہی ہے۔ اس یادداشت میں حکومت کے غیر جمہوری اور ظالمانہ اقدامات کی پندرہ مثالیں پیش کی گئیں جن میں ایک مثال یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ نواکھلی نے، جس کا صدر ضلع مجسٹریٹ ہے، نواکھلی کے مسلم سکولوں، مکتبوں اور مدرسوں کی گرانٹ بند کر دی ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ ان اسکولوں اور مدرسوں کے لڑکوں نے ان جلسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا جو مسلم لیگ کے لیڈروں کی آمد پر منعقد کئے گئے تھے۔ ایک اور مثال یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق کی فینی سے روانگی کے بعد سات مسلمان طلبا کو مقامی کالج سے نکال دیا گیا اور ان کا وظیفہ بند کر دیا گیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے وزیر اعلیٰ کا کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا تھا اور آخری یعنی پندرھویں مثال یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق اپنی کابینہ کے بعض ارکان کے ہمراہ جس دن فینی پہنچا اس دن مسلح ملٹری سپاہیوں کو کالج ہوسٹل کے چاروں طرف متعین کر دیا گیا اور ان کی بندوقوں کی نالیوں کو ہوسٹل کی کھڑکیوں کے اندر رکھا گیا۔ تمام کھڑکیاں کھلی رکھی گئیں اور طلبا کو حکم دیا گیا کہ وہ ہرگز باہر نہ نکلیں۔ چنانچہ طالب علموں کو بندوق کے زور سے خلاف قانون مقید اور محبوس رکھا گیا۔ ملٹری کے زور و ظلم سے طالب علموں کو قید رکھنے کے علاوہ سارے شہر فینی کو پولیس فورس نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔[5] مسلم لیگی وفد کی اس یادداشت میں عائد کردہ الزامات بے بنیاد نہیں تھے۔ یہ حقیقت تھی کہ فضل الحق نے ہندو کانگرسیوں اور مہا سبھائیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے چند ہی ہفتوں میں مسلمانان بنگال کی نظروں میں اپنی ساکھ بالکل کھو دی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا تھا مسلم عوام مظاہروں اور ہڑتالوں سے

اس کے خلاف خفگی کا اظہار کرتے تھے اس کے برعکس مسلم لیگی لیڈر جہاں کہیں بھی جاتے تھے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا جاتا تھا اور ان کے جلسوں میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے تھے۔

تاہم مسلم لیگی لیڈروں کی جانب سے گورنر کی خدمت میں یادداشت پیش کرنے کی صرف یہی وجہ نہیں تھی۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت ہند نے فضل الحق کے بوس گروپ کے ساتھ گٹھ جوڑ کو پسند نہیں کیا تھا اور عام تاثر یہ تھا کہ اگر برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو حق وزارت کو برطرف کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جس دن رنگون پر جاپانیوں نے بمباری کی اسی دن لاہور کے اخبار انقلاب نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مولوی فضل الحق کو از خود مستعفی ہو جانا چاہیے۔ انقلاب کا اداریہ یہ تھا کہ ''جب بابو سرت چندر بوس کو جاپان سے خفیہ ساز باز کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تو مولوی فضل الحق صاحب نے بنگال اسمبلی میں یہ وعدہ کیا کہ ہم سرت بابو کو رہا کرائیں گے۔ مولوی صاحب سرت بابو کو ''قانون وانتظام'' کی وزارت دینے والے تھے کہ دفعتاً ان کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ اس کے بعد جب بنگال پولیس کے بڑے افسر سرت بابو کو کلکتہ سے ترچنا پلی پہنچانے کے لئے تیار ہو گئے تو مولوی صاحب نے بہت بھاگ دوڑ کی کہ کسی نہ کسی طرح سرت بابو سے ملاقات کریں۔ لیکن بنگال کے وزیر اعلیٰ کو کسی نے سرت بابو کی گاڑی کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ وزارت بنگال نے سرت بابو کی نظر بندی اور وزیر اعلیٰ کی اس تذلیل کے خلاف احتجاج کیا اور مسٹر بوس نے وزارت سے استدعا کی کہ وہ حکومت ہند سے بات چیت کر کے ایک تو انہیں بنگال میں رہنے کا انتظام کر دے دوسرے ان کا کیس ہائی کورٹ کے ججوں سے فیصلہ کرانے پر اصرار کرے لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند نے وزارت بنگال کی تمام استدعاؤں کو رد کر دیا ہے۔ گویا مولوی فضل الحق صاحب نہ تو مسٹر بوس کو رہا کرا سکے نہ ان سے ملاقات کر سکے اور نہ ان کے کیس کو ہائی کورٹ کے سپرد کروا سکے۔ یہ کسی وزیر اعلیٰ کی انتہائی تذلیل ہے جو حکومت ہند کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ ہم حکومت ہند کو اس موقع پر الزام نہیں دے سکتے کیونکہ اس نے واضح اور بین ثبوت کے خلاف ایسی کاروائی ہرگز نہ کی ہو گی۔ لیکن اس واقعہ سے مولوی فضل الحق کی پوزیشن ملک بھر میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً نہایت خراب اور اندیشناک ہو گئی ہے اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی آبرومند طریقہ باقی نہیں رہا کہ فی الفور وزارت سے مستعفی ہو جائیں۔ جس حالت میں حکومت ہند نے ان پر ذرہ برابر اعتماد نہیں کیا، ان کی ایک بات نہیں مانی اور ان پولیس افسروں

سے جو حقیقت میں وزارت ہی کے ماتحت ہیں ان کی حکم عدولی کرائی تو اب ان کے لئے وزارت پر قائم رہنا انتہائی ذلت کی بات ہوگی۔"[6]

روز نامہ انقلاب پنجاب میں جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کا ترجمان تھا اور یونینسٹ پارٹی کا سب سے بڑا نصب العین برطانوی سامراج کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری تھا۔ اس لئے سیاسی مبصرین کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ انقلاب نے مولوی فضل الحق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حکومت ہند کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ حکومت ہند ایسے موقع پر بوس برادران کے حلیف مولوی فضل الحق سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی جبکہ برما سے ہزاروں پناہ گزین آسام اور بنگال میں داخل ہو رہے تھے اور کلکتہ سے روزانہ ہزاروں لوگ اپنی دوکانیں اور مکانات چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ 25/جنوری کو ایسٹ انڈیا ریلوے کے ایک ترجمان کے مطابق 13/دسمبر 1941ء سے 20/جنوری 1942ء تک کلکتہ سے بذریعہ ریل 592،572 افراد باہر گئے حالانکہ عام حالات میں اتنے عرصے میں صرف ڈھائی لاکھ افراد جایا کرتے تھے۔ اس عرصے میں کتنے لوگ دوسرے ذرائع نقل وحمل کے ذریعے یا پیدل کلکتہ چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کی گنتی کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ فضل الحق ماضی میں ہر بات وائسرائے اور گورنر کی مرضی ومنشا کے مطابق کرتا رہا تھا لیکن اس نے بوس گروپ کے ساتھ "ترقی پسندانہ" گٹھ جوڑ ان دونوں کی اجازت کے بغیر اور ان کی مرضی کے خلاف کیا تھا اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ جاپانی فوجیں بنگال کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ لہٰذا حکومت ہند کی فضل الحق سے چھٹکارا پانے کی خواہش قابل فہم تھی۔

بنگال کی مسلم رائے عامہ حکومت ہند کی خواہش کی تکمیل کے لئے بہت مدد ومعاون ہو رہی تھی۔ مسلم لیگی لیڈروں نے 17/جنوری 1942ء کو گورنر کی خدمت میں حق وزارت کے خلاف جو 15 نکاتی یادداشت پیش کی تھی اس کے مکمل متن کی اشاعت کے بعد پورے صوبے کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی مسلم رائے عامہ بہت مشتعل ہوگئی تھی اور ہر جگہ "غدار قوم" کے خلاف مظاہروں اور جلسوں کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ 27/جنوری کو محرم کے موقع پر میمن سنگھ میں مسلمانوں نے ایک میل لمبا جلوس نکالا جس میں دیہاتیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی وہ مختلف اقسام کے اسلحہ سے مسلح تھے اور حق وزارت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ گویا وہ امام حسینؓ کی شہادت پر ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ فضل الحق کی غداری کا ماتم بھی کر رہے تھے۔ 3/فروری کو کلکتہ کے محمد علی پارک میں

تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا جلسہ ہوا جس میں سر ناظم الدین نے فضل الحق حکومت کو متنبہ کیا کہ ''اس نے مسلم لیگ کے خلاف جو سخت گیرانہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ مسلم لیگ کو دبانے کی جس قدر کوشش کی جائے گی حق کی آواز اتنی ہی زیادہ قوت سے بلند ہوگی۔ جیلوں کی سلاخیں اور ہتھکڑیوں کی چھنکار ہمارے جذبہ حقانیت کو دبا نہیں سکتی۔ اگر فضل الحق اس بات پر تلا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو دبا کر ہندو مہا سبھائی ساتھیوں کو خوش کر سکے گا تو یہ اس کی بھول ہے۔ فضل الحق کی مہا سبھائی وزارت پر تنقید سے ڈیفنس آف انڈیا رولز کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اگر فضل الحق جائز نکتہ چینی کو دبانا چاہتا ہے اور نکتہ چینوں کے خلاف ڈیفنس آف انڈیا رولز کے استعمال پر تلا ہوا ہے تو اسے کان کھول کر سن لینا چاہیے مسلم لیگ نے بھی اس امر کا فیصلہ کر لیا ہے کہ قدم قدم پر فضل الحق کی وزارت پر ضرب لگائی جائے گی خواہ اس کے لئے ہمیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ پیش کرنی پڑے...... اگر حکومت غیر آئینی اقدام کرنے پر تلی ہوئی ہے تو ہم بھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر آئینی اقدام کا جواب ایسے ہی اقدام سے دیا جائے گا اور اس کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔'' [7] ناظم الدین کی یہ تقریر حاضرین کے فضل الحق کے خلاف سخت غم وغصہ کی آئینہ دار تھی۔ سر ناظم الدین برطانوی سامراج کا پشتینی وفادار تھا۔ اس کی بسیار خوری اور آرام کوشی نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ ایسے شخص سے کسی پر تشدد ایجی ٹیشن کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن گزشتہ تین چار ہفتوں میں اس نے حسین شہید سہروردی کے ساتھ مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں میں حق وزارت کے خلاف مسلمانوں کا جو پر جوش مظاہرہ دیکھا تھا وہ ایک بزدل گیدڑ کو خوفناک شیر بنانے کے لئے بہت کافی تھا۔ اگر ناظم الدین اپنا سیاسی رویہ کم ازکم لفظی طور پر مسلم رائے عامہ کے اس وقت کے جنگجویانہ موڈ کے مطابق اختیار نہ کرتا تو اس کی اپنی لیڈری ختم ہو جاتی۔

قائداعظم کا دورۂ بنگال اور فضل الحق حکومت کے خلاف بھرپور تقریر

12 رفروری 1942ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کلکتہ پہنچے تو ہوڑہ سٹیشن پر تقریباً چار لاکھ مسلمانوں نے ان کا فقید المثال استقبال کیا اور پھر وہ انہیں پر جوش جلوس کی صورت میں ان کی رہائش گاہ تک لے گئے۔ 16 رفروری کو قائداعظم جناح نے سراج گنج میں مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت کی۔ حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ قائداعظم نے

مسلمانان بنگال کے اس عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے وہ واقعات بیان کئے جو آخرکار مولوی فضل الحق کے آل انڈیا مسلم لیگ سے نکالے جانے کا باعث ہوئے تھے۔ انہوں نے فضل الحق پر غداری، قوم فروشی، ضمیر فروشی، موقع پرستی اور فریب دہی کے الزامات عائد کئے اور کہا کہ ''اس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر جو ''قومی حکومت'' بنائی ہے وہ کس قدر کمزور اور غیر نمائندہ ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس حکومت کی تشکیل قسطوں میں ہوئی ہے۔ تیرہ وہپ مقرر کئے گئے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سنا ہے کہ 230 ارکان کے ایوان میں تیرہ وہپ مقرر کئے گئے ہوں؟ پارلیمنٹری سیکرٹریوں کی تعداد کا اندازہ لگانا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ سارے عہدے کم از کم 50 تو ضرور ہوں گے۔ یہ بنگال کی نام نہاد نیشنل وزارت کی حقیقت ہے۔ ہم ہندوؤں کے مخالف نہیں ہیں۔ نہ ہم ان کی راہ میں روڑا بننا چاہتے ہیں۔ ہم لوگوں کو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فضل الحق اور اس کے ساتھی مسلمانان بنگال کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں سے اس غداری کو فوراً روکا جائے۔ کیا یہ ہمارا حق نہیں کہ ہم فضل الحق کو بتائیں کہ 99 فیصدی مسلمان اس کے خلاف ہیں۔ فضل الحق چاہتا ہے کہ ہم اس سچائی کا اظہار نہ کر سکیں۔ وہ اسی سچ کو دبانے کے لئے ڈیفنس آف انڈیا رولز کا استعمال کر رہا ہے۔ اس قانون کو اس طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس سے یہ مقصود ہے۔ امرت بازار پتریکا نے اس بات کی مذمت کی کہ ڈیفنس رولز کو ہندوؤں کے خلاف استعمال کیا گیا، لیکن اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس کا استعمال جائز ہے۔ میں گورنر کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس بدتمیزی کو فوراً بند کیا جائے ورنہ ایک طوفان برپا ہوگا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ (ہم تیار ہیں کے نعرے) میں نے گورنر اور گورنر جنرل سے اپیل کی تھی کہ اس معاملہ کا فیصلہ عام انتخابات کے ذریعہ کرا لیا جائے۔ اب میں بنگال اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے اپیل کروں کہ اس کی اصلاح کیجئے۔''

قائداعظم نے کانگرس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اب کانگرسی رہنماؤں کے لب ولہجہ میں اعتدال آ گیا ہے۔ راج گوپال اچاریہ نے مدراس کے اخبار ''ہندو'' میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اعتراف کر لیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو مضبوط جماعتیں ہیں۔ کانگرس اور مسلم لیگ۔ بالفاظ دیگر کانگرس کے ایک بہت بڑے لیڈر نے یہ مان لیا ہے کہ کانگرس ایک ہندو جماعت ہے۔ گاندھی کو اس سچائی کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ کانگرس ہندوؤں کی نمائندہ ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں

کی۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد ہم برابری کی حیثیت سے ملیں گے اور کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ جواہر لال نہرو کو تعجب ہے کہ مسلمان کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ میں اس سے کہوں گا کہ تم پریشان نہ ہو۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ ہندوستان کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔"؟

قائداعظم کی اس تقریر کے بعد کانفرنس میں متعدد قراردادیں پاس کی گئیں۔ ان میں سے ایک میں صوبائی اسمبلی کے نئے انتخابات کے لئے گورنر سے نئے احکام جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور موجودہ وزارت پر، جس کو فضل الحق نے آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی اور اس کے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قائم کیا تھا، عدم اعتماد کا اظہار بھی کیا۔ نیز مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے ان نمائندوں سے جنہوں نے اسمبلی اور کونسل کی پروگریسو پارٹی اور پروگریسو کولیشن پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے، مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنی نشستوں سے مستعفی ہو کر نیا انتخاب لڑیں کیونکہ وہ اپنے ووٹروں اور مسلم عوام کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ کانفرنس نے حق وزارت کی اس متشددانہ حکمت عملی کی بھی مذمت کی "جس کے ذریعہ وہ مسلم لیگ کی تنظیم کو دبانا چاہتی تھی، عوام کے حقوق غصب کر رہی تھی اور مسلم طلبا کے خلاف ڈیفنس آف انڈیا رولز کا ناجائز استعمال کر رہی تھی۔" ایک اور قرارداد میں کانفرنس نے اعلان کیا کہ "جب تک مسلمانان بنگال اپنے پاکستان کے نصب العین کو حاصل نہ کر لیں گے اس کی راہ میں پورے استقلال اور ثبات دل کے ساتھ ہر قسم کی امکانی قربانیاں پیش کرتے رہیں گے۔"[8]

رنگون پر جاپان کے قبضہ کے بعد انگریزوں کے لئے حق وزارت قابل قبول نہ رہی کیونکہ اس میں بوس گروپ شامل تھا جبکہ سوبھاش بوس سنگاپور میں جاپانیوں کے ہندوستانی جنگی قیدیوں پر مشتمل آزاد ہند فوج ترتیب دے رہا تھا

جس دن سراج گنج میں مسلم لیگ کی یہ کانفرنس شروع ہوئی تھی، انگریزوں نے اسی دن سنگاپور میں جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس طرح جنوب مشرقی ایشیا میں بے پناہ جنگی اہمیت کا جزیرہ دشمن کے ہاتھ میں چلا گیا تھا اور یہ بات یقینی نظر آنے لگی تھی کہ اب برما جاپانیوں کی دست برد سے نہیں بچ سکے گا۔ چنانچہ 10 مارچ 1942ء کو ایسا ہی ہوا جبکہ رنگون پر

جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد جب بنگالی لیڈر سو بھاش چندر بوس سنگاپور میں ہندوستانی فوج کے جنگی قیدیوں پر مشتمل ایک ''آزاد ہند فوج'' تشکیل دینے میں مصروف ہو گیا اور بنگال کو جاپانیوں اور اس آزاد ہند فوج کے مشترکہ حملے کا فوری خطرہ لاحق ہو گیا تو انگریزوں کو فضل الحق کی وزارت سے، جس میں بوس گروپ کے ارکان بھی شامل تھے، چھٹکارا پانے کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوئی۔ چنانچہ 18 / مارچ کو کلکتہ کے کاروباری انگریزوں کے ترجمان اخبار سٹیٹسمین (Statesman) نے فضل الحق کی وزارت کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ ''ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس حالت میں جاپانی ہندوستان کے دروازے پر پہنچے ہوئے ہیں فضل الحق کی حکومت ہمیں بالکل غیر موزوں اور ناقابل اعتماد نظر آتی ہے۔ فضل الحق پانچ سال سے بنگال کا وزیر اعلیٰ چلا آ رہا ہے۔ اس مدت میں جن مواقع پر اس کے تعلقات بعض وزارتی رفیقوں کے ساتھ ناخوشگوار ہوئے، اس نے اخفا کی سعی کئے بغیر سو بھاش چندر بوس سے گفت وشنید کی۔ حال ہی میں جب وہ وزارت کے لئے پارٹیوں کے موجودہ اشتراک کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہا تھا، جس کی وجہ سے اسے دوبارہ وزارت عظمیٰ مل گئی، تو اس نے اپنی سابقہ وزارت کے ارکان کو یقین دلایا کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس کی وزارت کے طویل عہد میں ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس کی ویسی ہی عزت کریں جیسی ایک بڑے صوبے کے وزیر اعلیٰ کی ہونی چاہیے لیکن ہم نے اپنی بے اطمینانی کو کبھی نہیں چھپایا۔ 1924ء میں فضل الحق وزیر تھا تو سی۔ آر۔ داس اور جے۔ ایم۔ سین گپتا نے متحد ہو کر وزارت کی تنخواہوں کا مطالبہ مسترد کر دیا تھا اور اس طرح فضل الحق کو وزارت سے نکالا تھا۔ اس وقت معاملہ یہ پیش آیا تھا کہ سی۔ آر۔ داس کے اخبار ''فارورڈ'' میں ایک خط شائع ہوا تھا جو ایک رائے بہادر کے نام تھا۔ کہا گیا تھا کہ یہ مولوی فضل الحق کا ہے۔ فضل الحق نے کہا کہ یہ میرا نہیں ہے نیز کہا کہ کھلی ہوئی جعل سازی ہے۔ سی۔ آر۔ داس نے اسمبلی میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''میں اس ایوان میں یہ دعویٰ دہراتا ہوں کہ دستخط فضل الحق کے ہیں۔ اگر اس کو مزید معلومات درکار ہیں تو وہ مجھے جہاں چاہے لے جائے۔ میں اپنے دعوے کو ثابت کروں گا۔ یہ ایوان اس فیصلے کا موزوں مقام نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ میرے خلاف دعویٰ دائر کرے اور عدالت میں لے جائے تو میں ہر دیانت کیش اور غیر جانبدار جج کے اطمینان کے مطابق ثابت کر دوں گا کہ دستخط اس کے ہیں۔ لیکن فضل الحق نے ہماری تجویز کے مطابق نہ تو دعویٰ

دائر کیا اور نہ ہی سیاسی زندگی سے الگ ہوا۔ آج ہم اپنے مطالبہ کو دہراتے ہیں۔ فضل الحق کو سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن موت و حیات کی جنگ ہمارے سامنے ہے اور یہ شخص ایسے نازک موقع پر ہمارا رازدان بننے کے لئے موزوں نہیں ہے۔"[9]

سٹیٹسمین کے اس اداریے کے چار پانچ دن بعد جب 23 مارچ 1942ء کو جاپان نے انڈیمان پر قبضہ کر لیا، 5 اور 6 اپریل کو ہندوستان کے مشرقی ساحل کی بندرگاہ وزیگا پٹم اور لنکا پر بمباری کی اور خلیج بنگال میں انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر بمباری کر کے بنگال کے بحری راستے کو مسدود کر دیا تو فضل الحق، حکومت ہند کے لئے اور بھی زیادہ غیر پسندیدہ شخصیت بن گیا کیونکہ اس کے سیاسی حلیف بوس برادران ہندوستان کو "آزاد" کرانے کے لئے کھلم کھلا جاپانیوں کی امداد کر رہے تھے اور کانگرس میں ایسے عناصر کی کمی نہیں تھی جو جاپانیوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کانگرس کی مجلس عاملہ 2 اپریل 1942ء کو ہندوستان کے مستقبل کے آئینی ڈھانچے کے بارے میں کرپس پلان کو مسترد کر چکی تھی اور عام تاثر یہ تھا کہ گاندھی جسے 16 مارچ 1940ء کو سول نافرمانی کی تحریک کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا تھا اس نازک موقع پر انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لئے پرتشدد ایجی ٹیشن شروع کرے گا۔

دوسری طرف صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح بھی جاپانیوں کے خلاف بھرپور تعاون کے لئے یہ شرط عائد کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے واضح الفاظ میں ضمانت دی جائے۔ ان کی 5 اپریل 1942ء کو الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں تقریر یہ تھی کہ "ہمیں غیر ملکی حملے کے خطرے کا پورا پورا احساس ہے۔ ہم دفاع وطن کے سلسلے میں اپنی بے قراری کا اظہار بھی کر سکتے ہیں اور جنگی مہم میں بھی امداد دے سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم اپنے مستقبل سے ہرگز غافل نہیں ہو سکتے۔ کرپس پلان میں پاکستان کو مبہم طور سے تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ اس کو صاف الفاظ میں تسلیم کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہاں فلسطین کی تاریخ دہرائی جائے۔" 7 اپریل کو مسلم لیگ کے اس اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے فضل الحق کے مسلم لیگ سے اخراج پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ "فضل الحق نے ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص مفاد ملت کے ساتھ بار بار غداری کر کے مسلمانوں کا اعتماد کھو دیا ہے۔" ایک اور قرارداد میں حکومت ہند کی توجہ اس امر کی طرف دلائی گئی

کہ ''اناج کی کمی کی وجہ سے ہندوستان میں خوفناک صورت حال رونما ہو رہی ہے۔ بالخصوص گندم، دھان اور دال کی کمیابی نے قیامت بپا کر رکھی ہے۔''

انگریزوں نے بنگال پر جاپانی حملہ کے خطرہ کے پیش نظر بوکھلاہٹ میں ایسے ہنگامی اقدامات کئے جو قحط کا سبب بن گئے

مسلم لیگ کی آخری قرارداد کا اہم ترین پس منظر یہ تھا کہ خلیج بنگال میں جاپانیوں کی بحری اور ہوائی فوجوں کی کامیاب سرگرمیوں اور برما میں ان کی بری فوج کی کلکتہ کی جانب پیش قدمی کی وجہ سے صوبہ بنگال کے عوام کی زندگی بالکل درہم برہم ہوگئی تھی۔ حکومت ہند نے صوبہ کے ساحلی اضلاع سے اہم سرکاری ریکارڈ منتقل کر دیا تھا۔ کلکتہ شہر تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ آئندہ سردیوں کے موسم میں اس شہر پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ پورے صوبے میں ریل گاڑیوں، لاریوں، ٹرکوں، بیل گاڑیوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ بالخصوص چٹاگانگ، نواکھلی اور تپرہ کے اضلاع کی حالت بہت بری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان اضلاع نے محاذ کے عقب میں میدان جنگ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ برما سے ہر روز ہزاروں پناہ گزین براستہ آسام ان اضلاع میں پہنچ رہے تھے اور چاروں اطراف نفسانفسی کا دلخراش منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس صورت حال میں برطانیہ کے اعلیٰ فوجی حکام نے بنگال کے ساحلی علاقوں میں ''انکار'' کی تباہ کن پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پالیسی کے تحت اپریل کے وسط میں یہ کیا گیا کہ مدناپور، باقر گنج اور کھلنا کے اضلاع کے لوگوں کے پاس جو ''فالتو'' اناج تھا وہ سرکاری کارندوں کے ذریعہ زبردستی ''خرید'' لیا گیا۔ اس ظالمانہ اقدام کی ایک وجہ یہ تھی کہ برما سے چاول کی فراہمی بند ہوگئی تھی اس لئے کلکتہ اور اس کے گرد ونواح میں مقیم افواج کے لئے اناج کی ضرورت ان اضلاع کے عوام الناس کو اناج سے زبردستی محروم کر کے پوری کی گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز فوج کی رائے میں بنگال کے ساحلی علاقوں پر جاپانیوں کا قبضہ بعید از امکان نہیں تھا اسی لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان ساحلی علاقوں کا ''فالتو'' اناج جاپانیوں کے ہاتھ لگ جائے۔ تاہم ان دونوں اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال کے ساحلی علاقوں میں اناج کی زبردست قلت ہوگئی اور شمالی علاقوں میں اس کے بھاؤ میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

دوسرا اقدام 16 اپریل 1942ء کو صوبائی حکومت کے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے کیا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ ''فوجی ضروریات اور ملک کی حفاظت کی تیاریوں کی خاطر بڑے علاقوں کو مختصر نوٹس پر جبراً خالی کرایا جائے گا۔ اس لئے ان علاقوں کے باشندوں کو ہر تکلیف کا سامنا کرنا ہو گا۔ حکومت لوگوں کی ایسی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے سخت اقدام پر غور وخوض کررہی ہے۔ یہ انتظام کیا گیا ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو سکے لوگوں کو طویل نوٹس دیا جائے۔ ڈسٹرکٹ افسروں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی منظوری کا انتظار کئے بغیر لوگوں کی امداد کے لئے ضروری اخراجات کریں۔ جن لوگوں کو بیدخل کیا جائے گا ان کے لئے عارضی پناہ گاہیں تعمیر کی جائیں گی۔ حکومت ان کی امداد کے لئے فنڈ جاری کرے گی اور اگر ممکن ہو سکا تو انہیں خاص رعایتیں دی جائیں گی۔ ڈسٹرکٹ افسروں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ پناہ گزینوں کی خاطر زمینوں پر قبضہ کریں۔ حکومت ان زمینوں سے نکلنے اور نئے گھر بنانے کے اخراجات، فصل کی قیمت اور ٹیوب ویل لگانے کے اخراجات خود برداشت کرے گی۔'' مگر عملی طور پر اس سرکاری اعلان کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور لاکھوں اس اقدام کی وجہ سے خانماں برباد ہو گئے۔

تیسرا اقدام یکم مئی کو کیا گیا اور وہ یہ تھا کہ ڈیلٹا کے وسیع علاقے میں ایسی کشتیوں کی آمدورفت پر سخت پابندی لگا دی گئی جن میں دس سے زیادہ مسافر بیٹھ سکتے تھے۔ یہ ممنوعہ علاقہ مشرق میں چاند پور سے لے کر مغرب میں باریسال، کھلنا، بالسر ہاٹ، ڈائیاماؤنٹ ہاربر اور کھرگ پور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے میں دشمن کو حملہ کے وقت بڑی کشتیاں دستیاب نہ ہو سکیں۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس علاقے میں ریلوے اور سڑکوں کی عدم موجودگی میں عوام کی نقل وحرکت اور ضروریات زندگی کی نقل وحمل تقریباً بند ہو گئی اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے اور دور دور تک قحط کے آثار نظر آنے لگے۔ بالخصوص ماہی گیروں کی حالت بہت ہی بری ہو گئی۔ وہ کہیں بھی مچھلیاں نہیں پکڑ سکتے تھے اور ان کے پاس کوئی اور ذریعۂ روزگار نہیں تھا۔ ان کی بے روزگاری سے شہروں کے لوگ بھی متاثر ہوئے کیونکہ مچھلی ان کے روز مرہ کی خوراک کا اہم جزو تھا۔ فیمن (Famine) انکوائری کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ان اقدامات سے مشرقی اور جنوبی بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، عوام الناس کو بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ مرکزی اور صوبائی حکومت دونوں ہی کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔

فضل الحق نے بنگالی مسلم رائے عامہ میں اپنی ساکھ کھونے کے بعد قائد اعظم کو غیر اسلامی، غیر جمہوری، متکبر اور فرعون قرار دیتے ہوئے ایک نئی پروگریسو مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا اور پھر اس سے منحرف ہو گیا

وزیر اعلیٰ فضل الحق کی رسوائی کی حالت یہ تھی کہ اپریل 1942ء میں صوبائی اسمبلی کے مسلم حلقہ نٹور میں ضمنی انتخاب ہوا تو اس کی پارٹی کے امیدوار کو صرف 840 ووٹ ملے اور اس کے مقابلے میں مسلم لیگی امیدوار 10843 ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوا۔ اس انتخابی نتیجہ پر لاہور کے روزنامہ انقلاب کا 23/ اپریل کو تبصرہ یہ تھا کہ ''اب مولوی فضل الحق کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمان کس طرف ہیں۔ اگر آج انتخابات ہو جائیں تو مولوی صاحب کی پارٹی کا کہیں نام و نشان بھی نظر نہ آئے۔ فارورڈ بلاک اور مہا سبھا والے کہا کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو ساتھ ملا کر ایک مشترکہ وزارت بنا رکھی ہے۔ کیا یہی وہ مسلمان ہیں جن کے تعاون پر ہندوؤں کو ناز ہے؟ اور ان کو عامتہ المسلمین میں کوئی ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا؟ دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ مولوی صاحب مع اپنی پارٹی کے مستعفی ہو جائیں اور ان لوگوں کو حکومت بنانے کا موقع دیں جن کی پشت پر عوام ہیں۔ آج کل بنگال کو بیرونی حملے کا فوری اندیشہ ہے۔ ایسی خطرناک حالت میں ایسی غیر ہر دلعزیز پارٹیوں کا حکومت میں شامل رہنا امن عامہ کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا اور جس قدر جلد موجودہ مخلوط وزارت کا ڈھونگ ختم کر دیا جائے اسی قدر عوام کے لئے باعث فلاح ہو گا''

فضل الحق نے برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے مسلم حلقوں کے اس مطالبہ کا جواب 16/ مئی 1942ء کو اس طرح دیا کہ اس نے نواب مرشد آباد، نواب ڈھاکہ، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، این۔ جی۔ چیٹر جی، عبدالحلیم غزنوی، ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے، سر منتھارام مکرجی، سر طارق امیر علی، سید بدرالدجیٰ اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن نلنی رنجن سرکار کے ساتھ مل کر مشترکہ اعلان کیا کہ ''فرقہ پرستی کے خاتمہ کے لئے مستقبل قریب میں ایک ہندو۔ مسلم اتحاد کانفرنس بلائی جائے گی۔ یہ اعلان ڈھاکہ کے فسادات کی انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کے پیش نظر کیا گیا تھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ جب تک صوبہ کی اہم سیاسی اور فرقہ وارانہ تنظیموں اور لیڈروں کے نظریے میں بنیادی تبدیلی نہیں لائی جائے گی اور مذہبی اور سیاسی رواداری کو فروغ نہیں دیا جائے گا اس وقت تک

صوبہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی قائم رہے گی۔" 17 مئی 1942ء کو اس نے مدنا پور میں عوام سے اپیل کی کہ وہ غیر ملکی حملے کے خطرے کے پیش نظر فرقہ وارانہ اتحاد قائم کریں۔

25 مئی کو کشتیا میں کرشک پرجا پارٹی کی کانفرنس ہوئی جس میں فضل الحق نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ہندوستان کے آئندہ کے آئینی ڈھانچے کے بارے میں تنازعہ سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کلی طور پر خودمختار اور بااختیار یونٹوں پر مشتمل ایک ایسی فیڈریشن آف انڈین ری پبلکس کی تشکیل کی جائے جس کے واضح اختیارات ہوں۔ یکم جون 1942ء کو فضل الحق نے کلکتہ میں اپنی پروگریسو کولیشن پارٹی کی جانب سے نیشنل لبرل فیڈریشن آف انڈیا کے صدر سر بیجائے پرشاد سنگھ رائے کی یہ تجویز مسترد کروا دی کہ "چونکہ جنگ ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گئی ہے اس لئے ملک میں سارے سیاسی عناصر پر مشتمل ہر سطح پر ایک جنگی کابینہ بنائی جائے۔" پارٹی نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ "جو عناصر فضل الحق کو اپنا قائد تسلیم نہیں کرتے، پروگریسیو پارٹی کے پروگرام اور نظم وضبط کی پابندی نہیں کرتے، انہیں کابینہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"

اور پھر 20 جون کو فضل الحق نے ایک پروگریسو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر کے قائداعظم جناح کی مسلم لیگ کی قیادت کو چیلنج کر دیا اور اس نے برصغیر کے سارے ممتاز مسلمان لیڈروں کے نام ایک خط میں اس الزام کی تردید کی کہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنی پروگریسو کولیشن وزارت بنا کر میر جعفر کی طرح مسلمانوں کے نصب العین سے غداری کی ہے۔ اس نے اپیل کی کہ "مسلم لیگ کو غیر اسلامی لیڈروں کے شکنجے سے چھڑایا جائے۔ مسلم لیگ کا موجودہ ماحول سراسر غیر اسلامی اور غیر جمہوری ہے۔ اس میں صرف ایک شخص کی مرضی کارفرما ہوتی ہے اور یہ واحد شخص متکبر ترین فرعون سے بھی زیادہ ضدی اور رعونت پسند ہے۔ لیگ میں سارا اختیار ایک شخص کے پاس ہے جسے قائداعظم کہتے ہیں۔ اس میں اظہار خیال کی کوئی آزادی نہیں۔ موجودہ مسلم لیگ میں جمیعت العلمائے ہند کے جید علما، مومنین، پنجاب کے احرار اور خاکسار، سرحد کے خدائی خدمتگار اور سندھ و دوسرے صوبوں کے بیشتر مسلمان شامل نہیں ہیں۔ میری پروگریسو مسلم لیگ میں یہ سارے عناصر شامل ہوں گے۔" اس نے اپنی اس مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے جو کمیٹی بنائی اس کا صدر نواب ڈھاکہ اور سیکرٹری سید بدرالدجیٰ تھا۔ لاہور کے اخبار سول اینڈ

ملٹری گزٹ نے کلکتہ سے موصول شدہ یہ خبر اپنی 21ر جون کی اشاعت میں شہ سرخی کے ساتھ شائع کی اور 23ر جون کو اسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''ڈھاکہ کے مختلف علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں چار افراد ہلاک اور 17 زخمی ہوئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے رات کو دس بجے سے صبح سات بجے تک کرفیو لگا دیا ہے۔'' اور اس کے ساتھ یہ خبر بھی چھپی کہ حکومت ہند نے آل انڈیا فارورڈ بلاک (فضل الحق کی حلیف پارٹی) کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔

23ر جون 1942ء کو بنگال میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد سر ناظم الدین نے لاہور میں ایک بہت بڑے جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فضل الحق بہت متلون مزاج اور جذباتی آدمی ہے۔ اگر یہ شخص کل ایک بیان میں اپنے آج کے بیان کی تردید کر دے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔ بنگال کے 90 فیصد مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ اس کا ثبوت نٹور کے ضمنی انتخاب میں مل گیا ہے جس میں فضل الحق کی انتہائی کوشش کے باوجود سرکاری امیدوار کو بری طرح شکست ہوئی ہے۔''

لیکن پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان نے غیر مبہم الفاظ میں فضل الحق کی مذمت نہ کی۔ اس نے ایک انٹرویو میں اس سلسلے میں صرف یہ کہا کہ ''فضل الحق نے پروگریسو مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر کے ہندوستان کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ اپنا نقطۂ نگاہ مسلم لیگ کے اندر رہ کر پیش کرتا تو یہ بات اس کے لئے بہتر ہوتی۔ اگر اسے اپنی طاقت کا یقین ہے تو اسے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' سر سکندر کے اس انٹرویو کا مطلب دراصل یہ تھا کہ فضل الحق نے قائداعظم جناح کے خلاف فرعونیت اور مطلق العنانیت کا جو الزام عائد کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ مسلم لیگ کے اندر رہ کر جناح کے خلاف محاذ بناتا۔ سر سکندر بھی فضل الحق کی طرح قائداعظم کی روز افزوں سیاسی قوت کو ناپسند کرتا تھا لیکن وہ پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ سے خوفزدہ ہونے کے باعث کھلم کھلا اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ لاہور میں ملک برکت علی اس شہری درمیانہ طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس نے 24ر جون 1942ء کو ایک بیان میں فضل الحق کی سخت مذمت کرتے ہوئے رائے ظاہر کی ''اگر جنگ کی وجہ سے عام انتخابات ملتوی نہ ہوتے تو اب تک فضل الحق کی سیاسی موت واقع ہوگئی ہوتی۔'' ملک برکت علی کی یہ رائے بے بنیاد نہیں تھی کیونکہ فضل الحق کے ہندو۔ مسلم اتحاد کے پرچار کے باوجود بنگال

میں فرقہ وارانہ خونریزی ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ ڈھاکہ میں روزانہ کئی افراد ہلاک وزخمی ہوتے تھے اس لئے حکومت نے 6رجولائی 1942ء کو مجبوراً 1941ء کا آرڈیننس پھر نافذ کردیا جس کے تحت مقامی حکام کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ فسادزدہ علاقوں میں اجتماعی جرمانے عائد کریں۔

اس آرڈیننس کے نفاذ کے چار پانچ دن بعد فضل الحق کو بظاہر اس تلخ حقیقت کا احساس ہوگیا جس کی نشاندہی ملک برکت علی نے اپنے 24رجون کے بیان میں کی تھی۔ چنانچہ ''شیر بنگال'' سرناظم الدین کی 23رجون کی پیش گوئی کے مطابق اپنے 20رجون کے بیان سے منحرف ہوگیا۔ اس نے 11رجولائی کو لکھنؤ میں ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ ''میں نے ابھی تک پروگریسو لیگ کے قیام کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ میں مسلم لیگ سے اس مضمون کی ایک آخری اپیل کرنے کا خواہاں ہوں کہ میرے ساتھ انصاف کیا جائے۔ جناح نے 10ردسمبر 1941ء کو مجھے مسلم لیگ سے خارج کرنے کا جو حکم صادر کیا تھا وہ انتہائی غیر منصفانہ، آمرانہ اور غیر ضروری تھا۔'' پھر 9راگست کو فضل الحق نے کانگرس کی 8راگست کی قرارداد (ہندوستان چھوڑ دو) پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اور قلابازی کھائی اور اپنی 41-1940ء کی اس تجویز کا اعادہ کیا کہ ''مرکز اور صوبوں میں ساری پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل قومی حکومتیں قائم ہونی چاہئیں۔''

کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک۔ کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاریاں اور ہندوؤں کی ایجی ٹیشن، فضل الحق نے کانگرس کی ہمنوائی کی...... مسلم لیگ نے فرقہ وارانہ تصفیہ کی اولیت پر زور دیا

فضل الحق کا متذکرہ بیان بہت بعد از وقت اور غیر حقیقت پسندانہ تھا کیونکہ 9راگست 1942ء کی صبح تک گاندھی سمیت کانگرس کی مجلس عاملہ کے سارے ارکان گرفتار کئے جاچکے تھے اور کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں میں ممتاز کانگرسیوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ 10اور 11راگست کو کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے۔ مظاہرین تقریباً سو فیصدی ہندو تھے۔ تاہم مشرقی یو۔ پی۔ کی طرح کوئی پرتشدد واردات نہ ہوئی۔ 12راگست کو بنگال ہندو مہاسبھا کی مجلس عاملہ نے اس امر پر احتجاج کیا کہ ''اگرچہ گاندھی کوئی تحریک شروع کرنے

سے پہلے وائسرائے، چرچل اور روز ویلٹ سے رابطہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا لیکن حکومت ہند نے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان باعزت تصفیہ کے امکانات کا جائزہ لئے بغیر اس بحران میں جبر و تشدد کی پالیسی اختیار کی ہے۔'' مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کہ ''حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں نیشنلسٹ انڈیا کے بنیادی مطالبہ کو نظرانداز کر کے ہندوستان کے تحفظ اور اتحادیوں کے نصب العین کو نقصان پہنچایا ہے'' مہاسبھا کی یہ قرارداد بالکل واضح تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کٹر ہندوؤں کی یہ جماعت برصغیر کے صرف ان عناصر کو نیشنلسٹ تصور کرتی تھی جو بورژوا پارلیمانی نظام حکومت کے تحت ہندوؤں کے بالائی طبقہ کی آمریت کے خواہاں تھے۔ یہ جماعت جواہر لال نہرو کے اس موقف سے بھی متفق تھی کہ ہندوستان میں صرف دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک کانگرس یعنی ہندو اور دوسری حکومت برطانیہ یعنی انگریز۔ ان دونوں کے درمیان سمجھوتے کو وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان سمجھوتہ قرار دیتی تھی۔ اس کے نزدیک مسلم لیگ اور مسلم اقلیت دونوں ہی کسی شمار میں نہیں آتی تھیں۔

قبل ازیں 11 راگست کو بنگال کی کمیونسٹ پارٹی بھی مہاسبھا کی یہ کہہ کر ہمنوائی کر چکی تھی کہ گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی گرفتاری سے فاشسٹوں کی جارحیت کے خلاف قومی تنظیم کے کام میں رکاوٹ حائل ہوگی۔ بیوروکریسی نے پرامن تصفیہ کی بجائے جبر کی پالیسی پر انحصار کیا ہے۔ ہم گرفتاریوں کے خلاف زوردار احتجاج کرتے ہیں کیونکہ اس طرح عوام الناس میں بیگانگی پیدا ہوگی اور جاپانی فاشسٹوں کو حملہ کرنے کی ترغیب ملے گی۔ موجودہ سنگین بحران میں ساری پارٹیوں کو متحد ہو کر کانگرسی لیڈروں کی رہائی کروانی چاہیے تاکہ قومی حکومت کے قیام کے لئے قومی تصفیہ ہو سکے اور عوام کو فاشسٹ جارحیت کے خلاف جنگ مزاحمت کے لئے منظم کیا جا سکے۔''[10] کمیونسٹ پارٹی کا یہ بیان موقع پرستانہ تھا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوؤں کے جو عناصر کانگرس سے ہمدردی رکھتے ہیں ان کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اس بیان میں اس حقیقت کو نظرانداز کیا گیا تھا کہ کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ تصفیہ کے بغیر 16 رمارچ 1940ء سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور اس نے 8 راگست 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی قرارداد ایسے موقع پر منظور کی تھی جبکہ جاپانی فوجیں بنگال کے ساحل تک پہنچ گئی تھیں اور سوبھاش چندر بوس نے سنگاپور میں اپنی آزاد ہند فوج کی داغ بیل ڈال دی تھی اور ہندو مہاسبھا اور

فارورڈ بلاک کے تین وزرا مستعفی ہونے کی دھمکیاں دے چکے تھے۔ انہوں نے اس طرح کی دھمکیاں اگست کے اواخر میں بھی دی تھیں مگر ان کو جامہ عمل نہ پہنایا اور کانگرس تنہا بنگال میں کوئی زیادہ گڑ بڑ نہ کر سکی تھی۔ برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل کا 10 ستمبر 1942ء کا یہ بیان سراسر بے بنیاد نہیں تھا کہ "کانگرس کارخانہ داروں اور ساہو کاروں کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے اور اس جماعت کی پر تشدد سرگرمیوں میں جاپانی جاسوس بھی ملوث ہیں۔"

13 ستمبر 1942ء کو ضلع بردوان میں کالنا میونسپلٹی کانگرسیوں کے ہنگاموں سے بری طرح متاثر ہوئی۔ اس قصبہ میں مشتعل ہجوم نے ڈاک خانہ، ریلوے سٹیشن اور تار گھر کو نقصان پہنچایا اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ریسٹ ہاؤس کو آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح ضلع ڈھاکہ کے قصبہ گندار یا اور ضلع مرشد آباد کے قصبہ بل ڈنگا میں زبردست فسادات ہوئے۔ 15 ستمبر کو منشی گنج کے نزدیک بکرم پور میں بھی ڈاکخانے کے نزدیک ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلائی جس سے تین افراد ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔

16 ستمبر کو صوبائی گورنر سر جان ہربرٹ نے بنگال لیجسلیٹو کے مشترکہ سیشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "بنگال کو محوری طاقتوں کے حملے کا زبردست خطرہ لاحق ہے۔ اگر یہاں دشمن کی فتح ہوگئی تو مفتوح عوام پر دشمن کا ظالمانہ قبضہ قائم ہو جائے گا۔ کانگرس نے جو ایجی ٹیشن شروع کر رکھی ہے۔ اس صوبے کے عوام کی اکثریت اس کی حامی نہیں۔ بنگال میں اس ایجی ٹیشن سے کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تاہم یہ حقیقت بالکل عیاں ہوگئی ہے کہ یہ ایجی ٹیشن ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چلائی گئی ہے۔" گورنر نے کہا کہ "حکومت نے بنگال کے ساحلی علاقوں میں کشتیوں کی آمدورفت پر پابندی اس لئے لگائی ہے کہ دشمن یہاں کے ذرائع نقل وحمل سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اسی طرح ساحلی علاقوں سے اناج کے فالتو ذخائر کو دوسرے علاقوں میں منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ یہ دشمن کے ہاتھ نہ لگیں۔ بلاشبہ اس پالیسی سے لوگوں کو تکلیف ہوئی ہے لیکن یہ تکلیف اس تکلیف سے بہت کم ہے جو جاپانیوں کے بنگال پر حملے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔"

18 ستمبر کو مرکزی اسمبلی میں ایوان کے قائد ایم۔ ایس۔ اینی نے بتایا کہ "چٹاگانگ میں برما کے تقریباً 30 ہزار پناہ گزین مقیم ہیں۔ حکومت ان کے بارے میں غافل نہیں ہے۔ مقامی حکام ان کے لئے الاؤنس مقرر کرنے کے لئے مناسب کاروائی کر رہے ہیں۔"

19 ستمبر کو فرید پور کے نزدیک کانگرسیوں اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا جس میں ایک سب انسپکٹر ہلاک ہو گیا۔ 20 ستمبر کو بکرم پور میں ایک اور ڈاکخانہ جلا دیا گیا اور 21 ستمبر کو کشور گنج ریلوے سٹیشن پر فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کی چار بوگیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ 22 ستمبر کو ڈھاکہ سے 180 میل دور نواب پور میں پولیس نے کانگرسیوں کے ایک ہجوم پر گولی چلائی جس سے ایک شخص ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ مدنا پور اور بعض دوسرے اضلاع کے مختلف علاقوں میں بھی فسادات ہوئے جن کے بعد مقامی حکام نے فسادزدہ علاقوں کے لوگوں پر اجتماعی جرمانے عائد کئے۔

چونکہ پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں سے ہلاک اور زخمی ہونے والے زیادہ تر ہندو ہوتے تھے اور اجتماعی جرمانوں کی زد بھی زیادہ تر ہندوؤں پر ہی پڑتی تھی اس لئے بنگال ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ نے 26 ستمبر کو اس صورت حال کا نوٹس لیا اور اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی مکمل آزادی کا فوری طور پر اعلان کیا جائے اور مرکز اور صوبوں میں با اختیار قومی حکومتیں قائم کی جائیں۔ کانگرس بھی اکتوبر 1939ء کے بعد سے مسلسل یہ مطالبہ کرتی رہی تھی۔ 1940ء میں اس نے یہی مطالبہ منوانے کے لئے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تھی اور پھر 8 اگست 1942ء کو اس نے اسی مطالبہ کی تکمیل کے لئے ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہندو مہا سبھا نے بھی یہی مطالبہ پورا کروانے کے لئے 1939ء میں ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر بعد میں اس نے ایجی ٹیشن کا فیصلہ تو منسوخ کر دیا البتہ وہ آئے دن یہ مطالبہ دہراتی رہی۔ اس کے 26 ستمبر 1942ء کے اجلاس کی صدارت بنگال کے وزیر خزانہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے کی اور اس نے مجلس عاملہ کو اس گفت وشنید سے آگاہ کیا جو اس نے ''قومی حکومت'' کے قیام کے لئے مختلف لیڈروں اور جماعتوں سے کی تھی۔ لیکن بنگال مسلم لیگ کا رویہ کانگرس، فارورڈ بلاک اور ہندو مہا سبھا کے بالکل برعکس تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے کوئی سمجھوتہ کیا جائے اور پھر متحدہ طور پر قومی حکومت اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جائے۔ وہ صوبائی کانگرس کے ایجی ٹیشن کے بھی سخت خلاف تھی۔ چنانچہ جب 3 اکتوبر 1942ء کو بنگال لیجسلیٹو کونسل کا اجلاس ہوا تو مسلم لیگی ارکان نے فسادات کے سد باب میں صوبائی حکومت کی ناکامی پر ایک تحریک مذمت پیش کی جس پر گرما گرم بحث ہوئی۔ جس کے دوران وزیر زراعت نواب ڈھاکہ نے یقین دلایا کہ صوبائی

حکومت پر تشدد ہنگاموں کو روکنے کے لئے ہر ممکن کاروائی کر رہی ہے مگر اس تحریک پر رائے شماری نہ ہوئی کیونکہ ڈپٹی پریذیڈنٹ نے اس سے پہلے ہی کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا۔لیکن اس کے دو دن بعد 5 راکتوبر کو صوبائی مسلم لیگ کے لئے ایک اور اشتعال انگیز کاروائی ہوئی جبکہ فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کی مجلس عاملہ نے کانگرس اور ہندو مہاسبھا کی ہمنوائی کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''ملک میں امن وامان بحال کرنے کے لئے ہندوستان کی مکمل آزادی کا فوری اعلان کیا جائے اور مرکز میں قومی حکومت قائم کی جائے۔مجلس عاملہ نے کانگرسی لیڈروں اور کارکنوں کے خلاف حکومت کی جابرانہ پالیسی کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ سارے سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر کے ایک عارضی قومی حکومت قائم کی جائے'' جس دن پرجا پارٹی نے یہ قرارداد منظور کی اس دن فضل الحق نئی دہلی میں تھا جہاں اس نے آل پارٹیز کانفرنس بلائی ہوئی تھی مگر اسے یہ کانفرنس ملتوی کرنا پڑی کیونکہ مدعوین کی اکثریت اس مقصد کے لئے دہلی نہیں پہنچی تھی۔ جو چند لیڈر پہنچے تھے ان میں مولوی فضل الحق کے علاوہ نواب اللہ بخش، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی، این۔سی۔ چیٹر جی، ڈاکٹر مونجے، وی۔ ڈی۔ ساورکر۔ ماسٹر تارا سنگھ، مہر چند کھنہ اور مہیشور دیال سیٹھ شامل تھے۔ان سب نے لالہ شنکر لال کے مکان پر دو دن تک ملک کی صورت حال پر غیر رسمی تبادلۂ خیالات کیا۔

زبردست سمندری طوفان، چٹاگانگ اور آسام پر جاپانی فضائیہ کی بمباری

متذکرہ غیر رسمی تبادلہ خیالات ملک کی صورت حال میں کسی خوشگوار تبدیلی کا باعث نہ بنا بلکہ 16 راکتوبر کو صورت حال اور بھی ابتر ہو گئی جبکہ ایک زبردست سمندری طوفان کے باعث صوبہ کے مغربی اضلاع میں زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا۔تقریباً 3200 مربع میل کا علاقہ اس طوفان سے متاثر ہوا۔کھڑی فصلیں بالکل تباہ ہو گئیں اور ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے۔صرف مدنا پور اور 24 پرگنہ کے اضلاع میں 11 ہزار افراد لقمۂ اجل ہوئے۔ تاہم یو۔ پی، بہار اور بنگال میں پر تشدد ہنگامے جاری رہے اور پولیس لاٹھیوں، گولیوں اور اجتماعی جرمانوں کے ذریعہ انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

25 راکتوبر کو جاپان کے ہوائی جہازوں نے چٹاگانگ کے ہوائی اڈے اور صوبہ آسام کے بعض ہوائی اڈوں پر بمباری کی اور دو دن بعد 28 راکتوبر کو آسام کے ہوائی اڈوں پر حملے

ہوئے۔ بعد ازاں جب آٹھ دس دن تک چٹا گانگ کے ہوائی اڈے اور صوبہ آسام کے ہوائی اڈوں پر کئی حملے ہوئے تو بنگال کے سارے فرقوں کے عوام میں بالعموم اور اونچی ذات کے ہندوؤں میں بالخصوص اس تاثر نے یقین کی صورت اختیار کر لی کہ بنگال پر جاپانیوں کا حملہ ہونے ہی والا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خود صوبائی گورنر سر جان ہربرٹ اپنی تقریروں میں بنگال کے جاپانیوں کے زیر تسلط جانے کو بعید از امکان قرار نہیں دیتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے فوجی حکام آسام اور بنگال میں ایسی تنصیبات کو از خود تباہ کروا رہے تھے جو جاپانیوں کے حملے میں ممد و معاون ہو سکتی تھیں اور تیسری وجہ یہ تھی کہ سو بھاش چندر بوس ہندوستانی جنگی قیدیوں پر مشتمل ''آزاد ہند فوج'' بنا کر ہندوستانی عوام کو یہ ''مژدہ'' سنا رہا تھا کہ اب ہندوستان ''آزاد'' ہونے ہی والا ہے۔ چونکہ بنگال کے اونچی ذات کے ہندو ''نیتاجی'' کی اس ''خوش خبری'' کو بالکل صحیح جانتے تھے اس لئے نومبر 1942ء کے اوائل میں چٹا گانگ اور بنگال و آسام کے بعض دوسرے علاقوں میں کانگرسیوں کی تخریب کاری میں بہت اضافہ ہو گیا۔

ہندو۔ مسلم فساد زدہ علاقوں پر اجتماعی جرمانے...... مسلم لیگ اور مہا سبھا کا احتجاج، شیاما پرشاد مکرجی کا وزارت سے استعفیٰ

10 نومبر کو چٹا گانگ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک سرکاری اعلان میں بتایا کہ گزشتہ چند دنوں میں چٹا گانگ کے ضلع میں آتشزنی کی کئی وارداتیں ہوئی ہیں اور بعض علاقوں میں اجتماعی جرمانے عائد کئے گئے ہیں۔ اس نے متنبہ کیا کہ ''اگر آئندہ بھی کسی علاقے میں ایسی وارداتیں ہوئیں تو وہاں بھی اجتماعی جرمانے عائد کئے جائیں گے۔ امن پسند عوام کا فرض ہے کہ وہ بدامنی کا از خود سد باب کریں اور شہری دفاع کے لئے مقامی حکام سے تعاون کریں۔'' ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس اعلان سے ایک دن پہلے یعنی 9 نومبر کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئی تھیں ان میں سے ایک قرارداد میں اس امر پر احتجاج کیا گیا تھا کہ بدامنی والے علاقوں میں مسلمانوں سے بھی جرمانے وصول کئے جا رہے ہیں حالانکہ ان کا کسی قسم کی بدامنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ہندو مہا سبھا کا الزام یہ تھا کہ بنگال میں بہت سے بے گناہ ہندو سرکاری جبر و تشدد کا شکار بنائے جا رہے ہیں اور اجتماعی جرمانے بھی زیادہ تر

ہندوؤں سے وصول کئے جاتے ہیں۔

فضل الحق کی حکومت کا وزیر خزانہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی ان دنوں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کا صدر تھا۔ چنانچہ وہ پہلے تو وزیر اعلیٰ فضل الحق پر دباؤ ڈال کر ہندوؤں کے خلاف اس مبینہ بے انصافی کا ازالہ کرانے کی کوشش کرتا رہا مگر جب فضل الحق اس سلسلے میں کوئی مؤثر کاروائی نہ کر سکا تو 20رنومبر کو اس نے وزارت خزانہ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور صوبائی گورنر نے یہ استعفیٰ منظور کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔ ڈاکٹر مکر جی کا الزام یہ تھا کہ گورنر سر جان ہربرٹ صوبائی کابینہ کے اختیارات میں ناجائز مداخلت کرتا ہے۔ اس نے اپنے اس الزام کی تائید میں ایک مثال دی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اس کی شکایات پر مدنا پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نیاز محمد خان کو، جو طوفان زدہ علاقے کے صرف ایسے لوگوں کو سرکاری امداد دینا چاہتا تھا جنہوں نے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا، تبدیل کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا مگر گورنر نے مداخلت کر کے اس حکم پر عمل درآمد رکوا دیا تھا۔ مکر جی کی طرف سے اس سلسلے میں دوسری مثال یہ تھی کہ ''گورنر کی طے کردہ پالیسی کے مطابق بدامنی والے علاقوں میں صرف ہندوؤں سے اجتماعی جرمانے وصول کئے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کو اس اجتماعی سزا سے مستثنیٰ رکھا جا رہا ہے۔'' 26رنومبر کو بوس گروپ کے دو وزرا سنتوش کمار باسو اور پی۔ این۔ بینرجی نے وزیر اعلیٰ فضل الحق کے نام ایک میمورنڈم میں ڈاکٹر مکر جی کے الزامات کی تائید کی اور وزیر اعلیٰ کو مطلع کیا کہ اگر صوبائی حکومت نے اجتماعی جرمانوں، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور مدنا پور اور 24 پرگنہ کے طوفان زدہ علاقوں میں امدادی کام کے انتظام سے متعلقہ پالیسی میں تبدیلی نہ کی تو ان کے لئے اپنے عہدوں پر فائز رہنا ممکن نہیں ہوگا لیکن انہوں نے اس دھمکی پر عمل نہ کیا۔ وہ بدستور اپنے وزارتی عہدوں پر فائز رہے حالانکہ متنازعہ مسائل کے بارے میں حکومت کی پالیسی وہی رہی جو ان کے میمورنڈم سے پہلے رائج تھی۔

قحط کی ابتدا

دسمبر 1942ء کے اوائل میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے سارے محاذوں پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کے نئے حملوں کا زور کم ہو گیا تو برطانوی افسروں کی زیر کمان ہندوستانی فوج نے 19ردسمبر کو برما پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ لیکن اس جوابی حملہ سے بنگال کے عوام کے مصائب میں

کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہوگیا۔ چاول کا بھاؤ ساڑھے سات روپے فی من سے بڑھ کر سولہ روپے فی من ہوگیا اور مشرقی بنگال کی بہت سی جھونپڑیوں میں قحط کا بھوت ناچنے لگا۔ اس دلخراش منظر کی سب سے بڑی وجہ صوبہ میں اناج کی شدید قلت میں مضمر تھی۔ اس قلت کی کئی وجوہ تھیں۔ اول یہ کہ اگرچہ مئی 1942ء میں چاول کی فصل اچھی ہوئی تھی لیکن حکومت نے نہ صرف ''انکار کی پالیسی'' کے تحت ساحلی علاقوں سے فالتو چاول جبراً حاصل کئے تھے بلکہ صوبہ کے شمالی علاقوں سے بھی اپنی افواج کے لئے اناج کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ دوئم یہ کہ برما سے ایک لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول کی درآمد بند ہو جانے کے باوجود حکومت نے اس قلت کو دور کرنے کے لئے کوئی متبادل انتظام نہیں کیا تھا۔ سوئم یہ کہ جاپانیوں نے برما میں برطانیہ کے جوابی حملے کو ناکام کرنے کے لئے چٹاگانگ، فینی اور بنگال و آسام کے علاوہ دوسرے علاقوں پر روزانہ ایسے ہوائی حملے شروع کر دیئے تھے جن کی وجہ سے صوبہ کے وسیع علاقے میں کسانوں کی معمول کی زندگی بالکل درہم برہم ہوگئی تھی اور چہارم یہ کہ مدناپور اور 24 پرگنہ کے علاقوں میں سمندری طوفان سے فصلوں کو جونقصان پہنچا تھا اس کی فوری طور پر تلافی ممکن نہیں تھی۔ ان علاقوں میں اناج کے علاوہ نمک کی بھی شدید کمی ہوگئی تھی۔ یہ چاروں وجوہ دسمبر 1942ء کے سارے مہینے میں موجود رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس کے لئے اناج کی بہم رسانی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئی۔ 28ردسمبر کو کمیونسٹ پارٹی کے زیراہتمام پریذیڈنسی ڈویژن میں بھوکوں کا جلوس نکالا گیا اور اسی روز ڈھاکہ کے سرکاری حکام نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''چاول کی قیمت میں خطرناک طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر چیز پر منافع خوری بڑھ رہی ہے اور چور بازاری کا راج ہے۔''

جنگی محاذ کی قربت کی وجہ سے گورنر بنگال زیادہ بااختیار اور وزیر اعلیٰ بے اختیار ہو گیا تو فضل الحق نے اپنی وزارت بچانے کے لئے پھر مسلم لیگ سے رجوع کیا

تاہم مولوی فضل الحق اس تشویشناک غذائی صورت حال سے کوئی خاص پریشان نہیں تھا۔ اسے پریشانی تھی تو صرف یہ کہ صوبہ میں جنگی حالات کی وجہ سے گورنر انتظامیہ کے امور میں بہت مداخلت کرتا تھا۔ چونکہ اعلیٰ حکام گورنر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے اس لئے وزیر اعلیٰ کی حیثیت

محض نمائشی بن کر رہ گئی تھی۔ اکتوبر 1942ء میں مدنا پور اور 24 پرگنہ میں زبردست طوفان کے بعد کلکتہ کے اخبارات میں اس کی اس بے حیثیتی کے بارے میں خبر چھپی تو کسی نے اس کی تردید نہ کی۔ یہ خبر اس کے وزیر خزانہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے چھپوائی تھی جسے معلوم تھا کہ اس کے کہنے پر وزیر اعلیٰ نے مدنا پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نیاز محمد خان کے تبادلے کا حکم صادر کیا تھا لیکن گورنر نے اس حکم پر عملدرآمد رکوا دیا تھا۔ پھر جب اکتوبر کے آخری ہفتے میں جاپانیوں نے چٹا گانگ پر بمباری شروع کر دی تو گورنر نے انتظامیہ پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں برطانوی فوجی افسر برما پر جوابی حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور گورنر ایسے حالات میں فضل الحق پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی پروگریسو کولیشن کابینہ میں کم از کم تین ہندو وزرا ایسے تھے جن کی ہمدردیاں کھلم کھلا کانگرس اور بوس برادران کے فارورڈ بلاک کے ساتھ تھیں۔

فضل الحق کو جب گورنر کے سامنے اپنی بے بسی اور بے حیثیتی کا شدید احساس ہوا اور ہندو اخبارات و سیاسی لیڈروں کی جانب سے اسے طعنے دیئے جانے لگے تو اس نے ایک اور زبردست سیاسی قلابازی کھائی۔ اس نے 13 نومبر 1942ء کو صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کو ایک خط لکھا جس میں اس نے استدعا کی کہ اسے مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اس نے قائداعظم کو یقین دلایا کہ اگر ماضی کو فراموش کر کے مجھے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے تو میں نہ صرف وزارت اعلیٰ کے عہدہ سے مستعفی ہو جاؤں گا بلکہ اپنی پروگریسو کولیشن پارٹی کو بھی توڑ دوں گا۔ اس خط کے بعد اس نے جناح سے ملاقات کی جنہوں نے اسے یقین دلایا کہ اگر تم وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو جاؤ اور اپنی کولیشن پارٹی توڑ دو تو تم پر مسلم لیگ میں شمولیت کے بارے میں جو پابندی عائد ہے وہ اٹھالی جائے گی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو جب اپنے وزیر اعلیٰ کی اس نئی قلابازی کا علم ہوا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر 21 نومبر 1942ء کو وزارت خزانہ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے دو ایک دن بعد بوس گروپ کے دو ہندو وزرا نے استعفیٰ کی دھمکی دے دی۔ بظاہر ان تینوں کو گورنر کی جانب سے انتظامی امور میں آئے دن کی مداخلت سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی نظر میں فضل الحق ایک غیر پسندیدہ شخصیت بن گیا ہے اور اب اس کی وزارت چند دن کی مہمان ہے۔

جب جنوری 1943ء میں برما میں انگریزوں کا جوابی حملہ جاری تھا تو فضل الحق کی

بے وقعتی اور بھی زیادہ نمایاں ہوگئی کیونکہ صوبائی گورنر اس کے مشوروں کو نظر انداز کر کے براہ راست اعلیٰ حکام کو احکامات جاری کرتا تھا چنانچہ اس نے گورنر کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر نئی وزارت بنائی جائے اور اس وزارت میں ایسے وزرا کو شامل کیا جائے جن کی وفاداری کے بارے میں انگریزوں کو کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ اس تدبیر کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے اس نے 5رفروری 1943ء کو صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کو ایک اور خط لکھا جس میں اس نے امید ظاہر کی کہ اس کی مسلم لیگ میں شمولیت کی صورت میں قائداعظم مسلم لیگ اسمبلی پارٹی پر اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونسیں گے۔ بالفاظ دیگر وہ چاہتا تھا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اسے ہی اپنا قائد منتخب کرے اور اس حیثیت سے وہ از سرنو وزارت اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہو جائے۔ اسے اندیشہ تھا کہ قائداعظم اس پر سر ناظم الدین کو ترجیح دیں گے اور لیگ اسمبلی پارٹی وہی کرے گی جو قائداعظم چاہیں گے۔

جناح نے فضل الحق کے مذکورہ خط کے جواب میں 10رفروری 1943ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے اس کی ماضی کی سیاسی ہیرا پھیریوں اور قلابازیوں کا ذکر کیا اور پھر اس کے فیصلہ ٹھونسنے کے الفاظ کو ناقابل فہم قرار دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تم مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہتے ہو تو وزارت اعلیٰ سے علیحدہ ہو کر غیر مشروط طور پر شامل ہو جاؤ۔ تمہیں از سرنو وزیر اعلیٰ بنانے کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اگلے دن فضل الحق نے ٹیلیفون پر قائداعظم سے کوئی بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے متذکرہ مطالبے پر مصر ہے۔ چنانچہ قائداعظم نے 11رفروری کو فضل الحق کو بذریعہ تار مطلع کرنے کے بعد اس کے ساتھ کی گئی خط وکتابت 17رفروری کو برائے اشاعت اخبارات کو بھیج دی کیونکہ ''اس کے بارے میں غلط افواہیں پھیل رہی تھیں اور بنگال کی سیاست میں بعض واقعات ہو رہے تھے۔'' فضل الحق کا جواب یہ تھا کہ ''میں صوبائی اسمبلی کے معاملات میں مصروف تھا اس لئے فوری طور پر جناح کے خط کا جواب نہیں دے سکا تھا۔'' درحقیقت ''اسمبلی کے معاملات'' یہ تھے کہ ان دنوں وہ اسمبلی میں حزب اختلاف کے غیر لیگی گروپوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے تگ ودو کر رہا تھا۔ اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے والا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ اس کی پارٹی کے کئی مسلم ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے اور پھر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی یورپینوں اور اچھوتوں کا تعاون حاصل کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے گی۔ فضل الحق نے

اس خطرے کو ٹالنے کے لئے پہلے قائداعظم جناح سے سودابازی کرنے کی کوشش کی مگر جب وہاں اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو اس نے ان عناصر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جو کسی نہ کسی وجہ سے اس سے خوش نہیں تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی کابینہ میں توسیع کرنے کو بھی تیار تھا۔

قحط کے بارے میں فضل الحق وزارت کی بے حسی

مارچ / 1943ء کے اوائل میں بنگال اسمبلی اور کونسل کے بجٹ سیشن شروع ہوئے تو ابتدأ کئی دن تک دونوں ایوانوں کے ارکان نے صوبہ کی غذائی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ کئی علاقوں میں قحط شروع ہو گیا تھا اور روزانہ سینکڑوں اموات ہو رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت ہند نے ''انکار کی پالیسی'' کے تحت اناج کا بہت بڑا ذخیرہ اپنی افواج کے لئے جمع کر لیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک میں افراط زر کی شرح 225 فیصد تک پہنچ جانے کے باعث چاول، دالوں اور دوسری اشیائے خوردنی کے بھاؤ بہت چڑھ گئے جبکہ غریب کسانوں میں قوت خرید نہ ہونے کے برابر تھی۔ کسان کی آمدنی پٹ سن سے ہوتی تھی لیکن جیوٹ ایسوسی ایشن نے اس سنہری ریشے کا بھاؤ 14 روپے سے لے کر 19 روپے فی من تک مقرر کر رکھا تھا اس بھاؤ پٹ سن بیچ کر 22 سے لے کر 25 روپے فی من تک چاول خریدنا غریب کسانوں کے بس میں نہیں تھا۔ مارچ میں چاول کا بھاؤ یہ تھا حالانکہ فروری میں 23,169,000 ایکڑ رقبہ میں چاول کی فصل کی پیداوار حاصل ہوئی تھی۔ کسانوں سے یہ چاول سرکاری کارندوں اور ذخیرہ اندوزوں نے سستے نرخوں خرید لیا تھا اور پھر بازار میں فوراً ہی اس کا بھاؤ چڑھ گیا تھا۔ جب کئی ارکان اسمبلی نے کسانوں کی بدحالی کے بارے میں حکومت کی غفلت پر نکتہ چینی کی تو 6 / مارچ کو وزیر زراعت خان بہادر ہاشم علی خان کا جواب یہ تھا کہ چاول کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور 15 / مارچ کو وزیر مال پی۔ این۔ بینر جی کا بیان یہ تھا کہ فلاؤڈ کمیشن نے بندوبست دوامی اور لگان داری کے نظام کو ختم کرنے کی سفارش کی ہے۔ حکومت نے کسانوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی پالیسی بھی منظور کر لی ہے اور تجربہ کے طور پر اس کام کی ابتدا ہو چکی ہے۔ وزیر اعلیٰ فضل الحق کا اس مسئلہ کے بارے میں اعلان یہ تھا کہ ''صوبہ میں غذائی صورت حال سے نمٹنے کے لئے کابینہ میں توسیع کی جائے گی۔''

اسمبلی میں فضل الحق کولیشن کے ارکان نے گورنر کے بڑھتے ہوئے اختیارات پر تنقید کی، گورنر نے فضل الحق سے زبردستی استعفیٰ پر دستخط لے کر اسے برطرف کردیا

17 مارچ 1943ء کو اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس شکایت پر بہت تند و تیز بحث ہوئی کہ صوبائی گورنر انتظامیہ کے معاملات میں ناجائز مداخلت کرتا ہے اور وزیر اعلیٰ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ فضل الحق اس بحث کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے گورنر کے خلاف اس الزام کی تردید نہ سکا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ تاہم اسے اعتراف کرنا پڑا کہ گورنر نے کئی مواقع پر اس کے مشورے قبول نہیں کئے ہیں۔ چونکہ اس بحث میں مسلم لیگ اور یورپین گروپ کے ارکان نے تقریباً یکساں خیالات کا اظہار کیا تھا اور گورنر کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے وزیر اعلیٰ کی موقع پرستی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے وزارتی پارٹی کے کئی موقع پرست ارکان کو پتہ چل گیا کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ چنانچہ 27 مارچ کو اس پارٹی کے چار مسلم ارکان وزارتی بنچوں سے اٹھ کر حزب اختلاف کے بنچوں پر مسلم لیگی ارکان کے ساتھ جا بیٹھے۔

28 مارچ 1943ء کی شام کو گورنر نے وزیر اعلیٰ فضل الحق کو اپنے ہاں طلب کیا اور اسے کہا کہ ''اس ٹائپ شدہ استعفیٰ پر دستخط کر دو ورنہ تمہیں برطرف کر دیا جائے گا'' گورنر نے یہ مطالبہ اس حقیقت کے باوجود کیا کہ گزشتہ چند دن کے دوران اسمبلی میں مختلف تحاریک پر کئی مرتبہ رائے شماری ہوئی تھی اور ہر مرتبہ ایوان کی اکثریت نے حکومت کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ فضل الحق نے تقریباً 20 منٹ تک پہلے تو گورنر کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی اور پھر اس نے ''قومی حکومت'' کے بارے میں اپنی پرانی تجویز پیش کی مگر گورنر نے ایک نہ سنی اور حکماً اصرار کیا کہ ''ٹائپ شدہ استعفیٰ پر دستخط کرو'' لٰہذا ''شیر بنگال'' فوراً بکری بن گیا اور اس نے طوعاً و کرہاً دستخط کر دیئے جس کے بعد اسی رات تقریباً دس بجے گورنر ہاؤس سے سرکاری طور پر اطلاع دی گئی کہ تمہارا استعفیٰ منظور کر لیا گیا ہے۔ [11] اگلے دن صبح اسمبلی کے اجلاس میں جب اس نے اپنے استعفیٰ کا اعلان کیا تو کانگرس کے صوبائی صدر کرن شنکر رائے اور دوسرے ہندو ارکان نے

خاصی دیر تک ہنگامہ برپا کیا اور گورنر شاہی کی مذمت کی۔ ڈاکٹر نلنی آکاش سانیال (کانگرس) نے فضل الحق پر اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا نوٹس دیا مگر سپیکر نے اس نوٹس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور اسمبلی کا اجلاس دو ہفتے کے لئے ملتوی کر دیا۔ 30/مارچ کو خواجہ سر ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، پی۔ این۔ بینر جی، سنتوش کمار باسو اور فضل الحق نے گورنر سے ملاقاتیں کیں۔ 31/مارچ کو گورنر نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کی دفعہ 93 کے تحت گورنری راج نافذ کر دیا اور خواجہ سر ناظم الدین سے کہا کہ وہ وسیع بنیادوں پر وزارت سازی کے امکان کا جائزہ لے۔[12]

چونکہ 29/مارچ کو سپیکر نے صوبہ کے سالانہ بجٹ کی منظوری کے بغیر ہی اسمبلی کا اجلاس دو ہفتے کے لئے ملتوی کر دیا تھا اس لئے 31/مارچ کو گورنر نے اپنے آئینی اختیارات کو بروئے کار لا کر بجٹ کی منظوری دے دی اور یکم اپریل کو سرکاری گزٹ میں اس امر کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی دن فضل الحق کی کابینہ کے 15 وزرا نے جن میں نواب ڈھاکہ، سنتوش کمار باسو۔ پی۔ این۔ بینر جی، شمس الدین احمد اور خان بہادر ہاشم علی خان شامل تھے، گورنر سے ملاقات کی اور پھر اسے ایک خط ارسال کیا جس میں اس امر پر احتجاج کیا گیا کہ "فضل الحق سے ٹائپ شدہ استعفیٰ پر زبردستی دستخط کروائے گئے ہیں۔ اسے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی اسے اپنی کابینہ کے ارکان سے مشورہ کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ فضل الحق استعفیٰ دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اسے ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ بجٹ سیشن شروع ہونے کے بعد مسلم لیگ، یورپین گروپ اور اچھوتوں نے کئی مرتبہ حکومت کو شکست دینے کی مشترکہ کوشش کی مگر ایوان کی اکثریت نے ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔"[13] مگر گورنر نے ان کے اس خط کو قابل توجہ نہ سمجھا اور خواجہ سر ناظم الدین وزارت سازی کے لئے جوڑ توڑ میں مصروف رہا۔

2/اپریل 1943ء کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ممتاز رکن خان بہادر محمد علی بوگرا کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلم لیگ کو ایوان میں 130 کی حمایت حاصل ہے اور وہ ایک مستحکم وزارت بنانے کی پوزیشن میں ہے مگر اسی دن مولوی فضل الحق نے پروگریسو کولیشن پارٹی کے ایک جلسہ میں محمد علی بوگرا کے دعویٰ کو غلط قرار دیا اور صوبہ میں ایک کل جماعتی وزارت بنانے کا منصوبہ پیش کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "اس کی مجوزہ 15 رکنی وزارت میں وزیر اعلیٰ سمیت 8 مسلمان، چار ہندو اور تین اچھوت شامل ہونے چاہئیں۔ اس وزارت کا پروگرام اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی سپلائی، داخلی

سلامتی اور شہری دفاع، شہری آزادیوں، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور فرقہ وارانہ امن وامان برقرار رکھنے تک محدود ہونا چاہیے اور اسے ہنگامی حالات میں کسی فرقہ وارانہ تنازعہ کے بارے میں باہمی اتفاق رائے کے بغیر کوئی کاروائی نہیں کرنی چاہیے۔'' فضل الحق کی یہ تجویز اس کی جانب سے ماضی میں پیش کردہ ''قومی حکومت'' کی تجویز سے مختلف نہیں تھی لہذا گورنر نے اس پر کان نہ دھرا۔ البتہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی ہندو نیشنلسٹ پارٹی نے اس کی تائید کی۔

باب: 9

ناظم الدین کی مسلم لیگ مخلوط حکومت اور بنگال کے ہولناک قحط کا چیلنج

ناظم الدین کی قیادت میں مسلم لیگیوں، اچھوتوں اور یورپینوں کی مخلوط حکومت کا قیام، فضل الحق اور مہا سبھائیوں کا واویلا

13 اپریل 1943ء کو گورنر نے خواجہ ناظم الدین کو وزارت سازی کی دعوت دی تو خواجہ نے ''اللہ کے بھروسے'' پر یہ دعوت قبول کر لی اور ایک بیان میں اعلان کیا کہ اس کی وزارت جنگی حالات اور صوبائی سلامتی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اخبارات اور اجتماعات کی آزادی دے گی اور سیاسی نظر بندوں کے معاملات پر وقتاً فوقتاً غور کرتی رہے گی۔ اس نے صوبہ کی بگڑتی ہوئی غذائی صورت حال کا بھی ذکر کیا اور یقین دلایا کہ اس کی حکومت اناج کی قیمتوں میں کمی کروانے کی پوری کوشش کرے گی۔ مقامی اخبارات کی رپورٹ کے مطابق ان دنوں کلکتہ میں چاول کا بھاؤ ساڑھے بائیس روپے فی من تھا حالانکہ فصل کی کٹائی صرف دو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ تاہم خواجہ ناظم الدین کو پروگریسو کولیشن پارٹی میں سے چند ہندوؤں، مسلمانوں اور اچھوتوں کو وزارت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے میں چند دن لگ گئے اور وہ تقریباً دس دن بعد 24 اپریل کو 13 رکنی وزارت بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کی وزارت اس کے اپنے علاوہ حسین شہید سہروردی، تمیز الدین خان، خان بہادر جلال الدین احمد، خان بہادر معظم الدین حسین، خواجہ شہاب الدین، نواب مشرف حسین، ٹی۔ سی گوسوامی، برادا پرسنا پین، ترک ناتھ مکرجی، پیین بہاری ملک، جوگندر ناتھ منڈل اور پریم ہری برداون پر مشتمل تھی۔ حسین شہید سہروردی کو خوراک

اور سول سپلائیز کا محکمہ دیا گیا تھا۔

صبح کو گورنر نے اس وزارت سے حلف وفاداری لیا تو شام کو کلکتہ میں پروگریسو کولیشن پارٹی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں گورنر کے اس غیر آئینی اقدام کی پر زور مذمت کی گئی۔ مولوی فضل الحق کا اس جلسہ میں الزام یہ تھا کہ گورنر نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت 28ر مارچ کو اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا کہنا یہ تھا کہ ہم گورنر کو جلد ہی احساس دلا دیں گے کہ اس نے جس قسم کی مطلق العنانیت کے ساتھ صوبہ پر نئی وزارت کو مسلط کیا ہے، بنگالی عوام اسے زیادہ دیر تک برداشت نہیں کریں گے۔ 25ر اپریل کو ٹاؤن ہال میں سر عبدالحلیم غزنوی کی زیر صدارت ایک اور جلسہ ہوا جس میں گورنر کے اس طریقے کی مذمت کی گئی جس کے مطابق ''ایک فرقہ پرستانہ اور رجعت پسندانہ وزارت کو اقتدار سونپا گیا ہے۔'' ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا مطالبہ یہ تھا کہ ''گورنر کو اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو کر ریٹائر ہو جانا چاہیے کیونکہ بنگال کے عوام کو اس پر اعتماد نہیں رہا۔''

نئی وزارت کی طرف سے قحط سے نمٹنے کے اقدامات......

ذخیرہ اندوزوں کے خلاف مہم

جس دن سر ناظم الدین کی وزارت نے حلف وفاداری اٹھایا تھا اسی دن برما میں انگریزوں کے وہ کمانڈو دستے پسپا ہو کر واپس اپنے اڈوں پر آ گئے تھے جنہوں نے تین ماہ قبل جوابی حملہ کیا تھا۔ جاپانیوں نے اس حملے کو ناکام کر کے بنگال کی جانب پھر پیش قدمی شروع کر دی تھی جس کی بنا پر کلکتہ، چٹاگانگ اور بنگال کے دوسرے ساحلی علاقوں میں پھر زبردست خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور صوبہ کی غذائی صورت حال روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ جب 3ر مئی 1943ء کو بنگال اسمبلی کے سپیکر سر عزیز الحق نے نلنی رنجن سرکار، جو 17ر فروری 1943ء کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا تھا، کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تجارت، خوراک اور صنعت کے محکموں کا چارج سنبھالا تو اس کا خیال یہ تھا کہ بنگال میں چاول کی قلت و مہنگائی مصنوعی ہے اور اس کے لئے وہ ''وطن دشمن'' عناصر ذمہ دار ہیں جو ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے 15ر مئی کو کرشنگر میں ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ ''حکومت بنگال

کے کروڑوں عوام کو فاقہ کشی سے بچانے کے لئے ایسے وطن دشمن عناصر کو سزا دینے کا پختہ عزم کئے ہوئے ہے۔ امید ہے کہ ایک ہفتے میں چاول کی قیمتوں میں خاصی کمی آ جائے گی"[1] مگر ایسا نہ ہوا اور بنگال میں چاول کی قلت و مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔

جب دو تین ہفتوں میں صورت حال قابو سے باہر ہو گئی تو وزیر اعلیٰ خواجہ سر ناظم الدین حکومت ہند سے یہ استدعا کرنے کے لئے نئی دہلی پہنچا کہ چاول کی بین الصوبائی نقل و حمل پر عائد شدہ پابندی اٹھوا دی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر صوبائی رکاوٹیں دور کر دی جائیں تو صوبہ آسام صوبہ بنگال کی چاول کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اس نے 27 رمئی کو نئی دہلی میں ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "بنگال میں چاول کا بھاؤ 30 سے 40 روپے فی من تک پہنچ گیا ہے جس کی بنا پر عوام کو بہت مشکل در پیش ہے۔"[2] سر ناظم الدین نئی دہلی میں تین چار دن قیام کرنے کے بعد واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے بتایا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر خوراک اور محکمہ خوراک کے سیکرٹری میجر جنرل وڈ (Wood) نے بنگال میں غذائی مشکلات پر قابو پانے کے لئے ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا ہے۔

30 رمئی کو سر ناظم الدین اور اس کے وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے کلکتہ میں اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ مہاراجہ آف پرالاکھی منڈی (Mahraja of Paralakhi Mundi) سے ملاقات کر کے اس امر کا جائزہ لیا کہ صوبہ اڑیسہ بنگال کے غذائی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کس طرح اور کس حد تک امداد دے سکتا ہے۔ 31 رمئی کو سر ناظم الدین شیلانگ گیا اور وہاں اس نے اس مسئلہ پر آسام کے وزیر اعلیٰ سے بات چیت کی لیکن اس کی ان ساری کوششوں کا فوری طور پر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

یکم جون 1943ء کو وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی پٹنہ گیا کیونکہ حکومت بہار کھلی منڈی میں بنگال کے لئے چاول کی خریداری میں رکاوٹ حائل کر رہی تھی۔ وہاں سے واپسی پر سہروردی نے اپنے دورۂ بہار کی ناکامی کا اس طرح ذکر کیا کہ "بنگال کے غذائی بحران سے ان لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے جو ہندوستان کو ایک وحدت قرار دیتے ہیں۔" اس کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ بہار، اڑیسہ اور آسام کی حکومتیں بنگال کے بھوکوں کے لئے چاول کی فراہمی میں مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر اس نے 4 رجون کو بنگال کی

ساری پارٹیوں کے لیڈروں کو طلب کر کے انہیں اس سرکاری منصوبے سے آگاہ کیا جو حکومت نے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کاروائی کے لئے بنایا تھا۔ لیکن ان لیڈروں نے اس منصوبے سے اتفاق نہ کیا اور اس سے اگلے دن مولوی فضل الحق، کرن شنکر رائے، شمس الدین احمد، ہیم چندر ناسکر اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی نے ایک مشترکہ بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ حکومت نے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف مہم چلانے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ مبہم اور ناقص ہے۔ اس کے تحت سرکاری حکام کو اپنے اختیارات ناجائز استعمال کرنے کا موقع ملے گا اور اس طرح عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ ان کی مزید رائے یہ تھی کہ صوبہ میں غذائی بحران حقیقی ہے لیکن حکومت اس حقیقت کو تسلیم کر کے اناج درآمد کرنے کی بجائے اس بحران کی ذمہ داری عوام پر ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

تاہم 7رجون 1943ء کو ذخیرہ اندوزی کے خلاف سرکاری مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے صوبہ بھر میں ایک لاکھ خوراک کمیٹیاں بنائی گئیں اور 30,000 ہمہ وقتی کارکنوں کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ دیہات اور شہروں میں چاول کے ذخیروں کا سراغ لگائیں۔ مگر یہ مہم نتیجہ خیز نہ ہوئی اور جون کے آخری ہفتے میں ہر طرف سے قحط قحط کی آوازیں آنے لگیں۔ 26رجون 1943ء کو بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس کے صدر اے۔ سی۔ سین نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''صوبہ میں بہت جلد قحط پڑنے والا ہے جبکہ نئی فصل آنے میں ابھی چھ مہینے باقی ہیں۔'' اسی دن وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے سابق ممبر خوراک نلنی رنجن سرکار نے آل بنگال فوڈ کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی کہ بنگال میں تیزی سے بگڑتی ہوئی غذائی صورت حال پر قابو پانے کے لئے بلا تاخیر کل ہند اقدامات کرنے چاہئیں۔ غیر ممالک سے گندم اور چاول کی درآمد کا بندوبست کیا جائے اور صوبہ بھر میں مکمل راشن بندی کی جائے۔ نلنی رنجن سرکار نے کہا کہ ''اگر ہندوستان کے مشرقی صوبوں کی کھلی منڈی میں چاول خریدنے کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے سرکاری سطح پر ہمسایہ صوبوں سے رابطہ پیدا کیا جاتا تو اس سلسلے میں بہت بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔'' اس کانفرنس کے دوسرے دن کی نشست میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ ''بنگال کو قحط زدہ علاقہ قرار دیا جائے'' لیکن جب 6رجولائی کو صوبائی اسمبلی کا مختصر سیشن شروع ہوا تو کسی جانب سے اس قسم کا مطالبہ نہ ہوا اور زیادہ تر بحث غذائی بحران کی بجائے سیاسی بحران پر ہوئی۔

مولوی فضل الحق نے اپنی طویل تقریر میں مارچ 1943ء میں اپنے استعفیٰ کا پس منظر

بیان کرتے ہوئے گورنر سر جان ہربرٹ پر مطلق العنانیت اور جانبداری کا الزام عائد کیا۔ اس نے بتایا کہ ''صوبائی گورنر نے اپریل 1942ء میں کابینہ سے مشورہ کئے بغیر جوائنٹ سیکرٹری کو حکم دیا تھا کہ تین ساحلی اضلاع میں سے 24 گھنٹے کے اندر چاول کے سارے ذخائر کہیں اور منتقل کر دیئے جائیں۔ اس کا یہ حکم اگست 1942ء میں چاول کی قلت کا باعث بنا۔ گورنر نے کشتیوں کی نقل وحرکت پر بھی کابینہ سے مشورہ کئے بغیر پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی اتنی سخت تھی کہ خلیج بنگال کے جزیروں میں بر وقت کوئی کاشتکاری نہ ہو سکی۔ فضل الحق نے مزید کہا کہ ''جب 12رفروری 1943ء کو ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے گورنر پر انتظامی امور میں ناجائز مداخلت کرنے کا الزام عائد کیا تھا تو گورنر کا ہم سے مطالبہ یہ تھا کہ ہم اس الزام سے بے تعلقی کا اظہار کریں۔ مگر ہم نے ایسا نہ کیا اور پھر جب میں نے اسمبلی میں یہ اعلان کیا کہ مدنا پور کے حکام کے خلاف شکایات کی انکوائری کی جائے گی تو گورنر بہت خفا ہوا اور اس نے مجھے نہایت ہتک آمیز خط لکھ کر میری جواب طلبی کی۔ میں نے اپنے جوابی خط میں اپنے اس اعلان کے سلسلے میں کوئی صفائی پیش نہ کی۔ البتہ اسے متنبہ کیا کہ آئندہ وہ اس قسم کا خط لکھنے سے گریز کرے۔ میں نے اپنے جوابی خط میں یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ فوج میں ایک لاکھ بنگالی نوجوانوں کو بھرتی کیا جائے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب نصف نصف ہو۔''

بنگالیوں کی فوج میں بھرتی کرنے کا مطالبہ......فوج میں پنجابی پچاس فیصد اور بنگالی دو فیصد تھے

مولوی فضل الحق کا آخری مطالبہ سر ناظم الدین سمیت بنگال کے سارے لیڈروں کا مطالبہ تھا مگر حکومت برطانیہ بنگالیوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کرتی تھی اور وہ مارشل اور نان مارشل نسل کی سامراجی تھیوری کے تحت زیادہ تر پنجابیوں کو بھرتی کرتی تھی جن کی وفاداری کی پہلی جنگ عظیم کے دوران پوری طرح سے آزمائش ہو چکی تھی۔ چنانچہ مولوی فضل الحق کی اس تقریر کے دوسرے دن وزیر ہند ایمری نے ایوان عام میں ایک سوال کے جواب میں ہندوستانی فوج میں مختلف صوبوں اور مذہبی فرقوں کی نمائندگی کے بارے میں یہ اعداد و شمار بتائے:

پنجاب	=	50 فیصد
یو۔ پی	=	15 فیصد

مدراس	=	10 فیصد
بمبئی	=	10 فیصد
سرحد	=	05 فیصد
اجمیر، مارواڑ	=	03 فیصد
بنگال	=	02 فیصد
سی۔ پی۔ برار، آسام، بہار واڑیسہ	=	05 فیصد

مولوی فضل الحق کا یہ الزام بالکل صحیح تھا کہ صوبائی گورنر نے اپریل 1942ء میں صوبائی کابینہ سے مشورہ کئے بغیر بنگال کے ساحلی اضلاع میں چاول کی مصنوعی قلت پیدا کر دی تھی اور کشتیوں کی نقل وحرکت پر پابندی عائد کر کے اور بہت سی کشتیوں کو تباہ وبرباد کر کے ساحلی علاقوں کے لاکھوں لوگوں کو نہ صرف ان کے واحد ذریعۂ آمدورفت سے محروم کر دیا تھا بلکہ مزید لاکھوں ماہی گیروں اور کسانوں کو بے روزگار کر دیا تھا۔

انگریزوں نے بنگال پر جاپانی قبضہ کے پیش نظر جو ہنگامی اقدامات کئے ان پر نہ صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیا، نہ عوام کی غذائی ضروریات کی پرواہ کی

صوبائی گورنر نے یہ کارروائی برطانوی فوجی افسروں کی اس پالیسی کے تحت کی تھی کہ جس علاقے میں جاپانیوں کے قبضے کا خطرہ لاحق ہو وہاں کوئی ایسی چیز نہیں رہنی چاہیے جو حملہ آوروں کے لئے سودمند ہو سکے۔ ان دنوں جاپان، برما سمیت سارے جنوب مشرقی ایشیا پر قبضہ کر چکا تھا اور انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ ساحلی بنگال کا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی افواج کا ہیڈکوارٹر صوبہ بہار کے شہر رانچی میں منتقل کر لیا تھا۔ امریکیوں نے اپنی ہوائی فوج کو میلا اور ڈھاکہ میں متعین کر دی تھی اور برطانوی جرنیل سلم (Slim) مغربی برما پر جوابی حملہ کرنے کے لئے چٹاگانگ کی پہاڑیوں میں ایک کمانڈو فوج کو تربیت دے رہا تھا جبکہ ہزاروں ہندوستانی پناہ گزین برما سے اسی علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔

یہ پناہ گزین جاپانیوں کے جبر وتشدد کی بنا پر وہاں سے نہیں بھاگے تھے بلکہ برما کے عوام نے انہیں مار پیٹ کر بھگا دیا تھا۔ ان ہندوستانیوں کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل

تھی جو گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے برما میں برطانیہ کے زیر سایہ ساہوکاری، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز طریقوں سے برمی عوام کا استحصال کرتے آرہے تھے۔ جب انگریز جاپانیوں کے حملے کی تاب نہ لاکر وہاں سے بھاگے تھے تو غریب برمی عوام ان کے ان ہندوستانی گماشتوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ انہوں نے بہت سے ہندوستانی ساہوکاروں، زمینداروں اور دوسرے استحصالیوں کو قتل کیا تھا۔ ان کی منقولہ وغیر منقولہ جائیدادیں لوٹی تھیں اور پھر ہندوؤں کو وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں فرار ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ ان پناہ گزینوں میں سے ہزاروں راستے ہی میں لقمہ اجل ہوگئے تھے اور جو کسی نہ کسی طرح چٹاگانگ کے علاقے میں پہنچ گئے تھے ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔

لیکن صوبائی گورنر نے ساحلی علاقوں کے کروڑوں غریب عوام کے علاوہ ان پناہ گزینوں کی زبوں حالی کی پرواہ کئے بغیر متذکرہ ظالمانہ پالیسی پر عمل کرکے بنگال میں ہولناک قحط کی بنیاد رکھی۔ درآں حالیکہ وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق اور اس کی کابینہ کے دوسرے ارکان بے بسی کی حالت میں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ گورنر نے اس سلسلے میں کابینہ سے کوئی مشورہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ اس میں ایسے وزرا موجود تھے جن کی وفاداری پر اسے شبہ تھا اور وہ جنگی معاملات میں انہیں اعتماد میں نہیں لے سکتا تھا۔

بہار، اڑیسہ اور آسام کی ہندو وزارتوں نے بنگال کو اناج فراہم کرنے سے انکار کردیا۔ ہندو۔ مسلم تضاد کی انتہا

تاہم مولوی فضل الحق کا اسمبلی میں یہ واویلا صوبہ میں اناج کی قلت اور مہنگائی پر کوئی خوشگوار اثر نہ ڈال سکا بلکہ غذائی صورت حال روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ چاروں طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں کہ ''بنگال بھوکا ہے اسے بچاؤ'' جو لوگ بھوکوں مر رہے تھے ان کی بھاری اکثریت مشرقی بنگال کے مسلمانوں اور اچھوتوں پر مشتمل تھی۔ 17/جولائی کو صوبائی وزیر مال ڈی۔ این۔ مکرجی نے اسمبلی میں اعلان کیا کہ حکومت بنگال نے ان آفت زدہ لوگوں کی امداد کے لئے 88 لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی ہے لیکن اس اعلان کے دو دن بعد پٹنہ سے جب یہ خبر آئی کہ حکومت بہار نے دو ماہ قبل حسین شہید سہروردی کے دورے کے نتیجے میں اناج کی نقل وحمل پر

سے پابندی اٹھانے کا جو حکم دیا تھا وہ اب منسوخ کر دیا گیا ہے اور آئندہ صوبہ بہار سے اناج کی برآمد کی اجازت نہیں ہوگی تو سب کو پتہ چل گیا کہ صوبائی حکومت کی اس امدادی رقم سے بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکے گا۔ قبل ازیں جون 1943ء کے وسط میں اڑیسہ کی حکومت نے بنگال کی حکومت کی کھلی منڈی میں اناج کی خریداری پر یہ کہہ کر پابندی عائد کر دی تھی کہ اس طرح اس کے صوبائی اختیارات میں مداخلت ہوتی ہے اور آسام کی حکومت نے کچھ اسی قسم کی دلیل دے کر بھوکے بنگال کو اناج فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس طرح اس نے حکومت ہند کی فروری 1943ء کی دوسری غذائی کانفرنس کے اس فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی جس کے تحت بہار، اڑیسہ اور دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بنگال کے لئے گندم اور چاول کا مقررہ کوٹا مہیا کریں۔ مسلم لیگی اخبارات اور لیڈروں کا الزام یہ تھا کہ ان تینوں ہمسایہ صوبوں کی ہندو وزارتوں کی جانب سے بنگال کو اناج فراہم نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح یہ خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت کو ناکام کرنا چاہتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بنگال کے جن علاقوں میں قحط کا سایہ لمبا ہو رہا ہے وہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں اور اچھوتوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں صوبوں کے ہندو ارباب اقتدار اور اناج کے ہندو بیوپاریوں کو ان بدنصیبوں کے زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گویا مشرقی ہندوستان میں ہندو۔ مسلم تضاد وحشت، بربریت و سنگدلی کی ساری حدود سے باہر نکل چکا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ حکومت بنگال نے ایم۔ اصفہانی کی فرم کو اناج کی خریداری کے لئے واحد ایجنٹ مقرر کر رکھا تھا اور ہندو بیوپاری اس مسلمان فرم سے تعاون نہیں کرتے تھے۔ حکومت بہار کے اس اعلان سے قبل 7/جولائی کو صوبائی اسمبلی میں جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا تو بعض ہندو ارکان نے مسلم لیگی حکومت کی اصفہانی نوازی پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ ہری داس موزمدار نے اصفہانیوں کو چاول کی خریداری کی واحد ایجنسی دینے کے فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کلکتہ میں یورپین اور ہندو فرموں کی کمی نہیں تھی کہ اتنے بڑے کام کی ایجنسی صرف ایک فرم کو دی جاتی...... بنگال میں پچاس فیصد آبادی ہندو ہے جو ٹیکسوں کا بہت بڑا حصہ ادا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اتنی بڑی ایجنسی ایک مسلم لیگی کو دے دی گئی ہے۔ کیونکہ اس وقت اقتدار مسلم لیگ وزارت کے ہاتھ میں ہے اس طرح مسلم لیگ وزارت نے اپنی جماعت نوازی کا وہی کام کیا ہے جس کی بنا پر جناح نے کانگرسی وزارتوں کے خلاف بارہا شکایت

کی تھی۔'' سہروردی نے اس موقع پر اسمبلی کے اندر ہندو ارکان کی اس نکتہ چینی کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ ''اصفہانیوں کی مسلم لیگ کے ساتھ ہمدردی کا سب کو علم ہے۔ میں نے ان کو یہ کام سونپنے سے پہلے اس سوال پر بہت سنجیدگی سے غور کیا تھا کہ اس طرح مجھ پر اپنے سیاسی ہمدردوں کی امداد کرنے کا الزام تو نہیں لگے گا لیکن بنگال کی فوری ضروریات نے اس سلسلے میں میرے تامل کو دور کر دیا تھا۔''[3]

تاہم اسمبلی سے باہر سہروردی نے اڑیسہ اور آسام کی ہندو وزارتوں کے متعصّبانہ رویے کے پیش نظر ہندو ارکان کی اس شکایت کے ازالہ کی کوشش کی۔ قمر الدین احمد لکھتا ہے کہ ''حسین شہید سہروردی نے حسن اصفہانی سے، جو صوبہ مسلم لیگ کا خزانچی تھا، اپیل کی کہ وہ اس امر پر رضامند ہو جائے کہ بہار اور اڑیسہ سے چاول کی فراہمی کے لئے چند ہندو فرموں کو ایجنٹ مقرر کیا جائے۔ سہروردی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ غالباً یہ اس کی سیاسی زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ اس نے مسلم لیگ کی سیاست میں اصفہانیوں کے بے پناہ اثر ورسوخ کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ حسن اصفہانی بنگال میں جناح کا سب سے زیادہ معتبر آدمی تھا۔ اصفہانیوں کے کاروبار میں سہروردی کی مداخلت ناقابل برداشت تھی اور سہروردی کو اس گناہ کی کبھی معافی نہ ملی۔ اس واقعہ کے بعد غیر بنگالی کاروباری عناصر نے سہروردی کے مقابلے میں سر ناظم الدین کو آگے بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہی غلط فہمی آخر کار سہروردی کی سیاسی زندگی کے زوال کا باعث بنی۔ جناح خود خوجہ تھے۔ انہیں ان کاروباری عناصر کی دوسرے ہر مسلمان لیڈر سے زیادہ حمایت حاصل تھی اور اس بنا پر انہیں پنجاب اور بنگال جیسے علاقوں کے لیڈروں پر نمایاں فوقیت حاصل تھی۔''[4]

انگریزوں کی سامراجی دفاعی پالیسی نے بنگال کو تاریخ کے ہولناک قحط سے دوچار کر دیا، معاشرتی اور اخلاقی اقدار بھی خاک میں مل گئیں

19 رجولائی کو بنگال لیجسلیٹو کونسل میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ کانگرس پارٹی کی نکتہ چینی کا خلاصہ یہ تھا کہ صوبائی حکومت کے پاس غذائی صورت حال پر قابو پانے کے لئے کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ 27 رجولائی کو حکومت ہند کی تیسری غذائی کانفرنس نے بھی حکومت بنگال پر یہی الزام عائد کیا اور ایک قرارداد میں حکومت بنگال سے اس امر کی وضاحت طلب کی کہ اس نے اناج کے

وسیع ذخائر کی کس طرح تقسیم کی ہے۔ کانفرنس کی رائے یہ تھی کہ حکومت بنگال کے متعلقہ وزیر نے اس سلسلے میں جو بیان دیا ہے وہ غیر تسلی بخش ہے۔[5] اس کانفرنس میں اناج کی آزاد تجارت کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا اور ایک نئے منصوبے کے تحت بنگال کے لئے 150,000 ٹن چاول، 340,000 ٹن گندم اور اس کی مصنوعات، 46,000 ٹن چنے اور 40,000 ٹن باجرے کا کوٹا مقرر کیا گیا۔

نئی دہلی کے مذکورہ فیصلے سے بھوکے بنگالی عوام کے پیٹ میں کچھ بھی نہ پڑا اور جب اگست 1943ء کا مہینہ چڑھا تو صوبہ کے مختلف علاقوں میں سینکڑوں لوگ بھوک سے جاں بحق ہو رہے تھے چنانچہ حکومت بنگال کو مجبوراً قحط کی صورت حال کا اعلان کرنا پڑا۔ اس اعلان کے بعد صوبائی حکومت نے چٹا گانگ اور بعض دوسرے علاقوں میں امدادی مراکز کھولے۔ یہاں بھکاریوں کے لئے مفت دال بھات کا انتظام کیا گیا۔

9/اگست کو مرکزی اسمبلی میں غذائی صورت حال پر بحث ہوئی تو ایگزیکٹو کونسل کے ممبر خوراک سر عزیز الحق نے اپنی طویل تقریر میں بنگال کے قحط کا پس منظر بیان کیا۔ اس نے اپنی اس تقریر میں یہ نہ بتایا کہ صوبائی گورنر نے فوجی حکام کے منصوبے کے مطابق اپریل 1942ء میں جو ظالمانہ ''انکار کی پالیسی'' اختیار کی تھی اس سے اس قحط کی بنیاد پڑی تھی۔ اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ 14/دسمبر 1942ء کو نئے قائم شدہ مرکزی محکمہ خوراک کے زیر اہتمام نئی دہلی میں جو پہلی غذائی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بنگال کی غذائی قلت کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا تھا بلکہ صرف یہ اندازہ کیا گیا کہ افواج کے لئے کتنے اناج کی ضرورت ہوگی اور اس ضرورت کے مطابق اناج کی خریداری کیسے ہوگی۔ اس نے نہ بتایا کہ 26/فروری 1943ء کو دوسری غذائی کانفرنس میں مرکزی اور صوبائی نمائندوں کے متفقہ طور پر منظور کردہ ''بنیادی منصوبے'' کے مطابق برصغیر کے مختلف صوبوں کے فالتو اناج اور غیر ممالک سے درآمد کردہ اناج میں سے بنگال کے لئے 350,000 ٹن چاول، 224,000 ٹن گندم اور 209,000 ٹن باجرے کا کوٹا مقرر کیا گیا تھا جس کی بعد میں سپلائی نہ ہوئی اور اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ اپریل 1943ء میں جب فضل الحق کی وزارت کی جگہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت بنی تھی یا بنائی گئی تھی تو اس وقت صوبہ میں قحط کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ کئی علاقوں سے اموات کی خبریں آ رہی تھیں جبکہ خواجہ ناظم الدین کے بقول بنگال کا نعمت خانہ خالی پڑا

تھا۔ البتہ اس نے یہ بتایا کہ ’’مرکزی حکومت نے ہندوستان کے مشرقی صوبوں میں اناج کی ’’آزاد تجارت‘‘ کی اجازت دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر بہار اور اڑیسہ کی حکومتوں نے عملدرآمد نہیں کیا تھا۔ ان صوبوں کی حکومتوں نے حکومت بنگال کے مقرر کردہ ’’ایجنٹ خریداری‘‘ کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل کی تھیں مثلاً بعض اوقات اس ایجنٹ کے خرید کردہ اناج کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ جن بیوپاریوں کے پاس برائے فروخت اناج تھا انہیں کہہ دیا گیا تھا کہ اپنے گودام بند کر دیں۔ بعض بیوپاریوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ کوئی اناج نہ بیچیں اور اسٹیشن ماسٹروں سے کہا گیا تھا کہ حکومت بنگال کے ایجنٹ کو ریل کے ڈبے مہیا نہ کریں اور اگر مہیا کریں تو ان ڈبوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کریں اور بعض اوقات صوبہ سے اناج کی برآمد پر یکایک پابندی لگا دی گئی تھی۔‘‘[6] گویا سر عزیز الحق کے بقول بہار اور اڑیسہ کی حکومتیں صوبائی شاونزم یا مذہبی عصبیت کی بنا پر بنگال کے بھوکوں کے بارے میں کھلم کھلا شقاوت قلبی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مگر مرکزی حکومت محض خاموش تماشائی بنی رہی اور اس نے اس صورت حال کی اصلاح کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا۔ جولائی 1943ء کو تیسری غذائی کانفرنس نے ’’نئے ترمیم شدہ منصوبے‘‘ کے تحت بنگال کے لئے اناج کا کوٹا مقرر کیا مگر اس وقت صورت حال قابو سے باہر ہو چکی تھی اور پورے بنگال کے غریب عوام کیڑے مکوڑوں کی طرح بھوکے مر رہے تھے۔

12 راگست کو لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ مرکزی حکومت کی مقرر کردہ خوراک کمیٹی کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ’’حکومت بنگال صوبہ کے غذائی مسئلہ سے نپٹنے کے کام میں کئی لحاظ سے مجرم ثابت ہوئی ہے۔ لہٰذا اس وقت تک بنگال کو اناج کی سپلائی بند کر دی جائے جب تک وہاں کی حکومت اناج کے ذخیروں کے بارے میں اپنی بدانتظامی کا اعتراف کر کے موجودہ انتظامی عملہ کی جگہ ایسے اہلکاروں کا تقرر نہیں کرتی جو یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ کمیٹی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ حکومت بنگال کے سرکاری گوداموں میں اناج کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ مخیر افراد کی جانب سے پکا پکایا کھانا مفت تقسیم کیا جا رہا ہے۔ ان مخیر افراد نے اس مقصد کے لئے کچا اناج کہاں سے حاصل کر لیا ہے۔‘‘ 13 راگست کو نئی دہلی میں ایک سرکاری اعلان کے ذریعے بتایا گیا کہ سر جوالا پرشاد سری واستوا کو سر عزیز الحق کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر خوراک مقرر کیا گیا ہے اور میجر جنرل وڈ کی جگہ سر آر۔ ایچ۔ ہچنگز

(R.H.Hutchings) کا مرکزی محکمہ خوراک کے سیکرٹری کے طور پر تقرر ہوا ہے لیکن مرکز کے محکمہ خوراک میں اس ردوبدل سے بنگال کی صورت حال پر نہ کوئی اچھا اثر پڑ سکتا تھا اور نہ پڑا۔ چنانچہ 13/اگست کے بعد اخبارات میں ہر روز اس مضمون کی ہولناک خبروں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں پر سے سینکڑوں لاشیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ 26/اگست کو یہ خبر آئی کہ صوبہ میں ضروریات زندگی کی قیمتوں پر کنٹرول نافذ کر دیا گیا ہے اور چاول کا سرکاری بھاؤ 30 روپے من مقرر کیا گیا ہے۔ 27/اگست کو مرکزی ممبر خوراک سر جوالا پرشاد کی زیر صدارت کلکتہ میں مشرقی ہندوستان کی ریجنل فوڈ کونسل کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو لوگ شہر میں بھوک اور وباؤں کی وجہ سے بیمار پائے جائیں گے انہیں اضافی ہسپتالوں میں پہنچایا جائے گا جن میں دو ہزار مریضوں کو رکھنے کی گنجائش ہے اور جو بچے یتیم ہو جائیں گے انہیں امدادی مراکز میں رکھا جائے گا۔ اس فیصلہ کا اطلاق صرف کلکتہ کی حدود میں ہونا تھا جہاں فاقہ زدہ اور خانماں برباد لوگوں کی تعداد 80 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے تقریباً 40 ہزار بنگال کے دوسرے علاقوں سے خوراک کی بھیک مانگنے کے لئے آئے تھے۔ اس میٹنگ میں ان لاکھوں بدنصیبوں کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا گیا جو کلکتہ سے باہر چٹاگانگ، ڈھاکہ، میمن سنگھ اور دوسرے اضلاع کے دیہاتی اور قصباتی علاقوں میں بھوک اور بیماری کے باعث لقمۂ اجل ہو رہے تھے۔ 2/ستمبر کو صوبائی اسمبلی کے سپیکر سید نوشیر علی کا بیان یہ تھا کہ آج کل بنگال ایسی قومی آفت میں مبتلا ہے جس کی مثال صوبہ کی تاریخ میں نہیں ملتی اور کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن کی قرارداد یہ تھی کہ ''بنگال کی غذائی صورت حال اتنی خراب ہے جتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ حکومت نے اس سلسلے میں جس ''مجرمانہ غفلت'' کا مظاہرہ کیا ہے اس کے باعث بے شمار لوگ بھوک سے مر گئے ہیں'' اور سابق وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کا اعلان یہ تھا کہ ''چونکہ صوبائی حکومت بھوکے عوام کو جھوٹی تسلیوں کے سوا اور کچھ نہیں دے رہی اس لئے اسمبلی اور کونسل میں آئندہ بجٹ سیشن کے دوران حکومت کی مخالفت کی جائے گی۔''

مولوی فضل الحق نے 6/ستمبر 1943ء کی رات کو کلکتہ کے یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک جلسہ عام میں بھی صوبائی حکومت کی غذائی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس جلسہ کی صدارت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک سابق رکن نلنی رنجن سرکار نے کی اور اس میں ایک قرارداد

کے ذریعہ صوبہ کی مسلسل غذائی بدحالی پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔" بظاہر صوبہ کے وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی کو بھی اس سلسلے میں بہت تشویش تھی۔ چنانچہ وہ 6 ستمبر کو ہی اس جلسہ سے پہلے ایک ریلیف کمشنر مقرر کرنے کے علاوہ اڑیسہ کی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کر چکا تھا جس کے تحت یہ طے پایا تھا کہ اڑیسہ بنگال کو 4 لاکھ ٹن دھان فراہم کرے گا۔ اس معاہدہ کے بعد سہروردی 8 ستمبر کو لاہور پہنچا۔ حکومت پنجاب، بنگال کو گندم اور اس کی مصنوعات کی سپلائی کے سلسلہ میں مرکز کی تیسری غذائی کانفرنس کے 7 جولائی 1943ء کے فیصلہ کی تعمیل میں پس و پیش کر رہی تھی۔ 9 ستمبر کو سہروردی نے نوابزادہ رشید علی خان کے مکان پر ایک پریس کانفرنس میں اس الزام کی پرزور تردید کی کہ حکومت بنگال گندم کے کاروبار میں نہ صرف آٹا پیسنے کی ملوں کے مالکان اور دوسرے بیوپاریوں کو ناجائز منافع خوری کی اجازت دے رہی ہے بلکہ وہ خود بھی نفع کما رہی ہے۔ سہروردی نے اپنی حکومت کی بے گناہی کے ثبوت میں سرکاری اور غیر سرکاری اخراجات کے بارے میں تفصیلی اعداد و شمار پیش کئے اور بتایا کہ حکومت بنگال پنجاب سے گیارہ روپے دس آنے من کے حساب سے جو گندم خریدتی ہے اس کی کلکتہ تک نقل و حمل اور پسائی پر تقریباً 6 روپے من کے حساب سے خرچ ہوتا ہے اس لئے حکومت کلکتہ میں آٹا سترہ روپے آٹھ آنے من اور مضافات میں پندرہ روپے من کے حساب سے فروخت کر رہی ہے۔"

12 ستمبر کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی ایک اطلاع کے مطابق سہروردی نے حکومت ہند اور حکومت پنجاب سے درخواست کی کہ "وہ اپنے حکام کو بنگال بھیجیں تا کہ وہ وہاں گندم اور گندم کی مصنوعات کے نرخوں کے مسئلہ کا جائزہ لے کر یہ بتائیں کہ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں ان اشیا کی کم از کم قیمت فروخت کیا ہونی چاہیے۔" تاہم حکومت پنجاب کے وزیر خوراک بلدیو سنگھ کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے 15 ستمبر کو ایک انٹرویو میں اس الزام کا اعادہ کیا کہ "حکومت بنگال، سٹاکسٹس، ملرز، آڑھتی اور دوسرے ادارے گندم کے کاروبار میں بہت منافع کما رہے ہیں"[7] اور 28 ستمبر کو ہندوستان کے ریجنل فوڈ کنٹرولر سر کولن گاربٹ (Collin Garbet) آئی۔سی۔ایس۔ نے کلکتہ میں روٹری کلب کے ایک ظہرانے میں تقریر کرتے ہوئے اس الزام کی اس طرح تائید کی کہ "حکومت بنگال نے غالباً حساب کتاب کی غلطی کی وجہ سے حکومت پنجاب کے ساتھ گندم کے کاروبار میں تقریباً چالیس لاکھ روپے کا منافع کمایا ہے۔"[8]

جن دنوں فوڈ کمشنر نے یہ نا قابل یقین تقریر کی ان دنوں کلکتہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں ہزاروں افراد بھوک اور بیماری سے راہیٔ ملک عدم ہو رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ برصغیر کے اس زرخیز ترین صوبہ کی پوری آبادی تھوڑے ہی عرصے میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ چنانچہ جب ستمبر کے وسط میں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو حزب اختلاف کے ارکان نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی ایک قرارداد مذمت پر تقریریں کرتے ہوئے صوبہ میں قحط کی ہلاکت خیزی کی بڑی ہی لرزہ خیز تصویر کشی کی۔ ضلع باریسال کے ایک رکن نے بتایا کہ وہاں بھوکے لوگ اپنے بچوں کو فروخت کر رہے ہیں۔ یہ ضلع قحط سے پہلے بنگال کا اناج گھر تصور کیا جاتا تھا۔ ایک اور رکن نے کہا کہ صوبہ بھر میں ایک گاؤں بھی ایسا نہیں جہاں لوگوں کو دو وقت کا کھانا ملتا ہو۔ بردوان کے قصبہ کے ایک رکن کا بیان یہ تھا کہ اس قصبہ میں ہر روز اوسطاً 25 افراد معدوم ہو رہے ہیں۔ وزیر خزانہ ٹی۔ سی۔ گوسوامی نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ ''بنگال میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے قحط کہہ لیجئے یا اسے جو چاہے نام دے لیجئے یہ حقیقت ہے کہ آج صوبہ کی معاشی بدحالی ایسی ہے کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔'' اس نے کہا کہ ''حکومت ہند کو اس صورت حال سے نمٹنے کی زیادہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کیونکہ صوبائی حکومت کو جنگ کی وجہ سے بہت اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ 20 ستمبر کو رائے ہر بندرا ناتھ چودھری نے اسمبلی میں بتایا کہ ''اگست کے دوسرے پندرہواڑے کے دوران کلکتہ میں بھوک سے مرنے والوں کی تعداد 548 تھی اور ستمبر کے پہلے دو ہفتوں میں 804 افراد بھوک کی وجہ سے راہیٔ ملک عدم ہوئے۔'' 22 ستمبر کو ایک اخباری رپورٹ کے مطابق کلکتہ میں صرف ایک دن میں 112 افراد ہلاک ہوئے اور کھلنا میں ایک بھوکی عورت نے اپنی بیٹی کو صرف پندرہ روپے میں فروخت کر دیا۔

23 ستمبر کو وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے بتایا کہ ''کلکتہ کی غذائی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے ہر ہفتے شہر کی منڈی میں 40 ہزار من زائد آٹا مہیا کیا جائے گا۔ چاول کے کوٹے میں روزانہ 3 ہزار من کا اضافہ ہوگا۔ منڈی میں آٹے کا بھاؤ ساڑھے چھ آنے سیر ہو گا اور چاول کنٹرول نرخ پر ملے گا اور باجرے کا پرچون بھاؤ ساڑھے چار آنے سیر ہو گا۔'' سہروردی کے اس بیان کے بعد حزب اختلاف کا قائد مولوی فضل الحق اپنا اختلافی موقف پیش کرنے کیلئے کھڑا ہوا تو سپیکر نے اسے اس بنا پر تقریر کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ

اب بجٹ کے بارے میں ڈاکٹر سانیال کی تحریک تخفیف زیر بحث آئے گی۔ اس پر مولوی بہت برہم ہوا اور اس نے کہا کہ یہ بجٹ انتہائی بد دیانتی کا بجٹ ہے۔ ہمیں اس بجٹ کی منظوری یا نامنظوری میں کوئی دلچسپی نہیں۔ حزب اختلاف کا اس بجٹ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر حکومت یہ بجٹ منظور کروانا چاہتی ہے تو اسے یقین دلانا ہوگا کہ وہ اس صوبہ کے عوام کو خوراک مہیا کرے گی۔'' اسی دن لندن میں وزیر ہند لارڈ ایمری نے بھی ایوان عام میں بنگال کے ''غذائی بحران'' کے بارے میں ایک بیان دیا۔ اس نے بنگال میں قحط کا ذکر کرتے ہوئے سر عزیز الحق کی طرح اس حقیقت کا ذکر نہ کیا کہ اپریل 1942ء میں برطانوی فوجی حکام بنگال کے دفاع کے بارے میں مایوس ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے صوبائی گورنر کے ذریعے اس صوبہ کے ساحلی علاقوں میں تباہ و برباد کرو اور نیست و نابود کرو کی پالیسی یعنی انکار کی پالیسی پر عمل کر کے ہولناک قحط کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے موقف کے مطابق اس قحط کی وجہ یہ تھی کہ بنگال میں چاول کی فصل بہت کم ہوئی تھی اور برما سے چاول کی درآمد کم ہوگئی تھی۔ تقریباً پانچ کروڑ کاشتکاروں نے اپنی فصل کا کچھ حصہ فروخت نہیں کیا تھا۔ بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی کی تھی۔ صوبائی اور قومی مفادات کے تصادم کی وجہ سے دوسرے صوبوں سے اناج کی سپلائی کم ہوئی تھی اور بعض مقامی سرکاری اہلکار اپنے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے میں ناکام رہے تھے۔''[9]

24 ستمبر کو اخبارات میں فضل الحق اور ایمری کی تقریروں کے ساتھ یہ خبریں چھپیں کہ گزشتہ دو دنوں میں کلکتہ کے ہسپتالوں میں مرنے والوں کی تعداد 97 ہے۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ چاول کے نرخوں پر کنٹرول کے نفاذ کے بعد منشی گنج کی کھلی منڈی میں چاول نایاب ہوگیا ہے۔ البتہ یہ بلیک مارکیٹ میں 50 سے لے کر 60 روپے من تک بک رہا ہے۔ 25 ستمبر کو اخبارات میں یہ اعلان ہوا کہ حکومت نے کلکتہ اور ہوڑہ میں گندم، باجرے اور جوار کا بھاؤ علی الترتیب 5 آنے فی سیر، 4 آنے فی سیر اور ساڑھے چار آنے فی سیر مقرر کیا ہے۔ یہ اعلان بنگال کونسل میں اس مضمون کی تحریک کے کثرت رائے سے مسترد کئے جانے کے بعد ہوا کہ بنگال کو قحط زدہ علاقہ قرار دیا جائے۔ یہ تحریک بوس گروپ کے للت چندر داس نے پیش کی تھی۔ 26 ستمبر کو مدراس کے ممتاز کانگرسی لیڈر راجگوپال اچاریہ نے وزیر ہند ایمری کے اس بیان کو غلط قرار دیا کہ ہندوستان میں غذائی بحران

صوبائی خودمختاری کے تصور کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ اچاریہ نے اس سلسلے میں لارڈ ویول (Wavel) کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ جنگ نے ہندوستان پر بہت زیادہ بوجھ ڈال رکھا ہے اور اب اس ''سونے کی چڑیا'' پر مزید بوجھ ڈالنا دانشمندی نہیں ہوگی۔ اچاریہ کی رائے یہ تھی کہ ''مرکزی حکومت پر ہندوستان میں غذائی بحران پیدا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اب یہ بحران اسی صورت میں حل ہوسکتا ہے کہ مرکز میں ایک قومی حکومت قائم ہو۔''

اسی دن اخبارات میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ بشریات (Department of Anthropology) کے اساتذہ اور طلبا کی ایک سروے رپورٹ شائع ہوئی جو انہوں نے تقریباً 504 خاندانوں سے استفسارات کی بنیاد پر مرتب کی تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ''قحط کے باعث 24.4 فیصد خاندانوں کا معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی تعلقات کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ شوہروں نے بیویوں کو نکال دیا ہے اور بیویاں بیمار شوہروں کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہیں۔ بچوں نے اپنے بوڑھے اور اپاہج والدین کو چھوڑ دیا اور والدین دل برداشتہ ہو کر گھروں سے چلے گئے ہیں۔ بھائی اب اپنی بھوکی بہنوں کی التجائیں نہیں سنتے اور انہوں نے اپنی ان بیوہ بہنوں کو بھی چھوڑ دیا ہے جنہیں انہوں نے تھوڑا عرصہ پہلے تک اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ گویا نفسا نفسی کا عالم ہے جس نے ہمارے منہ کالے کردیئے ہیں اور اس سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات کے سامنے تہذیب و تمدن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی...... محتاجوں میں 52.7 اچھوت ہیں۔ 30.9 فیصد مسلمان ہیں 15.4 فیصد اونچی ذات کے ہندو ہیں اور ایک فیصد عیسائی ہیں۔ ان میں غیر شادی شدہ افراد کا تناسب 55.6 فیصد اور شادی شدہ افراد کا تناسب 31.2 فیصد ہے۔ سب سے زیادہ کھیت مزدور قحط کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا تناسب 47.7 فیصد ہے۔ ان کے بعد چھوٹے مالکان اراضی کا نمبر آتا ہے جن کا تناسب 25 فیصد ہے۔ گویا کھیت مزدوروں اور غریب کسانوں کو ملا کر ان کا تناسب 72.7 فیصد بنتا ہے۔ پرچون فروشوں کا تناسب 7 فیصد، بھکاریوں کا تناسب 6.6 فیصد، ماہی گیروں کا تناسب 4.2 فیصد اور دوسرے پیشہ وروں کا تناسب 10.97 فیصد ہے۔ کھیت مزدوروں کے اپنے کام کی جگہوں سے بھاگنے کی وجہ سے آئندہ فصل پر بھی برا اثر پڑے گا اور اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ہمارے معاشرتی اور معاشی نظام میں خرابی کہاں ہے۔''[10]

کلکتہ یونیورسٹی کی اس سروے رپورٹ سے بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی روح کانپ اٹھی مگر برطانوی سامراج اور مقامی منافع خوروں کے ضمیر میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی کیونکہ سامراج اور سرمایہ دار کے پاس کوئی ضمیر ہوتا ہی نہیں ہے اسی لئے 25 ستمبر کو منشی گنج میں چاول کا بھاؤ 75 روپے سے لے کر 80 روپے فی من تھا۔ حالانکہ صوبائی محکمہ سول سپلائیز کا اعلان یہ تھا کہ چاول کا تھوک بھاؤ 20 روپے من ہے اور دھان کا بھاؤ 10 روپے من ہے۔ 27 ستمبر کو صوبائی کونسل میں وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی کے خلاف قرارداد مذمت پر دو روزہ بحث وزیر مال کے اس بیان پر ختم ہوئی کہ ''حکومت نے 24 پرگنہ، ہگلی، ہوڑہ اور مدنا پور کے علاقوں میں 12 امدادی مراکز کھول رکھے ہیں، جن میں 57,000 محتاجوں کی دیکھ بھال کا انتظام موجود ہے۔'' وزیر مال کے اس بیان میں ڈھاکہ کا کوئی ذکر نہیں تھا جہاں سے 30 ستمبر کو بار ایسوسی ایشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری کی گورنر کے نام تار یہ تھی کہ ''اس شہر میں گزشتہ پندرہ دن سے اناج بالکل نایاب ہے اور روزانہ سینکڑوں لوگ بھوک کی وجہ سے جاں بحق ہو رہے ہیں۔'' 4 اکتوبر کو خبر یہ تھی کہ وہاں کی بلیک مارکیٹ میں چاول کا بھاؤ ایک سو روپے من تک پہنچ گیا ہے اور 7 اکتوبر کو ایک اور خبر کے مطابق ڈھاکہ کے نزدیک نارائن گنج میں ستمبر کے مہینے میں 245 افراد بھوک کا شکار ہوئے جن میں سے 187 مسلمان تھے لیکن ان ساری ہولناکیوں کے باوجود حکومت بنگال اپنے صوبہ کو قحط زدہ علاقہ قرار دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ صوبائی وزیر تجارت و محنت خواجہ شہاب الدین کا 9 اکتوبر کو بیان یہ تھا کہ ''محض صوبہ کو قحط زدہ علاقہ قرار دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ فیمن کوڈ (Famine Code) کی بعض دفعات امدادی کارروائیوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں۔''

صوبائی گورنر سر تھامس ردرفورڈ (Thomas Rutherford) کا کلکتہ ریڈیو پر اپنی نشری تقریر میں موقف یہ تھا کہ بنگال کو تین وجوہ کی بنا پر قحط زدہ علاقہ قرار نہیں دیا گیا۔ اول یہ کہ حکومت کے پاس کبھی بھی اناج کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوا کہ وہ فیمن کوڈ کے تحت راشن کی ضمانت دے سکے۔ دوئم یہ کہ غذا کی تقسیم کا موجودہ نظام لچکدار ہے اور سوئم یہ کہ آج کل کے موسم میں آزمائشی کام ممکن نہیں ہے۔ گورنر نے صوبہ کے لئے اڑھائی لاکھ ٹن اناج کی کمی کا ذکر کرنے کے بعد سیاسی لیڈروں اور اخبارات سے اپیل کی کہ وہ موجودہ حکومت کو ناجائز طور پر ہدف ملامت بنا کر عوام

میں بے اعتمادی پیدا نہ کریں۔ اس نے حکومت کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کی ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے ملحقہ صوبہ بہار میں عام تاثر یہ تھا کہ کلکتہ میں اناج کا دوماہ کے لئے ذخیرہ موجود ہے حالانکہ حقیقتاً یہ ذخیرہ صرف تین دن کے لئے تھا۔''

قحط کے دوران ہندو۔ مسلم تضاد میں مزید اضافہ ہوا

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے سابق رکن نلنی رنجن سرکار نے گورنر کی اس نشری تقریر پر ایک بیان جاری کر کے خواجہ ناظم الدین کی حکومت پر الزام عائد کیا کہ وہ جماعتی تنازعات سے بالاتر ہو کر عوام کو اعتماد میں نہیں لیتی۔ ''ماضی میں یہ حکومت غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں اس لئے ناکام رہی ہے کہ اس نے اس مقصد کے لئے جماعتی جذبہ اور عناد کے تحت کام کیا اور صرف چند افراد کو اپنی نوازشات کا مستحق سمجھا۔'' نلنی رنجن سرکار کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت، صوبہ مسلم لیگ کے خزانچی مرزا ابوالحسن اصفہانی کی فرم کو اناج کی خریداری کی ایجنسی دینے کی وجہ سے غذائی قلت کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اگر اصفہانی اینڈ کمپنی کی بجائے چند ہندو فرموں کو یہ کام سپرد کیا جاتا تو صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی۔ این۔ آر۔ سرکار کی جانب سے جماعت پروری اور احباب پروری کا یہ الزام کوئی نیا نہیں تھا۔ جولائی 1943ء کے بعد تقریباً سارے ہندو لیڈر اور اخبارات یہ الزام عائد کرتے رہے تھے اور مولوی فضل الحق بھی شب و روز یہ الزام عائد کرنے میں پیش پیش تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ مسلم لیگی حکومت کے خلاف اس مخالفانہ پروپیگنڈے کا، جو سراسر بے بنیاد نہیں تھا، بنگال کی مسلم رائے عامہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس عرصے میں کسی بھی جگہ کے مسلمانوں نے ناظم الدین وزارت کے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس بنگالی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ یہ باور کرتا تھا کہ قحط کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بہار اور اڑیسہ کی ہندو حکومتوں نے بنگال کو بروقت اناج مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بظاہر اس طبقہ کے نزدیک کسی حکومت کے اچھا یا برا ہونے کا معیار یہ تھا کہ ہندو لیڈر اور اخبارات اس کی مخالفت کرتے ہیں یا حمایت کرتے ہیں۔ ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات کی طرف سے ناظم الدین کی حکومت کی جتنی زیادہ مخالفت کی جاتی تھی مسلم رائے عامہ اسے اتنا ہی اچھا سمجھتی تھی۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کی مسلمانوں میں

بے پناہ مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کے خلاف ہندو لیڈروں اور اخبارات کے معاندانہ پروپیگنڈے میں مضمر تھی۔ 1943ء میں ہندو۔ مسلم تضاد کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہوگئی تھی۔

فرقہ وارانہ تضاد کی اس نوعیت کی آئینہ داری 14 ر اکتوبر کو کلکتہ کے ایک بنگالی اخبار باسومتی میں بھی ہوئی جبکہ اس نے اپنے اداریے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ''اگر اب بنگال میں دو کروڑ ہندو اور دو کروڑ مسلمان مر جائیں تو آبادی کا یہ خلا سنتھال، اوراؤں اور خاصی اور جینتیا کی پہاڑیوں کے ان قبائلیوں سے پر ہو جائے گا جو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ اس طرح دو سال سے بھی کم عرصہ میں بنگال کی مسلم اکثریت پانچ اور ایک کی نسبت سے اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔''[11] ہری داس موز مدار نے مارچ 1944ء میں شائع کردہ اپنی کتاب میں روزنامہ باسومتی کا یہ اقتباس بنگال کی مسلم رائے عامہ کو یہ احساس دلانے کے لئے درج کیا تھا کہ سر ناظم الدین کی حکومت اپنی نااہلیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے صوبہ کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر رہی ہے۔ لیکن اس اقتباس کی ایک اور تعبیر یہ تھی کہ اس ہندو اخبار کے نزدیک بے مثال قحط کے زمانے میں بھی سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہ اکثریت جس طرح بھی ہو اقلیت میں تبدیل ہونی چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس قحط میں چار کروڑ مسلمان اور اچھوت مر جائیں تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

عالمی جنگ کا پانسہ پلٹنے پر قحط کے بارے میں برطانوی پالیسی میں تبدیلی، وزیر ہند ایمری کا تجزیہ، جناح کی تنقید

9 ر اکتوبر کو گورنر سر تھامس ردر فورڈ کی نشری تقریر کی تعبیر یہ تھی کہ آئندہ برطانوی حکومت بنگال کے قحط کے مسئلہ پر قابو پانے کی جانب سنجیدگی سے توجہ دے گی۔ برطانوی پالیسی میں اس تبدیلی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ ہولناک قحط ساری دنیا میں برطانوی سامراج کی شقاوت قلبی کو بے نقاب کر رہا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ گزشتہ دو ماہ میں عالمی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ 26 ر جولائی کو روم میں مسولینی کا تختہ الٹا جا چکا تھا اور 3 ر ستمبر کو اتحادی طاقتوں کی جانب سے اٹلی پر حملہ کے چار پانچ دن بعد وہاں کی نئی حکومت نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پھر یورپ، سوویت یونین، شمالی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں جرمنی اور جاپان کی پسپائی شروع ہو

گئی تھی۔ حکومت ہند نے جنگ کی اس موافق صورت حال میں 13 را کتوبر کو یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ ہندوستان سے اناج کی برآمد نہیں ہوگی۔ 15 را کتوبر کو ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری کے سد باب کے لئے آرڈیننس نافذ کیا گیا اور 16 را کتوبر کو ملک کے سارے صوبوں میں نہ صرف اناج کے نرخوں پر کنٹرول عائد کر دیا گیا بلکہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ شہری علاقوں میں اناج کی راشن بندی ہوگی۔ حکومت پنجاب نے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر مرکزی حکومت اپنے فیصلے پر مصر رہی اور بالآخر پنجاب میں بھی اس فیصلے پر عملدر آمد کرنا پڑا۔

21 را کتوبر کو بنگال کا مستقل گورنر سر جان ہر برٹ خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہو گیا۔ وہ دو اڑھائی ماہ قبل سے ہسپتال میں زیر علاج تھا اور اس کی جگہ سر تھامس ردر فورڈ بطور قائم مقام گورنر کام کر رہا تھا۔ 27 را کتوبر کو وائسرائے لارڈ ویول نے مدنا پور کے ضلع میں بعض قحط زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور 28 را کتوبر کو لندن میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی غذائی صورت حال کے بارے میں پہلی مرتبہ قرطاس ابیض شائع کیا جس میں بنگال کے قحط کی ذمہ داری برما کے سقوط، اکتوبر 1942ء کے سمندری طوفان، کلکتہ پر جاپانیوں کی بمباری، بیوپاریوں کی ذخیرہ اندوزی اور 1943ء میں سیلاب کے باعث ریلوے کا نظام درہم برہم ہونے پر عائد کی گئی۔ یکم نومبر کو حکومت ہند نے اناج کے وہ ذخائر اپنی تحویل میں لے لئے جو بیوپاریوں اور زمینداروں نے بینکوں کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے۔ 5 رنومبر کو لندن کے ایوان عام میں بنگال کے قحط کا مسئلہ زیر بحث آیا تو وزیر ہند ایمری نے یہ تو نہ بتایا کہ بنگال کے وزیر اعلیٰ فضل الحق نے 11 ردسمبر 1941ء کو اپنی بوس گروپ اور کانگرس کے تعاون سے پروگریسو کولیشن پارٹی کی نئی حکومت بنانے کے کچھ عرصہ پہلے انگریزوں کی جیوٹ مل اونرز ایسوسی ایشن کے دباؤ کے تحت صوبہ میں پٹ سن کی کاشت کا رقبہ 15 لاکھ ایکڑ سے بڑھا کر 27 لاکھ ایکڑ کر دیا تھا حالانکہ ان دنوں برما سے سالانہ تقریباً 15 لاکھ ٹن چاول کی درآمد کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اس کے اس اقدام کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ پٹ سن کی قیمت کم ہو کر صرف پانچ روپے من ہو گئی تھی جبکہ یورپین مل اونرز کا منافع 300 فیصد تک پہنچ گیا تھا۔ البتہ ایمری نے یہ بتایا کہ ''حکومت ہند نے دسمبر 1942ء میں جو غذائی کانفرنس بلائی تھی اس میں بنگال کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ فضل الحق نے اپنے صوبہ کی غذائی صورت حال کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا تھا اور اس نے رجائیت کی وجہ سے ہندوستان کے غذائی مسئلہ سے نمٹنے کی

اجتماعی سکیم میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس کی یہ رجائیت بے بنیاد ثابت ہوئی اور سب سے سنگین غذائی بحران اسی صوبے میں پیدا ہوا۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دو ماہ میں صرف کلکتہ میں قحط کی وجہ سے 18 ہزار افراد ہلاک ہوئے ہیں۔"[12]
18 نومبر کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کی یہ تحریک کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی کہ بنگال کے قحط کی تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد محمد علی جناح نے اس تحریک پر تقریر کرتے ہوئے قحط کی ذمہ داری حکومت برطانیہ اور حکومت ہند پر عائد کی۔ انہوں نے کہا کہ "صوبائی حکومت کو اس سلسلے میں موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ اس حکومت کو افراط زر، کسٹمز، ٹرانسپورٹ، فوجی مقاصد کے لئے حکومت ہند کی کارروائیوں، قیمتوں پر کنٹرول، اناج کی فراہمی یا راشننگ پر کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے۔"[13] 19 نومبر کو کونسل آف سٹیٹ میں غذائی مسئلہ پر بحث ہوئی تو سرائے۔ پی۔ پیٹرو (Patro) نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بنگال میں قحط کو سیاست کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ دو پارٹیاں جنگ اقتدار میں مصروف ہیں جس کے نتیجے میں عوام بھوکے مر رہے ہیں۔ پیٹرو کا تخمینہ یہ تھا کہ صوبہ میں ہر ہفتے اموات کی شرح 50 ہزار سے زیادہ ہے اور آئندہ سردی کے باعث اس شرح میں اضافہ ہو جائے گا۔ کونسل آف سٹیٹ میں اس مسئلہ پر تین دن تک بحث ہوئی جس کے خاتمہ پر ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص غذائی قلت کے اسباب کی تحقیقات کرائی جائے۔

قحط کے جانی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا......

سب سے زیادہ اچھوت اور مسلمان متاثر ہوئے

بنگال کے بھوکوں کو تحقیقات کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی انہیں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی، کونسل آف سٹیٹ اور برطانیہ کے ایوان عام میں محض گرما گرم بحث سے کوئی فائدہ ہو سکتا تھا۔ انہیں پیٹ بھرنے کے لئے اناج کی ضرورت تھی اور وہ انہیں کسی صورت دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ صوبہ میں نہ صرف بھوک کی ہلاکت خیزی بدستور جاری رہی بلکہ ملیریا، ہیضہ، چیچک اور دوسری وباؤں نے مزید قیامت برپا کر دی۔ 10 دسمبر کو کلکتہ کے میئر سید بدرالدجیٰ کی اطلاع یہ تھی

کہ ضلع مرشد آباد کی کنڈی سب ڈویژن کی چار لاکھ کی آبادی میں سے 50 ہزار افراد ملیریا، ہیضہ اور دوسری بیماریوں سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ضلع رنگ پور کی نلفا ماڑی (Nilpha Marri) سب ڈویژن میں لوگ اسی قسم کی بیماریوں سے لقمۂ اجل ہوئے ہیں۔ ضلع چٹا گانگ میں کشتیا کی 40 ہزار آبادی میں سے 10 ہزار جاں بحق ہوئے ہیں۔ اس کا الزام یہ تھا کہ ''اگر حکومت ان وباؤں کے سد باب کے لئے بروقت کاروائی کرتی تو ان اللہ کے بندوں کی زندگیاں بچائی جا سکتی تھیں۔'' 17 ردسمبر کو وزیر ہند ایمری کا ایوان میں انکشاف یہ تھا کہ 27 رجون سے لے کر 13 رنومبر تک بنگال پریذیڈنسی میں 77389 افراد ہیضے سے ہلاک ہوئے ہیں۔

جب کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا 31 واں سالانہ اجلاس ہوا تو بنگال مسلم لیگ ریلیف کمیٹی کے سیکرٹری چودھری معظم حسین نے ایک اخباری بیان میں بتایا کہ ''فروری، مارچ 1943ء میں (فضل الحق کی پروگریسو کولیشن وزارت کے دوران) غریب عوام الناس فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیونکہ چاول کھلی منڈی سے ناپید ہو گیا تھا اور بعض جگہوں پر بلیک مارکیٹ میں اس کا بھاؤ ایک سو روپے من تھا یعنی عوام کی دسترس سے باہر تھا۔ بنگال کے چھ کروڑ عوام میں سے ساڑھے پانچ کروڑ قحط سے متاثر ہوئے ہیں۔ لوگوں کو خوراک کی تلاش میں اپنے دیہات کو چھوڑنا پڑا ہے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق گزشتہ پانچ ماہ میں چٹا گانگ کی 30 ہزار کی آبادی میں 3 ہزار ہلاک ہو گئے۔ ضلع نوا کھلی کی 21 لاکھ کی آبادی میں ایک لاکھ اب تک ہلاک ہو چکے ہیں اور مزید دو لاکھ جاں بہ لب ہیں۔ منشی گنج (ڈھاکہ)، نلفا (رنگ پور) اور کنڈی (مرشد آباد) میں بھوک، مضر صحت غذا، ملیریا اور دوسری بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد 50 ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ فرید پور میں گزشتہ پانچ ماہ میں 54971 افراد ملیریا میں مبتلا ہوئے۔ جن میں 30057 راہی ملک عدم ہو چکے ہیں۔ والدین اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بیچ رہے ہیں۔ شوہر بیویوں کو اپنے گھروں سے باہر دھکیل رہے ہیں اور بھائی اپنی بہنوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ وہ خوراک حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ نیترکونا (میمن سنگھ) میں بعض مسلم لیگیوں نے ایک قحبہ خانے سے 12 بچوں کو برآمد کیا ہے جن کی عمریں دو سال سے دس سال تک ہیں۔ ان کے والدین نے انہیں دو روپے سے لے کر 10 روپے تک فروخت کیا تھا۔ ان بچوں میں گیارہ مسلمان تھے اور ایک ہندو تھا۔ بنگال کو خطرہ لاحق تھا کہ اس کا اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہو جائے گا اور یہ

صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کا مشرقی وطن اجڑ جائے گا۔ اس کے تباہ شدہ دیہات میں ایسے لوگ رہ جائیں گے جو محض ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں گے۔ اگر لاکھوں مسلمان مر گئے تو مسلم لیگ کہاں ہوگی۔ اگر اجڑے ہوئے دیہات میں محض ہڈیوں کے ڈھانچے باقی رہ گئے تو پاکستان بے معنی ہوگا۔"[14]

سید بدرالدجیٰ، وزیر ہند ایمری اور معظم حسین چودھری نے اپنے بیانات میں بنگال کے قحط زدگان کے بارے میں جو اعداد و شمار دیئے تھے ان کی حیثیت محض قیاس آرائیوں اور اندازوں کی تھی۔ دراصل اس قحط میں بنگال کا کس قدر جانی، اخلاقی، معاشرتی اور مالی نقصان ہوا اس کے بارے میں کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بنگال پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا قیاس یہ تھا کہ 1943ء میں کل 688846 افراد قحط کا شکار ہوئے۔ تاہم جو حقیقت بالکل واضح تھی وہ یہ تھی کہ سب سے زیادہ نقصان غریب مسلمانوں اور اچھوتوں کا ہوا۔ 24/دسمبر 1943ء کو جب کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو سب کو اس تلخ حقیقت کا شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ متعدد مقررین نے بنگال کے اس عظیم المیہ پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، ایس۔ اے۔ ڈانگے اور دوسرے ممتاز کمیونسٹ لیڈر بھی موجود تھے اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے وہاں ایک اشتہار تقسیم کیا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مسلم لیگ کو قیمتوں پر کنٹرول اور راشننگ کا مطالبہ کرنا چاہیے تاکہ سارے عوام کو اناج مل سکے۔ اشتہار میں مزید لکھا تھا کہ مسلمانوں کے حق خود اختیاری کے حصول اور قومی حکومت کے قیام کے لئے کانگرسی لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرنا چاہیے اور مسلم لیگ کو جمہوری اور عوامی جماعت بنایا جائے۔

5/جنوری 1944ء کو بنگال کا وزیر تعلیم مولوی تمیز الدین خان مسلم لیگ کے اس اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے بتایا کہ "لیگ کے کراچی سیشن میں جو مسائل زیر بحث آئے ان میں اہم ترین مسئلہ بنگال کے غذائی بحران کا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے مقررین نے حکومت ہند کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ چونکہ بنگال کا قحط عالمی جنگ کا نتیجہ ہے اس لئے اس قحط کی ذمہ داری ہز مجسٹیز گورنمنٹ پر عائد ہوتی ہے۔" تاہم تمیز الدین خان نے حکومت ہند کے خلاف اس الزام کی تفصیل پر روشنی نہ ڈالی۔ اس نے نہ تو یہ

بتایا کہ کس طرح برطانوی فوجی افسروں کی ''انکار کی پالیسی'' کے تحت لاکھوں غریب کسانوں، کھیت مزدوروں، ماہی گیروں اور ملاحوں کو خانماں برباد کر دیا گیا تھا اور نہ ہی یہ بتایا کہ کس طرح حکومت ہند نے برما سے چاول کی درآمد بند ہو جانے کے باوجود اپنی افواج کے لئے پورے ہندوستان کے کاشتکاروں سے بالعموم اور بنگالی کاشتکاروں سے بالخصوص زبردستی اناج فراہم کیا تھا۔ حکومت نے 1942ء-1943ء میں جبکہ بنگال میں قحط کے باعث بے شمار مخلوق خدا مکھیوں کی طرح مر رہی تھی، افواج کے لئے 312,000 من گندم اور 115,000 من چاول خریدا تھا اور اس طرح وہ طلب اور رسد کے درمیان نازک توازن کو درہم برہم کر کے قیمتوں میں بے پناہ اضافے کا باعث بنی تھی۔ مزید برآں حکومت ہند نے اناج کی خریداری اور دوسرے جنگی اخراجات کے لئے فالتو نوٹ اتنے زیادہ چھاپے تھے کہ ہندوستان میں افراط زر کی شرح 225 فیصد تک پہنچ گئی تھی جبکہ برطانیہ میں افراط زر کی شرح 20 فیصد اور امریکہ میں 100 فیصد تھی۔

مسلم لیگ حکومت نے راشن ڈپوؤں کے ذریعہ اناج کی تقسیم کا ہنگامی انتظام کیا تو ہندو بنیوں نے اسے اپنے کاروبار کے خلاف قرار دے کر لیگ حکومت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا

تمیز الدین خان کا مذکورہ بیان سر ناظم الدین کی مسلم لیگی حکومت کے اس عزم کا آئینہ دار تھا کہ آئندہ وہ بنگال کے مختلف سیاسی حلقوں کا تعاون حاصل کر کے حکومت ہند کے اکتوبر 1943ء کے فیصلوں کے مطابق غذائی بحران پر قابو پائے گی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اناج کے سرکاری ڈپوؤں اور پرائیوٹ دکانداروں کو اناج کی مقررہ نرخوں پر فروخت کے لئے راشن کارڈ دیئے جائیں گے۔ سب سے پہلے اس فیصلہ پر کلکتہ میں عملدرآمد ہو گا جہاں چار سو سرکاری ڈپوؤں کو اور چار سو پرائیویٹ دکانداروں کو راشن کارڈ ملیں گے۔ ہر ڈپو اور ہر دوکان پر 1500 راشن کارڈوں پر اناج کی پرچون کا ہر روز کا انتظام ہو گا۔

جب جنوری 1944ء کے اوائل میں اس فیصلے کا اعلان کیا گیا تو ہندوؤں کے کاروباری حلقوں میں کہرام مچ گیا اور اس مضمون کا زبردست پروپیگنڈا ہوا کہ اگر تجارت کے ''روایتی

طریقوں'' سے انحراف کیا گیا تو ''تباہی مچ جائے گی'' ان کی تجارت کا ''روایتی طریقہ'' یہ تھا کہ صوبہ میں ہر قسم کے تھوک اور پرچون کاروبار پر مارواڑیوں اور اونچی ذات کے دوسرے ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ انہیں بجا طور پر خدشہ تھا کہ اگر سرکاری طور پر اناج کی جزوی یا مکمل راشننگ ہوئی تو تجارت پر ان کی روایتی اجارہ داری ٹوٹ جائے گی کیونکہ مسلم لیگ حکومت مسلمانوں کو بھی اس کاروبار میں حصہ لینے کا موقع فراہم کرے گی۔ قبل ازیں یہی حکومت ابوالحسن اصفہانی کی فرم کو اناج کی خریداری کی واحد ایجنسی دے چکی تھی۔ چنانچہ انڈین اینڈ مارواڑی چیمبرز آف کامرس کا ایک وفد فوراً نئی دہلی پہنچا اور اس نے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر خوراک سر جوالا پرشاد سری واستوا سے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت بنگال کو اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی اجازت نہ دے اور سر جوالا پرشاد نے اس مطالبہ پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا۔ جب جنوری کے دوسرے ہفتے میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تو لاہور کے مسلمانوں کے اخبار ایسٹرن ٹائمز نے اس پر سخت اداریہ لکھا۔ اخبار نے الزام عائد کیا کہ ''بنگال میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کی قحط سے ہلاکت کی زیادہ تر ذمہ داری ہندو ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں پر عائد ہوتی ہے۔ اب جبکہ حکومت بنگال نے ان عناصر کی شرارت کے سدباب کے لئے اناج کی تقسیم کے لئے کچھ متبادل انتظام کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ اب یہ اپنے بنیے بھائی سر جوالا پرشاد سے شکایت کرنے کے لئے دہلی پہنچے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر روایتی تجارتی طریقوں سے انحراف کیا گیا تو تباہی آجائے گی۔'' اخبار کا مطالبہ یہ تھا کہ ''سر جوالا پرشاد کو مستعفی ہو جانا چاہیے کیونکہ جب تک یہ مہا سبھائی بنیا مرکز میں رہے گا اس وقت تک بنگالی بنیوں کی چیخ و پکار ختم نہیں ہوگی۔''[15]

ایسٹرن ٹائمز کی اس قدر برہمی کی وجہ یہ تھی کہ آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر اور بنگال ہندو مہا سبھا کے سیکرٹری ایم۔ این۔ مترا نے اپنے بیانات میں حکومت بنگال کے متذکرہ فیصلے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا تھا کہ صوبہ میں گورنری راج نافذ کر دیا جائے۔ اول اس لئے کہ مسلم لیگی حکومت مرکزی حکومت کی فرمانبرداری نہیں کرتی اور دوئم اس لئے کہ بنگال عنقریب جنگ کے مشرقی محاذ کا سب سے بڑا اڈہ بننے والا ہے۔ ایسٹرن ٹائمز کی رائے یہ تھی کہ ''ان مہا سبھائی لیڈروں کو یکا یک مرکزی حکومت سے اس لئے پیار ہو گیا ہے کہ آج کل وہاں ان کا ایک بنیا بھائی محکمہ خوراک کا انچارج ہے۔ انہیں امید ہے کہ سر جوالا پرشاد

بنگال کے بنیا منافع خوروں کی امداد کرے گا۔" اس اخبار کا مزید تبصرہ یہ تھا کہ "یہ ہندو منافع خور بنیے، جن پر بنگال میں قحط کی خاصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، صوبہ کی حکومت کے خلاف جنگ شروع کر رہے ہیں۔ ماضی میں یہ عناصر قحط کے ہتھیار کے زور پر مسلم لیگی حکومت کو بدنام کرنے اور بالآخر اس کا تختہ الٹنے کی امید کرتے رہے ہیں۔ ان کا یہ حملہ بدستور جاری ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ چاول کی فراہمی اور تقسیم کے روایتی طریقوں کو برقرار رکھا جائے یعنی بنیوں کو بلا روک ٹوک لوٹ کھسوٹ کی اجازت دی جائے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو صوبہ میں آئین معطل کر کے گورنری راج نافذ کر دیا جائے...... بنگال رائس مل اونرز کے وفد کے قائد سی۔ کے۔ گھوش اور کلکتہ رائس ڈیلرز کے وفد کے قائد آر۔ این۔ چیٹر جی نے صوبائی حکومت کے خلاف جو الزامات عائد کئے ہیں ان پر صوبائی اسمبلی میں بحث ہونی چاہیے۔ مرکزی ممبر خوراک نے ان الزامات کا نوٹس لے کر اور صوبائی حکومت کے غذائی منصوبے میں مداخلت کر کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہے......ان وفود کی شکایت یہ ہے کہ چاول کے تقسیم کنندگان (یعنی بنیا دوکاندار) اس کاروبار میں اس وقت سے ہیں جب کلکتہ شہر وجود میں آیا تھا۔ چاول کی تقسیم کے کام سے تقریباً 50 ہزار لوگ منسلک ہیں۔ اب وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اور اگر تجارت ان سے چھین لی گئی تو وہ بے روزگار ہو جائیں گے۔ ان کا تجارت میں 10 لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ یہ بھاری رقم اب غیر پیداواری بن رہی ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ بیوپاری بالآخر مالی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔"[16] بلاشبہ ایسٹرن ٹائمز کا یہ اداریہ بہت تلخ تھا اگرچہ اس نے اس میں اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں کے یہ مفاد پرست عناصر جولائی 1943ء کے بعد سے سر ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت کو محض اس لئے ہدف ملامت بناتے رہے ہیں کہ اس نے ہندوؤں کے روایتی بیوپاریوں کی بجائے اصفہانی اینڈ کمپنی کو اناج کی خریداری کا واحد ایجنٹ مقرر کر دیا تھا۔ جب ان کے الزامات حد سے بڑھ گئے تھے تو وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ اس کمپنی کے حسابات کی خود جانچ پڑتال کر کے یہ بتائے کہ اس مسلم کاروباری ادارے نے کیا بدعنوانی کی ہے۔ مگر ڈاکٹر مکر جی نے یہ دعوت قبول نہیں کی تھی اور وہ بدستور مسلم لیگی وزارت کا تختہ الٹنے کے درپے رہا تھا کیونکہ اس کے نزدیک قحط کا مسئلہ بھی ایک فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور وہ اس مسئلہ کے ہتھیار کے زور سے مسلم لیگی وزارت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔

بنگالی ہندوؤں میں اگر کوئی سیاسی شخصیت اعلانیہ طور پر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی اور دوسرے ہندو فرقہ پرست عناصر کے خلاف تھی تو وہ سابق کمیونسٹ لیڈر ایم۔این۔رائے کی شخصیت تھی۔اسے اناج کی فراہمی اور تقسیم کے سلسلے میں حکومت بنگال کی پالیسی سے اتفاق تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ فوج کی امداد سے صوبہ کی غذائی صورت حال پر بہت حد تک قابو پالیا گیا ہے۔آئندہ فصل کی تقسیم کا مناسب انتظام کیا گیا تو قلت بالکل ختم ہوجائے گی اور قیمتیں بھی نچلی سطح پر آجائیں گی لیکن اگر اناج کی تقسیم کے لئے تجارت کے روایتی طریقے کو برقرار رکھا گیا تو غذائی قلت کی صورت حال پھر ابتر ہو جائے گی۔اگر حکومت اناج کی صرف فراہمی کرے اور اس کی تقسیم کا مناسب بندوبست نہ کرے تو اس سے صارفین کو اناج کی سپلائی کی ضمانت نہیں ملے گی۔ اس کی مزید رائے یہ تھی کہ کاشتکاروں اور صارفین کو کوآپریٹو سوسائیٹوں کے ذریعے عوام کے لئے اناج کی سپلائی کو یقینی بنانا چاہیے۔[17] 21/جنوری کو صوبہ سندھ کا وزیر داخلہ ہاشم گزدر بنگال کا دورہ کرنے کے بعد واپس کراچی پہنچا تو اس نے بھی ایک اخباری بیان میں کچھ اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا۔اس کا خیال یہ تھا کہ اگر اب بنگال میں غذائی بحران پیدا ہوا تو یہ خالصتاً مرکزی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے ہوگا جس نے بنگال ہندو مہاسبھا کے زیر اثر اپنی سابقہ پالیسی میں ترمیم کر دی ہے۔ہندو مہاسبھا نے دھان کی فصل کی فراہمی اور تقسیم کے بارے میں صوبائی حکومت کے پلان کے خلاف بہت شور وغوغا کیا ہے کیونکہ اس پلان نے اناج کی تجارت میں آڑھتیوں کا کردار ختم کر کے تجارت کے پرانے طریقے کو ختم کر دیا ہے۔آڑھتی زیادہ تر ہندو ہیں اس لئے مہاسبھا نے ان کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور بدقسمتی سے حکومت ہند کے ممبر خوراک نے مہاسبھا کے اس رویے کی حمایت کرتے ہوئے حکومت بنگال کے پلان میں، جس پر خوش اسلوبی اور کامیابی سے عمل ہو رہا ہے، مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس نے اس الزام کی تردید کی کہ چاول بلیک مارکیٹ میں مہنگے بھاؤ فروخت ہو رہا ہے اور بتایا کہ کلکتہ میں اس کا بھاؤ 12 روپے من اور صوبہ کے دوسرے علاقوں میں اس کا بھاؤ 15 روپے سے 17 روپے من کے درمیان ہے۔[18] لیکن کلکتہ کے مارواڑیوں اور دوسرے ہندو بیوپاریوں کو ان حقائق و دلائل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں دلچسپی تھی تو صرف اس بات میں کہ ان کی منافع خوری میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے اور یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ صوبہ میں مسلم لیگ کے اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ بظاہر

انہی مفاد پرست عناصر کی تحریک پر 15 رجنوری 1944ء کو کلکتہ کارپوریشن نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت بنگال کی راشننگ سکیم پر نکتہ چینی کی۔ اس نکتہ چینی کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سکیم کے تحت غریبوں اور مزدوروں کو ایک ہفتہ تک اپنے راشن کا کوٹا نہیں ملے گا اور جو لوگ باہر سے کلکتہ آئیں گے انہیں یہاں قیام کے دوران خوراک نہیں مل سکے گی اور دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ ہندوؤں کے مندروں میں بھینٹ چڑھانے کے لئے راشن کا کوٹا مقرر نہیں کیا گیا۔[19] بایں ہمہ حکومت بنگال نے 31 رجنوری کو کلکتہ میں چاول، گندم اور کھانڈ کی راشن بندی کر دی تھی۔

یکم فروری 1944ء کو بنگال اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو کانگرس اسمبلی پارٹی نے اپنی مرکزی ہائی کمان کی اجازت سے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ فضل الحق کی پروگریسو کولیشن پارٹی کے ساتھ مل کر مسلم لیگی وزارت کی نئی غذائی پالیسی کی مخالفت کی جائے گی۔ قبل ازیں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی یہ دھمکی دے چکا تھا کہ اگر مسلم لیگی وزارت کو برطرف نہ کیا گیا تو صوبہ میں پھر قحط پڑ جائے گا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد 12 رفروری کو ''قحط کے اس دیوتا'' کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی جبکہ صوبائی اسمبلی میں بوس گروپ کے ایک رکن نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا کہ صوبہ میں چاول اور دھان کے کم از کم نرخ مقرر کئے جائیں کیونکہ اس کے ضلع دیناج پور میں ان کا بھاؤ بہت ہی گر گیا ہے۔ کانگرس پارٹی نے اس قرارداد کی حمایت کی اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اگر حکومت نے غذائی مسئلہ پر پوری طرح قابو نہ پایا تو صوبہ میں پھر قحط پڑ جائے گا۔ وزیر سول سپلائز حسین سہروردی نے اپنی جوابی تقریر میں ایک اور قحط کے اندیشوں کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''حکومت چاول اور دھان کے نرخوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بلاشبہ نرخ کم ہوئے ہیں لیکن اتنے کم نہیں ہوئے جتنے کہ ہم چاہتے ہیں...... موجودہ حالات میں اناج کے کم از کم یا زیادہ سے زیادہ نرخ مقرر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

سہروردی کی تقریر کے بعد رائے شماری ہوئی تو کانگرس کی یہ قرارداد کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی۔ ایوان کے اس فیصلے کی تعبیر یہ تھی کہ اگرچہ 1943ء میں قحط کے باعث مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ دس سے لے کر بیس لاکھ تک تھا اور اگرچہ ان مرنے والوں میں کم از کم 40 فیصد مسلمان تھے لیکن اس کے باوجود صوبہ کی مسلم رائے عامہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت کی برطرفی کے حق میں نہیں تھی کیونکہ اس قحط سے ہندو۔ مسلم تضاد کی شدت میں کمی آنے کی بجائے

اضافہ ہوا تھا۔ کاروباری ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلم لیگی وزارت نے ان کے معاشی مفادات کو نقصان پہنچایا ہے اور مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ یہ باور کرتا تھا کہ چھوٹے بڑے ہندو بیوپاری ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کے ذریعے لاکھوں اموات کا باعث بنے ہیں۔ بظاہر یہ دونوں ہی الزامات صداقت سے سراسر خالی نہیں تھے۔ مسلم لیگی وزارت کے آنے سے کاروباری ہندوؤں کے معاشی مفادات کو نقصان پہنچا تھا اور یہ الزام بھی کسی حد تک صحیح تھا کہ مرکزی ممبر خوراک سر جوالا پرشاد مارواڑیوں اور دوسرے ہندو بنیوں کی پشت پناہی کرتا تھا۔

قحط کا شکار ہونے کے باوجود مسلم رائے عامہ نے مسلم لیگ حکومت کی پرجوش حمایت کی، ثانوی تعلیمی بل کے حق میں زبردست مظاہرہ ہوا

یہ ہندو۔ مسلم تضاد جون 1944ء کے تیسرے ہفتے میں اور بھی شدید ہو گیا۔ جب خواجہ ناظم الدین وزارت نے اسمبلی میں سیکنڈری ایجوکیشن بل پیش کیا۔ مولوی فضل الحق نے اپنے عہد اقتدار میں اسمبلی سے یہ بل منظور کرانے کی 1940ء اور 1942ء میں دو مرتبہ کوشش کی تھی مگر دونوں مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی زبردست مخالفت کے باعث وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اب تیسری مرتبہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے یہ بل ایوان میں پیش کیا تو ہندوؤں نے پھر بہت شور مچایا۔ ان دنوں وزیر تعلیم کے عہدہ پر مولوی تمیز الدین خان فائز تھا لیکن عوامی سطح پر حسین شہید سہروردی نے اس بل کی زوردار وکالت کی۔ اگرچہ 1944ء کے اوائل میں قحط کے بعد ملیریا، ہیضہ، چیچک اور دوسری وباؤں سے روزانہ سینکڑوں لوگوں کے مرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ جون میں بھی جاری تھا۔ تاہم 25رجون کو سیکنڈری ایجوکیشن بل کی حمایت کے لئے کلکتہ کے محمد علی پارک میں جو جلسہ عام ہوا اس میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی اور ''شہید سہروردی زندہ باد'' کے نعرے لگائے گئے۔ یہ وہی سہروردی تھا جو 1943ء کے قحط کے المیہ کے دوران وزیر سول سپلائیز تھا اور اس حیثیت کی بنا پر وہ ہندو اخبارات اور لیڈروں کی نکتہ چینی کا سب سے بڑا ہدف تھا لیکن صوبہ کی تعلیم یافتہ مسلم رائے عامہ اسی وجہ سے اسے بنگالی مسلمانوں کا سب سے بڑا بہی خواہ سمجھتی تھی اور سمجھتی رہی۔ اس زمانے میں ہندو۔ مسلم مناقشت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہندو اخبارات اور لیڈر کسی مسلمان لیڈر کی جتنی

زیادہ مخالفت کرتے تھے وہ لیڈر مسلم عوام میں اتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا تھا۔ چنانچہ جب محمد علی پارک کے جلسہ عام میں حسین شہید سہروردی نے سیکنڈری ایجوکیشن بل کے حق میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ بل تعلیم کو جمہوری بنانے اور اسے غریب عوام تک پہنچانے کے لئے پیش کیا جارہا ہے تو فضا نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھی۔ سہروردی نے کہا کہ ”آج کل بنگال میں سیکنڈری تعلیم اونچی ذات کے مٹھی بھر ہندوؤں کے کنٹرول میں ہے اور اونچے طبقہ کے چند امرا اس سے مستفید ہوئے ہیں۔ غریب ہندو، مسلمان اور اچھوت اس تعلیم کے دائرے سے باہر ہیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت فرقہ سارے اچھوتوں اور دوسرے مظلوم فرقوں کو، جن کا صوبہ کی آبادی میں تناسب 90 فیصدی ہے سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے معاملات یعنی تعلیمی پالیسی، پروگرام، نصب العین، نصاب، درسی کتب اور امتحانات کے تعین کے کام میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں ان کا اس کام پر کوئی کنٹرول نہیں اور ان کی کوئی شنوائی نہیں۔ مسلم لیگ وزارت نے سیکنڈری ایجوکیشن بل (1944ء) اس مقصد کے تحت پیش کیا ہے کہ تعلیم میں اونچی ذات کے مٹھی بھر ہندوؤں کی اجارہ داری ختم ہو اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو (بشمول مظلوم طبقے) ایجوکیشن بورڈ میں مساوی نمائندگی حاصل ہو۔ اس بل میں یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ حکومت پسماندہ طبقوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے سالانہ 75 لاکھ روپے خرچ کرے گی۔ غریب اساتذہ، غریب طلبا اور غریب مزدوروں اور کسانوں کو اس سرکاری گرانٹ سے، جو ایک سال میں بڑھا کر ایک کروڑ کر دی جائے گی، بہت فائدہ پہنچے گا۔ سہروردی نے کہا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ ہندو مہا سبھائی لیڈر شیاما پرشاد مکرجی اس بل کی محض اس لئے مخالفت کر رہا ہے کہ اس میں بورڈ کی تشکیل کے لئے جداگانہ طریقۂ انتخاب تجویز کیا ہے۔ شیاما پرشاد مکرجی وغیرہ نے فضل الحق کے مجوزہ دو بلوں کی بھی مخالفت کی تھی حالانکہ اس میں جداگانہ طریقۂ انتخاب کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ ان کی مخالفت کی اصل وجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں اب تک تعلیم پر اجارہ داری حاصل رہی ہے اور انہوں نے اسے ایک محدود ٹریڈنگ کارپوریشن بنائے رکھا ہے۔ یہ اپنی خود غرضی کی بنا پر نہیں چاہتے کہ مسلمانوں اور دوسرے مظلوم طبقوں کو ایجوکیشن بورڈ اور تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے کام میں ان کے مساوی نمائندگی ملے۔ سہروردی نے اس حقیقت پر افسوس کا اظہار کیا کہ سیکنڈری ایجوکیشن بل کے مخالفین نہ صرف اونچی ذات کے ہندو فرقہ یعنی ہندو مہاسبھا، کانگرس اور فارورڈ بلاک کو متحد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں

بلکہ انہوں نے مسلمانوں میں بھی کامیابی کے ساتھ تفرقہ ڈلوایا ہے۔ان کی جانب سے ایجوکیشن بل کوملتوی کرانے کے لئے جو کمینے، مکروہ اور بد دیانتی کے حربے استعمال کئے گئے ہیں ان کی داستان بڑی شرمناک ہے۔ انہوں نے وزارت کو شکست دینے اور ایجوکیشن بل کو ناکام کرنے کے لئے دو لاکھ روپے جمع کئے ہیں۔ ان کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوؤں کو متحد کیا جائے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوائی جائے اور اس طرح بنگال پر حکومت کی جائے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہوں کہ میرے مکان واقعہ 40 تھیٹر روڈ پر جو مسلم لیگی ارکان اسمبلی ٹھہرے ہوئے تھے انہیں یہ پیشکش کی گئی تھی کہ اگر وہ ایجوکیشن بل کے خلاف ووٹ دیں تو انہیں دس ہزار روپے فی ووٹ کے حساب سے دیئے جائیں گے لیکن ان مسلم لیگیوں نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور وہ اپنی جماعت کے ساتھ ثابت قدمی کے ساتھ منسلک رہے۔ جس دن یہ بل ایوان میں پیش ہوا تھا اس دن سپیکر کا رویہ بھی قابل اعتراض تھا۔ اس نے مارواڑیوں اور ہندو مہاسبھا کے حامیوں کو تو پبلک گیلری کے لئے کھلے دل سے اجازتی کارڈ دیئے لیکن مسلم لیگیوں کو مطلوبہ کارڈ دینے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ اس نے خواجہ ناظم الدین کی درخواست بھی مسترد کر دی۔'' سہروردی نے اللہ اکبر، شہید سہروردی اور مسلم لیگ زندہ باد کے نعروں کے درمیان کہا کہ ''جس شخص نے بجٹ سیشن کے دوران ایجوکیشن بل کی منظوری کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تھی اس کا نام فضل الحق ہے جو شیاما پرشاد مکر جی اور ہندو مہاسبھا کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ تاہم مسلم لیگی وزارت نے اس بل کو منظور کروانے کا تہیہ کر رکھا ہے، اگر یہ اس سلسلے میں ناکام رہی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ مسلم لیگ کے فیصلے کی پابندی کروں گا اور کوئی وزارتی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔''[20]

سہروردی کی یہ تقریر کئی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اول یہ کہ بنگال میں فقید المثال قحط کے باوجود اس صوبہ میں مسلم لیگ کی مقبولیت کم نہیں ہوئی تھی حالانکہ ہندو مہاسبھا، کانگرس، فارورڈ بلاک اور کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر اور اخبارات اس قحط کی ساری ذمہ داری ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت پر عائد کرتے رہے تھے۔ دوئم یہ کہ بنگال مسلم لیگ نے 1944ء کے وسط میں ہی انتخابی مہم شروع کر دی تھی۔ اس وقت تک عالمی جنگ میں جرمنی اور جاپان کی شکست یقینی ہو گئی تھی اور سارے سیاسی مبصرین کو یقین تھا کہ اس جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد عام انتخابات ہوں گے جن میں برصغیر کے آئینی و سیاسی مستقبل کے بارے میں فیصلہ ہو جائے گا۔

صوبہ سندھ کے وزیر داخلہ ہاشم گزدر کو تو اس سلسلے میں اتنا یقین تھا کہ اس نے 1944ء کے اوائل میں ہی کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مقیم کاروباری مسلمانوں کی تنظیموں سے کہا تھا کہ "وہ پاکستان اور بنگستان کی ریاستوں کی معاشی ترقی کے لئے منصوبے تیار کریں۔"[21]

مسلم لیگ، 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کے مطابق پاکستان اور بنگستان کی دو آزاد خود مختار مسلم ریاستوں کے مطالبہ اور برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق ومفادات کے تحفظ کے پروگرام کے تحت انتخاب میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ بنگال مسلم لیگ کے لئے یہ دونوں انتخابی نعرے بہت ہی ضروری تھے کیونکہ ان نعروں کے بغیر مولوی فضل الحق کی پرجا پارٹی کو صوبہ کے سیاسی میدان سے مکمل طور پر نکالنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت کلکتہ میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام فروری۔ مارچ میں پہلے اردو کانفرنس منعقد ہوئی اور پھر صوبائی وزیر تعلیم مولوی تمیز الدین کی زیر صدارت "یوم اقبال" منایا گیا اور اسی پروگرام کے تحت 13 رجون 1944ء کو کلکتہ میں ریلوے مسلم ایمپلائز ویلفیئر لیگ کی کانفرنس ہوئی۔ جس میں ایک قرارداد کے ذریعے محکمہ ریلوے میں مسلمانوں کی نمائندگی ناکافی ہونے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ محکمہ ریلوے میں بھرتی کرنے والے سلیکشن بورڈ میں کم از کم ایک مسلمان افسر کی شمولیت کو لازمی قرار دیا جائے۔ کانفرنس میں اس تنظیم کے عہدیداروں کا بھی انتخاب ہوا۔ صدارت کے عہدے پر ایس۔ ایم۔ نعمان۔ ایم ایل اے (مرکز) کو فائز کیا گیا اور نائب صدارت کے عہدے کے لئے خان بہادر محمد علی بوگرا منتخب ہوا۔

ریلوے کے مسلم ملازمین کی اس کانفرنس کے بعد جب جولائی۔ اگست 1944ء میں مسلم لیگی لیڈروں نے اس پروگرام کے ساتھ صوبہ کا دورہ کیا تو ہر طبقہ کے مسلمانوں کا ردعمل بہت موافق تھا۔ حالانکہ ان دنوں مرکزی حکومت کے مقرر کردہ فیمن انکوائری کمیشن کے ارکان صوبہ کا دورہ کر رہے تھے اور ان کے روبرو جو گواہ پیش ہو رہے تھے ان کا تخمینہ یہ تھا کہ قحط میں 10 لاکھ سے لے کر 35 لاکھ تک لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ بعض گواہوں کے بیان کے مطابق صرف ضلع ڈھاکہ میں بھوک سے مرنے والوں کی تعداد 10 لاکھ تھی۔ یہ سب مرنے والے غریب کسان اور کھیت مزدور تھے۔ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے بڑے شہروں کے لوگ بالعموم اس قحط سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ بالخصوص کاروباری طبقہ میں سے کوئی ایک شخص بھی قحط کا شکار نہیں ہوا تھا۔ بلکہ

اس طبقہ نے اس قحط کے دوران ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کے ذریعہ خوب منافع کمایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہری داس موز مدار کے بیان کے مطابق قحط کے ان ہولناک مہینوں میں کلکتہ کے کسی بھی سینما ہاؤس میں کوئی ایک سیٹ بھی خالی نہیں ہوتی تھی۔ایک فلم بنام ''گناہ کا راستہ'' بہت رش لیتی رہی۔اس کے تینوں شوز میں ہاؤس فل ہوتا تھا۔مزید مٹھائیوں کی دکانوں پر بھی مٹھائیوں اور رس گلوں کی بہت بکری ہوتی رہی اور ''خواتین'' کی زیبائش کے سامان اور رنگا رنگ ساڑھیوں کا بازار بھی گرم رہا۔درآں حالانکہ شہر میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ بھوکے سڑکوں پر تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے''[22] اور معظم حسین چودھری کی اطلاع کے مطابق ہزاروں والدین اپنی بھوک کی آگ بجھانے کے لئے اپنی بیٹیوں کو قحبہ خانوں کے مالکان کے پاس کوڑیوں کے بھاؤ بیچ رہے تھے۔ کلکتہ میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دس بارہ سال کی لڑکی کا بھاؤ ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ نہیں تھا اور اس طرح یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ انسان کی اولین ضروریات کے سامنے مروجہ اخلاقی اقدار کے تقدس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

باب: 10

آسام کے لائن سسٹم اور کپڑے کی تجارت کے اجارہ پر ہندو۔ مسلم تضاد میں اضافہ اور ناظم الدین وزارت کا خاتمہ

راجکو پال اچاریہ فارمولا اور گاندھی۔ جناح مذاکرات کے فیصلہ کے خلاف بنگالی ہندو لیڈروں میں کھلبلی مچ گئی

مسلم لیگی لیڈروں کے سیاسی پروگرام کی بنگال کے مسلمانوں میں مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت نے بالآخر جناح کا یہ موقف عملی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے حصول سے پہلے ہندو۔ مسلم تنازعہ کا تسلی بخش تصفیہ ضروری ہے۔ مدراس کے کانگرسی لیڈر راجکو پال اچاریہ نے صدر مسلم لیگ کے اسی موقف کے پیش نظر 1943ء کے وسط میں فرقہ وارانہ مصالحت کے لئے ایک فارمولا☆ مرتب کیا تھا جس میں مطالبہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس نے 10 رجولائی 1943ء کو اس فارمولے کے بارے میں گاندھی کو جیل میں مطلع کیا تھا اور پھر اس نے اپریل 1944ء میں صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کو اس کی نقل بھیجی تھی۔ پھر جب جولائی 1944ء کے اوائل میں یورپ کے ہر محاذ پر جرمن فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی اور انگریزوں نے برما میں جاپانیوں کے خلاف بھرپور جوابی حملہ کر دیا تو گاندھی نے

☆ اسے سی راج گوپال اچاریہ کے نام سے سی۔ آر فارمولا بھی کہا جاتا ہے۔

راجکو پال اچاریہ کے فارمولے کی بنیاد پر صدر مسلم لیگ جناح سے گفت وشنید کا فیصلہ کیا۔اس نے اس فیصلے کے تحت جیل سے 17رجولائی 1944ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں بات چیت کی پیشکش کی۔اس پیشکش کا قومی پس منظر یہ تھا کہ اگست 1942ء کی کانگرس کی پر تشدد تحریک کی ناکامی کے بعد پورے برصغیر میں مسلم لیگ کے وقار اور مقبولیت میں اتنا اضافہ ہوا تھا کہ اسے مزید نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ ٹوکیو میں ٹوجو کی حکومت مستعفی ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ ایشیا میں جاپانی بعض شرائط کے تحت شکست تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور سوبھاش چندر بوس کے جاپانیوں اور آزاد ہند فوج کی امداد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے خواب کے پورا ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ صدر مسلم لیگ نے ان دونوں عوامل کو پیش نظر رکھ کر گاندھی سے گفت وشنید کی تجویز فوراً منظور کر لی کیونکہ اس تجویز میں ''مطالبہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔''

30رجولائی 1944ء کو جب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے لاہور میں قائداعظم جناح کو اس سلسلے میں گاندھی سے بات چیت کرنے کا پورا اختیار دے دیا تو بنگال کے بورژوا ہندوؤں میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ انہیں یہ خطرہ پیش ہو گیا کہ اگر اچاریہ فارمولا کے مطابق بنگال کے مسلم اکثریتی علاقوں کو علیحدگی کا حق دے دیا گیا تو وہاں نہ صرف ان کی زمینداریوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ پٹ سن کا کاروبار بھی زود یا بدیر ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اسی خطرے کے احساس کے تحت 2راگست 1944ء کو پونا میں بال گنگا دھر تلک کی برسی کے موقع پر اچاریہ فارمولے پر سخت نکتہ چینی کی۔اس نے کہا کہ ''بنگال تلک کو ہمیشہ یاد رکھے گا کیونکہ اس نے اس صوبہ کی تقسیم کے خلاف کل ہند سطح پر زبردست تحریک چلائی تھی۔تلک نے ہندوستان کے اتحاد کے لئے جدوجہد کی تھی۔اب اس کے صوبہ مہاراشٹر کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تحریک کی قیادت کرے۔اگر پاکستان (بال گنگا دھر) تلک کے دور میں برا تھا تو یہ ہمیشہ برا ہی رہے گا۔مہاتما گاندھی خواہ کتنی ہی اس کی حمایت کرے اس میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہو گی۔ جب تک انگریز ہندوستان میں ہیں پاکستان قائم نہیں ہو گا اور جب انگریز اس ملک سے چلے جائیں گے تو ہندو، پاکستان قائم نہیں ہونے دیں گے۔''[1]

3راگست کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر خوراک سر جوالا پرشاد سری واستوا نے

بھی لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے اچاریہ فارمولے کی بنیاد پر مجوزہ گاندھی۔ جناح گفت وشنید کی مخالفت کی لیکن اس نے اس مقصد کے لئے ذرا محتاط الفاظ استعمال کئے۔ اس نے کہا کہ ''ہمارے جو ہم وطن مصالحتی فارمولے کی تلاش کے متمنی ہیں میں ان کی گرم جوشی میں کوئی کمی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ بہترین مقاصد کے تحت ایسا کر رہے ہیں لیکن ان کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس رائے کا حامل ہوں کہ مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرنے سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہوگا'' سر جوالا پرشاد نے یہ تقریر ہندو مہا سبھا کے ایک وفد کی جانب سے پیش کردہ میمورنڈم کے جواب میں کی تھی۔ اس میمورنڈم میں کہا گیا تھا کہ کانگرس ہندوؤں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ ہندو مہا سبھا کو ہندوؤں کے علاوہ سکھوں اور بنگالیوں کی تائید وحمایت حاصل ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسے فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گی جس میں اس کی حیثیت ایک فریق کی نہیں ہوگی۔ بنگالی مفاد پرست ہندوؤں کی طرف سے یو۔ پی۔ ہندو مہا سبھا کے اس میمورنڈم کی تائید 7/اگست کو کی گئی جبکہ کلکتہ میں ہندو مہا سبھا کے زیر اہتمام اینٹی پاکستان ڈے منایا گیا۔ اس جلسہ میں ایس۔ آر۔ چودھری اور دوسرے مقررین نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کی پرزور مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر آج ٹیگور زندہ ہوتا تو وہ ہندوستان کی چیر پھاڑ کی مخالفت کرتا۔[2]

مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے اچاریہ فارمولا اور گاندھی۔ جناح مذاکرات کی حمایت میں تحریک

مفاد پرست ہندو عناصر کی اس بوکھلاہٹ پر ردعمل کے طور پر بنگال کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ نے مجوزہ گاندھی۔ جناح گفت وشنید کے حق میں مہم چلائی۔ اس سلسلے میں کانگرس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام 3/اگست کو عبدالحمید چودھری کی زیر صدارت کلکتہ میں ایک جلسہ عام ہوا۔ جس میں پہلے تو اچاریہ فارمولے کی حمایت میں مسلم لیگی لیڈر خواجہ شہاب الدین اور کانگرسی لیڈر جے سی گپتا کے بیانات پڑھ کر سنائے گئے اور پھر صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری کامریڈ بھوانی سنگھ کی پیش کردہ اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی کہ موجودہ سیاسی بحران ملک کے لئے نقصان دہ ہے۔ امید ہے کہ مجوزہ گاندھی۔ جناح گفت وشنید سے یہ بحران دور ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر اچاریہ فارمولے کی تائید وحمات کرنی چاہیے۔ معظم حسین چودھری

اور شمس الہدیٰ وغیرہ نے اس قرارداد کی تائید میں تقریریں کیں۔[3] مسلم لیگیوں کی یہ مہم اس قدر موثر ہوئی کہ 8 راگست کو نواب بہادر ڈھاکہ نے مولوی فضل الحق کی پروگریسو کولیشن پارٹی سے رشتہ توڑ کر دوبارہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان ہوا کہ عنقریب اسمبلی کے کئی دوسرے مسلم ارکان بھی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ساتھ مل جائیں گے۔ 17 راگست کو ہندو مہاسبھا کی سخت مخالفت کے باوجود کلکتہ کارپوریشن نے گاندھی۔ جناح گفت وشنید کی حمایت کی اور اسی دن ویلنگٹن اسکوائر میں بنگال پراونشل سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ایک جلسہ کیا جس کے نام خواجہ ناظم الدین کے پیغام میں دعا کی گئی تھی کہ ''گاندھی۔ جناح گفت وشنید بار آور ثابت ہو۔''

چونکہ اس جلسہ سے پہلے اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر اور دوسرے بہت سے سیاسی لیڈروں کی طرح مولوی فضل الحق کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ گاندھی کی قائداعظم جناح سے گفت وشنید کی تجویز کے بعد بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں مسلم لیگ کے وقار اور مقبولیت میں جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے اسے روکا نہیں جا سکتا اس لئے فضل الحق نے 17 راگست کو اپنی شرمناک روایت کے مطابق ایک اور قلابازی کھائی۔ اس نے مرزا ابوالحسن اصفہانی کے اخبار ''مارننگ نیوز'' کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ ''اگر میں ملت کے ساتھ دوبارہ مل جاؤں، پاکستان کے حصول کے لئے اپنے آپ کو دلجمعی کے ساتھ وقف کر دوں تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی'' اور پھر اس نے 19 راگست کو اورینٹ پریس سے ایک انٹرویو میں اپنے پہلے انٹرویو کی تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ''مسٹر جناح نے میرے مخالفین کی جانب سے گمراہ کئے جانے کی بنا پر مجھے مسلم لیگ سے خارج کیا تھا۔ اگر اب وہ یہ پابندی اٹھا دیں تو میں پہلے کی طرح خود بخود مسلم لیگ کا ممبر بن جاؤں گا۔ میں نے رضاکارانہ طور پر مسلم لیگ کو نہیں چھوڑا ہے۔ اس لئے میں اس جماعت میں دوبارہ شمولیت کی درخواست نہیں دے سکتا۔'' لیکن فضل الحق کی یہ قلابازی بھی اس کی متعدد پہلی قلابازیوں کی طرح بعد از وقت تھی۔ اب اس کے لئے بس نکل چکی تھی۔ اب بنگال کے مسلم لیگی لیڈروں کو اس کے تعاون کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان دنوں خواجہ ناظم الدین، این۔ ایس۔ گپتا، مولانا اکرم، حسین شہید سہروردی، ابوالہاشم، جے۔ سی، گپتا اور دوسرے 19 لیڈروں کی مشترکہ اپیل کے مطابق پورے صوبے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے جلسے شروع ہو گئے تھے جن میں گاندھی۔ جناح گفت وشنید کی

کامیابی کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں۔

اگست 1944ء کے اواخر میں بنگال کے مسلم لیگی لیڈروں کو بظاہر ایک سیاسی دھچکا لگا جبکہ دو انگریز افسروں کی انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کی خبر میں یہ بتایا گیا کہ بنگال کی مسلم لیگی حکومت نے 1943ء میں قحط کے دوران گندم کے کاروبار میں ایک کروڑ 14 لاکھ اور 71 ہزار روپے کا منافع کمایا تھا۔[4] مگر بنگال کی مسلم رائے عامہ نے اس خبر سے کوئی اثر قبول نہ کیا اور مسلم لیگ کا سیاسی ڈنکا بدستور بجتا رہا۔ 5 ستمبر 1944ء کو جیسور میں ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس لیگ، ڈسٹرکٹ سٹوڈنٹس فیڈریشن اور گرلز سٹوڈنٹس یونین نے مشترکہ طور پر کانگرس اور مسلم لیگ کے جھنڈے اٹھا کر مظاہرہ کیا جس کے اختتام پر ایک جلسہ میں گاندھی۔جناح بات چیت کا خیر مقدم کیا گیا۔اس موقع پر بنگال ہندو سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سات ارکان سیوا گرام گئے ہوئے تھے تاکہ وہاں دھرنا مار کر گاندھی کو ترغیب دی جائے کہ وہ اچاریہ فارمولے کی بنیاد پر قائداعظم جناح سے کوئی مذاکرات نہ کرے۔

10 ستمبر کو بمبئی میں گاندھی کی جناح کے ساتھ بات چیت شروع ہوئی تو اس کے تین چار دن بعد کلکتہ میں اعلان کیا گیا کہ مولوی فضل الحق کی پروگریسو کولیشن پارٹی کے مزید پانچ ارکان۔ یوسف مرزا، ایم۔اے۔زمان، بارات علی، دیوان مصطفی علی اور لکشمی نارائن بسواس وزارتی پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ یوسف مرزا، فضل الحق وزارت میں چیف وہپ تھا لیکن اب جب وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں شامل ہوا تو اسے کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔اس موقع پر اس کا بیان یہ تھا کہ "ہندو مہاسبھا کے مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے گاندھی۔جناح مذاکرات کے بارے میں مخالفانہ رویے نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔"

گاندھی۔جناح مذاکرات کی ناکامی اور کلکتہ مسلم لیگ کانفرنس کی طرف سے جناح کے موقف کی تائید

28 ستمبر کو گاندھی۔جناح مذاکرات ناکام ہوئے تو بنگال میں مسلم لیگ اور اس کے صدر محمد علی جناح کا وقار اور بھی بلند ہو گیا کیونکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو مزید یقین ہو گیا کہ ان کا قائداعظم مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے بارے میں سودا بازی نہیں کرے گا۔ان

مذاکرات کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ گاندھی ''آزادی پہلے اور پاکستان بعد میں'' کے موقف پر مصر تھا اور جناح کا جواب یہ تھا کہ ''یہ موقف گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہے۔''

اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں کلکتہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کونسل کی کانفرنس میں قائداعظم کے اس موقف کی بھرپور حمایت کی گئی۔ اس سلسلے میں متفقہ طور پر منظور کردہ قرارداد میں کہا گیا کہ ''قائداعظم کو آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی نصب العین اور نظریے سے انحراف کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا یعنی وہ ان اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانان ہند ایک بالکل الگ قومیت ہیں اور اس بنا پر وہ مکمل آزادی اور حق خودارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو برصغیر کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں ایسی قومی ریاستیں درکار ہیں جو سیاسی لحاظ سے آزاد و خودمختار ہوں، معاشی لحاظ سے مستحکم اور خوشحال ہوں اور فوجی لحاظ سے محفوظ اور طاقتور ہوں۔ ان ریاستوں کا رقبہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونا چاہیے تا کہ ان کی توسیع، ترقی اور سلامتی کا بندوبست ہو سکے۔ مسلمانوں کے ساتھ برطانوی راج کے قیام کے بعد جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ گاندھی نے نہ صرف مسلمانوں کو مساوی درجہ دینے سے انکار کر دیا ہے بلکہ اس نے ایسی تدابیر وضع کی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلمان اور دوسرے عوام مستقل طور پر ہندو اکثریتی راج کے ماتحت چلے جائیں گے۔ گاندھی کے منصوبوں کی منظوری مسلمانوں کی بحیثیت قومیت موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کے مترادف ہوتی۔ گاندھی حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے ہندوستان کے اتحاد اور ہندوستانی قومیت کے واہموں کا تعاقب کرتا رہا ہے حالانکہ ہندوستان کی تاریخ میں ان دونوں چیزوں کا کبھی کوئی وجود نہیں رہا اور اب برطانوی سامراجی ہندوستان کی سالمیت کے تحفظ کے بہانے کے تحت یہاں اپنے راج کو دائمی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمام محب الوطن اور وسیع المشرب لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو مان لیں کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس میں کئی قومیتیں ہیں جو حق خودارادیت اور آزادی کی زندگی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے اس پیچیدہ مسئلے کا قابل عمل، حقیقت پسندانہ اور منصفانہ حل یہ ہے کہ بڑی بڑی قومیتوں کی، جو اپنی قدرتی آبادی کے لحاظ سے اپنے اپنے مربوط وطن رکھتی ہیں، مساویانہ حیثیت، آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کیا جائے اور اس طرح انہیں اپنی مختلف النوع قومی

صلاحیتوں کی ترقی اور توسیع کا موقع دیا جائے۔ صرف مسلمانوں اور دوسری قومیتوں کی مکمل مساویانہ حیثیت اور آزادی کو تسلیم کرنے سے ہی برصغیر کے مختلف لوگوں کے لئے اجتماعی سلامتی اور اتحاد ممکن ہو گا۔ ایسا اتحاد جس کی تشکیل آزادانہ ہو گی اور جسے مختلف آزاد ریاستیں برقرار رکھیں گی۔ لیکن ہندوستان کی مختلف قومیتوں کی جانب سے لیگ آف نیشنز، اجتماعی سلامتی اور باہمی اتحاد کے قیام سے پہلے ضروری ہے کہ اس برصغیر کے سارے محکوم اور مظلوم عوام میں حقیقتاً انفرادی سلامتی اور آزادی کا احساس پیدا ہو۔ مزید برآں انہیں قوموں کی برادری میں مکمل مساوی درجہ، آزادی اور خودمختاری دینا ضروری ہے تا کہ وہ بیرونی دباؤ یا مجبوری کے تحت کوئی کارروائی نہ کریں۔ کانفرنس ہندوستان کے سارے بہی خواہوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ قومیتوں کے مسئلہ کے وسیع اور بنیادی تصفیہ کے لئے اور ان کی انفرادی آزادی اور اجتماعی سلامتی کے لئے اپنی مخلصانہ کوششیں جاری رکھیں تا کہ کمزوروں پر طاقتوروں کے سامراجی استحصال و غلبہ اور اونچی ذاتوں اور طبقوں کے سرمایہ داروں کے بارے میں وہ سارے خدشات دور ہو جائیں جو ہندوستان میں قومیتوں کے مسئلہ کا منبع ہیں۔" [5]

کلکتہ مسلم لیگ کانفرنس کی اس قرارداد کا مطلب بالکل واضح تھا یعنی یہ کہ بنگال کے غریب و پسماندہ مسلمان، سرمایہ دار ہندوؤں کے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور معاشرتی غلبہ سے خوفزدہ تھے اور اس بنا پر نہ صرف اپنے لئے بلکہ ان قومیتوں کے لئے بھی حق خودارادیت کا مطالبہ کرتے تھے جو نسلی، ثقافتی، لسانی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس کانفرنس میں جو دوسری قرارداد منظور کی گئی تھی اس میں مسلمانوں کو مظلوم طبقوں، دراوڑوں، اچھوتوں اور آدی باسیوں کے زمرہ میں شامل کیا گیا تھا۔

پروفیسر تھامسن کا ہندو نکتہ نظر کی حمایت میں خط اور مسلمانوں کا احتجاج

بنگالی مسلمانوں کے اس خوف کا طویل تاریخی پس منظر تھا جس کی نشاندہی ایک کانگرس نواز انگریز مصنف ایڈورڈ تھامسن نے نادانستہ طور پر ستمبر 1944 کے اوائل میں کی تھی۔ تھامسن نے لندن کے ہفت روزہ سپیکٹیٹر کے نام ایک خط میں جناح۔ گاندھی مذاکرات کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ صحیح ہے کہ بنگال میں ایک معمولی سی مسلم اکثریت کی ایک روایت اور ثقافت

ہے لیکن دولت کے لحاظ سے یہ قوم نمایاں طور پر ہندو ہے۔ بنگالی مسلمان ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں اور مسلمان شعرا ہندو دیوتاؤں اور انسانی روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے بنگالی ادب میں کسی جگہ بھی مسلم رنگ کی آمیزش نہیں ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے لئے تقریباً سارے عطیات ہندوؤں نے دیئے ہیں۔ کسی پسماندہ اکثریت کو معاشی اور ثقافتی زندگی کی اونچی سطح پر تو پہنچایا جاسکتا ہے لیکن اس اکثریت کے معیار پر اس چیز کو غرق نہیں کیا جاسکتا جس کے ذریعہ کوئی قوم لاکھوں سال سے زندہ ہے۔ برطانیہ میں کوئی شخص یہ احساس نہیں کرتا کہ حالیہ ایجی ٹیشن (مطالبہ پاکستان) کس بیہودہ حد تک پہنچ گئی ہے۔ بنگالیوں کا قومی شعور انتہائی بلند ہے۔ گاندھی اور جناح کے درمیان کوئی بھی سمجھوتہ انہیں پاکستانی نہیں بنا سکتا۔ اگر دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ہوا تو اس کی حیثیت ایک کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں ہوگی۔''[6] گویا تھامسن کے نزدیک بنگال کی مسلم اکثریت محض اس لئے الگ وطن کی مستحق نہیں تھی کہ وہ تاریخی وجوہ کی بنا پر ہندو اقلیت کے مقابلے میں معاشی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے پسماندہ تھی اور چونکہ ہندو اقلیت دولت مند تھی اس لئے اسے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی بالادستی قائم کرنے کا حق حاصل تھا۔

تھامسن کے بنگالی مسلمانوں کے بارے میں اس توہین آمیز خط کی اشاعت پر مولانا اکرم خان اور بعض دوسرے مسلم لیگی لیڈروں نے سخت احتجاج کیا۔ ان کے مشترکہ بیان میں کہا گیا تھا کہ ''پروفیسر تھامسن کا یہ خط جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کو بنگالی مسلمانوں کی خصوصیت، روایت اور ثقافت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے معیاروں کو اپنے معیاروں میں غرق کرنے کے متمنی ہیں۔'' مولانا اکرم خان وغیرہ کے اس مشترکہ بیان کی حیثیت محض جوابی پروپیگنڈے کی نہیں بلکہ اس کی بنیاد بہت حد تک ایسے تاریخی حقائق پر تھی جو یا تو پروفیسر تھامسن کے دائرۂ علم سے باہر تھے یا جن کی اس نے محض ہندو نوازی کے جذبہ کے تحت پردہ پوشی کی تھی۔ وہ تاریخی حقائق یہ تھے کہ تقریباً ایک ہزار سال قبل بنگال میں بیرونی مسلمان حملہ آوروں کے قبضہ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تضاد پیدا ہوا تھا اس میں کبھی بھی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا تھا اور

1944ء میں یہ فرقہ وارانہ تضاد اس سطح پر پہنچ گیا تھا کہ کوئی فرقہ دوسرے فرقہ کی بالادستی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ صرف ان دونوں کے درمیان حقیقت پسندانہ تصفیہ ہی ان دونوں کو یکجا رکھ سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے برصغیر کے مفاد پرست ہندوؤں کی جانب سے بالعموم اور بنگالی ہندو سرمایہ داروں کی جانب سے بالخصوص گاندھی۔ جناح مذاکرات کی مخالفت ایسے تصفیے کے راستے میں حائل ہوئی اور نتیجہ ہندو۔ مسلم تضاد مزید زہریلا ہو گیا۔

آسام میں بنگالی مسلمان کسانوں کی آبادکاری روکنے کے لئے لائن سسٹم کی پالیسی اور اس کے خلاف مولانا بھاشانی کی تحریک

ستمبر۔ اکتوبر 1944ء میں بنگال کے فرقہ وارانہ تضاد کے زہر میں اضافہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ان دنوں آسام میں بنگالی مسلمان آبادکاروں نے مولانا عبدالحمید بھاشانی کی زیر قیادت صوبائی حکومت کے 21رجون 1941ء کے اس فیصلے کے خلاف تحریک شروع کر رکھی تھی کہ وہاں ایسے غیر آسامی آبادکاروں کو غیر مزروعہ سرکاری اراضی پر کاشت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جو یکم جنوری 1938ء کے بعد وہاں جا کر آباد ہوئے تھے۔ حکومت آسام کے اس فیصلے سے، جسے لائن سسٹم کہتے تھے، بنگال کے ضلع میمن سنگھ کے بہت سے غریب کسان متاثر ہوئے تھے جو زرعی زمین کی تلاش میں آسام چلے گئے تھے۔ وہاں غیر مزروعہ سرکاری اراضی کا وسیع رقبہ موجود تھا لیکن مقامی شاونزم بنگالی مسلمان کسانوں کی آبادکاری کے راستے میں حائل تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس کے سابق صدر جواہر لال نہرو نے ابتداً اس لائن سسٹم کی مخالفت کی تھی مگر جب آسام کے اونچی ذات کے ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں نے اسے بتایا کہ اس طرح صوبہ آسام تھوڑے عرصے میں مسلم اکثریتی صوبہ بن جائے گا تو اس نے اس سسٹم کی حمایت شروع کر دی حالانکہ یہ کانگرس کے انڈین نیشنلزم کے تصور کے سراسر منافی تھا۔ حکومت آسام نے اپنا یہ فیصلہ نہ صرف 1943ء کے قحط کے دوران برقرار رکھا تھا بلکہ اس نے بہار، یو۔ پی، سی۔ پی اور اڑیسہ کی ہندو وزارتوں کی طرح اپنا فالتو اناج بھی بنگالی بھوکوں کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کا ممبر خوراک سر عزیز الحق تھا اور اس نے مرکزی اسمبلی میں بنگال کے غذائی قلت کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے ان صوبائی حکومتوں کی فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کی 60

مثالیں پیش کی تھیں اور بتایا تھا کہ کس طرح ان حکومتوں نے اناج کی آزاد تجارت کے راستے میں دانستہ طور پر رکاوٹیں حائل کی تھیں جبکہ بنگال میں لاکھوں لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ بنگال کے وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کانگرس کے ایک قومی نظریے کو باطل قرار دیا تھا اور درمیانہ طبقہ کے بنگالی مسلمانوں کو سہروردی کی اس رائے سے اتفاق تھا۔ انہیں صحیح یا غلط طور پر یقین تھا کہ پندرہ بیس لاکھ بنگالیوں کے جانی نقصان کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندو اکثریتی صوبوں کی متعصب حکومتوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اناج کی بروقت سپلائی نہیں ہونے دی تھی اور اندرون بنگال ہندو ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں نے مسلم لیگی حکومت سے تعاون نہیں کیا تھا۔

اکتوبر کے اواخر میں جبکہ آسام کے لائن سسٹم کے خلاف مولانا بھاشانی کی تحریک جاری تھی بنگالی مسلمانوں کی یہ رائے اور بھی پختہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ اسی رائے کے دباؤ کے تحت بنگال لیجسلیٹو کونسل نے ایک قرارداد میں گورنر سے استدعا کی تھی کہ آسام کی وادی میں بنگالی کسانوں کی آباد کاری پر جو پابندیاں عائد ہیں انہیں حکومت ہند کی وساطت سے فوری طور پر منسوخ کرائے اور حکومت بنگال نے حکومت آسام سے درخواست کی تھی کہ وہ بین الصوبائی دوستی اور بنگال کے مصیبت زدہ عوام کی امداد کے لئے ان پابندیوں کو ہٹا دے لیکن حکومت نے اس درخواست پر یہ کہہ کر عمل کرنے سے انکار کر دیا کہ آسام کے قبائلی عوام اپنے علاقہ میں غیر آسامی آباد کاروں کی موجودگی برداشت نہیں کرتے کیونکہ انہیں ماضی میں ان آباد کاروں کے ہاتھوں نقصان پہنچا تھا۔[7] 4 نومبر کو آسام مسلم لیگ کے صدر مولانا بھاشانی کی گوہاٹی سے اطلاع یہ تھی کہ ''ضلع کامروپ میں ڈپٹی کمشنر کے حکم کے تحت آباد کاروں کے 100 مکانات کو منہدم کر دیا گیا ہے۔'' اگرچہ ڈپٹی کمشنر کی یہ کاروائی کانگرس کے نظریہ قومیت کے منافی تھی لیکن یہ گاندھی کے اس مشورے کے عین مطابق تھی جو اس نے انہی دنوں آسام کے ہندوؤں کو دیا تھا۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ آسامی ہندوؤں کو بنگالی مسلم آباد کاروں کے بارے میں سر سعد اللہ کی حکومت کی فراخدلانہ پالیسی کی مخالفت کے لئے اور 1938ء کے لائن سسٹم کو برقرار رکھنے کے لئے یعنی بنگالی مسلمان کسانوں کی آسام کی غیر مزروعہ وادی میں آباد کاری کو روکنے کے لئے پرتشدد کاروائی کی ضرورت محسوس ہو تو انہیں ایسا کرنا چاہیے۔ کلکتہ کے اخبار مارننگ نیوز کا گاندھی کے اس مشورے پر تبصرہ یہ

تھا کہ بنگالی آبادکاروں پر پہلے ہی وحشیانہ تشدد ہو رہا ہے۔ اب جبکہ گاندھی نے مزید تشدد کی کھلی اجازت دے دی ہے تو معلوم نہیں آئندہ ان پر کیا گزرے گی۔

فرقہ وارانہ کشیدگی کے اس ماحول میں بنگال اسمبلی کا دسمبر میں اجلاس ہوا مگر اس میں کوئی ایسا معاملہ زیر بحث نہ لایا گیا جس سے اس ماحول کے مزید مکدر ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اگرچہ وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے دو ایک ماہ قبل بڑے دھڑلے سے یہ اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگی حکومت نے سیکنڈری ایجوکیشن بل منظور کروانے کا عزم کیا ہوا ہے مگر اس اجلاس میں اس عزم کو جامۂ عمل نہ پہنایا گیا اور ایجوکیشن بل بدستور کھٹائی میں پڑا رہا۔ غالباً اس لئے کہ ہندوؤں کے سارے گروپوں کے علاوہ یورپین گروپ بھی اس بل کا مخالف تھا۔ بنگال کی تعلیمی زندگی میں ہندوؤں کا اس قدر غلبہ تھا کہ 1943ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں سر عزیز الحق کی مختصر عرصے کی وائس چانسلری کے دوران اسلامی تاریخ کا جو شعبہ قائم کیا گیا تھا اس کے سربراہ کے عہدے کے لئے پہلی مرتبہ نومبر 1944ء میں ایک لیکچرار کی نامزدگی ہوئی تھی۔ اس لیکچرار کا نام مکھن لال چودھری تھا اور اسے عربی کی تعلیم کے لئے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں بھیجا گیا تھا۔ گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے نزدیک پورے بنگال میں کوئی مسلمان لیکچرار اس عہدے کے لئے موزوں نہیں تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان نے یونیورسٹی کے اس فیصلے کے خلاف 13 دسمبر 1944ء کو ایک بیان میں سخت احتجاج کیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

14 دسمبر 1944ء کو جبکہ شمالی برما سے جاپانیوں کو نکالا جا چکا تھا، وائسرائے لارڈ ویول کلکتہ پہنچا اور اس نے اس دن ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”آئندہ ہندوستان کے دفاع کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک کو سیاسی و انتظامی طور پر متحد رکھا جائے۔ موجودہ سیاسی بحران پر قابو پانے کے لئے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت نہیں۔“ 15 دسمبر کو صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے وائسرائے کی اس تقریر پر نکتہ چینی کی کیونکہ اس تقریر میں اس کے بقول ”اشارۃً پاکستان کی سکیم کی مخالفت کی گئی تھی اور دانستہ طور پر کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں تفرقہ اور انتشار پیدا ہو۔“ لیکن ابوالہاشم کی وائسرائے کے خلاف یہ شکایت اس لحاظ سے بے جا تھی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے مقامی لیڈر خود ہی باہمی اتحاد و اتفاق کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ برطانوی سامراج کے نمائندے کو اس مقصد کے لئے کسی خاص کوشش کی

ضرورت نہیں تھی۔ آسام میں لائن سسٹم کے خلاف گاندھی کے متذکرہ مشورے سے اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مشورے سے مشرقی ہندوستان میں انتشار و افتراق کی آگ کو ہوا مل سکتی تھی اور وہ ملی۔

دسمبر 1944ء کے تیسرے ہفتے میں آسام کے وزیر اعلیٰ سعد اللہ نے مقامی کانگرسی لیڈر گوپی ناتھ باردولی کی تجویز کے مطابق مختلف جماعتوں کے نمائندوں کی لینڈ سیٹلمنٹ کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں باردولی کا مطالبہ یہ تھا کہ ''نہ صرف لائن سسٹم کو برقرار رکھا جائے اور نہ صرف سب ساگر اور لکھیم پور کے اضلاع میں سے آباد کاروں کو بیدخل کیا جائے بلکہ کامروپ، نواگاؤں اور دار جیلنگ کے اضلاع میں بھی مختلف ذاتوں اور قبیلوں کے مقامی لوگوں کے غیر مزروعہ اراضی کے رقبہ جات کو محفوظ کیا جائے۔ اس نے چراگاہوں سے بھی آباد کاروں کی اس وجہ سے بیدخلی پر اصرار کیا کہ ان کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہے۔'' اس کانفرنس کے بعد 23 / دسمبر کو آسام مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی اور رکن اسمبلی سید عبدالرؤف نے ایک مشترکہ بیان میں حکومت آسام کو متنبہ کیا کہ اگر اس نے کانگرسی لیڈر کی شرانگیز اور رجعت پسندانہ تجاویز پر عمل کیا تو اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔

25 / دسمبر کو بنگال ہندو مہا سبھا نے باردولی کی تجاویز کی، کے۔سی۔ چودھری کی اس قرارداد کے ذریعے تائید کی کہ ''مشرقی بنگال کے اضلاع کی غیر مطلوبہ مسلمان آبادی کو آسام کی مقابلتاً غیر مزروعہ اراضی پر پھینکا جا رہا تھا تا کہ اس صوبہ کو مسلم اکثریتی صوبہ بنایا جائے۔ این۔ گھوش اندر کمار دت نے اس قرارداد کی تائید کی اور سبجکٹس کمیٹی میں متفقہ طور پر منظور ہوئی۔''[8] مہا سبھا کی یہ قرارداد اول تو اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں وہ بات غیر مبہم الفاظ میں کہی گئی تھی جو گاندھی، جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈر ہیر پھیر کر کے کہتے تھے اور دوئم اس لحاظ سے کہ جب کانگرسی لیڈر سیکولر اور غیر فرقہ وارانہ نیشنلزم کا نعرہ لگا کر انگریزوں سے فوری طور پر مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے تھے، اس وقت ہندو۔ مسلم تنازعہ نا قابل برداشت سطح پر پہنچ چکا تھا۔ کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے لیڈر نظریاتی طور پر تو بظاہر غیر فرقہ واریت کے علمبر دار بنتے تھے لیکن عملاً وہ خود بدترین قسم کے فرقہ پرست تھے۔ وہ بنگال کے بے زمین کسانوں کو آسام کی غیر مزروعہ اور غیر آباد وادی میں محض اس لئے آباد ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ مذہباً مسلمان ہیں۔

انہوں نے مشرقی بنگال کے مفلوک الحال کسانوں کے معاشی مسئلہ کو فرقہ وارانہ مسئلہ بنا دیا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ آئے دن برطانوی سامراج پر الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے برصغیر میں اپنے راج کو طول دینے کے لئے مصنوعی ہندو۔ مسلم تنازعہ کھڑا کر دیا ہے۔ بنگال کے مسلمانوں کو ہر جماعت اور ہر مکتب فکر کے ہندوؤں کے اس مسلم دشمن رویے کا سالہا سال سے تلخ تجربہ تھا۔ اس لئے ان کی مسلم لیگ سے وابستگی بنگال مسلم لیگ کے لیڈروں کی رجعت پسندی، نااہلی اور بددیانتی کے باوجود روز بروز زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور وہ مطالبہ پاکستان کی خلوص دل سے تائید وحمایت کرتے تھے۔

جنوری 1945ء میں مولانا عبدالحمید بھاشانی اور صوبہ آسام کے دوسرے مسلم لیگی لیڈر، کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے اس عوام دشمن اور مسلم دشمن رویے کے خلاف عوامی سطح پر واویلا کرتے رہے۔ ان کا یہ احتجاج اتنا موثر تھا کہ جنوری 1945ء کے وسط میں ضلع سلہٹ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وائی۔ کے۔ پوری نے بھاشانی کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔ تاہم جب 22؍جنوری کو سنام گنج ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو مولوی محمد حافظ چودھری، مولوی عبدالباری اور حاجی حبیب الرحمان کے علاوہ کئی ممتاز کانگرسی مسلمانوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا اور 23؍جنوری کو آسام اسمبلی کے رکن دیوان محمد ارباب چودھری نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے اس بیان کی تردید کی کہ آسام ہندو اکثریتی صوبہ ہے۔ اس نے کہا ''90 لاکھ کی آبادی کے اس صوبہ میں مسلمانوں کا تناسب 37.6 فیصد ہے اور ہندوؤں کا تناسب 31.9 فیصد ہے۔ اچھوتوں کا تناسب 7.1 فیصد ہے۔ انہیں ہندوؤں کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا لیڈر ڈاکٹر امبید کر ہے۔''

تاہم 3؍فروری کو ضلع کامروپ کی بارپٹن سب ڈویژن کے سب ڈپٹی کلکٹر نے کالی ماتی ریزرو میں آبادکاروں کے مکانات منہدم کروا کر وہاں مسلح پولیس متعین کر دی چونکہ ان آبادکاروں نے وہاں فصل اگائی ہوئی تھی اس لئے وہ اپنے گھروں کے انہدام کے باوجود وہاں سے نقل مکانی پر رضامند نہ ہوئے۔ چنانچہ 6؍فروری 1945ء کو ان پر گولی چلائی گئی جس سے دو افراد ہلاک ہوئے اور کئی زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کے دو دن بعد 8؍فروری کو آسام کا وزیر اعلیٰ سر محمد سعد اللہ کلکتہ آیا تو اس وقت تک اس کے علاقے میں 65 آبادکاروں کو گرفتار کر کے ان کی عدم

موجودگی میں ان کے گھروں کو منہدم کر کے انہیں نذر آتش کیا جا چکا تھا اور آسام مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری مولوی خوندکر مختار الدین کے الزام کے مطابق اس موقع پر مقامی چرواہوں نے آبادکاروں کی عورتوں سے بدسلوکی کرنے کے علاوہ قرآن مجید کی بے حرمتی کی تھی۔ تاہم سر سعد اللہ نے اس الزام کی تردید کی کہ بنگالی مسلمانوں کے بارے میں حکومت آسام کا رویہ معاندانہ ہے۔ اس نے کہا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی سے برابر کا انصاف ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو زمین دینے کا کوئی فائدہ نہیں جن کے پاس زمین خریدنے کے لئے ذرائع نہیں ہیں اور جو حکومت کو لگان نہیں دے سکتے۔ لائن سسٹم تین سال کے بعد ختم کر دیا جائے گا کیونکہ اس وقت تک غیر مزروعہ اراضی آسامی اور غیر آسامی لوگوں میں تقسیم کی جا چکی ہو گی۔ صرف 30 فیصد اراضی حکومت اپنی تحویل میں رکھے گی۔

سر محمد سعد اللہ برطانوی راج کی برکتوں کی پیداوار تھا۔ اس کی رائے اور صوبہ کے لاٹ صاحب کی رائے میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ اکتوبر 1939ء میں جب کانگرس پارٹی مکمل آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں صوبائی حکومتوں سے علیحدہ ہوئی تو اس کے کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے آسام کی حکومت کی باگ ڈور اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس نے بطور وزیر اعلیٰ ابتداً تو مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں کے بارے میں کچھ فراخدلی کا مظاہرہ کیا مگر جب کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے فیصلہ کیا کہ جو بنگالی 1938ء کے بعد آسام میں آباد ہوئے ہیں انہیں بیدخل کر دیا جائے گا تو اس نے اس فیصلے پر عملدرآمد کیا۔ تاہم فروری 1945ء میں اس کے بارے میں یہ افواہ گرم تھی کہ اسے عنقریب آسام کی وزارت اعلیٰ کی گدی سے الگ کر کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بنا دیا جائے گا۔

بنگال کی مسلم رائے عامہ کی جانب سے آسام کے لائن سسٹم کے خلاف بھرپور ایجی ٹیشن

کالی ماتی کے اس واقعہ سے بنگالی مسلمانوں میں ناگزیر طور پر سخت ہیجان پیدا ہوا۔ چنانچہ 18 فروری کو وزیر ہند کے سابق مشیر لیفٹیننٹ کرنل سر حسن سہروردی کی زیر صدارت کلکتہ کے محمد علی پارک میں 20 ہزار مسلمانوں کا جلسہ عام ہوا۔ اس جلسہ کا اہتمام پراونشل مسلم ایسوسی

ایشن اور کلکتہ مسلم سٹوڈنٹس لیگ نے کیا تھا۔ سرحسن سہروردی نے اپنی طویل صدارتی تقریر میں اس وحشیانہ واقعہ کی پرزور مذمت کی اور کہا کہ گاندھی نے حال ہی میں آسام کے کانگرسی لیڈر گوپی ناتھ باردولی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ آسام میں بنگالی کسانوں کی آبادکاری کی، عدم تشدد کے ذریعے سے، یا حسب ضرورت تشدد کے ذریعے سے مزاحمت کرے۔ کالی ماتی کے واقعہ سے اسی مشورے کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ ''بنگال کے بے زمین کسانوں کی برما اور آسام کے غیر آباد علاقوں میں بڑی دیر سے ہجرت ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال ایک انتہائی گنجان صوبہ ہے، یہاں غریب کسانوں کو کاشتکاری کے لئے زمین نہیں ملتی۔ ہمارے اس صوبہ کا رقبہ 77,442 مربع میل ہے اور اس کی آبادی 60,306,525 افراد پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس آسام کا رقبہ 67,000 مربع میل ہے اور اس میں صرف 90 لاکھ افراد آباد ہیں۔ اس صوبہ کے بعض علاقوں میں فی مربع میل دس بیس افراد رہتے ہیں۔ قدرتی طور پر ایسے غیر آباد علاقوں میں بنگالی کسان جاتے ہیں اور انہیں جانا بھی چاہیے۔ 1912ء سے قبل آسام صوبہ بنگال کا ایک حصہ تھا اور معاشی لحاظ سے یہ دونوں صوبے ایک یونٹ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن آسام کے مہاجنوں اور زمینداروں نے اپنی مفاد پرستی کے باعث اس خالصتاً معاشی مسئلہ کو سیاسی رنگ دے کر فرقہ وارانہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ یہ مہاجن اور زمیندار زراعت پیشہ نہیں ہیں۔ یہ اپنی زمینوں پر کاشت کے لئے بنگالی کھیت مزدوروں کو ملازم رکھتے ہیں، ان کھیت مزدوروں کو نہ تو مناسب اجرت ملتی ہے اور نہ ہی انہیں وہاں اپنی زمین خرید کر مستقل رہائش اختیار کرنے کا حق ملتا ہے۔ اس طرح آسام میں جاگیرداریت اور کسان پرولتاریہ کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ لائن سسٹم جاگیرداری نظام کی بنیاد ہے اور اس سسٹم کے تحت زمین پر حقیقتاً ہل چلانے والوں کو بیدخل کیا جا رہا ہے۔''[9]

22 فروری 1945ء کو بنگال پراونشل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے آسام میں لائن سسٹم جاری رکھنے کے خلاف اس بنا پر سخت احتجاج کیا کہ اس سسٹم کے تحت آسام میں جنگلات اور دوسری غیر مزروعہ اراضی پر مہاجرین کی آبادکاری پر پابندی عائد ہے۔ مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں دوسرے مقامی ممتاز لیگی لیڈروں کے علاوہ خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، خواجہ شہاب الدین اور معظم حسین چودھری نے بھی شرکت کی اور اس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے کالی ماتی کے واقعہ پر افسوس اور تشویش کا اظہار کیا گیا۔ تاہم مجلس عاملہ نے اس مضمون کی کوئی قرارداد

منظور نہ کی کہ بنگال میں زمینداری نظام ختم کر کے بے زمین کسانوں کو ان کے اپنے آبائی گھروں کے پاس ہی زمین دی جائے تا کہ ان کسانوں کی تعداد میں کمی ہو جو زمین کی تلاش میں آسام کی وادی میں جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ 23 رفروری کو سر حسن سہروردی نے ایک بیان میں لائن سسٹم کی ایک مرتبہ پھر مذمت کی لیکن اس نے بنگال میں زمینداری نظام کے خاتمہ کا مطالبہ نہ کیا حالانکہ فلاؤڈ کمیشن کی رپورٹ میں یہ تجویز شامل تھی۔ سر حسن کی رائے یہ تھی کہ ''لائن سسٹم کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا معاشی مسئلہ ہے جس کی بہت اہمیت ہے اور جس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔ بنگالیوں کو آسام کی غیر مزروعہ اراضی پر آباد ہونے سے منع کر دیا گیا ہے۔ کیا ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ بنگالیوں کے سیاسی شعور اور ثقافت کا معیار مقابلتاً زیادہ بلند ہے؟ اگر یہ بات ہے تو پھر ہندوستان کا وہ اتحاد کہاں ہے جس کا اس قدر ذکر ہوتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کا سوال بہت زیادہ افسوس ناک ہے۔ میمن سنگھ، ڈھاکہ، کومیلا اور چٹا گانگ کے ملحقہ اضلاع کے لوگوں کے پاس بنگال میں زمین بہت کم ہے اس لئے انہیں یہ حق حاصل ہے کہ آسام جا کر وہاں کی غیر آباد زمین پر آباد ہوں۔''[10]

بنگال ہندو مہا سبھا اور آسام کانگرس کی جانب سے لائن سسٹم کی بھرپور حمایت

بنگال ہندو مہا سبھا کو سر حسن سہروردی اور مسلم لیڈروں کے متذکرہ موقف سے شدید اختلاف تھا۔ لہٰذا جب 26 رفروری 1945ء کو جلپائی گوڑی میں ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجے کی زیر صدارت مہا سبھا کی کانفرنس ہوئی تو اس کی ایک قرارداد یہ تھی کہ آسام میں لائن سسٹم کو برقرار رکھنا چاہیے تا کہ وہاں بلا روک ٹوک نقل مکانی کو روکا جا سکے۔ مہا سبھا کی اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ بنگال کے ہندو اپنے صوبہ کی مشترکہ روایت و ثقافت کا بہت چرچا کرتے تھے لیکن جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات کا سوال پیدا ہوتا تھا تو وہ اپنے ہم مذہبوں کے مفادات کو اپنے صوبہ کے مجموعی مفادات پر ترجیح دیتے تھے۔ بالفاظ دیگر ان کے نزدیک مذہبی فرقہ پرستی ان کی صوبہ پرستی سے بالاتر تھی یعنی وہ ہندو قومیت کو بنگالی قومیت پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ آسام میں بنگالی کھیت مزدوروں کی آبادکاری کے محض اس لئے خلاف تھے کہ ان کھیت مزدوروں کا مذہب اسلام تھا۔ وہ آسام کے ہندو لیڈروں کی اس رائے سے متفق تھے کہ اگر آسام میں بنگالی مسلمانوں کی آبادکاری پر پابندی عائد نہ کی گئی تو یہ صوبہ بہت جلد مسلم اکثریتی صوبہ بن جائے گا اور اس طرح

مسلم لیگ کی پاکستان کی سکیم کو بہت تقویت مل جائے گی۔

آسام کے سابق کانگرسی وزیر اعلیٰ گوپی ناتھ باردولی نے بھی 2/مارچ 1945ء کو شیلانگ میں ایک انٹرویو کے دوران یہی بات کہی۔ اس نے کہا ''مستقبل قریب میں آسام کے لینڈ سیٹلمنٹ کے مسئلہ کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں۔ کانگرس پارٹی نے اس سلسلے میں وہی رویہ اختیار کیا ہے جو مسلم لیگ نے 1940ء میں اختیار کیا تھا۔ اس مسئلہ کو خالصتاً معاشی مسئلہ کے طور پر نمٹانا چاہیے تھا لیکن اب اس میں سیاسی رنگ کی آمیزش ہوگئی ہے اور اب اس مسئلہ سے سیاسی مسئلہ کے طور پر ہی نمٹا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ سے نہ صرف مسلمان مطالبہ پاکستان کو حق بجانب ثابت کر رہے ہیں بلکہ آسام کی زبان کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کانگرس پارٹی نے اس سلسلے میں 15/جنوری 1945ء کو کراچی میں جس سپرٹ کے تحت قرارداد منظور کی تھی اس پر اس سپرٹ کے تحت عمل نہیں ہوگا۔ دراصل بے زمین کسانوں کو زمین نہیں ملے گی بلکہ دولتمند لوگ اپنے پٹھوؤں کے ذریعے بہت مہنگے بھاؤ زمین خرید لیں گے۔ آج کل موجودہ قانون ساز اسمبلی اور وزارت کی موجودگی میں صورت حال بہت ابتر ہے اور مستقبل قریب میں اس مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ میرے حلقہ اور میرے فرقہ کے لوگ پہلے ہی 15/جنوری کی قرارداد کے خلاف سخت شکایت کر رہے ہیں۔''[11] باردولی کا یہ بیان صحیح نہیں تھا کہ 1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد آسام میں لینڈ سیٹلمنٹ کے مسئلہ میں سیاسی رنگ بھرا گیا تھا۔ دراصل آسام میں بے زمین بنگالی مسلمانوں کی آبادکاری پر 1938ء میں ہی پابندی عائد کر دی گئی تھی جبکہ خود باردولی 1935ء کے ایکٹ کے تحت بطور وزیر اعلیٰ صوبہ میں برسر اقتدار تھا۔ چنانچہ 1939ء میں مسلم لیگ کے پاس کانگرس وزارتوں کے خلاف شکایات کا جو طومار تھا اس میں یہ شکایت بھی شامل تھی اور جن شکایات کی بنا پر بنگالی مسلمانوں نے 1940ء میں قرارداد پاکستان کی تائید وحمایت کی تھی ان میں بھی یہ شکایت شامل تھی۔ انہیں امید تھی کہ اس قرارداد کی بعد مشرقی ہندوستان میں آزاد اور خودمختار مسلم اکثریتی ریاست کے قیام سے انہیں آسام میں کھیتی باڑی کی اجازت ہوگی اور اس طرح ان کا روزگار کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مشرقی بنگال میں اللہ کی سرزمین ان کے لئے تنگ تھی اس لئے وہ گزشتہ تقریباً 25 سال سے بہار، برما اور آسام کی غیر آباد زمین کو آباد کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں انہیں بے شمار دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔

آسام میں بنگالی مسلمان کسانوں کی آبادکاری کی حقیقت کیا تھی اور کانگرس اورمہا سبھا کی طرف سے اس کے خلاف واویلا کیوں تھا؟

1937ء میں آسام میں بے زمین بنگالی آبادکاروں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ 1942ء-1943ء میں قحط اور سمندری طوفان کی وجہ سے بنگالی کسانوں کی آسام کی جانب نقل مکانی میں بہت اضافہ ہوا۔ یہاں کی وادی میں قابل کاشت اراضی کا رقبہ 16,934,332 ایکڑ تھا۔ 1943ء-1944ء میں اس رقبہ میں سے 5 لاکھ ایکڑ رقبہ پر تقریباً 10 لاکھ آبادکاروں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور بقیہ تقریباً 60 لاکھ ایکڑ پر مقامی آبادی کے تقریباً 40 لاکھ افراد قابض تھے۔ آبادکاروں میں چائے کے باغات کے سابق قلیوں، مارواڑیوں، نیپالیوں اور سنتھالیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بنگالی کسان بہت اقلیت میں تھے۔ چائے کے باغات کے سابق قلیوں کے پاس رقبہ 1573,131 ایکڑ تھا اور تقریباً 1560,633 ایکڑ رقبہ ریلوے قلیوں اور یو۔ پی۔ کے کسانوں اور دوسرے آبادکاروں کے زیر قبضہ تھا۔ چائے کے باغات کے سابق قلیوں کی آبادکاری پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پابندی صرف آبادکاروں پر تھی لیکن اس کے باوجود یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ ''آسام میں مسلمان آبادکار جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس صوبہ کو مسلم اکثریتی صوبہ بنا کر اسے پاکستان میں شامل کیا جائے۔''

آسام اور بنگال کے مسلم لیگی لیڈر اس پروپیگنڈے کی تردید کرتے تھے لیکن مہاسبھائی اور کانگرسی عناصر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ وہ آئے دن یہ الزام عائد کرتے تھے کہ ایک سازش کے تحت مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں کو آسام بھیجا جارہا ہے۔ 1942ء-1943ء میں جب مشرقی بنگال سے مسلمانوں کی خاصی تعداد نے نقل مکانی کر کے آسام کے جنگلات اور چراگاہوں میں جھونپڑیاں بنالی تھیں، اس وقت صوبہ کے بیشتر کانگرسی لیڈر جیلوں میں تھے اور وہاں سرمحمد سعداللہ کی اقلیتی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ سابق کانگرسی وزیر اعلیٰ گوپی ناتھ باردولی اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں کا کہنا یہ تھا کہ سعداللہ وزارت کی فراخدلانہ پالیسی کے تحت آسام میں مسلمان کسانوں کا سیلاب آگیا ہے۔ لہٰذا وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ 1938ء کے بعد جو بے زمین

بنگالی مسلمان آسام میں آ کر آباد ہوئے ہیں انہیں لائن سسٹم کے تحت صوبہ سے بیدخل کر کے واپس بنگال بھیج دیا جائے اور بنگال کے ہر مکتب فکر کے ہندو لیڈر آسام کے ہندو لیڈروں کے اس مطالبہ کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ چنانچہ 2رجنوری 1945ء کو لینڈ سیٹلمنٹ کانفرنس میں ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور فروری کے اوائل میں اسی فیصلے کے مطابق جب آباد کاروں کی زبردستی بے دخلی شروع ہوئی تھی تو کالی ماتی کا خونریز واقعہ پیش آیا تھا۔

10رمارچ کو آسام اسمبلی کے متعدد مسلمان ارکان اسمبلی نے، جو قبل ازیں سعد اللہ وزارت کے حامی تھے، ایک مشترکہ بیان میں حکومت آسام کی اس ظالمانہ پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے لائن سسٹم کی فی الفور تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ ان کے مزید مطالبات یہ تھے کہ بے زمین بنگالی مہاجرین کو، اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ وہ کب سے اس صوبہ میں آئے ہوئے ہیں، زمین مہیا کی جائے اور فالتو جنگلات اور چراگاہوں میں بھی ان مہاجرین کو آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ ان آباد کاروں کو اناج اور دوسری ساری اشیائے صرف کے تھوک و پرچون کاروبار میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے حصہ دیا جائے۔ تعلیم یافتہ آباد کاروں کو سرکاری ملازمتیں دی جائیں اور جو بے روزگار آباد کاران پڑھ ہیں انہیں جنگلات اور محکمہ تعمیرات عامہ میں مزدوری کا کام دیا جائے۔ آباد کاروں نے اپنے جو تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں انہیں سرکاری گرانٹ دی جائے اور آباد کار نوجوانوں کی میڈیکل، انجینئرنگ، زراعت اور دوسرے اہم محکموں میں تربیت کا انتظام کیا جائے۔" مگر صوبائی حکومت میں کسی نے بھی ان مطالبات کو قابل توجہ نہ سمجھا اور آباد کاروں کی بزور قوت بیدخلی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس صورت حال میں 14رمارچ کو آسام اور بنگال کے ممتاز مسلم لیگی لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان میں بنگالی مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ان بنگالی آباد کاروں کی امداد کے لئے چندہ دیں جنہیں آسام سے زبردستی بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس چندہ سے لائن سسٹم منسوخ کروانے کے لئے قانونی چارہ جوئی بھی کی جائے گی۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں مولانا اکرم خان، مولانا عبدالحمید بھاشانی، ابوالہاشم، خواجہ ناظم الدین، سرحسن سہروردی، راغب احسن اور حبیب اللہ بہار کے نام بھی شامل تھے۔

مسلم لیگ حکومت نے سوت اور کپڑے کی راشن بندی کر کے مسلمانوں کو بھی کپڑے کے کاروبار میں حصہ دیا تو اس پر ہندو تنظیموں اور اخباروں نے لیگ حکومت کے خلاف سخت واویلا مچایا......گاندھی کی کھدر مہم صرف ہندو تاجروں کے مفاد میں تھی

آسام میں لائن سسٹم کے بارے میں اس فرقہ وارانہ تنازعہ کے دوران صوبہ بنگال کے اندر ایک اور وجہ کپڑے کے قحط کی صورت میں پیدا ہوگئی۔ بنگال میں سوت اور کپڑے کی شدید کمی دراصل 1944ء کے اواخر میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ 11رنومبر 1944ء کو صوبائی وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے بنگال چیمبر آف کامرس کے دفتر میں سوت کے بیوپاریوں اور جولاہوں کے نمائندوں کے ایک مشترکہ اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بیوپاریوں کی چور بازاری کے باعث صوبہ میں سوت کے نرخوں میں 400 فیصد اضافہ ہوگیا ہے اور بہت سے جولاہے سوت کی نایابی کے باعث بے روزگار ہو گئے ہیں۔ لیکن کلکتہ یارن مرچنٹس ایسوسی ایشن کے آنریری سیکرٹری کا اس موقع پر موقف یہ تھا کہ ''بیوپاری اس صورت حال کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ حکومت نے سوت کی تقسیم کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اگر سوت کے کھلے کاروبار پر عائد کردہ پابندی اٹھالی جائے تو صورت حال بہتر ہو جائے گی۔'' سوت کے ہندو بیوپاریوں اور مسلم لیگی حکومت کے درمیان سوت کی تقسیم کے سلسلے میں یہ اختلاف رائے ایسا ہی تھا جیسا کہ 1944ء کے اوائل میں اناج کی تقسیم کے مسئلہ پر پیدا ہوا تھا۔

دسمبر 1944ء کے اوائل میں جب یہ اختلاف رائے بہت بڑھ گیا اور صوبہ میں سوت کے علاوہ کپڑے کی شدید قلت محسوس کی جانے لگی تو حکومت نے تقریباً 500 بزازوں کے لائسنس واپس لے لئے تھے جس پر بنگال ٹیکسٹائل ایسوسی ایشن نے بہت احتجاج کیا تھا۔ جنوری 1945ء میں صوبہ میں کپڑے کے قحط کی صورت پیدا ہوگئی اور بنگال کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری کے 22رجنوری کے بیان کے مطابق ایسے دیہات کی کمی نہیں تھی جہاں کی عورتیں تقریباً ننگی رہ رہی تھیں اور جہاں کے 90 فیصد جولاہے بالکل بے کار بیٹھے تھے۔ چونکہ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری

کا یہ بیان بے بنیاد نہیں تھا اس لئے جب فروری کے وسط میں صوبائی اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو سوت اور کپڑے کی کمیابی اور مہنگائی کا موضوع پارلیمانی بحث کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اس بحث میں صوبائی حکومت نے یہ عندیہ دیا کہ وہ معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کپڑے اور سوت کے بیوپاریوں کو منافع خوری اور چور بازاری کی کھلی چھٹی نہیں دے گی۔ وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے اس پالیسی کے تحت 7 / مارچ 1945ء کو بردوان میں ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کانفرنس میں اعلان کیا کہ حکومت کپڑے اور سوت کی قلت دور کرنے کے لئے سوت کی تقسیم پر مکمل کنٹرول قائم کر کے اس کی راشن بندی کرے گی۔'' 12 / مارچ کو کلکتہ میں اسمبلی کے سپیکر سید نوشیر علی کی زیر صدارت ممتاز شہریوں کے ایک اجتماع میں سہروردی کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کپڑے اور سوت کی تقسیم اور راشننگ کا ایک ایسا سسٹم رائج کرے کہ آئندہ بلیک مارکیٹ نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے عوامی نگرانی میں سنٹرل بورڈ کا قیام سود مند ہوگا۔''

بنگال پراونشل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 17 / مارچ کو صوبہ میں اس نئے بحران کا نوٹس لیا۔ مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں کپڑے اور سوت کی سپلائی کے سلسلے میں حکومت ہند کے بنگال کے خلاف امتیازی سلوک پر احتجاج کرتے ہوئے ان اعداد و شمار کو غلط قرار دیا کہ بنگال میں کپڑے کی فی کس کھپت دس گیارہ گز سالانہ ہوتی ہے۔ ایک اور قرارداد میں اس امر پر بھی احتجاج کیا گیا کہ حکومت ہند بنگال میں کپڑے کی تقسیم کے کام میں مداخلت کرتی ہے اور یہ اصرار کرتی ہے کہ یہ کاروبار حسب سابق روایتی تجارتی ذرائع سے ہی ہونا چاہیے۔ مجلس عاملہ نے حکومت بنگال سے مطالبہ کیا کہ صوبہ میں اس وقت جتنا کپڑا دستیاب ہے اس کی راشن بندی کر کے اسے عوام میں منصفانہ طریقے سے تقسیم کیا جائے۔ عاملہ کی رائے یہ تھی کہ حکومت ہند نے بنگال کے لئے کپڑے کی جو مقدار مخصوص کی ہے وہ نہایت ناکافی اور نامناسب ہے۔ اگر اس مقدار میں اضافہ نہ کیا گیا تو عوام کو بہت مشکلات درپیش ہوں گی۔ عاملہ نے حکومت بنگال سے مزید مطالبہ کیا کہ مسلم تاجروں کے مفادات کا تحفظ کرے تاکہ انہیں کپڑے کی راشن کی سکیم میں مناسب حصہ مل سکے۔

وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی، سپیکر صوبائی اسمبلی سید نوشیر علی اور صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے یہ اعلانات اور مطالبات سوت اور کپڑے کے ہندو بیوپاریوں کے لئے

بہت ہی تشویشناک تھے۔ انہیں پھر ویسا ہی اندیشہ لاحق ہو گیا تھا جیسا کہ انہیں 1943ء کے اوائل میں اناج کی راشن بندی کے موقع پر لاحق ہوا تھا۔ ان کے اس اندیشے کی نوعیت یہ تھی کہ مسلم لیگی حکومت مسلمانوں کو بھی سوت اور کپڑے کے ڈپو الاٹ کر کے انہیں اس کاروبار میں نمائندگی دے دے گی۔ اب تک اس کاروبار پر نیچے سے لے کر اوپر تک مارواڑیوں اور اونچی ذات کے دوسرے ہندوؤں کی اجارہ داری رہی تھی۔ ان کے لئے یہ تصور بالکل ناقابل برداشت تھا کہ اس کاروبار میں وہ مسلمان بھی ان کے برابر کے حصہ دار بنیں جنہیں وہ گھٹیا اور ملیچھ سمجھتے تھے۔

مارواڑیوں کی اس اجارہ دارانہ ذہنیت کا ایک بدترین مظاہرہ اکتوبر 1940ء میں عید کے موقع پر بھی ہوا تھا جبکہ کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا نے اپنی 19 راکتوبر کی اشاعت میں قارئین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ”جو لوگ کھدر کو پسند کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ دیکھیں کہ ان کو اصل کپڑا مل رہا ہے۔ محض اس لئے کہ جعلی کھادی کم دام میں ملتا ہے۔ اس کو خریدنے سے بہتر ہے کہ لوگ کھدر ہی پہننا چھوڑ دیں۔ اصلی کھادی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ کھادی خریدیں جس پر آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن کی تصدیق ثبت ہو۔ حال ہی میں گاندھی جی جب شملہ میں تھے تو ان کو یہ دیکھ کر تعجب اور دکھ ہوا کہ وہاں غیر مصدقہ کھدر بڑی مقدار میں خریدے اور بیچے جاتے ہیں اور انہوں نے کھادی کے خریداروں سے کہا کہ آئندہ وہ مصدقہ مال لینے پر اصرار کریں۔“

کلکتہ کے مسلم لیگی اخبار عصر جدید نے امرت بازار پتریکا کے اس ادارتی مشورے کو فرقہ پرستی کی بدترین مثال قرار دیا۔ اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ”ان جملوں کو ذرا غور سے پڑھیئے۔ نقلی کھادی کی خریداری سے بہتر یہی ہے کہ لوگ کھدر پہننا ہی چھوڑ دیں، یعنی اگر آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن کا تیار اور تصدیق کیا ہوا مال نہ ملے تو لوگ کھدر کی بجائے جاپانی سلک یا ولایتی آب رواں خرید لیں لیکن کرگھہ کے بنے ہوئے غیر مصدقہ کپڑے نہ خریدیں۔ یہ ہے ذہنیت ان حضرات کی جو قوم پرور ہیں اور جو پورے ہندوستان کو ایک اور یہاں کے بسنے والوں کو ناقابل تقسیم قوم قرار دیتے ہیں۔ آپ آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن سے ناواقف نہیں ہوں گے؟ کھدر کا رواج عام ہوا تو مسلم بافندوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچنے لگا۔ مسٹر گاندھی اور اس کے دوستوں کی قوم پرستی اس چیز کو برداشت نہ کر سکی اور ان لوگوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ بنیا اور اس کی ہم قوم یا

ہم مذہب یا ہم نام قوم کا پیسہ کسی طرح بھی مسلمان قوم کے افراد لے جائیں۔ لہٰذا مسٹر گاندھی نے اصلی سوت کاتنے والوں کی ایک انجمن بنائی جس کا نام آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن ہے۔ تمام ہندوستان کے چرخہ کاتنے والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس انجمن کے ممبر بنیں اور اپنا سوت انجمن کو دیں۔ اس انجمن نے اپنے تحت میں ان سوتوں کے کپڑے بنوانے کا ذمہ لیا۔ کپڑوں کی تیاری کے ساتھ اپنی نگرانی میں سپلائی ڈپو اور خوردہ کی دکانوں کا انتظام بھی کیا اور اس طرح میسرز گاندھی اینڈ کمپنی کی اس کھادی کارپوریشن لمیٹڈ کا کاروبار چل پڑا...... اس پس منظر میں عید کے موقع پر مسلمانوں سے درخواست ہے کہ وہ خریداری کے وقت اپنے بھائیوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے خریدنا چاہیے اور کپڑے کی صنعت کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ گاندھی کی ''کھادی مہم کا مقصد ہندوؤں کو فائدہ پہنچانا ہے۔''[12]

مارواڑیوں اور اونچی ذات کے ہندو بیوپاریوں نے بعض ارکان اسمبلی کو خرید کر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا خاتمہ کروادیا

اکتوبر 1940ء کے بعد جولائی 1943ء میں مارواڑیوں نے بہت واویلا کیا تھا۔ جب کہ مسلم لیگی حکومت نے کلکتہ کی ایک مسلمان فرم اصفہانی اینڈ کمپنی کو اناج کی خریداری کی واحد ایجنسی دے دی تھی تو انہوں نے اس موقع پر ہر ممکن طریقے سے ناکام کوشش کی تھی کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ پھر جنوری 1944ء میں حکومت بنگال نے سرکاری نگرانی میں اناج کی تقسیم اور راشن بندی کا فیصلہ کیا تھا تو مارواڑی اور اونچی ذات کے دوسرے ہندو بیوپاری اس قدر تلملائے کہ انہوں نے ناظم الدین وزارت کو برطرف کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے مرکزی حکومت کے ممبر خوراک سر جوالا پرشاد واستوا کی امداد بھی حاصل کی تھی مگر اس مرتبہ بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی تھی۔

لیکن اب جب مارچ 1945ء میں صوبائی وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے سوت اور کپڑے کی راشن بندی کے فیصلے کا اعلان کیا تو مارواڑیوں کا پیمانہ صبر بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کاروبار پر اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف مرکزی حکومت کی کامیابی کے ساتھ حمایت حاصل کی بلکہ انہوں نے ناظم الدین وزارت کے خاتمہ کے لئے

رشوت ستانی کا بازار بھی اتنا گرم کیا کہ جب 28/ مارچ 1945ء کو صوبائی اسمبلی میں ایک مطالبہ زر پر رائے شماری ہوئی تو وزارت 97 کے مقابلے میں 106 ووٹوں کی اکثریت سے شکست کھا گئی حالانکہ 16 یورپی ارکان نے وزارت کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ ناظم الدین حکومت کی اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ اس دن بالکل غیر متوقع طور پر اس کے 18 حمایتی ارکان حزب اختلاف سے جا ملے۔ ان باغی ارکان میں نواب ڈھاکہ بھی شامل تھا۔ رائے شماری کے اس نتیجہ کے اعلان کے فوراً بعد اسمبلی کا اجلاس وزیر اعلیٰ کی تحریک پر اگلے دن یعنی 29/ مارچ کو ساڑھے چار بجے دوپہر تک ملتوی کر دیا گیا مگر جب 29/ مارچ کا اجلاس ہوا تو سپیکر نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی قانونی حیثیت کو قبول کرنے سے انکار کر کے اجلاس غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس پر دو دن بعد 31/ مارچ کو صوبائی گورنر نے 1935ء ایکٹ کی دفعہ 93 کے تحت عارضی طور پر صوبہ میں گورنری راج نافذ کر دیا۔

2/ اپریل کو بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے ایک انٹرویو میں گورنر کی اس کاروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بحران کی ذمہ داری کلکتہ میں کپڑا چوروں کی ناپاک سازشوں اور حزب اختلاف کی ہوس اقتدار پر عائد کی۔ اس نے کہا کہ ''یہ بحران حکومت کی اس مہم کے فوراً بعد پیدا ہوا جو اس نے کپڑے کے سماج دشمن ذخیرہ اندوزوں کا سراغ لگانے کے لئے شروع کی تھی۔'' اس نے مزید کہا کہ ''عوام کو اسمبلی کے باہر منافع خوروں، چور بازاری کرنے والوں اور کپڑے اور اناج چوروں اور اسمبلی کے اندر ان کے سرپرستوں کو پوری طرح بے نقاب کر کے انہیں عوامی زندگی سے بے دخل کر دینا چاہیے۔''[13] ابوالہاشم کے اس مشورے پر چند دن کے بعد عمل ہوا جبکہ کلکتہ میں ایک بہت بڑے جلسہ عام میں مارواڑیوں کے معاشرتی بائیکاٹ کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس جلسہ میں ہزاروں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے اچھوتوں نے بھی شرکت کر کے اس قرارداد کی پر زور تائید کی کہ ''بنگال کے عوام کو مارواڑ، احمد آباد، گجرات، بمبئی اور دوسرے علاقوں کے اجنبی سرمایہ داروں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہ اجنبی سرمایہ دار بنگال کی قومی دولت کا استحصال کر کے اسے صوبہ سے باہر لے جاتے ہیں اور بنگال کو اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا۔ تمام محب الوطن بنگالیوں کا فرض ہے کہ وہ بلا لحاظ ذات پات اور دین و مذہب ایسے اقدامات کریں کہ بنگال کی معاشی، تجارتی اور صنعتی زندگی اجنبی بنیوں، استحصالیوں، ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں

اور چور بازاری کرنے والوں کے غلبہ سے آزاد ہو۔ یہ بنیے بنگال کے دشمن نمبر ایک ہیں۔ عوامی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے خلاف پورے بنگال اور آسام میں معاشرتی بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے۔"

اس جلسہ عام سے قبل 4/اپریل کو مارواڑی چیمبر آف کامرس کے دفتر میں ہنگامہ ہوا تھا جبکہ چیمبر کے ارکان کے ایک اجتماع میں حاضرین نے ایک مارواڑی کلاتھ مرچنٹ مگو رام جے پوریا، جو بنگال لیجسلیٹو کونسل کا رکن بھی تھا، کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور کچھ لوگوں نے دفتر میں لگی اس کی تصویر اتار کر پھینک دی۔ چونکہ اس جلسہ میں صرف مارواڑی عناصر شریک ہوئے تھے اس لئے اس ہنگامے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ مارواڑیوں کے مختلف گروہوں میں ٹھن گئی ہے۔ ایک گروہ کا الزام یہ تھا کہ مارواڑیوں نے 7 لاکھ روپے جمع کر کے اسمبلی میں حزب اختلاف کی ایک اہم شخصیت کو دیئے تھے لیکن یہ رقم مطلوبہ طریقے سے خرچ نہیں کی گئی تھی۔"[14] اسمبلی کی یہ اہم شخصیت غالباً مولوی فضل الحق کی تھی جو سیاسی مقاصد کے لئے رشوت قبول کرنے کی بنا پر پورے برصغیر میں بدنام اور رسوا ہو چکا تھا۔ گورنر بنگال رچرڈ کیسی (Richard Casey) نے بھی اپنی ایک خفیہ سرکاری رپورٹ میں مولوی فضل الحق کے سیاسی کردار کے اس گھناؤنے پہلو کا ذکر کیا تھا۔

باب: 11

1945ء-1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی فقیدالمثال کامیابی

ناظم الدین وزارت کے خاتمہ سے بنگالی مسلمانوں کو قیام پاکستان کی ضرورت کا پہلے سے بھی زیادہ احساس ہوا

سرناظم الدین وزارت کے اس طرح خاتمے کے بعد صوبہ کے مسلم لیگی لیڈروں نے پاکستان کے حق میں زورشور سے مہم شروع کردی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قائداعظم جناح نے اپریل 1945ء میں سرتیج بہادر سپرو کی تشکیل کردہ آئینی کمیٹی کی رپورٹ مسترد کردی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ برصغیر کو تقسیم نہ کیا جائے، مخلوط طریقۂ انتخاب رائج کیا جائے اور اس کے عوض مسلمانوں کو آئین سازی کے کام میں اور مرکز کی قومی حکومت میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر نمائندگی دی جائے۔ مزید برآں قائداعظم نے اسی مہینے میں مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں لیاقت۔ ڈیسائی معاہدے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کر کے لیاقت علی خان کی سازشی سیاست کو بے نقاب کردیا تھا اور اس طرح انہوں نے ہر سطح پر مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان تعاون کا امکان ختم کر کے اس قیاس آرائی کو بھی ختم کردیا تھا کہ بنگال میں مسلم لیگ اور کانگرس کی مخلوط وزارت قائم ہوگی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بنگال کے مسلم لیگیوں کو برصغیر کے دوسرے سارے سیاسی عناصر کی طرح یقین تھا کہ دوایک ماہ میں عالمی جنگ کے اتحادیوں کی فتح کی صورت میں اختتام پذیر ہونے کے فوراً بعد برصغیر میں عام انتخابات ہوں گے۔ چنانچہ پاکستان کا نعرہ بنگال مسلم لیگ کے لئے بہترین انتخابی نعرہ تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ درمیانہ طبقہ کے جن مسلمانوں نے

جنوری 1945ء میں وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی کے اعلان کے بعد سوت اور کپڑے کے ڈپو الاٹ کرانے کی امید لگالی تھی، وہ مارواڑی ہندوؤں کی مبینہ رشوت ستانی کی بنا پر ناظم الدین وزارت کے خاتمہ پر بہت برہم ہوئے تھے اور ان کی اس برہمی سے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں بحیثیت مجموعی یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ اس کے حقوق و مفادات کا تحفظ بنگال اور آسام پر مشتمل ایک آزاد و خود مختار مسلم اکثریتی ریاست کے قیام سے ہی ہو سکتا ہے۔ صوبہ آسام میں مفلوک الحال بنگالی مسلمانوں کی آباد کاری کے سد باب کے لئے نافذ کردہ لائن سسٹم کے حق میں ہر مکتب فکر کے ہندوؤں کے متحدہ محاذ سے بھی یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ترقی یافتہ و مفاد پرست ہندو عناصر، پسماندہ و مفلوک الحال مسلمانوں کو کسی جگہ بھی کسی قسم کی کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ اس سلسلے میں گاندھی اور جواہر لال نہرو سے لے کر گوپی ناتھ باردولی اور شیاما پرشاد مکر جی تک کا رویہ کانگرس کے ''غیر فرقہ وارانہ'' یک قومی نظریے کے سراسر منافی تھا۔ اس لئے بنگال کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے جن تھوڑے سے لوگوں کو مطالبہ پاکستان کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شبہ تھا وہ اپریل 1945ء میں ناظم الدین وزارت کا تختہ الٹے جانے کے بعد دور ہو گیا تھا۔[1]

قیام پاکستان کے حق میں بنگالی طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں کی بھرپور مہم کا آغاز

صوبائی مسلم لیگ کی جانب سے پاکستان کے حق میں مہم کا غیر رسمی آغاز 25 را پریل کو کلکتہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی ایک افتتاحی تقریب میں ہوا جبکہ صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''غیر منقسم ہندوستان کا خیال کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ موریہ خاندان اور مغلیہ خاندان کے مہاراجوں اور شہنشاہوں نے فوجی قوت اور سفارتکاری کے ذریعے متحدہ ہندوستان میں اپنی ایسی سلطنتیں قائم کرنے کی کوششیں کی تھیں مگر جب ان سلطنتوں کا زوال ہوا تو برصغیر کے مختلف علاقوں کے محکوم لوگوں نے اپنے حق خود ارادیت کے لئے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کی۔ برطانوی حکومت نے بھی متحدہ ہندوستان کی تعمیر کی کوشش کی ہے لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے ہر علاقے کے لوگوں نے اپنے حق خود ارادیت کا مطالبہ شروع کر دیا ہے...... مسلمانوں کی جانب سے پاکستان کا مطالبہ فرقہ وارانہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ پورے

ہندوستان کے لئے جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ ہے۔''[2]

طلبا کے اس اجتماع کے دو تین دن بعد 28/اپریل کو کلکتہ کے مزدوروں کے علاقے میں ایک مسلم لیگ کانفرنس ہوئی جس میں رسمی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ یکم مئی سے صوبہ بھر میں عوامی رابطہ کی مہم شروع کی جائے گی جو دو ہفتے تک جاری رہے گی۔ اس کانفرنس کے موقع پر صوبائی کانگرس فضل الحق گروپ کے ساتھ مل کر ایک ''کل جماعتی'' وزارت بنانے کی کوشش کر رہی تھی چنانچہ اس کانفرنس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں سے ایک قرارداد میں ناظم الدین وزارت کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ بنگال میں کسی غیر لیگی وزارت کا وجود برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ایک اور قرارداد میں آسام سے 350 بنگالی مسلمان کسان خاندانوں کی بے دخلی کی مذمت کی گئی اور کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی تنظیم آل انڈیا کسان سبھا پر بھی نکتہ چینی کی گئی کیونکہ اپریل کے اوائل میں میمن سنگھ میں جو کسان کانفرنس ہوئی تھی اس میں آسام کے زمینداری نظام کے خلاف اور مفلوک الحال بنگالی کسانوں کی آبادکاری کے حق میں کوئی قرارداد منظور نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی سماج دشمن اور کسان دشمن لائن سسٹم کی مذمت کی گئی تھی۔ لیگ کانفرنس کی رائے یہ تھی کہ ''کمیونسٹوں نے آسام کے لائن سسٹم کی مخالفت محض اس لئے نہیں کی کہ اس سے متاثر ہونے والے کسانوں کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ کمیونسٹوں کی مسلمان کسانوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ آسام میں ہندو زمینداروں اور مہاجنوں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی پالیسی کی بنیاد ہندو نوازی اور کانگرس نوازی پر ہے۔''[3] مزدوروں کے علاقوں میں مسلم لیگ کانفرنس کی کامیابی اس امر کی علامت تھی کہ اگرچہ بنگال میں اس جماعت پر خواجہ ناظم الدین، ایم۔ اے۔ اصفہانی اور مولانا اکرم خان جیسے غیر بنگالی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور اسلام پسندوں کا غلبہ تھا تاہم یہ 1945ء میں درمیانہ طبقہ کے وسیع المشرب نمائندوں حسین شہید سہروردی اور ابوالہاشم وغیرہ کی کوششوں سے صحیح معنوں میں ایک عوامی جماعت بن چکی تھی۔

مولوی فضل الحق کی مسلم لیگ میں شمولیت کی ناکام کوشش

بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے اس صورت حال میں پہلے تو سرتوڑ کوشش کی کہ اسے کانگرس کے تعاون سے حکومت بنانے کی اجازت مل جائے مگر جب ایسا نہ ہو سکا

تو اس نے مئی کے وسط میں اس خواہش کا ایک مرتبہ پھر اظہار کیا کہ ”میں مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہتا ہوں بشرطیکہ میری عزت اور شہرت داغدار نہ ہو۔“ اس کے اس بیان کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ اپریل 1945ء میں مسولینی اور ہٹلر کی موت کے بعد 4 رمئی کو برطانیہ کی فوجیں رنگون میں داخل ہو چکی تھیں اور 8 رمئی کو نازی جرمنی سوویت یونین کی فوج کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اور قومی پس منظر یہ تھا کہ بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں انتخابی مہم شروع ہو چکی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ 1945ء کے اواخر میں عام انتخابات ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے رائے دہندگان کی نئی فہرستیں زور شور سے مرتب ہو رہی تھیں اور وائسرائے ویول اس کوشش میں مصروف تھا کہ مرکز میں کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں پر مشتمل عبوری حکومت بن جائے۔ تاہم مسلم لیگ ہائی کمان نے فضل الحق کے اس بیان کا سنجیدگی سے نوٹس نہ لیا۔ جب 19 رمئی کو گوہاٹی میں نوابزادہ لیاقت علی خان سے اس بیان پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے قہقہہ لگانے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ نوابزادہ ان دنوں چودھری خلیق الزماں کے ہمراہ آسام کے دورے پر تھا جہاں سے وہ 31 رمئی کو کلکتہ پہنچا۔ 2 رجون کو وہ وہاں سے نئی دہلی کے لئے روانہ ہوا تو اسی شام مسلم انسٹی ٹیوٹ میں مولانا اکرم خان کی زیر صدارت ایک جلسہ عام میں اس امر پر احتجاج کیا گیا کہ گورنری راج میں بنگالی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ایک شکایت یہ تھی کہ کپڑے کے ڈپوؤں کی الاٹمنٹ کرتے ہوئے مسلمان درخواست دہندگان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور پبلک سروس کمیشن مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کر رہا ہے۔

لیکن 14 رجون کو بنگالی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی اس قسم کی دیرینہ شکایات عارضی طور پر کل ہند سطح کی بھرپور سیاسی سرگرمیوں کے بوجھ تلے دب گئیں۔ جب وائسرائے ویول نے لندن سے واپس آ کر کانگرسی لیڈروں کی رہائی کا حکم صادر کر کے یہ اعلان کیا کہ وہ مرکز میں نمائندہ حکومت کے قیام کے لئے کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈروں سے بات چیت کرے گا۔ یہ بات چیت 25 رجون کو شملہ میں شروع ہوئی اور 14 رجولائی کو قائداعظم جناح کے اس اصرار کی وجہ سے ناکام ہو گئی کہ ”اس مجوزہ نمائندہ حکومت میں برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔“

جنگ عظیم کا خاتمہ، عام انتخابات کا اعلان اور بنگال میں انتخابی سرگرمیوں کا آغاز

29 رجولائی کو سر ناظم الدین، ایم۔ اے۔ اصفہانی اور دوسرے بنگالی مسلم لیڈروں نے کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں قائداعظم جناح کے اس موقف کی پرزور تائید کی اور مطالبہ کیا کہ ''مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات کرائے جائیں تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق کونسی جماعت کو حاصل ہے۔'' پھر 4 راگست کو بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں رائے ظاہر کی کہ ''جب تک پاکستان کے اصول کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک کسی عبوری حکومت کا قیام ممکن نہیں ہوگا۔''

مولوی فضل الحق اور اس کے کانگرسی حلیفوں نے جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 20 راگست 1945ء کو مسلم لیگی لیڈروں کے اس مطالبہ کا جواب دیا۔ ایک جلسہ عام میں مطالبات یہ تھے کہ صوبہ میں گورنری راج ختم کر کے نمائندہ حکومت قائم کی جائے، کپڑے کی قلت اور اناج کی مہنگائی کا خاتمہ کیا جائے اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کو منسوخ کیا جائے۔ کانگرسی لیڈر کرن شنکر رائے کا اعلان یہ تھا کہ کانگرس عام انتخابات کے لئے تیار ہے۔ اس کا انتخابی نعرہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' ہوگا۔

مذکورہ جلسہ کے اگلے دن جب وائسرائے ویول نے برطانیہ کی نئی منتخب لیبر حکومت کی ہدایت کے مطابق یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 1945ء کے موسم سرما میں ہوں گے تو اس کے فوراً ہی بعد بنگال میں انتخابی سرگرمیاں پورے زورشور کے ساتھ شروع ہوگئیں۔ 26 راگست کو حکومت بنگال نے اپنا 1942ء کا وہ حکم منسوخ کر دیا جس کے تحت کانگرس پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا تھا اور پھر 13 رستمبر کو سرت چندر بوس کو رہا کر دیا گیا جبکہ یہ خبر موصول ہو چکی تھی کہ اس کا بھائی سوبھاش چندر بوس 14 راگست کو جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے سے کچھ عرصہ پہلے ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ تائیوان میں پیش آیا تھا اور کانگرس نے محض انتخابی مصلحت کی بنا پر اسے قومی ہیرو کا درجہ دے دیا تھا۔

جب 19 رستمبر 1945ء کو وائسرائے ویول نے لندن سے واپس آ کر یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ پوری کوشش کرے گی کہ ہندوستان کے لیڈروں کے تعاون سے ہندوستان کو جلد

از جلد آزادی دینے کا بندوبست کرے اور عام انتخابات کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو گا ایک دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا انتظام کیا جائے گا تو بنگال میں انتخابی مہم بہت تیز ہو گئی کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ یہ انتخابات برصغیر کے آئینی و سیاسی مستقبل کے تعین کے سلسلے میں فیصلہ کن ہوں گے۔ 24 ستمبر کو خواجہ شہاب الدین کا بیان یہ تھا کہ ''ان انتخابات میں مسلم قوم کی تقدیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بنگال میں ہم بہت طاقتور ہیں اور اللہ کے فضل سے ہم یہاں سو فیصد نشستیں جیتیں گے۔''

کانگرس نواز مسلمان مذہبی جماعتوں کی طرف سے مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف فتوے

کانگرس کو بھی اپنی سیاسی قوت پر بہت بھروسہ تھا کیونکہ اسے نہ صرف ہندو عوام کی بہت بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی بلکہ اس نے جمیعت العلمائے ہند، جماعت اسلامی، مجلس احرار، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا مومن کانفرنس، خاکسار جماعت اور جمیعت اہل حدیث وغیرہ جیسی مذہب فروش تنظیموں سے بلا واسطہ یا بالواسطہ گٹھ جوڑ کر کے یہ باور کر لیا تھا کہ مسلم لیگ کو ان انتخابات میں فیصلہ کن کامیابی حاصل نہیں ہو گی۔ بنگال میں کانگرس کو مولوی فضل الحق جیسے عناصر کی بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی ان کانگرس نواز اور اسلام فروش جماعتوں کے پیشواؤں کے فتوے یہ تھے کہ ''صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کافر اعظم ہے......وہ بحکم شریعت اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ تعینیہ کی بنیاد پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے''...... ''لیگ کی حمایت کرنا، اس میں چندے دینا، اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا، منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے...... مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے''...... ''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی''...... ''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے...... کانگرس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں

جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے...... جواہر لال نہرو ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔''[4]

کلکتہ میں لیگ نواز مولویوں کی کانفرنس اور جمیعت العلمائے اسلام کا قیام

مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح عقیدہ کے لحاظ سے اسماعیلی شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن عملی طور پر ان کا مذہبی کٹر پن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ''مسلم لیگ نے جو اہم کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ان کے رجعت پسند طبقہ سے نجات دلا دی ہے اور یہ خیال عام کر دیا ہے کہ مفاد پرست طبقہ قوم کا غدار ہے۔ اس نے مسلم عوام کو اس نا قابل قبول طبقہ کے چنگل سے آزاد کرا دیا ہے جنہیں مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔'' جناح نے اپنے اسی نظریے کی بنا پر مارچ 1940ء کے بعد مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کے حق میں فتوے دینے والے مولویوں کی کوئی ذیلی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ انہوں نے صرف مسلم طلبا کی آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

جب 1945ء کی انتخابی مہم کے دوران کانگرس نواز ملاؤں کی فتویٰ بازی حد سے بڑھ گئی تو 26، 27 اور 28 / اکتوبر 1945ء کو کلکتہ میں لاہور کے مولانا غلام مرشد کی زیر صدارت لیگ نواز مولویوں اور پیروں کی ایک سہ روزہ کانفرنس ہوئی جس میں کل ہند جمیعت العلمائے اسلام کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس جمیعت کے انتخابی نعرے یہ تھے ''قائداعظم جناح کافر اعظم نہیں ہے، بلکہ مرد مومن ہے۔ مطالبہ پاکستان اسلام کے عین مطابق ہے۔ پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ ہے اور برصغیر میں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی بقاو سلامتی اور فلاح و بہبود کے لئے پاکستان کا قیام ضروری ہے۔''

مسلم لیگی مولویوں اور پیروں کی یہ کانفرنس کلکتہ میں اس لئے منعقد کی گئی تھی کہ بنگال میں ہندو۔ مسلم تضاد بے انتہا شدید ہونے کے باعث اس صوبہ کی سیاسی فضا مسلم لیگ اور اس کے حامی مفتیان دین کے لئے بہت سازگار تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد سبحانی کی اس کانفرنس میں افتتاحی تقریر یہ تھی کہ ''مسلم قوم مستقبل قریب میں اتنی طاقتور ہو جائے گی کہ وہ تخت یا تختہ کے لئے کاری ضرب لگانے میں تامل نہیں کرے گی۔''[5] اس کانفرنس کے دو تین روز بعد منشی گنج میں اس وجہ سے زبردست ہندو۔ مسلم فساد ہوا کہ ہندوؤں نے درگا پوجا کے جلوس میں مسجدوں کے سامنے بینڈ

باجے بجائے تھے۔ پھر 6 رنومبر کو نواب گنج میں بھی اسی وجہ سے فرقہ وارانہ جھگڑا ہوا جس میں کئی افراد زخمی ہوئے اور پانچ چھ دکانیں لوٹ لی گئیں۔ اگر چہ ان فسادات کے بارے میں یہ بات وثوق سے تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان کے پیچھے کسی تنظیم کے منصوبے کی کارفرمائی تھی تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ اس سے انتخابی فائدہ مسلم لیگ کو ہی پہنچا تھا۔

نومبر کے مہینے میں کانگرس نے اپنی انتخابی مہم کے پروگرام کے تحت جو کارروائیاں کیں ان میں ایک کارروائی تو یہ تھی کہ اس نے سوبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے بعض افسروں کے خلاف مقدمہ چلانے کے بارے میں حکومت ہند کے فیصلے کے خلاف کلکتہ اور برصغیر کے دوسرے بڑے شہروں میں مظاہرے کرائے اور دوسری کارروائی یہ تھی کہ اس نے قوم پرست ملاؤں کی جماعتوں کی وساطت سے اور براہ راست مسلم عوام سے رابطہ پیدا کر کے انہیں مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ مزید برآں اس نے اپنے سارے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور بنگال میں مسلمانوں کے ان سارے عوام دشمن سیاسی عناصر سے بھی گٹھ جوڑ کیا جو کسی نہ کسی وجہ سے مسلم لیگ اور پاکستان سکیم کے مخالف تھے۔

بنگال مسلم لیگ کی قیادت، جاگیردار ناظم الدین کے ہاتھ سے نکل کر درمیانہ طبقہ کے حسین شہید سہروردی کے ہاتھ میں چلی گئی

بنگال کا سابق وزیر سول سپلائیز اور بنگال مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا سیکرٹری حسین شہید سہروردی کانگرس کے ان انتخابی حربوں کے خلاف دوسرے سارے مقامی مسلم لیگی لیڈروں سے زیادہ سرگرم تھا۔ اس نے 15 رنومبر کو کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں طلبا کی یونین کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس کی عوامی رابطہ کی مہم پر سخت نکتہ چینی کی اور الزام عائد کیا کہ ''اس مہم کی بنیاد رشوت ستانی پر ہے۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس بنگال میں مسلم لیگ کے خلاف انتخابی مہم کے لئے مولوی فضل الحق وغیرہ کو سرمایہ مہیا کر رہی ہے۔ تاہم اسے یقین تھا کہ ''مسلم عوام کانگرس کے ان منصوبوں سے حوصلہ نہیں ہاریں گے اور ان انتخابات میں وہ ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیں گے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ وہ ایک الگ قوم ہیں اور پاکستان ان کا پیدائشی حق ہے

جوانہیں ضرور ملنا چاہیے۔"

جب پورے صوبے میں سہروردی کی اس قسم کی انتخابی سرگرمیوں کی بنا پر مسلم عوام میں اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تو صوبہ لیگ کی عنان قیادت عملی طور پر اس کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ چونکہ خواجہ ناظم الدین کے لئے یہ صورت حال قابل قبول نہیں تھی اس لئے 23 رنومبر 1945ء کو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ پارلیمانی سیاست سے الگ رہے گا یعنی وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے گا۔ خواجہ ناظم الدین کے اس اعلان کی تعبیر یہ تھی کہ پنجاب کی طرح بنگال میں بھی مسلم لیگ پر مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کا غلبہ قائم ہوگیا تھا اور سہروردی اس طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے آئندہ بنگال کی وزارت اعلیٰ کے عہدے کا امیدوار تھا۔ بنگال مسلم لیگ کی تنظیم کی طبقاتی حیثیت میں تبدیلی مسلمانوں کے ترقی پسند حلقوں کے لئے خاصی اطمینان بخش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی انتخابی مہم میں تقریباً دو ہزار بنگالی کمیونسٹوں کا بھرپور تعاون حاصل کیا جو اقلیتوں کو حق خود ارادیت دینے کے مسئلہ پر اختلاف کی بنا پر کانگرس سے خارج کر دیئے گئے تھے۔

کانگرس نے لیگ مخالف جاگیرداروں کے ساتھ انتخابی گٹھ جوڑ کر کے ان کے زیر اثر مسلمان کسانوں سے لیگ کے خلاف ووٹ ڈلوانے کی ناکام کوشش کی

دوسری طرف صوبائی کانگرس نے محض اپنی مسلم لیگ دشمنی کی بنا پر ان ساری بدعنوانیوں کا ارتکاب کیا جو کسی بھی باوقار اور با اصول جماعت کے لئے انتہائی شرمناک ہوسکتی تھیں۔ ان بدعنوانیوں کی ایک مثال یہ تھی کہ کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس نے نومبر کے وسط میں مرکزی اسمبلی کے میمن سنگھ۔ ڈھاکہ مسلم حلقہ کے ہندو زمینداروں کو بذریعہ خط یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے مسلمان عملہ اور مسلمان مزارعین کو یہ ہدایت کریں کہ وہ مسلم لیگی امیدوار تمیز الدین خان کے مقابلے میں ایک آزاد امیدوار سر عبدالحلیم غزنوی کو ووٹ ڈالیں۔[6] تمیز الدین خان سابق خلافتی لیڈر تھا اور مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں خود کانگرس کو تو اپنا امیدوار کھڑا کرنے کی ہمت نہ ہوئی البتہ اس نے ایک ایسے آزاد امیدوار کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا جو 1937ء کے بعد سے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ مسلم لیگ کی مخالفت کرتا چلا آ رہا تھا۔ سر عبدالحلیم غزنوی بنگال کے انتہائی رجعت پسند اور سامراج نواز مسلمان جاگیرداروں میں سے

تھا۔ وہ بنگال کا سر خضر حیات خان ٹوانہ تھا لیکن کانگرس کی نظر میں وہ اس کی حمایت کا محض اس لئے مستحق تھا کہ وہ مسلم لیگ اور قائداعظم جناح کا بدترین مخالف تھا۔ اس کی حمایت کے لئے کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس نے ہندو زمینداروں کے نام جو خط لکھا تھا جب اس کا عکس مسلم لیگی اخبارات میں شائع ہوا تو جمہوریت پسند حلقے ششدر رہ گئے۔ خواجہ ناظم الدین کے بقول اس خط سے کانگرس کی جمہوریت پسندی کے ڈھول کا پول کھل گیا۔ سرت چندر بوس نے اپنے اس خط میں ہندو زمینداروں سے توقع کی تھی کہ وہ مسلمان عملہ اور مسلمان مزارعین کو غیر لیگی امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالنے پر مجبور کریں گے مگر اس حلقہ کے مسلم رائے دہندگان پر اس خط کا الٹا اثر ہوا اور انہوں نے پہلے سے زیادہ زور شور سے مسلم لیگ کی حمایت شروع کر دی۔

اس صورت حال میں جب 3 دسمبر کو مولوی فضل الحق، سر عبدالحلیم غزنوی کے حامیوں کے ساتھ میمن سنگھ جا رہا تھا تو راستے میں اس کا کالی جھنڈیوں، لاٹھیوں، اینٹوں اور پتھروں سے استقبال کیا گیا۔ اس ہنگامے میں کئی افراد زخمی ہوئے جنہیں برائے علاج ہسپتال جانا پڑا۔ خود فضل الحق جان بچانے کے لئے اپنی کار سے نکل کر پیدل بھاگا اور اس نے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک ہندو زمیندار کے گھر میں پناہ لی۔

7 دسمبر 1945ء کو گاندھی، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کلکتہ پہنچے۔ 9 دسمبر کو وائسرائے ویول بھی کلکتہ پہنچا تو 10 دسمبر کو گاندھی نے اس سے ملاقات کی۔ اسی دن کلکتہ میں ہی کانگرس کا منشور جاری کیا گیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ کانگرس مکمل آزادی کے حصول کے لئے عام انتخابات میں حصہ لے رہی ہے۔

مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی کامیابی اور کلکتہ میں مسلمانوں کا جشن فتح

11 اور 12 دسمبر 1945ء کو مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے لئے پولنگ ہوئی۔ جس کے نتیجے کا اعلان دسمبر کے آخری ہفتے میں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی ساری کی ساری مسلم نشستیں جیت لی ہیں۔ 28 دسمبر کو یوم فتح منایا گیا۔ اس مقصد کے لئے کلکتہ میں حسین شہید سہروردی کی زیر صدارت ایک جلسہ عام ہوا جس میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمانوں نے

شرکت کی۔اس سے پہلے اس شہر میں مسلمانوں کا اتنا بڑا جلسہ کبھی نہیں ہوا تھا۔جلسہ میں خواجہ ناظم الدین، مولانا اکرم، ابوالہاشم اور حسین شہید سہروردی نے تقریریں کیں جن میں آل انڈیا مسلم لیگ کے موقف کی تائید کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ ''صوبائی انتخابات کے بعد دو دستور ساز اسمبلیوں کی تشکیل کی جائے۔ایک پاکستان کے لئے اور ایک ہندوستان کے لئے۔''

مرکزی اسمبلی کے ان انتخابی نتائج سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہوگئی کہ بنگال کے مسلمانوں میں کانگرس کا کوئی وجود نہیں ہے۔کرشک پرجا پارٹی کا وجود بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور ''شیر بنگال'' مولوی فضل الحق کی حیثیت محض ایک سیاسی یتیم کی ہے۔چنانچہ اس کی پارٹی کے شمس الدین احمد اور بہت سے دوسرے ممتاز ارکان جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع ہوگئے۔ان میں سے چند ایک کا 9رجنوری 1946ء کو مشترکہ بیان یہ تھا کہ ''ایم۔اے۔جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی حالیہ تقریروں اور بیانوں سے یہ امر روز روشن کی طرح صاف اور عیاں ہوگیا ہے کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا جسے پوری خودمختاری حاصل ہوگی۔اس مقصد اور ملک کی آزادی کے حصول کے لئے مسلم لیگ برطانوی سامراج سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہے۔پس عملی طور پر اب ہم ملک کے ہر دو سیاسی اداروں یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کے آئیڈیل کے درمیان کوئی فرق اور تضاد محسوس نہیں کرتے۔'' اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں غیاث الدین احمد، نورالاسلام چودھری اور افسر الدین احمد شامل تھے اور ان کے اس بیان کی تعبیر یہ تھی کہ وہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ مانگتے تھے۔انہیں مولوی فضل الحق کے سہارے صوبائی اسمبلی میں پہنچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔

مسلمان کسانوں کو زندہ جلانے اور ایک مسلمان عورت کی آبروریزی کے خلاف بنگال مسلم لیگ کا یوم احتجاج...... انگریزوں اور ہندوؤں سے سخت نفرت کا اظہار

11رجنوری 1946ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق کلکتہ اور بنگال کے دوسرے سارے چھوٹے بڑے شہروں میں یوم فتح تزک واحتشام سے منایا گیا۔اگرچہ اس سے تین چار دن قبل چٹاگانگ کے نزدیک مسلمانوں کے گاؤں ہاٹ ہزاری پر فوج کے سویلین عملے

کے سینکڑوں ارکان نے ایک عورت کے اغوا پر تنازعہ کی بنا پر حملہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ اس حملہ میں 14 افراد ہلاک اور 30 زخمی ہوئے تھے۔ کئی مسلمان کسانوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا اور ایک عورت کی کھلے عام آبروریزی کی گئی تھی۔ چونکہ اس واقعہ سے کلکتہ کے مسلمانوں میں بہت غصہ پھیل گیا تھا اس لئے 14 رجنوری کو مسلم لیگ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ 16 رجنوری کو شہر میں احتجاجی ہڑتال ہوگی۔ 15 رجنوری کو مسلم لیگی اخبار عصر جدید نے اس واقعہ پر زوردار تبصرہ کیا جس میں یہ بتایا گیا کہ کس طرح 1939ء میں عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد چھ سال کے عرصے میں بنگال کے مسلمانوں کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''بنگال کا مشرقی حصہ دراصل مسلم بنگال ہے اور جنگ کا سب سے زیادہ دباؤ اسی علاقے پر پڑا۔ جاپان سے جنگ شروع ہوتے ہی ''ڈینائل پالیسی'' جاری کی گئی یعنی بعض علاقوں کو جنگی ضروریات اور حالات کے پیش نظر خالی کرانے کا زور شروع ہوا اور کوئی بندوبست خاص کئے بغیر بعض علاقوں کے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھر بار، کھیت اور جائیداد کو چھوڑ کر ان علاقوں سے نکل جائیں۔ شاید دنیا کے دیگر حصوں میں بھی ایسا ہوا ہوگا لیکن وہاں ان نکالے جانے والوں کے لئے سر چھپانے اور اپنے بال بچوں اور مویشی واسباب کو منتقل کرنے کا کوئی سامان کیا گیا ہوگا مگر یہاں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا اندوہناک واقعہ ہے۔ دوسری چیز یہ کہ بنگال میں نقل وحرکت کا دارومدار کشتیوں پر زیادہ ہے اس لئے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں نہ ریل ہے نہ سڑکیں۔ مگر جنگ کے زمانے میں کشتیوں پر آفت آئی اور پانی کے ذریعے نقل وحرکت بہت ہی دشوار ہوگئی۔ تیسری چیز یہ کہ ہزاروں ہزار بیگھہ اراضی کو فوجی ضرورتوں کے لئے گھیر لیا گیا۔ ہوائی جہازوں کے لئے بہت سے سٹیشن بنائے گئے اور بہت سے گودام اور کیمپ وغیرہ تعمیر کئے گئے اور اس اراضی سے لوگوں کو بیدخل ہونا پڑا۔ چوتھی چیز یہ کہ بنگال کے قصبوں اور مرکزی مقامات میں اجنبیوں کا ریلا آ گیا۔ فوجی ٹھیکیداروں کا سیلاب امڈ آیا اور خدمات جنگ کے آدمی لاکھوں کی تعداد میں گھس آئے جو محض اس بنا پر کہ ''خدمات جنگ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے لئے ہر نادرست کو درست سمجھنے لگے اور قانون دفاع ہند نے جو دہشت لوگوں کے دلوں میں بٹھا دی تھی اس سے یہ اصحاب فائدہ اٹھانے لگے...... ہوا یہ کہ مسلم بنگال کو بے منہ کا جانور سمجھ کر جو کچھ جس کے جی میں آیا اس نے کیا اور آج جو رپورٹیں ہاٹ ہزاری چاٹگام کے بارے میں آئی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو یہ یقین ہو جاتا

ہے کہ انگریز حکمران صرف ان لوگوں کا خیال کرتے ہیں جو ان کو پریشان کر سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہندوؤں نے بہت زیادہ ایجی ٹیشن کیا اور ان کو تنگ کیا، لہٰذا وہ ہندو لیڈروں اور ہندو آبادی کی خوشامد کرتے ہیں اور چونکہ مسلمان ان کے خلاف کوئی محاذ قائم نہیں کر رہے ہیں اس لئے ان کے نزدیک مسلمانوں کی جان، ان کا مال اور ان کی آبرو کوئی اہم چیز نہیں ہے۔''[7]

''عصر جدید'' کے اس تبصرے کا ایک مقصد یہ تھا کہ صوبائی اسمبلی کے متوقع انتخابات کی مصلحت کے تحت مسلمانان بنگال کو یہ باور کرادیا جائے کہ انگریز اور ہندو دونوں ہی ان کے دشمن ہیں اور ان کی نجات اسی میں ہے کہ مسلم لیگ کی پشت پناہی کر کے اپنے لئے الگ وطن کے قیام کی راہ ہموار کریں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان دنوں برطانیہ کا جو پارلیمانی وفد بنگال کا دورہ کر رہا تھا اسے یہ تاثر دیا جائے کہ بنگالی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کا بندوبست کئے بغیر برصغیر کے آئینی مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہوگا اور اگر مسلمانوں سے منصفانہ سلوک نہ کیا گیا تو وہ بھی ایسی ہی پرتشدد ایجی ٹیشن کر سکتے ہیں جیسی کہ ماضی میں بنگال کے ہندو کرتے رہے ہیں۔ 28/جنوری 1946ء کو جب بنگال مسلم لیگ کے لیڈروں نے کلکتہ میں اس پارلیمانی وفد سے ملاقات کی تو انہوں نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کیں جیسی کہ عصر جدید نے اپنے اداریے میں لکھی تھیں۔ اسی دن مرزا ابوالحسن اصفہانی کے اخبار مارننگ نیوز نے ایک مضمون میں سرکاری انتظامیہ کے غیر مسلم اہل کاروں کی بدعنوانیوں، تعصب، جانب داری اور مسلم دشمنی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اس مضمون کی اشاعت پر عصر جدید نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا اور یہ لکھا کہ ''اگر ہندوؤں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا ہوتا اور کہیں ایک معاملے میں ان کا حق تلف ہوا ہوتا تو حکومت ہند اور حکومت بنگال دونوں ہی کی مشینریاں حرکت میں آجاتیں اور لارڈ ویول اور مسٹر کیسی دونوں ایک ایک بیان کے ساتھ نمودار ہو جاتے لیکن جن معاملات میں...... اور وہ کونسا معاملہ ہے جس میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کی گئی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ کھلی دشمنی کا ثبوت نہیں دیا گیا ہے...... تمام محکموں میں مسلمانوں کے بالکل واجبی اور قانونی حقوق پامال کئے جا رہے ہیں اور حکومت اطمینان سے سب کچھ جان کر بھی خاموش ہے۔ سول سپلائیز کے محکمہ سے مسلمانوں کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اسامیوں کے تقرر اور ترقی میں مسلمان امیدواروں کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ کپڑے کی راشننگ اور کنٹرول کے کاروبار کے سلسلہ میں

بڑے بڑے مشاہروں پر معمولی درجے کے ہندو کارندے بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کو سعی وسفارش کے باوجود دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ ان تمام الزامات کی تردید وتشفی کرنا حکومت کا فرض ہے لیکن حکومت بالکل گم صم ہے۔ کیوں؟ دال میں کالا ضرور ہے اور اگر نہیں ہے تو واقعات کو پبلک کے سامنے لایا جائے۔''[8] اگرچہ مارننگ نیوز، عصر جدید اور بعض دوسرے مقامی مسلمان جریدوں میں اس قسم کے مضامین اور اداریے صداقت سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ تاہم جنوری 1946ء میں ان کی بنیاد انتخابی مقاصد پر تھی۔ اس پروپیگنڈے سے یہ تاثر ملتا تھا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کے حقوق ومفادات کی علمبردار ہے اور انگریز و ہندو دونوں ہی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

آزاد ہند فوج کے کیپٹن عبدالرشید کو سزا سنائے جانے پر بنگالی مسلمانوں کا پرتشدد احتجاج جبکہ پنجاب میں کچھ نہ ہوا حالانکہ عبدالرشید پنجاب کا رہنے والا تھا

مسلم لیگی پریس کے اس مضمون کے پروپیگنڈے اور مسلم لیگی لیڈروں کی اس مضمون کی تقریروں اور بیانوں کا مقصد یہ نہیں تھا کہ مسلمانان بنگال مشتعل ہو کر فوراً ہی پرتشدد ایجی ٹیشن شروع کر دیں گے۔ تاہم جب فروری کے دوسرے ہفتے میں آزاد ہند فوج☆ کے ایک مسلمان آفیسر کیپٹن عبدالرشید کو، جس کی وکالت مسلم لیگی وکلا نے کی تھی، سزا کا حکم سنایا گیا تو صورت حال ان کے قابو میں نہ رہی۔ 12 رفروری کو کلکتہ میں زبردست احتجاجی مظاہرہ ہوا جس میں مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اور حسین شہید سہروردی نے بھی ڈلہوزی اسکوئیر میں ایک جلوس کی قیادت کی۔ اس ہنگامہ میں فوجی لاریوں پر حملے کر کے انگریز اور امریکی فوجیوں کو زخمی کر دیا گیا اور پھر سرکاری املاک کو نذر آتش کرنے کی اتنی وارداتیں ہوئیں کہ شہر کا نظم ونسق فوج کے حوالے کرنا پڑا جبکہ 17 افراد ہلاک اور 125 زخمی ہو چکے تھے۔ سہروردی کا ایسوسی ایٹڈ پریس سے انٹرویو کے دوران تبصرہ یہ تھا کہ ''جب ایک بار مسلم عوام بیدار ہو جائیں تو ان کو دبانے کے لئے حکومت کی طاقتیں درکار ہوں گی اور وہ اپنے تمام مطالبات کو تسلیم کروا کر رہیں گے۔ ہماری

☆ آزاد ہند فوج کے بارے میں تفصیل جاننے کے لئے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ: جلد 1۔ پاکستان کیسے بنا؟ ایڈیشن سوم 2012ء، ص ص 191 - 208 ادارہ مطالعہ تاریخ

کامیابی کا سبب یہ ہے کہ ان تمام مظاہروں کے پس پردہ سچا مقصد ہے۔ کاش کہ اس سچائی کے ساتھ تمام متعلقہ پارٹیاں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ اب موجودہ فضا میں ایک مخلصانہ سعی کی جائے گی تا کہ تعاون باہمی پیدا ہو۔ ایک دوسرے کے نکات کو سمجھیں اور ایک ایسا حل نکالیں جو لیگ اور کانگرس دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ کسی شخص کو ایسی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم لوگ برطانوی افراد کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں، یہ قطعی غلط ہے۔ ہم لوگ برطانوی سامراج کی جڑ اور شاخیں سب کچھ اکھاڑ پھینکیں گے مگر انتقام نہیں لیں گے۔ ہماری تحریک اخلاقی تنظیم پر مبنی ہے۔"[9] مگر سہروردی کے اس بیان کے باوجود 13رفروری کو کلکتہ میں پھر مظاہرہ ہوا۔ تین ٹرینوں کو جلا دیا گیا۔ سٹیشن کی عمارت کو آگ لگا دی گئی اور شہر میں کئی جگہ گولی چلی جس سے 12 افراد ہلاک اور ایک سو سے زائد زخمی ہوئے۔

کیپٹن عبدالرشید پنجاب کا رہنے والا تھا لیکن اس کی سزا یافتگی پر لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے مسلمانوں میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ بنگال کے مسلمانوں کی جانب سے اس کی سزا کے خلاف اس قدر پر تشدد مظاہروں کی ایک وجہ یہ تھی کہ بنگالی مسلمانوں کو جنگ کے دوران انگریزوں کی "انکار کی پالیسی" کی وجہ سے اس قدر مصائب برداشت کرنا پڑے تھے کہ ان کی برطانوی سامراج کے خلاف نفرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز سامراجیوں، ہندو زمینداروں و ساہوکاروں اور سرمایہ داروں نے تقریباً دو سو سال تک ان کا اتنا استحصال کیا تھا کہ وہ معاشی اور معاشرتی تنزل کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ جنگ کے دوران قحط کے عظیم المیہ نے ان دونوں استحصالیوں کے خلاف ان کے صبر کا پیمانہ پوری طرح لبریز کر رکھا تھا۔ انہیں اپنے غصہ و نفرت کے اظہار کے لئے کسی بہانے کی ضرورت تھی اور کیپٹن عبدالرشید کی سزا نے یہ بہانہ مہیا کر دیا تھا۔ انہوں نے اس موقع پر جو پر جوش مظاہرے کئے ان سے پہلی مرتبہ یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر ہندوستان کا آئندہ کا آئینی ڈھانچہ ان کے لئے اطمینان بخش نہ ہوا تو بنگال میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ اب ان کے حقوق و مفادات کو پامال کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ اب ان کے مطالبہ پاکستان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ تحریک پاکستان کا ہراول دستہ تھے۔

حسین شہید سہروردی کو بنگالی مسلمانوں کے ان جذبات کی شدت کا احساس تھا۔ تاہم وہ نہیں چاہتا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات سے چند دن قبل پر تشدد مظاہروں کا یہ سلسلہ طول پکڑ

جائے۔ لہٰذا اس نے ایک اور بیان میں اپیل کی کہ "کیپٹن عبدالرشید کے فیصلے کے خلاف جو مظاہرہ ہونا تھا کامیابی کے ساتھ ختم ہو چکا۔ اب مزید مظاہرہ کرنا فضول ہوگا اور اس سے ہمارے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ راستے کی رکاوٹوں کو دور کیجئے اور ہڑتال ختم کیجئے، دکانیں کھول دیجئے اور حسب دستور اپنے کاروبار میں لگ جایئے۔ کسی قسم کا تشدد نہیں ہونا چاہیے۔ یورپین یا ہندوستانیوں کو راستے میں ذلیل نہ کیجیے۔ میں محلہ کے سرداروں اور بااثر لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ لوگوں کو مظاہرہ کرنے سے، سڑکوں پر جمع کرنے سے اور اینٹ پتھر پھینکنے سے روکیں۔ لوگوں کو لاٹھی اور ڈنڈا ہاتھ میں لے کر چھوٹے بچوں کو لاری یا ٹرک میں سوار نہیں کرنا چاہیے۔"[10] مگر سہروردی کا یہ بیان بھی بے اثر ثابت ہوا۔ کلکتہ میں مظاہرے جاری رہے۔

جب 15 رفروری 1946ء کو صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کلکتہ پہنچے تو شہر کے کئی علاقوں میں صورت حال بہت کشیدہ تھی۔ 18 رفروری کو بلوائیوں نے ڈھاکہ اور نارائن گنج کے درمیان ایک مسافر گاڑی کو نذر آتش کر دیا۔ اسی دن جناح نے کلکتہ میں ایک بیان میں متنبہ کیا کہ اگر حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں صرف ایک ہی دستور ساز اسمبلی طلب کرنے کا ارادہ کیا تو اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ پورے ہندوستان میں مسلمان بغاوت کر دیں گے۔ یہ کام برطانیہ کا ہے کہ صحیح روش اختیار کرے۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ پاکستان منظور کرے اور اس کے متعلق صاف صاف اعلان کرے۔ سرحدوں کا انضباط اور دو اقوام کے مابین معاہدہ اس کے بعد ہو جائے گا۔"[11]

رائل انڈین نیوی کے عملہ کی شورش کی حمایت میں بنگال کے مسلمانوں کا مظاہرہ

19 رفروری 1946ء کو ڈھاکہ میں ساری رات ہنگامے ہوتے رہے جن کے باعث ڈھاکہ اور نارائن گنج کے درمیان ٹرین سروس رکی رہی اور اس دن بمبئی سے یہ خبر آئی کہ وہاں رائل انڈین نیوی☆ کے ہندوستانی عملہ نے شورش برپا کر دی ہے۔ چنانچہ حسین شہید سہروردی نے اس صورت حال کے پیش نظر ایک اور بیان جاری کیا جس میں اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ "برطانیہ

☆ رائل انڈین نیوی کی شورش کی تفصیل جاننے کے لئے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ: جلد 1۔ پاکستان کیسے بنا؟ ایڈیشن سوم 2012ء، ص ص 255 - 259 ادارہ مطالعہ تاریخ

ہندوستان کو چھوڑ رہا ہے۔ ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان چھوڑنے سے قبل اگر برطانیہ نے حکومت کی باگ ڈور کو صحیح طریقہ پر ہمارے حوالے نہیں کیا تو آئندہ اسی طرح ہنگامے برابر جاری رہیں گے۔ ہم مسلمان فساد اور بدامنی نہیں چاہتے، ہمارے پاس آزادی، امن اور حقوق کی پوری سکیم موجود ہے۔ ہمارے خیال میں ہماری یہ سکیم بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے ذریعہ تمام لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی اور سب کو آزادی ملے گی۔ تنہا یہی ایک سکیم ہے جو تباہی و بربادی سے ہندوستان کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ابوالکلام آزاد کا یہ بیان غلط ہے کہ یہ ہنگامے مسلم لیگی اور کمیونسٹ طلبا کی وجہ سے ہوئے ہیں۔'' سہروردی کا یہ بیان اس لحاظ سے اہم تھا کہ اسی دن شام کو جبکہ بمبئی میں انڈین نیوی کی بغاوت جاری تھی، لندن میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ عنقریب ایک وزارتی مشن ہندوستان بھیجا جائے گا جو ہندوستانی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کرے گا کہ آئندہ کے لئے ہندوستان کے آئین کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیے۔

20رفروری کو قائداعظم جناح نے حکومت برطانیہ کے اس اعلان پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے آئینی قضیے کا واحد حل یہ ہے کہ مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرلیا جائے۔ 21و22رفروری کو بمبئی، کراچی اور مدراس میں انڈین نیوی کی بغاوت جاری رہی تو کلکتہ میں ان باغیوں کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ اس پر جناح نے نیوی کے جوانوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کلکتہ کے شہریوں سے اپیل کی کہ وہ ہڑتالوں اور مظاہروں سے صورت حال کو مزید ابتر نہ بنائیں۔

قائداعظم کا کلکتہ میں اعلان کہ تحریک پاکستان سرمایہ داروں کے لئے نہیں بلکہ غریبوں اور ناداروں کے لئے چلائی جارہی ہے

24رفروری کو قائداعظم نے کلکتہ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کیا جس میں تقریباً چھ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ اس جلسہ میں ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پاکستان ہماری موت وحیات کا سوال ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں ایک باعزت قوم کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے پاکستان کے حصول کی کوشش ہی سب کچھ ہے۔ اگر وہ خود کو ہندو اور انگریز کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ پاکستان ہی کے ذریعے ممکن ہے...... ہم الیکشن کیوں لڑ رہے ہیں؟ ہم صرف

وزارت بنانے کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ صرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو ختم کر دینے کے لئے اور پاکستان حاصل کرنے کے لئے یہ الیکشن لڑ رہے ہیں۔ تمام دنیا اسے دیکھ رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم ایک آزاد قوم کی طرح رہیں گے۔''

25 اور 26 رفروری کو قائد اعظم نے مسلم خواتین اور مسلم طلبا کو خطاب کیا اور پھر 27 رفروری کو اصفہانی کے مکان پر مسلم لیگی کارکنوں کے اجتماع میں ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ پاکستان میں غریبوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس پر جناح کا جواب یہ تھا کہ ''مجھے سرمایہ داروں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ایک ضعیف اور سن رسیدہ آدمی ہوں۔ مجھے خدا نے اتنا کافی دے دیا ہے کہ میں اس عمر میں آرام سے زندگی بسر کر سکوں۔ پھر میں اپنا خون پانی کیوں کر رہا ہوں اور اتنی محنت، جفاکشی اور دوا دوش سے کیوں کام لے رہا ہوں؟ کیا سرمایہ داروں کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کے لئے۔ آپ جیسے غریبوں اور ناداروں کے لئے۔ میں 1936ء میں بنگال کے اندرونی علاقے میں گیا تھا میں نے لوگوں کی حد سے گزری ہوئی نکبت وادبار اور افلاس کو دیکھا تھا۔ ان میں بعضوں کو دن بھر میں ایک دفعہ بھی کافی خوراک میسر نہیں تھی۔ پاکستان میں ہم حتی الامکان کوشش کریں گے کہ ہر شخص کو شائستہ زندگی بسر کرنے کی توفیق نصیب ہو۔'' اس سوال کے جواب میں کہ ملک سے برطانویوں کو باہر کرنے کے لئے سب سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم متحد ہو جانا چاہیے اور اس کے بعد کوئی تصفیہ ہونا چاہیے۔ قائد اعظم نے کہا کہ ''فرض کر لیجیے کہ آپ کسی عام تحریک میں برطانیہ کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ اشتراک کر لیں۔ جہاں تک برطانویوں کا تعلق ہے، گفت وشنید کا آغاز ہوگا۔ آپ کے لئے گفت وشنید کرنے کون جائے گا؟ مسٹر گاندھی۔ کیونکہ آپ کا جداگانہ ادارہ ختم ہو جائے گا۔ مسٹر گاندھی خلافت کے زمانے کا پرانا کھیل شروع کر دیں گے۔ آپ اپنا خون بہائیں گے۔ قربانیاں دیں گے لیکن سہرا کس کے سر رہے گا؟ مسٹر گاندھی کے سر۔ وہ آپ کو کچلنے کے لئے گفت وشنید کریں گے۔ اس وقت آپ کیا کریں گے؟ آپ اس پر غور کریں۔ آپ کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ میں آپ سے متحد ہو جانے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہمیں صرف ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ نہیں کرنا بلکہ ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنا پڑے۔ آپ کسی بھی امداد واعانت کی امید نہ رکھیں۔''[12]

بنگال صوبائی اسمبلی کا انتخاب، 119 مسلم نشستوں میں سے 113 نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں

28رفروری کو قائداعظم جناح بذریعہ ریل سلہٹ چلے گئے جبکہ خواجہ سر ناظم الدین انڈین فوڈ ڈیلی گیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے براستہ لندن واشنگٹن کی طرف رواں دواں تھا اور بنگال کی مسلم سیاست کا میدان صرف حسین شہید سہروردی کے لئے کھلا تھا۔ سہروردی نے پورے بنگال میں تقریباً دو ہفتے تک بڑے زور شور سے انتخابی مہم چلائی۔ اس کی مسلمان رائے دہندگان سے گزارش یہ تھی کہ ''وہ ووٹ جو لیگی نمائندہ کو دیا جائے گا دراصل پاکستان کا ووٹ ہوگا اور ہر وہ ووٹ جو لیگی نمائندوں کے مقابل کو دیا جائے گا پاکستان کے خلاف ہوگا اور اکھنڈ بھارت کے لئے ہوگا۔''

19رمارچ کو پولنگ شروع ہوا۔ مسلم لیگ کا انتخابی نشان بیل گاڑی تھا۔ پولنگ تقریباً دس دن تک جاری رہا اور پھر یکم اپریل کو انتخابی نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلی کی 119 مسلم نشستوں میں سے 113 نشستیں جیت لی ہیں۔ کانگرس مسلمانوں کی کوئی ایک نشست بھی نہ جیت سکی۔ سارے کانگرسی امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔ مولوی فضل الحق خود تو ایک حلقہ سے منتخب ہو گیا لیکن باقی سارے حلقوں میں اس کی کرشک پرجا پارٹی کا جنازہ نکل گیا۔

2راپریل کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے سہروردی کو متفقہ طور پر اپنا قائد منتخب کیا تو 3راپریل کو صوبائی گورنر نے اسے وزارت سازی کی دعوت دے دی جو اس نے یہ کہہ کر قبول کر لی کہ ''میں وسیع ترین بنیادوں پر وزارت کی تشکیل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اخبارات کے نمائندوں سے اس کا انٹرویو یہ تھا کہ ''ہماری نظر میں پاکستان کے مقابلے میں وزارت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ہمیں کہا جائے کہ پاکستان کی خاطر وزارت کے عہدے چھوڑ دو تو ہم ایسا کرنے میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔'' 8راپریل 1946ء کو سہروردی نئی دہلی پہنچا تو اس نے وزارتی مشن سے تقریباً 65 منٹ ملاقات کر کے اسے پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔

مسلم لیگ کا دہلی کنونشن، 40ء کی قرارداد کے مطابق ''مسلمانوں کی آزاد ریاستوں'' کے بجائے پاکستان کی ایک ''ریاست'' پر مبنی قرارداد۔

9/اپریل کو نئی دہلی میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے نومنتخب ارکان اور مرکزی لیگ کے عہدیداروں کا کنونشن ہوا۔ یہ کنونشن قائداعظم جناح نے طلب کیا تھا اور اس کا ایک مقصد وزارتی مشن پر اس حقیقت کو آشکار کرنا تھا کہ مسلم لیگ نے ہندوستان کے آئندہ کے آئینی ڈھانچے کے بارے میں جو موقف پیش کیا ہے اسے مسلمانوں کے منتخب نمائندوں کی بھرپور تائید حاصل ہے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوئے ہیں ان کی مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری میں استواری پیدا کی جائے اور تیسرا مقصد حکومت برطانیہ اور کانگرس پر یہ واضح کرنا تھا کہ صدر مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی جانب سے برصغیر کے آئینی مستقبل کے بارے میں فیصلہ کی بات چیت کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ ان مقاصد کے پیش نظر کنونشن میں شرکت کرنے والوں نے ایک قرارداد کے ذریعے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ حصول پاکستان کی مہم کو کامیاب کرنے کے لئے مسلم لیگ کے ہر حکم کی وفاداری کے ساتھ پابندی کریں گے اور حسین شہید سہروردی کی پیش کردہ ایک اور طویل قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ''ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے کے صوبہ جات بنگال اور آسام اور شمال مغربی علاقے کے صوبہ جات پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک خودمختار و آزاد ریاست قائم کی جائے۔'' قرارداد کے یہ الفاظ 23/مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن کی قرارداد لاہور سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ان میں صرف ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا جبکہ 1940ء کی قرارداد میں دو ریاستوں کا ذکر تھا۔ مزید برآں اس قرارداد میں متذکرہ صوبوں کے علاقوں میں ردوبدل کا کوئی ذکر نہیں تھا جبکہ 1940ء کی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مناسب علاقائی ردوبدل کے بعد شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں دو آزاد و خودمختار مسلم ریاستیں قائم کی جائیں۔

اگرچہ ارکان اسمبلی کے کنونشن کو مسلم لیگ کے سالانہ سیشن کی 1940ء کی قرارداد میں اس قسم کی بنیادی ترمیم کرنے کا کوئی آئینی اختیار حاصل نہیں تھا تاہم اس وقت کسی نے اس ترمیم پر اعتراض نہ کیا۔ چودھری خلیق الزماں دعویٰ کرتا ہے کہ کنونشن کی قرارداد کا مسودہ حسب معمول

اس نے لکھا تھا اور یہ کہ ''اس نے اس میں ریاستوں کی بجائے ریاست کا لفظ غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر غالباً اس لئے لکھ دیا تھا کہ مسلم عوام کے ذہنوں میں پاکستان کا تصور یہ تھا کہ ایک واحد فیڈرل اور کنفیڈرل ریاست ہوگی۔''[13] لیکن رونق جہاں کے بیان کے مطابق قرارداد لاہور میں یہ تبدیلی سہواً یا غیر ارادی طور پر نہیں ہوئی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ ''دو ریاستوں کی بجائے ایک ریاست کے خیال نے اس وقت فروغ پایا تھا جبکہ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ بنگال تقسیم ہوگا اور مشرقی علاقے کا بطور آزاد ریاست دفاع نہیں ہو سکے گا۔''[14] قطع نظر اس کے کہ ان دونوں بیانات میں سے کونسا بیان صحیح ہے یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ 23/مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور اور 9/اپریل 1946ء کی قرارداد دہلی دونوں ہی بنگال کے وزرائے اعلیٰ نے پیش کی تھیں۔ پہلی مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق نے اور دوسری حسین شہید سہروردی نے۔

بنگال کی وزارت کی تشکیل کے لئے سہروردی اور کانگرس کے رہنماؤں کے مابین بات چیت بے نتیجہ ثابت ہوئی

جس دن نئی دہلی میں یہ کنونشن ہو رہا تھا اسی دن حسین شہید سہروردی نے کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد سے دو مرتبہ ملاقات کی اور پھر 10/اپریل کو بھی ابوالکلام آزاد سے ملا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی اطلاع کے مطابق ان ملاقاتوں میں بنگال میں وزارت سازی کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ 11/اپریل کو سہروردی نے قائداعظم جناح سے ملاقات کر کے ان سے اس تجویز کے بارے میں مشورہ کیا کہ بنگال میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت قائم ہونی چاہیے۔ اس نے اس دن یعنی 11/اپریل کو ہی بنگال کانگرس اسمبلی پارٹی کے قائد کرن شنکر رائے کو، جو ان دنوں دہلی میں ہی تھا اس مقصد کے تحت ایک خط لکھا جس میں اس نے یہ پیشکش کی کہ اگر بنگال میں کانگرس پارٹی، جو انتخابی نتائج کے مطابق ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے، مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارت بنانے پر آمادہ ہو جائے تو اسے بارہ ارکان کی کابینہ میں پانچ وزارتیں دی جائیں گی۔ کرن شنکر رائے نے اسی رات سہروردی کے اس خط کے جواب میں لکھا کہ ''کانگرس یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتی کہ وہ صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مزید برآں کانگرس کا مطالبہ یہ ہے کہ تمہاری سربراہی میں جو کابینہ بنے اس میں کانگرس اور مسلم لیگ کو مساوی نمائندگی ملنی چاہیے۔ کانگرس پر

مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کے سلسلے میں کوئی نظریاتی پابندی عائد نہیں بشرطیکہ پاکستان کے مسئلہ کو صوبائی سیاسیات سے بے تعلق رکھا جائے۔ ہمارے درمیان اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف رائے قائم رہے گا اور ہمیں اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہوگی۔'' سہروردی نے کرن شنکر رائے کے اس جواب کا فوراً ہی یہ جواب دیا کہ ''مجھے افسوس ہے کہ میں 12 رکنی کابینہ میں پانچ وزارتوں کی پیشکش سے منحرف نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس سلسلے میں جب ابوالکلام آزاد سے بات چیت کی تھی تو اس نے وزرا کی تعداد کے مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اس نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ سمجھوتے کے راستے میں حائل نہیں ہوگا...... کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے یا نہیں اور یہ بات کانگرس کے سیاسی نظریے کے مطابق ہے یا نہیں، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ انتخابی نتائج کے مطابق کانگرس کو ہندو فرقے کی بہت حد تک حمایت حاصل ہے لہٰذا میری خواہش ہے کہ ایسے اقلیتی نمائندوں کو کابینہ میں شامل کیا جائے جنہیں اپنے فرقہ کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو...... ابوالکلام آزاد نے مجھے بتایا تھا کہ کانگرس فضل الحق کو نہیں چھوڑ سکتی لہٰذا اسے لازمی طور پر اسمبلی کا سپیکر منتخب کیا جائے۔ میں ابھی سے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں یہ مطالبہ تسلیم نہیں کرسکتا کیونکہ مسلم لیگ کسی بھی عہدے کے لئے کسی غیر لیگی مسلمان کی حمایت نہیں کرسکتی۔''[15]

سہروردی کی ابوالکلام آزاد سے یہ بات چیت اور کرن شنکر رائے سے یہ خط و کتابت قائداعظم جناح کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ جناح نے سہروردی کو یہ اجازت غالباً اس وجہ سے دی تھی کہ بنگال اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت بہت ہی معمولی تھی اور اپریل 1945ء میں ناظم الدین وزارت کی ایوان میں شکست سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ ہندو سرمایہ داروں کے تعاون کے بغیر وہاں کوئی وزارت پائیدار نہیں ہوسکتی تھی۔ چونکہ مارچ 1946ء کے انتخابات میں ہندوؤں اور اچھوتوں کی بیشتر نشستیں کانگرس نے جیتی تھیں اس لئے صوبہ میں مستحکم وزارت کے قیام کے لئے اس پارٹی کا تعاون ضروری تھا۔ 3/اپریل 1946ء کو جب صوبائی گورنر نے سہروردی کو وزارت سازی کی دعوت دی تھی، اس وقت اس نے بھی مشورہ دیا تھا کہ اس مقصد کے لئے کانگرس پارٹی کا تعاون حاصل کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ کلکتہ میں انگریزوں نے بہت سرمایہ کاری کی ہوئی تھی اور پٹ سن و چائے کی برآمدی تجارت سے بھی وہ خوب منافع کماتے تھے، اس

لئے ان کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اشتراک سے ایسی وزارت بنے جو اس صوبہ میں امان وامان بحال رکھ سکے۔ آزاد ہند فوج کے افسروں کے مقدموں کے خلاف پر تشدد مظاہروں اور انڈین نیوی کی بغاوت نے کلکتہ کے انگریز سرمایہ داروں کے حلقوں میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔

تاہم جب سہروردی نئی دہلی میں تین دن کی کوشش کے باوجود وزارت سازی کے کام میں کانگرس کا تعاون حاصل نہ کر سکا تو وہ 12 راپریل کو بذریعہ جہاز واپس کلکتہ چلا گیا جہاں ہندو سرمایہ داروں میں مسلم لیگ کے کنونشن کی 9 راپریل کی قرارداد نے کھلبلی مچا رکھی تھی کیونکہ اس قرارداد میں مسلم لیگ نے نہ صرف بنگال اور آسام کے پورے صوبوں کی پاکستان میں شمولیت کا مطالبہ کیا تھا بلکہ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ شمال مغربی علاقے اور شمال مشرقی علاقے کی مسلم اکثریتی ریاستیں پاکستان کی ایک ہی مملکت کے جزو ہوں گی۔ بالفاظ دیگر پاکستان کے شمال مشرقی یونٹ پر پنجابیوں کا غلبہ ہوگا کیونکہ پاکستان کی فوج تقریباً سو فیصد پنجابیوں پر مشتمل ہوگی۔ سہروردی نے بنگالی ہندوؤں کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے 15 راپریل کو ایک بیان میں انہیں یقین دلایا کہ ''پاکستان میں یونٹوں کی حیثیت کا تعین ان کی زبان اور ثقافت کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا۔ بنگال کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے اور میرا خیال ہے کہ میرے ہندو احباب بھی بنگال کو ایک یونٹ ہی رکھنا چاہیں گے۔''

16 راپریل کو کرن شنکر رائے نئی دہلی سے کلکتہ واپس آیا تو سہروردی نے مخلوط وزارت کے قیام کے لئے پھر اس سے سلسلہ جنبانی کیا مگر تین چار دن کی کوشش کے باوجود اسے پھر ناکامی ہوئی۔ چنانچہ 22 راپریل کو یہ اعلان کیا گیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مخلوط وزارت کے قیام کے لئے جو بات چیت ہو رہی تھی وہ بارآور نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو رپورٹ دی اس میں بتایا گیا تھا کہ کرن شنکر رائے نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اشتراک وتعاون کے لئے مندرجہ ذیل شرائط پیش کی تھیں۔

1۔ سہروردی ایک بیان جاری کر کے ان خدشات کو دور کرے جو اس کے حالیہ اخباری بیانات اور مسلم لیگ پارلیمانی کنونشن میں اس کی تقریروں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کانگرسی حلقوں کے بیان کے مطابق سہروردی کی جانب سے کرن شنکر رائے کے

اس مطالبہ کا جواب یہ تھا کہ وہ ایک عمومی بیان دینے پر آمادہ ہے جس میں اقلیتوں کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کی وضاحت کی جائے گی یعنی یہ یقین دلایا جائے گا کہ مسلم لیگ ہندوؤں، عیسائیوں اور بدھوں سمیت ساری اقلیتوں سے انصاف کی علمبردار ہے۔ وہ دوسرے صوبوں میں اقلیتی فرقہ سے کانگرس کے سلوک کو بھی ملحوظ خاطر رکھے گی۔

2۔ قانون ساز اسمبلی میں کوئی فرقہ وارانہ نوعیت کا یا متنازعہ نوعیت کا قانون پیش نہیں کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا قانون پیش ہوا تو اس کے بارے میں فیصلہ کولیشن پارٹی کی دوتہائی اکثریت سے ہوگا۔ بالفاظ دیگر کانگرس پارٹی کو قانون سازی کے بارے میں ویٹو کا اختیار حاصل ہوگا۔ سہروردی کو اس مطالبہ سے بھی شدید اختلاف تھا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ مسلم لیگ نے سیکنڈری ایجوکیشن بل منظور کروانے کا وعدہ کیا ہوا ہے اور وہ یہ وعدہ بہر صورت پورا کرے گی۔

3۔ کابینہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد مساوی ہونی چاہیے اور داخلہ اور سول سپلائیز کے محکمے کانگرس کو ملنے چاہئیں۔ مگر سہروردی نے اس شرط کو بھی تسلیم نہ کیا اور اس کا خیال تھا کہ سول سپلائیز کا محکمہ وزیر اعلیٰ کے پاس ہی ہونا چاہیے۔

4۔ اس امر کی یقین دہانی کردی جائے کہ سارے سیاسی قیدیوں کو بلا تاخیر رہا کر دیا جائے گا۔ سہروردی نے اس مطالبے کے جواب میں یہ لکھا کہ جو سیاسی قیدی مقدمہ چلائے بغیر نظر بند ہیں، انہیں فوراً رہا کر دیا جائے گا لیکن جو سیاسی جرائم کی بنا پر سزا یافتہ ہیں ان کے معاملات پر غور کیا جائے گا۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے یہ رپورٹ کانگرسی حلقوں کے حوالے سے دی تھی اور اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کانگرسی ہندوؤں نے گزشتہ نو دس سال کے تجربے سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ وہ دراصل بنگال میں مخلوط وزارت کے نام پر ہندو مفاد پرستوں کی وزارت چاہتے تھے۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے پہلے فضل الحق وزارت اور پھر ناظم الدین وزارت کی متعدد کوششوں کے باوجود سیکنڈری ایجوکیشن بل منظور نہیں ہو سکا تھا اور وہ آئندہ بھی یہ بل منظور نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ چونکہ ماضی میں حسین شہید سہروردی کے پاس سول سپلائیز کا محکمہ ہونے کے باعث ہندو بیوپاریوں کے

مفادات پر زد پڑتی تھی اور مسلمانوں کو اناج اور کپڑے کی تجارت کے شعبے میں کچھ نمائندگی ملی تھی۔اس لئے کانگرس آئندہ یہ محکمہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔قدرتی طور پر یہ شرائط سہروردی کے لئے قابل قبول نہیں تھیں۔اول اس لئے کے بنگال کی مسلم رائے عامہ اسے اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔اس مسلم رائے عامہ نے صوبہ کے ہندو جاگیرداروں، ساہوکاروں، سرمایہ داروں اور افسروں سے تضاد کی بنا پر نہ صرف قحط کے دوران کی سرناظم الدین وزارت کی نااہلیوں اور بدعنوانیوں کو نظرانداز کر دیا تھا بلکہ اس نے مولوی فضل الحق کو بھی سیاسی یتیم بنا دیا تھا حالانکہ اس کی سیاست کی بنیاد کسانوں اور دوسرے غریب عوام کی حمایت پر تھی۔دوئم اس لئے کہ اگر وہ جناح کی رضامندی کے بغیر ان شرائط پر کانگرس کے ساتھ مخلوط وزارت بنانے کی کوشش کرتا تو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے بیشتر ارکان اس سے باغی ہو جاتے اور اس کا حشر بالکل ایسا ہی ہونا تھا جیسا کہ 1943ء میں مولوی فضل الحق کا مسلم لیگ سے اخراج کے بعد ہوا تھا۔اپریل 1946ء میں مسلم لیگ کے پارلیمانی کنونشن سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی تھی کہ بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کی مسلم رائے عامہ اب کسی بھی مسلم لیگی لیڈر کو قائداعظم جناح سے سرکشی کی اجازت نہیں دے گی۔سہروردی ایک زیرک بورژوا لیڈر تھا اور اسے ان سارے حقائق کا اچھی طرح شعور و احساس تھا۔چنانچہ اس نے کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل کا ارادہ ترک کر دیا۔

باب: 12

سہروردی کی مسلم لیگ مخلوط وزارت اور برصغیر کی ہندو۔ مسلم کشیدگی کا بدترین صوبہ...... بنگال

لیگ کے رہنماؤں کے ذہن میں پاکستان کا تصور ملاؤں کی مذہبی ریاست نہیں تھا

حسین شہید سہروردی نے اچھوتوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے 24/اپریل کو ایک آٹھ رکنی کابینہ کی تشکیل کی جن کے نام اور محکمے یہ تھے:

1۔ حسین شہید سہروردی	=	وزیر اعلیٰ۔ محکمہ داخلہ
2۔ خان بہادر محمد علی بوگرا	=	خزانہ، صحت عامہ اور لوکل سیلف گورنمنٹ
3۔ خان بہادر سید معظم الدین احمد	=	تعلیم اور مالیہ
4۔ احمد حسین	=	زراعت
5۔ خان بہادر عبدالغفران	=	سول سپلائیز
6۔ جوگندر ناتھ منڈل	=	عدلیہ، تعمیرات
7۔ خان بہادر اے۔ ایف۔ ایم عبدالرحمان	=	امداد باہمی، آبپاشی
8۔ شمس الدین احمد	=	تجارت، محنت اور صنعت

اس وزارت کی تشکیل کے بعد سہروردی نے 29/اپریل کو بنگال کی اقلیتوں کو یقین دلایا کہ مسلم لیگ کے مجوزہ پاکستان میں ساری اقلیتوں کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں

گے۔ اس نے کلکتہ کی مسلم ایسوسی ایشن کی ایک استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے کانگرس کو وزارت سازی کے سلسلے میں یہ ظاہر کرنے کے لئے پیشکش کی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگرس مل کر کام کر سکتی ہیں۔ پاکستان صرف مسلمانوں کے لئے نہیں ہوگا بلکہ یہ ہندوؤں سمیت سارے عوام کے لئے ہوگا۔ پاکستان میں سارے عوام کی حکومت ہوگی...... ہندوستان کبھی بھی ایک واحد ملک نہیں رہا۔ اگر اکھنڈ ہندوستان بنا تو مسلمان ہر جگہ کچلے جائیں گے۔ ان کے لئے کہیں بھی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اس لئے اکھنڈ ہندوستان کے خلاف جدوجہد کا سوال ان کے لئے موت وحیات کا سوال ہے۔ بنگال کے مسلمان پاکستان کے حصول کے لئے ہر قربانی کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ محض مسلم عوام کی جذباتی لہر نہیں ہے، وہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں انہیں مصائب کی زندگی سے نجات ملے گی۔ انہیں ظالموں سے نجات ملے گی۔ انہیں ظالموں سے تحفظ ملے گا۔ انہیں معلوم ہے کہ مسلم لیگ غریب اور پسماندہ عوام کی ترجمان ہے اور یہ کہ پاکستان میں وہ مسرت کی زندگی سے ہمکنار ہوں گے۔ مسلمان صرف اپنی ہی آزادی کے لئے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر پاکستان بنا تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی رہیں گے۔ ہندوؤں کے لئے پاکستان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ان کے پاس حکمرانی کے لئے تین چوتھائی ہندوستان ہوگا حالانکہ وہ حکمرانی کا فن بھول چکے ہیں۔ بنگال میں ہندو اقلیت بڑی تعداد میں ہوگی۔ اس لئے یہاں کے ہندوؤں کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔''[1] سہروردی کی اس تقریر کی تعبیر یہ تھی کہ اس کے ذہن میں پاکستان کا جو تصور تھا وہ ملاؤں کی مذہبی ریاست کا تصور نہیں تھا۔ اس کا تصور ایک جدید بورژوا جمہوری ریاست کا تصور تھا جس میں سب لوگوں کو بلا لحاظ دین ومذہب اور رنگ ونسل مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بظاہر اس کا یہ تصور مسلم لیگ کی ہائی کمان کا تصور تھا کیونکہ 9/اپریل 1946ء میں نئی دہلی کے لیگ پارلیمانی کنونشن میں اس کی پیش کردہ جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس میں پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں علاقائی ردوبدل کا ذکر نہیں تھا۔ گویا اس قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں غیر مسلم اقلیتوں کا تناسب تقریباً 45 فیصد ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے وہم وگمان میں نہیں ہو سکتی تھی کہ 45 فیصد غیر مسلموں کی موجودگی میں پاکستان کی ریاست ملاؤں کی مذہبی ریاست ہوگی۔

وزارتی مشن منصوبہ کے تحت مسلم لیگ نے بنگال اور آسام کا علیحدہ گروپ منظور کر لیا مگر گاندھی نے آسام کانگرس کی جانب سے اس منصوبے کو سبوتاژ کر دیا

سہروردی کی مذکورہ تقریر سے دو دن قبل یعنی 27/اپریل کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس (Pathic Lawrence) مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم جناح کو اور کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد کو وزارتی مشن کی گروپنگ سکیم کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کر چکا تھا اور جناح نے ان اصولوں کی بنیاد پر بات چیت جاری رکھنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بالفاظ دیگر جناح کو اس رائے سے اختلاف نہیں تھا کہ کل ہند یونین کی محدود اختیارات والی مرکزی حکومت کے تحت شمال مغربی اور شمال مشرقی صوبوں کی گروپنگ میں مسلمانوں کے حقوق ومفادات کا مناسب تحفظ ہو سکے گا۔ تاہم ایسی گروپنگ میں اسلامی نظام کے ساتھ تھیوکریسی کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وزارتی مشن کی سکیم کے ان اصولوں پر تقریباً ایک ہفتہ تک بات چیت ہوتی رہی۔ 8/مئی کو مشن نے دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو اپنی سکیم کے تفصیلی نکات سے آگاہ کیا اور پھر 16/مئی کو اس سکیم کا اعلان کر دیا جسے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے 6/جون کو قائد اعظم جناح کے مشورے کے مطابق منظور کر لیا۔ جواہر لال نہرو کے اخبار نیشنل ہیرلڈ کے بقول اس طرح ''جناح کے پاکستان کے تصور کی سرکاری طور پر تدفین ہوگئی'' لیکن مولوی فضل الحق کے سوا بنگال کے کسی قابل ذکر مسلمان لیڈر یا تنظیم نے پاکستان کے تصور کی اس تدفین کے خلاف احتجاج نہ کیا جبکہ صوبہ آسام کے ہندو لیڈر بلبلا اٹھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر آسام کا ادغام بنگال کے ساتھ ہو گیا تو ان کی ثقافت وتہذیب اور ان کے فن وادب کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

مسلم لیگ کی جانب سے وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک وائسرائے ویول کی مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں خط وکتابت اور گفت وشنید ہوئی مگر تینوں میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ بالآخر 16/جون 1946ء کو وائسرائے نے اس سلسلے میں اپنے فارمولے کا اعلان کیا جس میں

بتایا گیا تھا کہ مجوزہ عبوری حکومت میں کانگرس کے چھ اور مسلم لیگ کے پانچ نمائندے ہوں گے اوران کے علاوہ ایک سکھ، ایک انڈین کرسچین اور ایک پارسی ہوگا۔ 25/جون کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کا یہ فارمولا منظور کر لیا لیکن 26/جون کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے عبوری حکومت سے متعلقہ اس قلیل المیعاد منصوبے کو تو مسترد کر دیا البتہ اس نے وزارتی مشن کی طویل المعیاد گروپنگ سکیم کو منظور کر لیا۔ چنانچہ 29/جون کو وزارتی مشن اس امید کے ساتھ واپس چلا گیا کہ وائسرائے ویول عبوری حکومت کے قیام کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی مفاہمت کرا دے گا۔

6/جولائی کو ابوالکلام آزاد کی جگہ جواہر لال نہرو کانگرس کا صدر منتخب ہوا۔ اس کے انتخاب کی تجویز ابوالکلام آزاد نے پیش کی تھی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اگر سردار پٹیل کانگرس کا صدر بن گیا تو وہ وزارتی مشن کے منصوبے پر عملدرآمد نہیں ہونے دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ نہرو اس منصوبے کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ حائل نہیں کرے گا۔ اس انتخاب کے اگلے دن 7/جولائی کو نہرو کی زیر صدارت آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کانگرس کی مجلس عاملہ کی 26/جون کی قرارداد کی توثیق کر دی اور اس طرح پورے برصغیر میں یہ خوشگوار تاثر پیدا ہو گیا کہ ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں برطانوی وزارتی مشن کے منصوبے کی بنیاد پر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان بالآخر مفاہمت ہو گئی ہے۔ برطانوی حکومت کو بھی کانگرس کمیٹی کے اس فیصلے پر خوشی ہوئی۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس اور وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس (Stafford Crips) کی طرف سے مبارک باد کے تار موصول ہوئے لیکن 10/جولائی کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ابوالکلام آزاد کے بقول برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اس دن کانگرس کا نیا صدر جواہر لال نہرو کانگرس کی مجلس عاملہ کی 26/جون کی قرارداد اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی 7/جولائی کی توثیقی قرارداد سے منحرف ہو گیا۔ اس نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''کانگرس دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوگی تو معاہدوں کی زنجیروں سے بالکل آزاد ہوگی اور جو بھی صورت حال پیدا ہوئی اس سے نپٹنے کے لئے پوری طرح مجاز و مختار ہوگی...... کانگرس نے صرف دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کو منظور کیا ہے اور جو بھی اس کی دانست میں مناسب ہوگا وہ اس کے مطابق وزارتی مشن کے منصوبے میں رد و بدل کرنے کے لئے اپنے آپ

کو پوری طرح آزاد سمجھتی ہے......اغلب امکان یہ ہے کہ کوئی گروپ بندی نہیں ہوگی۔'' نہرو نے خود اپنے اس انحراف کی وجہ یہ بیان کی کہ ہندو اکثریت والا گروپ (الف) مجوزہ گروپ بندی کے خلاف ہوگا، نیز گروپ (ب) میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور گروپ (ج) میں صوبہ آسام اس کی مخالفت کریں گے لیکن اس کے اس بیان میں حسب معمول آدھا سچ اور آدھا جھوٹ تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ وزارتی منصوبے کے خلاف کانگرس کی قیادت پر سب سے زیادہ دباؤ گاندھی کی طرف سے تھا جس نے آسام کانگرس کے رہنماؤں کو اکسایا تھا کہ وہ گروپ (ج) میں سے آسام کی علیحدگی کے حق کا مطالبہ کریں تاکہ گروپنگ سکیم اپنی موت آپ مرجائے۔☆ یہ کانگرسی رہنما آسام کے ہندو مفاد پرستوں کی نمائندگی کرتے تھے جو 1940ء کے بعد سے آسام میں مشرقی بنگال کے بے زمین مسلمان کسانوں کی آباد کاری کی سخت مخالفت کرتے رہے تھے۔ انہوں نے 1944ء میں آسام میں سر سعد اللہ کی حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ جو بنگالی مسلمان کسان 1942-43ء کے قحط کے دوران آسام کی غیر مزروعہ اراضی پر آباد ہوئے ہیں انہیں زبردستی بیدخل کیا جائے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر بنگالی آبادکاروں کے خلاف سختی نہ برتی گئی تو یہ صوبہ بہت جلد مسلم اکثریتی صوبہ بن جائے گا۔ وزارتی مشن کے 16 رمئی 1946ء کے منصوبے میں ان کو یہی خدشہ نظر آتا تھا۔ وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ اگر آسام کو بنگال میں مدغم کر دیا گیا تو آسام کی ثقافت اور تہذیب چند سالوں میں ہی نیست و نابود ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے گاندھی کی شہ پر وزارتی مشن منصوبہ کو سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بنگال اسمبلی کی جانب سے دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب......لیاقت علی سمیت یو۔ پی اور دہلی کے پانچ افراد بنگال سے منتخب ہوئے

اگرچہ نہرو کی اس قلابازی کے بعد برصغیر کے سارے سیاسی حلقوں میں وزارتی مشن کے منصوبے پر عملدرآمد کے بارے میں شدید شکوک وشبہات پیدا ہو گئے تھے تاہم جولائی کے تیسرے ہفتے میں صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے ووٹوں سے مجوزہ دستور ساز اسمبلی کے انتخابات

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے، پاکستان کی سیاسی تاریخ: جلد1۔ پاکستان کیسے بنا؟
ایڈیشن سوم 2012ء ، ص ص 351 - 549 ادارہ مطالعہ تاریخ

ہوئے۔ بنگال کی 33 مسلم نشستوں میں سے 32 نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ صرف ایک نشست کے انتخاب میں مولوی فضل الحق کامیاب ہوا۔ کامیاب مسلم لیگی امیدواروں کے نام یہ تھے (1) نوابزادہ لیاقت علی خان (2) حسین شہید سہروردی (3) خواجہ سر ناظم الدین (4) ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی (5) خواجہ شہاب الدین (6) ابوالہاشم (7) راغب احسن (8) خان اے۔ایم۔عبدالحمید (9) فضل الرحمان (10) مجیب الرحمان خان (11) ابوالقاسم خان (12) سراج الاسلام (13) خان بہادر ابراہیم خان (14) تمیز الدین خان (15) ڈاکٹر محمود حسین (16) مظہر الحق (17) سر ایم۔عزیز الحق (18) خان بہادر عبدالمحمود (19) خان بہادر غیاث الدین پٹھان (20) محمد حسین ملک (21) بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ (22) خان بہادر بذل الکریم (23) مولانا شبیر احمد عثمانی (24) پروفیسر اشتیاق حسین قریشی (25) محمد حسان (26) حمید الحق چودھری (27) عبداللہ الباقی (28) شہزادہ یوسف مرزا (29) خواجہ نورالدین (30) فرموز الحق (31) خان بہادر ایم۔الطاف احمد اور (32) ایم۔ایس۔علی

ان 32 کامیاب امیدواروں میں سے کم از کم پانچ امیدوار ایسے تھے جن کا بنگال سے تعلق نہیں تھا۔ وہ دہلی اور یو۔پی کے رہنے والے تھے لیکن انہیں بنگال کے کوٹا میں محض اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ ان کا اپنے علاقوں سے منتخب ہونے کا امکان نہیں تھا۔ باقی 27 کامیاب امیدواروں میں سے دس امیدوار ایسے تھے جو اگرچہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں دو تین پشتوں سے مقیم تھے لیکن یہ بنگالی نژاد نہیں تھے اور ان کا بنگالی زبان، تہذیب اور ثقافت سے بھی واجبی سا تعلق تھا۔ گویا اس طرح بنگالی نژاد کامیاب امیدواروں کی تعداد سولہ سترہ سے زیادہ نہیں بنتی تھی اور وہ ایسے تھے کہ جن کا غیر بنگالی قیادت سے سرکشی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ تاہم کسی قابل ذکر بنگالی مسلم لیڈر نے اس انتخاب پر اعتراض نہ کیا کیونکہ اس زمانے میں صوبہ کی مسلم رائے عامہ برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار تھی۔ اسی ماحول میں 24ر جولائی کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو 25ر جولائی کو غذائی مسئلہ پر بحث کے بعد رائے شماری میں کانگرس پارٹی کو پہلی شکست ہوئی۔ حکومت کے حق میں 125 اور اس کے خلاف 86 ووٹ پڑے۔

وزارتی مشن منصوبہ کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ کی جانب سے راست اقدام کا اعلان

27رجولائی کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں تین دن تک وزارتی مشن کے منصوبے کے بارے میں کانگرس کے منافقانہ رویے پر بڑی تند و تلخ بحث ہوئی اور پھر 29رجولائی کو کونسل نے پہلے تو ایک قرارداد میں وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کے بارے میں اپنے 6رجون کے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور پھر ایک اور قرارداد میں اعلان کیا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کے حصول کے لئے مسلم قوم براہ راست اقدام کرے اور انگریزوں کے تحت موجودہ غلامی کے ساتھ ساتھ آنے والے دور کی اس محکومی سے بھی نجات پالے جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے غلبے سے پیدا ہوگی۔'' اس قرارداد میں مجلس عاملہ کو ہدایات دی گئیں کہ ''راست اقدام کا پروگرام تیار کیا جائے اور آنے والی جدوجہد کے لئے مسلمانوں کو منظم کیا جائے جس کا آغاز جب اور جس طرح ضروری ہوگا کیا جائے گا۔'' مزید برآں کونسل نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا کہ ''انہیں غیر ملکی حکومت نے جو خطابات عطا کئے ہیں وہ برطانوی رویہ کے خلاف سخت اظہار ناراضگی اور احتجاج کے طور پر واپس کر دیئے جائیں۔'' 30رجولائی کو مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں کونسل کی ہدایت کے مطابق ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا یہ پروگرام طے کیا گیا کہ اس دن جلسے منعقد کئے جائیں گے جس میں تحریک پاکستان کا پس منظر بیان کیا جائے گا۔

31رجولائی 1946ء کو صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح نے ایک پریس کانفرنس میں کونسل کے اس فیصلے کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ ''صرف مسلم لیگ وہ واحد جماعت ہے جس نے پوری احتیاط سے اپنے آپ کو آئینی دائرہ کے اندر رکھا ہے اور آئینی طریقوں پر کاربند رہی ہے لیکن برطانیہ کے وزارتی مشن سے مذاکرات کے دوران ہم نے دیکھ لیا ہے کہ برطانوی حکومت کے سر پر کانگرس نے تلوار لٹکا رکھی ہے اور اسے یہ ڈر ہے کہ اگر کانگرس کی پوری طرح دلجوئی یا تشفی نہ کی گئی تو وہ پھر جدوجہد شروع کر دے گی...... جو 1942ء کے مقابلے میں ہزار گنا بدتر ہوگی...... انگریزوں کے پاس مشین گنیں ہیں اور وہ اپنی بات کی جو چاہیں تاویل کر سکتے ہیں...... کانگرس ایک اور قسم کے ہتھیار سے پوری طرح لیس ہے...... اسے آسانی سے چٹکیوں

میں نہیں اڑایا جا سکتا۔ اس لئے ہم بھی اپنے دفاع اور اپنے تحفظ کے لئے آئینی ذرائع کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ راست اقدام کے لئے تیاری کریں تاکہ جس طرح اور جب بھی وقت آئے اس پر عملدرآمد شروع کر سکیں۔''

یکم اگست کو لندن میں برطانیہ کی کابینہ نے مسلم لیگ کے فیصلے پر بحث کر کے یہ فیصلہ کیا کہ لیگ کی جانب سے اس مجوزہ کاروائی کو رکوانے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ اسی روز کانگرسی لیڈر سردار پٹیل نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر مسلم لیگ کی ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی حقیقی ہے تو اس کا رخ برطانیہ کی طرف نہیں ہے بلکہ کانگرس کی طرف ہے کیونکہ برطانیہ پہلے ہی یہ واضح کر چکا ہے کہ اس کا ہندوستان میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' 5/اگست کو مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ ڈائریکٹ ایکشن ڈے 16/اگست کو منایا جائے گا۔

کانگرس کی مرکزی حکومت میں شمولیت، لیگ نے شمولیت کا مجوزہ فارمولا رد کر دیا

6/اگست کو وائسرائے ویول نے اپنی 22/مئی 1946ء کی تجویز کے مطابق ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے لئے جواہر لال نہرو کو دعوت دی۔ ویول کی تجویز یہ تھی کہ ایگزیکٹو کونسل 14 ارکان پر مشتمل ہو گی جن میں چھ کانگرس کے، پانچ مسلم لیگ کے اور تین اقلیتوں کے نمائندے ہوں گے۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح نے 31/جولائی کو وائسرائے کے نام ایک خط میں اس تجویز کو لیگ کونسل کے 29/جولائی کے فیصلے کے مطابق مسترد کر دیا۔ 8/اگست کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے بارے میں وائسرائے کی دعوت قبول کر لی۔ 9/اگست کو نہرو نے صدر مسلم لیگ کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہو جائے مگر جناح نے انکار کر دیا۔ 10/اگست کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں مسلم لیگ کی اس نکتہ چینی کو بے جا قرار دیا کہ کانگرس نے وزارتی مشن کا 16/مئی کا منصوبہ من وعن قبول نہیں کیا۔ مجلس عاملہ نے دعویٰ کیا کہ کانگرس نے اس منصوبے کو کلیتہً منظور کر لیا تھا لیکن اس کی تعبیر اس طرح کی تھی کہ اس میں جو تضادات ہیں وہ دور کئے جا سکیں اور جو فروگزاشتیں رہ گئی ہیں ان کا اس کے

بیان میں پیش کردہ اصولوں کے مطابق تدارک کیا جاسکے...... ہر صوبہ یہ فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اسے کسی گروپ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں...... دستور ساز اسمبلی قدرتی طور پر اپنی داخلی حدود میں رہ کر ہی کام کرے گی۔"

12 راگست کو جناح نے ایک بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ کانگرس کی مجلس عاملہ کی اس قرارداد سے 16 رمئی کے منصوبے کے بارے میں اس کے موقف میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس قرارداد میں الفاظ کی شعبدہ بازی کر کے اس موقف کا دوسرے الفاظ اور فقروں میں اعادہ کیا گیا ہے۔ 13 راگست کو نہرو نے رسمی طور پر جناح کو مطلع کیا کہ وائسرائے نے اسے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کی دعوت دی ہے اور یہ کہ وہ (نہرو) اس سلسلے میں مسلم لیگ کے تعاون کا خواہاں ہے۔ مگر جناح نے اس مرتبہ بھی معذوری ظاہر کی اور 14 راگست 1946ء کو انہوں نے مسلمانان ہند کو بتایا کہ وہ 16 راگست کو کس طرح ڈائریکٹ ایکشن ڈے منائیں۔ انہوں نے کہا کہ "یہ دن منانے کا مقصد ہندوستان کے طول وعرض میں مسلم عوام پر ان قراردادوں کی وضاحت کرنا ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے 29 رجولائی کو بمبئی میں منظور کی تھیں...... نہ کہ کسی صورت میں راست اقدام کرنا۔ اس لئے میں مسلمانوں کو از حد تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان ہدایات پر پوری طرح کاربند رہیں اور ان کی سختی سے پابندی کریں۔ پرامن رہیں، نظم وضبط کا پورا خیال رکھیں اور دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔"

مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن ڈے اور کلکتہ میں برصغیر کی تاریخ کا ہولناک ترین ہندو۔ مسلم فساد

قائداعظم جناح کی مذکورہ تاکید، جہاں تک بنگال کا تعلق تھا، بعد از وقت تھی۔ اس وقت تک کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ مشرقی کمان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر (Francis Tucker) کے بیان کے مطابق "اگست کے پہلے نصف میں کلکتہ کے بڑے بڑے عام جلسوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے جو تقریریں کیں وہ اشتعال انگیز اور تیز اور تند تھیں۔ سب تقریروں کا ہدف مخالف فرقہ ہوتا تھا۔" مارننگ نیوز کی 5 راگست کی رپورٹ کے مطابق بنگال

کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے 4/اگست کو مسلم نیشنل گارڈز کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ باہمی اختلافات کو پس پشت ڈال کر مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو جائیں اور اس عظیم کام کی تشکیل کے لئے تیاری کریں جو ہمیں درپیش ہے۔ اس اجتماع میں خواجہ ناظم الدین نے بھی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''دس کروڑ مسلمان اپنے اوپر ہندوؤں کی حاکمیت قائم کرنے کے بارے میں کانگرس کے ناپاک منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ انشاءاللہ کانگرس کو ہٹلر کی طرح شکست ہوگی۔'' اس دن مارننگ نیوز کا اداریہ یہ تھا کہ ''مسلمانوں کو ہندوستان میں بطور ایک باعزت قوم اپنی بقا کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔ وہ عدم تشدد کے نظریے کے حامل نہیں ہیں۔ اگر انہیں مجبور کیا گیا تو وہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام قائم کرنے کے حق کے حصول کے لئے سارے ذرائع استعمال کریں گے۔'' 5/اگست کو بنگال پراونشل لیگ کی مجلس عاملہ نے 16/اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کے لئے ایک چھ نکاتی پروگرام مرتب کیا۔ پروگرام یہ تھا کہ:

1۔ 16/اگست کو ہر جگہ مکمل ہڑتال اور جنرل سٹرائیک ہوگی۔
2۔ تمام مساجد میں جمعہ کی نماز سے پہلے ڈائریکٹ ایکشن کے بارے میں لیگ کونسل کی قرارداد کی وضاحت کی جائے گی۔
3۔ مسلمانان ہند، مسلمانان عالم اور اقوام مشرق کی آزادی کے لئے نفل پڑھے جائیں گے۔
4۔ پرامن جلوس نکالے جائیں گے اور مظاہرے کئے جائیں گے۔
5۔ پبلک جلسے کئے جائیں گے جن میں لیگ کونسل کی قرارداد کی مکمل حمایت کی جائے گی۔
6۔ ساری دوسری پارٹیوں سے پرامن طریقے سے گزارش کی جائے گی کہ وہ 16/اگست کو مکمل ہڑتال کر کے مظاہروں میں حصہ لیں۔''[2]

کلکتہ کے ہندوؤں کا مسلم لیگ کے اس پروگرام پر ردعمل تضحیک، طنز و مذاق اور دھمکیوں پر مشتمل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی قراردادیں محض دھونس جمانے اور دھمکی دینے کے لئے ہیں۔ مسلم لیگ کی قیادت پر اعتدال پسندوں کا غلبہ ہے۔ ان کا پس منظر جاگیردارانہ ہے اور اقتدار کے سامنے جھکنا ان کے خمیر میں ہے۔ مسلم لیگ کے لیڈر ادھیڑ عمر کے آسودہ حال لوگ

ہیں جن سے سول نافرمانی کی طویل جدوجہد کی سختیوں اور تکلیفوں کی تاب لانے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ لوگ جنگ کی آزمائش سے کبھی نہیں گزرے اور قربانی وضبط ونظم کی اہلیت میں آزمودہ کار کانگرسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگیوں نے انگریزوں کے انخلا سے ذرا پہلے خطابات واپس کرنے کا جو علامتی اقدام کیا ہے وہ کوئی حقیقی قربانی نہیں ہے۔ مسلم لیگ کی ہیئت حاکمہ میں نوجوانوں کی نمائندگی برائے نام ہے اور ان کا اثر ورسوخ بھی بہت کم ہے اور کانگرس کے برعکس مسلم لیگ کے پاس سیاسی کارکنوں کی فوج رکھنے اور ان کے خاندانوں کی کفالت کرنے کے لئے مالی وسائل کا بھی فقدان ہے۔ ہندوؤں کے اس خیال کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال کی انتظامیہ پر غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی اور انتظامیہ کے اہلکاروں کی بلاواسطہ یا بالواسطہ حمایت کے بغیر کسی ایجی ٹیشن کا زیادہ دیر تک جاری رہنا ممکن نہیں تھا۔

کلکتہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی 6/جولائی 1946ء کی ایک قرارداد کے مطابق "کلکتہ کی پولیس انتظامیہ کی ساری کلیدی اسامیوں پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے۔ مثلاً (1) کمشنر پولیس، یورپین (2) ڈپٹی کمشنر ہیڈ کوارٹرز، یورپین (3) ڈپٹی کمشنر، ہندو جسے ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ بھرتی کیا گیا تھا (4) ڈپٹی کمشنر شعبہ سراغ رسانی، ہندو (5) ڈپٹی کمشنر سپیشل برانچ، یورپین ایک، ہندو ایک (6) ڈپٹی کمشنر پورٹ پولیس، یورپین (7) ڈپٹی کمشنر انفورسمنٹ برانچ، ہندو (8) ڈپٹی کمشنر موٹر وہیکل، ہندو (9) ڈپٹی کمشنر نارتھ، مسلمان (10) ڈپٹی کمشنر ساؤتھ، مسلمان (11) افسر انچارج پولیس ٹریننگ سکول، اینگلو انڈین۔ مزید برآں گیارہ اسسٹنٹ کمشنروں میں سے سات ہندو، 2 مسلمان، ایک یورپین اور ایک اینگلو انڈین تھا۔ 1920ء کی تحریک خلافت سے پہلے پولیس کے سپاہیوں اور دوسرے چھوٹے اہلکاروں میں مسلمانوں کا تناسب 70 فیصد تھا لیکن اس کے بعد ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت شہر کی پولیس میں سے مسلمانوں کو بتدریج نکال دیا گیا تھا اور 1946ء میں پولیس انتظامیہ پر ان مسلم دشمن لوگوں کا غلبہ تھا جنہیں 1926ء کے فسادات میں تربیت دی گئی تھی۔ ہندوؤں کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے بڑے شہروں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے مسلم لیگی عناصر کوئی زیادہ گڑبڑ نہیں کر سکیں گے بالخصوص ایسی صورت حال میں کہ غریب مسلمانوں کے روزگار کا انحصار تجارت وصنعت کے شعبوں میں ہندو سرمایہ داروں پر تھا۔ مارننگ نیوز کی 6/اگست کی ایک رپورٹ کے مطابق لیگ

کونسل کی 29 ر جولائی کی قرارداد کے بعد ہوڑہ کی جیوٹ ملوں کے بہت سے مسلمان مزدوروں کو برطرف کر دیا گیا تھا اور کارخانوں کی انتظامیہ کے ہندو تمام مسلمان مزدوروں سے یہ کہتے تھے کہ ''تمہیں پاکستان جا کر کام کرنا چاہیے۔''

ہندو سرمایہ داروں کے اس اشتعال انگیز رویے سے کلکتہ اور صوبہ کے دوسرے شہروں کی مسلم رائے عامہ میں بہت برہمی پھیلی۔ بعض مسلم لیگی لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں اور بیانات سے ان کی اس برہمی میں مزید اضافہ کیا اور اس طرح ناگزیر طور پر دونوں فرقوں میں تعلقات بگڑتے چلے گئے۔ 5 ر اگست کو آسام مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی کا بیان یہ تھا کہ ''کرو یا مرو'' ہماری زندگی کا ماٹو ہے۔ ہمیں پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے یہاں تک کہ حسب ضرورت اپنی زندگیاں قربان کرنے کے لئے تیاری کرنی چاہیے۔ 10 ر اگست کو خواجہ ناظم الدین نے یونائیٹڈ پریس سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''ہم نے ڈائریکٹ ایکشن کے لئے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے دی ہے ہم ایک سو ایک طریقوں سے کانگرس اور حکومت برطانیہ کے لئے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ہم عدم تشدد کے نظریے کے پابند نہیں ہیں۔ بنگالی مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ڈائریکٹ ایکشن کے کیا معنی ہیں؟ انہیں اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کی ضرورت نہیں۔'' خواجہ ناظم الدین نے یہ انٹرویو ایسے موقع پر دیا تھا جبکہ وائسرائے ویول کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو کو مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے چکا تھا۔ ناظم الدین کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے بغیر عبوری حکومت کے قیام سے جلد یا بدیر شدید تصادم ہوگا اور 11 ر اگست کو نئی دہلی میں حسین شہید سہروردی کا ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ سے انٹرویو کے دوران کہنا یہ تھا کہ ''مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگرس کو عنان اقتدار دینے کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ بنگال مکمل آزادی کا اعلان کر کے اپنی متوازی حکومت بنا لے گا۔ ہم بنگال سے ایسی مرکزی حکومت کو کوئی ریونیو نہیں دیں گے اور اپنے آپ کو ایک الگ ریاست تصور کریں گے جس کا اس مرکز سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔'' اس نے مزید کہا کہ ''لیگ اس قسم کا انتہائی اقدام اسی صورت میں کرے گی کہ جب اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔''[3]

12 ر اگست کو جب حکومت بنگال نے صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ کی 5 ر اگست کی قرارداد کے مطابق ڈائریکٹ ایکشن ڈے یعنی 16 ر اگست 1946ء کو عام تعطیل کا دن قرار دینے کا اعلان

کیا تو بنگال اسمبلی میں بڑی تلخ بحث ہوئی جس کے بعد کانگرس پارٹی بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئی۔ اسی دن وائسرائے ویول نے اعلان کیا تھا کہ کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت قبول کر لی ہے۔ سر فرانسس ٹکر کے بیان کے مطابق ''صوبائی اسمبلی میں اس دن جو تلخ بحث ہوئی اس سے یہ واضح ہو گیا کہ ہندو اس حکم پر کس قدر برہم تھے۔ ان کی برہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پہلے کلکتہ کے تمام ذرائع آمد و رفت معطل کرنے کے لئے ہڑتالیں کرانے کی کانگرس کو کم وبیش اجارہ داری حاصل تھی۔ اس لئے سیاسی استحصال کے اس پسندیدہ میدان میں کسی اور حریف کے داخلے پر وہ سخت ناراض تھے اور حریف بھی مسلم لیگ جیسا جغادری۔'' ان کی برہمی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کلکتہ مسلم لیگ کی جانب سے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے اس پروگرام کا ہر روز اعلان ہوتا تھا جو صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ نے 5/ اگست کو بنایا تھا۔

کلکتہ مسلم لیگ نے 29/ جولائی کی قرارداد بمبئی کی روشنی میں ایک منشور بھی شائع کیا تھا اور صوبہ لیگ کے سیکرٹری ابوالہاشم کا 12/ اگست کو بیان یہ تھا کہ ''16/ اگست کے دن کو ہندوستان میں مسلم قوم کی تاریخ کا یادگار دن بنایا جائے گا۔ مسلم لیگ نے اپنے حامیوں سے کہا ہے کہ وہ اس دن برطانوی سامراج کے خلاف اپنی شکایات کا مظاہرہ کریں اور اس طرح ایک ایسی آزادی کی جدوجہد کی بنیاد رکھیں جس کے ڈھانچے کی تعمیر منصوبے کے مطابق ہوگی۔ میں عوام کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا ہدف صرف برطانوی سامراج ہے اور یہ کہ ہندوستان کی جو قوتیں مسلم قوم کی جائز تمناؤں کے خلاف برطانوی سامراج کی امداد کریں گی انہیں ہم قدرتی طور پر اپنا مخالف تصور کریں گے۔''

13/ اگست کو آل انڈیا ریلوے مسلم ایمپلائیز لیگ کی مجلس عاملہ نے کلکتہ میں اپنے نائب صدر نور الہدیٰ کی زیر صدارت ایک غیر معمولی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ ''16/ اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کے لئے فوری طور پر ریلوے مسلم نیشنل کور بنائی جائے گی اور ریلوے ملازمین اس دن پر امن مظاہرے اور جلسے کریں گے۔'' حکومت بنگال کا وزیر خزانہ محمد علی بوگرا بھی اس اجلاس میں موجود تھا اور اجلاس کے بعد نور الہدیٰ کا اعلان یہ تھا کہ ''اب مزید نعرے نہیں ہوں گے، اب عمل اور صرف عمل کا وقت آ گیا ہے۔''[4]

15/ اگست کو بنگال کونسل میں کانگرس پارٹی نے حکومت بنگال کے خلاف اس بنا پر

تحریک مذمت پیش کی کہ اس نے 16 ر اگست کو عام تعطیل کا اعلان کر دیا تھا۔ وزیر اعلیٰ سہروردی نے اس تحریک پر بحث میں جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''16 ر اگست کو تعطیل کا فیصلہ تصادم کے خطرے کو کم کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ عوام کے مختلف گروپ امن وامان قائم رکھنے میں پوری طرح تعاون کریں گے اور کوئی ایسی اشتعال انگیز حرکت نہیں کریں گے کہ جس سے بدامنی پیدا ہونے کا امکان ہو۔'' سہروردی کی اس تقریر کے بعد کانگرس پارٹی کی تحریک 13 کے مقابلے میں 31 ووٹوں سے مسترد کر دی گئی۔ چند اینگلو انڈین اور اچھوت ارکان نے حکومت کے ساتھ ووٹ دیئے لیکن یورپین ارکان غیر جانبدار رہے۔

لیکن 16 ر اگست کا دن آیا تو حسین شہید سہروردی کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ 5 ر اگست کے پروگرام کے مطابق مسلم لیگ کے زیر اہتمام ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے سلسلے میں بہت بڑا جلسہ عام ہوا جس میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی اور سہروردی نے اپنی تقریر میں 29 ر جولائی کی قرارداد بمبئی کی وضاحت کی۔ مگر جلسہ ختم ہوا اور حاضرین مختلف گروہوں کی صورت میں اپنے گھروں کو جانے لگے تو تھوڑی دیر میں پورے شہر میں قتل وغارت، لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم ہو گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کے بیان کے مطابق ''سوا چار بجے سہ پہر کو فورٹرس ہیڈ کوارٹرز نے '''خطرہ'' کا خفیہ پیغام بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ کلکتہ کے ہر حصے میں لڑائی جھگڑے کے حادثات ہو رہے ہیں۔ گزشتہ فروری کے قتل وغارت نے ہم سب کو سخت صدمہ پہنچایا تھا لیکن یہ تو کچھ اور ہی چیز تھی، یہ تو بے لگام خونخواری تھی...... صرف ایک رات کے اندر تین انگریز بٹالینوں نے گلی کوچوں سے ساڑھے چار سو نعشیں ہٹائیں۔''

یہ فساد 19 ر اگست تک جاری رہا جس کے دوران ایک لاکھ سے زائد اشخاص آتشزدگی کے باعث خانماں برباد ہو گئے۔ ہلاک شدگان اور زخمیوں کی صحیح تعداد کا کسی کو صحیح علم نہیں تھا۔ شہر میں جگہ بہ جگہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر ہزاروں گدھ جشن منا رہے تھے۔ بعض مقامی اخبارات کا اندازہ تھا کہ ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تعداد 50 ہزار سے کم نہیں تھی۔ وی۔ پی۔ مینن کے اندازے کے مطابق 20 ہزار افراد اس فساد کا شکار ہوئے۔ جن میں مرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لمبی (Lumby) کا تخمینہ 14 ہزار تھا جن میں سے پانچ ہزار ہلاک ہوئے تھے لیکن انگریزوں کے ایک مقامی روزنامے سٹیٹسمین نے اپنے ذرائع

سے جو اعداد و شمار جمع کئے تھے ان کے مطابق ہلاک شدگان اور مجروحین کی تعداد 20 ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس روزنامے کا ایڈیٹر آئین سٹیفنز (Ian Stephens) لکھتا ہے کہ ''پہلے دن کی لڑائی میں شاید اور دوسرے اور تیسرے دن کی لڑائی میں یقیناً مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ بظاہر مقامی ہندو تنظیموں نے یہ افواہیں سن کر کہ مسلمان کسی نہ کسی طرح کے حملے کی سوچ رہے ہیں، زبردست جوابی تیاریاں کی ہوئی تھیں لیکن جس بات نے پلڑا فیصلہ کن انداز میں جھکا دیا وہ شاید ہندوؤں کے بہت بڑے جوابی حملے نہ تھے بلکہ وہ دوسرے دن سہ پہر کو سکھوں کی مداخلت تھی جو 16 اگست کو اس فساد سے بہت حد تک الگ رہے تھے پھر کسی چیز نے ان داڑھی والے لڑاکوں میں ہل چل مچا دی تھی جن کے پاس اتفاق سے کلکتہ کی موٹر ٹرانسپورٹ کی اجارہ داری تھی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ اس نے سکھوں کے بہت بڑے جتھوں کو ٹیکسیوں، لاریوں اور بسوں میں شہر کے بھوانی پور کے نواحی علاقوں سے بڑے جوش و خروش سے کورنگی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ ہندوؤں کی حمایت میں شہر کی شمالی گندی بستیوں میں شریک جنگ ہوئے۔ یہ بستیاں دھوئیں میں لپٹی ہوئی تھیں۔'' سٹیفنز مزید لکھتا ہے کہ ''کلکتہ کے اس عظیم قتل عام کے تین دنوں میں خونریزی اور تباہی کے جو ہولناک مناظر دیکھنے میں آئے انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان تین دنوں کے بعد جب امن ہوا تو شہر لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔ مون سون کی ہواؤں کی وجہ سے گلی سڑی انسانی لاشوں کی بدبو ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ شامپوکر (Shampuker) اور دوسرے مضافاتی گندے علاقوں میں لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ بعض جگہوں پر لاشوں کے ان ڈھیروں کی اونچائی نزدیکی مکانوں کی دوسری منزل تک تھی۔ پولیس کے مردہ خانے میں سانس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہاں لاشیں چھت تک بھری ہوئی تھیں جبکہ دولتمند لوگوں کی پارک سٹریٹ کے فٹ پاتھوں پر گدھ لاشوں کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔''[5]

کلکتہ کے اس عظیم فرقہ وارانہ قتل عام کے بارے میں انگریز، ہندو اور مسلمان مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بیشتر انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کو اس ہولناک المیے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور برطانوی ارباب اقتدار کو اس سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ ہندو مؤرخین کا الزام یہ ہے کہ صوبہ کی مسلم لیگی حکومت نے ایک منصوبہ کے تحت یہ قتل عام کروایا تھا اور کلکتہ مسلم لیگ کے کارکنوں نے اس مقصد کے لئے بڑی تیاریاں کی ہوئی تھیں۔ مسلم لیگی لیڈر

اگست کے اوائل ہی سے تشدد کا پرچار کر رہے تھے اور ہر روز مرنے مارنے کی دھمکیاں دیتے تھے لیکن حکومت نے ان ہی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے 16 اگست کو عام تعطیل کا اعلان کیا تھا اور مسلمان مؤرخین کا موقف یہ ہے کہ مسلم لیگ کلکتہ شہر میں فرقہ وارانہ فساد کرانے کا منصوبہ نہیں بنا سکتی تھی کیونکہ اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب صرف 25 فیصد تھا اور پولیس کی انتظامیہ پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا۔ اگر مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے موقع پر فساد کروانا ہوتا تو وہ اس مقصد کے لئے برصغیر کا کوئی ایسا دوسرا شہر منتخب کرتی جہاں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان اتنا زیادہ نہ ہوتا۔ دراصل بنگالی ہندو اپنی دوسو سالہ بالادستی کے نشے میں بدمست تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کلکتہ میں مسلمان بھی کسی مسئلہ پر سر اٹھا کر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ان ہندوؤں نے نہتے مسلمانوں پر حملوں کی پوری تیاریاں کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب مسلم لیگ کے جلسہ عام کے بعد مسلمان اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو ان پر منظم طریقے سے حملے کئے گئے جو تین دن تک جاری رہے اور جن میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے ہلاک و زخمی ہوئے۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے۔

ان تینوں بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ برطانوی سامراجیوں کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے کہ صوبہ کے انگریز گورنر اور دوسرے اعلیٰ سول و فوجی حکام نے دونوں فرقوں کے درمیان اشتعال پھیلانے کے لئے فوری طور کوئی شر انگیز کارروائی نہیں کی تھی۔ مسلم لیگی اور کانگرسی لیڈر خود ہی ایک دوسرے کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے رہے تھے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت برطانیہ نے مسلم لیگ کی 29 جولائی کی قرارداد بمبئی کے بعد قائد اعظم جناح سے از سر نو گفت و شنید کے لئے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کیا تھا۔ اگر وائسرائے ویول اس مقصد کے لئے کوئی پہل کرتا تو ڈائریکٹ ایکشن ڈے ملتوی ہو سکتا تھا۔ کم از کم ابوالکلام آزاد کا یہی خیال ہے لیکن ویول نے ایسا کرنے کی بجائے کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو کو مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے کر مسلم لیگیوں کو مزید اشتعال دلایا تھا۔ 12 اگست کو ویول کے اس اعلان سے برصغیر کے مسلمانوں میں تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ "برطانیہ کی حکمران لیبر پارٹی نے برصغیر کی عنان اقتدار ہندو کانگرس کے حوالے کر کے یہاں سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ وزیر اعظم ایٹلی کانگرس کو ناراض کرنے کے حق میں نہیں ہے کیونکہ کانگرس کے پاس پر تشدد ایجی ٹیشن کا جو ہتھیار تھا وہ اس سے خوفزدہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انتقال اقتدار پر امن طریقے سے ہوتا کہ برصغیر کے سارے

وسائل بالواسطہ طور پر برطانوی سامراج کی تحویل میں ہی رہیں۔ جواہر لال نہرو جنگ کے دوران سنگاپور میں ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے بعد سے برطانیہ کا ''اپنا آدمی'' بن چکا ہے۔''

ہندو مؤرخین کا یہ الزام بھی صداقت سے سراسر خالی نہیں ہے کہ صوبائی مسلم لیگ نے اس موقع پر کچھ نہ کچھ مار کٹائی کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے کلکتہ مسلم لیگ ہڑتالوں، جلسوں اور مظاہروں کے ہر روز اعلان کرتی تھی اور حسین شہید سہروردی نے مسلم نیشنل گارڈز کو مستعد کیا تھا اور پھر جب 16 راگست کو فساد شروع ہوا تھا تو اس نے بطور وزیر اعلیٰ پہلے ہی دن فوج کی امداد طلب نہیں کی تھی۔ اس نے فوج 17 راگست کو اس وقت طلب کی تھی جبکہ مسلح سکھ جتھوں نے نہتے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا تھا۔ مولانا اکرم خان اور ناظم الدین وغیرہ اگست کے اوائل سے کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ مسلمان عدم تشدد کے نظریے پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اصفہانی کا اخبار مارننگ نیوز بھی اپنے اداریوں اور مضامین میں یہی لکھتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر تھوڑا بہت فساد ہوا تو جوابی کاروائی ہوگی اور پھر اس فساد کی آگ اتنی پھیل جائے گی کہ اس پر قابو نہیں پایا جاسکے گا۔

مسلمان مؤرخین کا یہ موقف بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ ہندوؤں نے وسیع پیمانے پر خونریزی کی بڑی تیاریاں کی ہوئی تھیں اور یہ ان کی تیاریوں کا ہی نتیجہ تھا کہ تین دن میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ سکھ اس فساد میں اتفاقی طور پر ملوث نہیں ہوئے تھے بلکہ مارواڑیوں اور دوسرے ساہوکاروں نے انہیں اس میں ملوث کرنے کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ گویا سکھ ''کرائے کے فوجی'' تھے اور انہوں نے بڑے منظم طریقے سے کلکتہ کے مضافات کی گندی بستیوں میں غریب مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون بہایا تھا۔

لیکن ان تینوں وجوہ کے علاوہ کلکتہ میں اتنے بڑے فساد کی ایک چوتھی وجہ بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ بنگال کے مسلمانوں کو تقریباً دوسو سال تک انگریزوں اور ہندوؤں کا جبر و تشدد برداشت کرنے کے بعد 1937ء کے بعد پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا تھا کہ اس صوبہ میں ان کی بھی سیاسی، معاشرتی اور معاشی بالادستی قائم ہوسکتی ہے اور 1940ء میں پاکستان کے نعرے نے ان کے احساس کو بے پناہ تقویت دی تھی لیکن دوسری طرف ہندو سرمایہ دار، زمیندار، ساہوکار اور سرکاری اہلکار مسلمانوں کو بدستور ملیچھ تصور کرتے تھے اور وہ انہیں کوئی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی رعایت

دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے اور وہ ہر شعبۂ زندگی میں بہر قیمت اپنی بالادستی قائم رکھنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ لہٰذا لندن ٹائمز کے بقول یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ برصغیر میں صرف کلکتہ شہر میں ہی اتنا ہولناک فساد کیوں ہوا۔ ''اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں کسی اور جگہ ہندو دولت اور مسلم غربت کے درمیان اتنا واضح فرق نہیں تھا۔ بنگال مسلم اکثریتی صوبہ تھا لیکن اس کا سب سے بڑا شہر ہندوؤں کا عظیم کاروباری مرکز تھا۔''[6]

بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی تھی اس عظیم قتل عام کا سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ اگر اس وقت تک کسی حلقہ میں یہ امید باقی تھی کہ انگریزوں کی دستبرداری کے بعد ہندوستان کو متحد رکھا جا سکتا ہے تو وہ بھی بالکل ناپید ہو گئی۔ بقول شخصے جب گدھ کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر انسانی لاشوں کو نوچ رہے تھے تو وہ دراصل ہندوستان کی سیاسی سالمیت کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ اس فرقہ وارانہ قتل عام کے بعد ہندوستان کے متحد رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ عظیم المیہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں ایک عظیم فیصلہ کن واقعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

19 اگست کی شام کو شہر میں قدرے سکون ہوا تو 20 اگست کو وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کے مکان پر ساری پارٹیوں کے لیڈروں کا ایک اجلاس ہوا جس میں دوسرے ممتاز لیڈروں کے علاوہ سرت چندر بوس، کرن شنکر رائے، خواجہ ناظم الدین اور ایم۔اے۔اصفہانی نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ (1) ساری پارٹیوں کے لیڈر مشترکہ طور پر ایک جلوس نکال کر شہریوں پر یہ واضح کریں گے کہ صوبہ کی کوئی پارٹی بھی فساد کے حق میں نہیں ہے (2) فوجی پہریداروں میں اضافہ کیا جائے گا اور انہیں یہ ہدایت کی جائے گی کہ وہ دفعہ 144 اور کرفیو کی سختی سے پابندی کرائیں اور اس مقصد کے لئے قانون شکنی کرنے والوں کے مذہب کا کوئی لحاظ نہ کریں۔ تاہم شہر میں اکا دکا وارداتوں کا سلسلہ جاری رہا جن میں ہلاک ہونے والوں میں عصر جدید کا ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی بھی شامل تھا۔

21 اگست کو ڈھاکہ میں بھی فساد شروع ہو گیا اور 24 اگست تک اس شہر میں 16 افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ اسی دن جواہر لال نہرو اور اس کے ساتھیوں کا مرکزی حکومت میں تقرر کیا گیا تھا اور یہ اعلان ہوا تھا کہ مرکز میں نئی عبوری حکومت کے یہ ارکان 2 ستمبر کو حلف وفاداری اٹھائیں گے۔ اس اعلان سے کلکتہ میں مسلم لیگی لیڈروں کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کلکتہ اور بنگال کے

دوسرے شہروں کے مسلمان نئی دہلی میں اس ہندو راج کے قیام سے بہت مشتعل ہوں گے اور نتیجۃً فرقہ وارانہ قتل وغارت کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اسی دن ایک قرارداد میں بنگالی مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ مسلم لیگ ہائی کمان سے ہدایات کی عدم موجودگی میں مرکز میں عبوری حکومت کے قیام پر کسی برہمی کا اظہار نہ کریں۔ اگر بعض حلقوں کی طرف سے انہیں اشتعال دلایا جائے تو بھی وہ امن برقرار رکھیں اور لیگ ہائی کمان کی ہدایات کا انتظار کریں۔ اگر مسلمانوں نے مکمل نظم وضبط قائم نہ رکھا تو وہ دشمنوں کے ہاتھ میں کھیلیں گے۔''

خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی وزارتی مشن منصوبہ کے تحت کنفیڈرل ہندوستان میں خودمختار متحدہ بنگال کے قیام کے خواب دیکھتے تھے

25 راگست کو وائسرائے ویول فساد زدہ علاقوں کا معائنہ کرنے کے لئے کلکتہ پہنچا تو اس نے یہاں اپنے 24 گھنٹے کے قیام کے دوران دوسرے لوگوں کے علاوہ خواجہ ناظم الدین سے بھی ملاقات کی۔ خواجہ ناظم الدین پورے برصغیر میں ان چند افراد میں سے تھا جن کا خیال تھا کہ کلکتہ کے عظیم المیہ کے بعد بھی ہندوستان کی سالمیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ کانگرس وزارتی مشن کی گروپنگ سکیم کو صدق دل سے قبول کر لے۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کے روبرو بھی یہی موقف پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ''اگر کانگرس یہ حتمی یقین دلائے کہ وہ وزارتی پلان سے انحراف نہیں کرے گی یا آپ یہ یقین دلائیں کہ آپ کانگرس کو پلان کی منشا سے (جو اس کے مصنفوں کی منشا ہے) انحراف نہ کرنے دیں گے تو ممکن ہے کہ مسٹر جناح اپنے عدم تعاون کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور ایسی عبوری حکومت بن سکے جس کے خلاف ملک میں بے چینی پیدا نہ ہو۔''[7] گویا خواجہ ناظم الدین بھی ابوالکلام آزاد کی طرح اس رائے کا حامل تھا کہ جناح نے 29 رجولائی کو قرارداد بمبئی محض اس امید کے تحت منظور کروائی تھی کہ حکومت برطانیہ اس سے ازسرنو گفت وشنید کا سلسلہ شروع کرے گی۔ وائسرائے ویول نے خواجہ کی اس رائے سے اتفاق کیا اور اس نے نئی دہلی واپس جا کر گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں پر بہت زور دیا کہ وہ وزارتی مشن کے پلان کو من وعن قبول کر لیں مگر وہ نہ مانے اور برصغیر میں ایک سنگین سیاسی بحران جاری رہا۔

2 ر ستمبر کو نئی دہلی میں جواہر لال نہرو اور اس کے ساتھیوں نے وائسرائے کی کونسل کے

ارکان کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھایا تو بنگالی مسلمانوں کو یوں لگا کہ بنگال میں انگریزی راج ختم ہونے کے بعد مارواڑی راج قائم ہوگا۔ یہ تاثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ مولوی فضل الحق نے اس موقع کو غنیمت جان کر ایک مرتبہ اور قلابازی کھائی۔ اس نے 5 ستمبر کو اعلان کیا کہ ''مسلمانان ہند اپنی تاریخ کے نہایت نازک حصہ سے گزر رہے ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جو مسلمان مسلم لیگ سے باہر ہیں وہ فوراً اس جماعت میں شامل ہو جائیں کیونکہ یہی جماعت مسلمانوں کا واحد نمائندہ ادارہ ہے۔ قائداعظم نے مسلمانوں کے اتحاد کی جو اپیل کی ہے وہ نہایت برموقع اور مناسب ہے۔ میں نے آج اس اپیل کے جواب میں مسلم لیگ میں شمولیت کی درخواست دے کر اس کے حلف نامہ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ میں تمام غیر لیگی مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بھی بلا تاخیر مسلم لیگ میں شامل ہوکر متحدہ محاذ بنائیں کیونکہ ہم ایک جھنڈے تلے جمع نہ ہوئے اور ہم نے موجودہ سنگین خطرے کا جرأت کے ساتھ مقابلہ نہ کیا تو بطور قوم ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔'' [8] بظاہر فضل الحق کے اس بیان سے کلکتہ کے ان ہندوؤں میں اشتعال پھیلا جن کے حوصلے نئی دہلی میں نہرو کی حکومت کے قیام سے بہت بلند ہو گئے تھے۔ چنانچہ 6 ستمبر کو کراس سٹریٹ، بڑا بازار، چیت پور اور بعض دوسرے ہندو علاقوں میں چھرا گھونپنے کی 2 وارداتیں ہوئیں جن میں تین افراد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

وزیراعلیٰ حسین شہید سہروردی اس صورت حال میں قائداعظم جناح سے ملاقات کرنے کے لئے اسی دن بمبئی چلا گیا جہاں 7 ستمبر کو اس نے یونائیٹڈ پریس آف امریکہ سے انٹرویو کے دوران پنڈت نہرو کو متنبہ کیا کہ ''ہندوستان کی مسلم قوم نے مرکز کے نئے حکومتی ڈھانچے کو نہ قبول کیا ہے اور نہ کبھی قبول کرے گی۔'' اس نے کہا ''جب آپ عوام کے جذبات سے کھیلیں گے تو انہیں مہذب کردار کی تنگ حدود کے اندر رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہندو قوم اور مسلمان قوم کے درمیان اتحاد کے راستے میں بظاہر بہت معمولی سی رکاوٹ ہے۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ کانگرس کو ہندوستان پر اپنا غلبہ جمانے، اپنا راج نافذ کرنے اور ہندوستان کی تعمیر نو میں مسلم لیگ کو اپنا شریک نہ بنانے کا جنون ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی پوری کی پوری قوم علم بغاوت بلند کر دے تو کیا اس میں حکومت چلانا یا نظم وسلیقہ کے ساتھ زندگی بسر کرنا ممکن ہوگا۔'' اس کے دو دن بعد 9 ستمبر کو سہروردی نے نئی دہلی میں ایک انٹرویو کے دوران نہرو کی نشری تقریر پر تبصرہ

کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر وہ واقعی مسلم لیگ کے تعاون کا خواہاں ہے تو اسے ہندو راج کے تصور کو ترک کر کے عبوری حکومت کے اقتدار میں مسلم لیگ کو حصہ دار بنانا چاہیے۔ جب وہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس طرح مسلمانوں کی یک جہتی میں اور بھی اضافہ کرتا ہے۔'' پھر 11 ؍ستمبر کو سہروردی نے کلکتہ میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو اسی مسئلہ پر ایک انٹرویو دیا۔ اس نے کہا کہ ''مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر سیاسی سبقت حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ نہ کریں بلکہ مخلصانہ طور پر باہمی تعاون کی کوشش کریں۔'' سہروردی کی جانب سے پے در پے اس مضمون کے انٹرویو دینے کا مطلب یہ تھا کہ ستمبر 1946ء میں مسلم لیگ ہائی کمان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ مرکزی حکومت سے اس کی علیحدگی مسلمانانِ ہند کے مفاد میں نہیں ہے۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت 12 ؍ستمبر کو قائداعظم جناح نے وائسرائے ویول سے ملاقات کی دعوت قبول کر لی۔ ویول 26 ؍اگست کو کلکتہ سے واپس جانے کے بعد سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ مرکز میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت بن جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اس طرح وزارتی مشن کے منصوبے کے تحت ہندوستان کے اتحاد کو قائم رکھنا ممکن ہو جائے گا۔

16 ؍ستمبر کو جناح کی وائسرائے سے 75 منٹ تک ملاقات ہوئی جس کے دوران عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ حسین شہید سہروردی نے مدراس کے روزنامہ ''ہندو'' سے ایک انٹرویو میں ان مذاکرات کو امید افزا قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں بنگال کے مسئلہ کو اس طرح نہ نمٹاؤں جیسے کہ بقیہ ہندوستان کے مسئلہ کو نمٹایا جا رہا ہے یعنی میں اپنے آپ کو کل ہند سیاست اور کل ہند جدوجہد سے الگ کر لوں لیکن جب وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہیں تو وہ ایک طرح سے پاکستان کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ علاقوں کے اپنے تصفیہ طلب امور ہیں۔ میں بھی ایک آزاد عظیم تر بنگال کے حق میں ہوں جس میں بنگالی عوام کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ جب بنگالیوں کو اپنی تقدیر کو خود بنانے کے مسئلہ سے دوچار کیا گیا تو وہ آپس میں نہیں لڑیں گے بلکہ وہ اسے عظیم اور خوشحال بنانے کی عظیم سعی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔'' جب سہروردی سے پوچھا گیا کہ اسے اس مقصد کے لئے پہل کرنے میں کونسی چیز روک رہی ہے تو اس نے کہا کہ

''مشکل یہ ہے کہ صوبائی کانگرس اپنی الگ تقدیر کو تسلیم نہیں کرتی۔ کانگرس عملی طور پر تو علیحدگی پسند ہے لیکن یہ اسے اصولی طور پر تسلیم نہیں کرتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وزارتی مشن کے منصوبے کے تحت صوبوں کی حالت بری نہیں ہوگی۔ اگر مرکز کا تھوڑے امور پر کنٹرول ہوگا تو اس سے ہندوستان کی سیاسیات میں کوئی بڑی تبدیلی یا زلزلہ نہیں آجائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل ہمارے ہاں ایک طاقتور وحدانی مرکز اور صوبائی خودمختاری دونوں ہی موجود ہیں لیکن اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ایک صوبہ کہتا ہے کہ وہ بنگال کو چاول نہیں دے گا۔ دوسرا صوبہ کہتا ہے کہ وہ خوردنی تیل نہیں دے گا اور تیسرا صوبہ بنگال کو مکھن یا گھی دینے سے انکاری ہے۔ مرکزی حکومت صوبہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی اور ساری منصوبہ بندی کے لئے بھی صوبائی رضامندی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ معاہداتی انتظامات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر علیحدگی ہوجائے تو ایک دوسرے کے بارے میں اچھے جذبات پیدا ہوں گے اور موجودہ کشیدگی دور ہوجائے گی۔'' جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر بنگال اپنی اہم ضروریات کے لئے بقیہ ہندوستان پر اس قدر انحصار کرتا ہے تو وہ علیحدگی کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے تو سہروردی نے کہا کہ ''اس سوال کے دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ بنگال کا معاملہ کوئی جداگانہ نہیں ہے۔ بنگال اپنی ضروریات کے لئے نہ صرف بقیہ ہندوستان پر بلکہ دنیا کے بعض دوسرے علاقوں پر بھی انحصار کرتا ہے۔ دوئم یہ کہ مرکزی منصوبہ بندی اس طرح کی جاتی ہے کہ بنگال کبھی بھی خود کفالت کی پوزیشن میں نہ ہو...... میں یقیناً اس بات کا خیر مقدم کروں گا کہ یہاں ایک مخلوط وزارت قائم ہو اور متحدہ بنگال کے لئے کام کیا جائے لیکن مرکز اور دوسرے صوبوں میں اس قسم کے تصفیہ کے بغیر صرف بنگال میں مخلوط وزارت کا مطالبہ غیر منطقی ہوگا۔''[9]

اگرچہ سہروردی کے اس انٹرویو میں تضاد بیانی تھی تاہم اس میں یہ حقیقت صاف دکھائی دیتی تھی کہ وہ بھی ستمبر 1946ء میں خواجہ ناظم الدین کی طرح وزارتی مشن کے گروپنگ پلان کے حق میں تھا۔ حالانکہ یہ پلان اس قرارداد پاکستان کے منافی تھا جو اس نے 9/ اپریل 1946ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے پارلیمانی کنونشن میں پیش کی تھی۔ اب اس کے ذہن میں ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے چند صوبوں پر مشتمل پاکستان کی واحد ریاست کا تصور نہیں تھا۔ وہ بنگال کو ایک الگ یونٹ سمجھتا تھا اور ایک آزاد عظیم تر بنگال کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ

خواب صرف سہروردی ہی نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ خواجہ ناظم الدین اور مولوی ابوالہاشم کے علاوہ بنگال مسلم لیگ کا خزانچی ایم۔ اے۔ اصفہانی بھی اس کے اس خواب میں شریک تھا۔ اس کا ثبوت 23 ستمبر کو مارننگ نیوز میں ملا جس میں اصفہانی کیمیکلز لمیٹڈ کے قیام کا اشتہار دیا گیا تھا۔ اس کمپنی کا سرمایہ ایک کروڑ روپے تھا اور اس کے دس ڈائریکٹروں میں تین ہندوؤں۔ جی۔ ایم۔ برلا، رنگ لال بگاریا اور نلنی رنجن سرکار کے نام تھے۔ بقیہ سات مسلمان ڈائریکٹروں کے نام یہ تھے۔ (1) مرزا احمد اصفہانی، کلکتہ (2) آدم جی حاجی داؤد، کلکتہ (3) محمد امیر احمد خان، راجہ صاحب محمود آباد (4) ایم۔ ایچ۔ ہاشم پریم جی (5) مرزا ابوالحسن اصفہانی (6) میر لائق علی، دکن اور (7) ممتاز الدین ملک۔

کلکتہ، ڈھاکہ اور دیہی علاقوں میں چھرا گھونپنے کی وارداتیں اور ہندو۔ مسلم کشیدگی میں اضافہ

اگرچہ مذکورہ اشتہار ہندو اور مسلمان سرمایہ داروں کے باہمی طبقاتی تعاون و اشتراک عمل کا مظہر تھا لیکن ان دونوں فرقوں کے نچلے طبقوں کے لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ جذبات بدستور پائے جاتے تھے۔ چنانچہ جس دن مارننگ نیوز میں یہ اشتہار شائع ہوا اسی دن کلکتہ میں پھر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا جس میں کم از کم 50 افراد زخمی ہوئے۔ 25 ستمبر کو ڈھاکہ سے یہ خبر آئی کہ فرقہ وارانہ فساد اس شہر کے گردونواح کے دیہاتی علاقوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ کلکتہ میں اس دن چھرا گھونپنے کی کئی وارداتیں ہوئیں اور مارننگ نیوز کے رپورٹر کا الزام یہ تھا کہ فسادات ہندو مہا سبھا کروا رہی ہے جس نے اس مقصد کے لئے بہار اور یو۔ پی سے مسلح ہندو غنڈوں کو بلوایا ہے لیکن آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی مجلس عاملہ کی اسی دن کی قرارداد میں فسادات کی ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد کی گئی تھی اور یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اگر یہ جماعت اپنی غیر آئینی اور غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھنے پر مصر ہے تو اسے غیر قانونی تنظیم قرار دے کر اس سے ویسا ہی سلوک کیا جائے جیسا کہ غیر قانونی جماعتوں سے کیا جاتا ہے۔

27 ستمبر کو صوبائی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے قائد کرن شنکر رائے کی رائے یہ تھی کہ اگر صوبہ میں مسلم لیگی وزارت برسر اقتدار رہی تو فسادات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اسی شام صوبائی

حکومت کے ایک سرکاری پریس نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ آج شام سات بجے تک لال بازار کے علاقے میں 21 افراد کو چھرا گھونپا گیا جن میں سے 7 افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور باقی بری طرح زخمی پڑے ہیں اور کلکتہ مسلم لیگ کے دفتر کی اطلاع یہ تھی کہ ہندو علاقوں میں خنجر زنی سے 6 مسلمان ہلاک اور 8 زخمی ہوئے ہیں۔ 28 ستمبر کو لال بازار میں چار افراد ہلاک اور 7 زخمی ہوئے جبکہ ماتیابروز (Matiabruz) کی کیشو رام مل سے اسی دن تین ہزار مسلمان مزدوروں کو برطرفی کی اطلاع ملی۔ ان مزدوروں کا مبینہ قصور یہ تھا کہ یہ مسلمان تھے اور ہندو سرمایہ داروں اور صنعتکاروں نے مسلمان مزدوروں کو نکالنے کی ایک مہم شروع کر رکھی تھی۔

29 ستمبر کو حسین شہید سہروردی اور کرن شنکر رائے کی سربراہی میں ہندو اور مسلمان لیڈروں کا ایک امن مشن ڈھاکہ پہنچا تو مسلم لیگ ریلیف کمیٹی کے سیکرٹری عطا الرحمان خان کا الزام یہ تھا کہ ''اس شہر میں 20 جولائی کو فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اس وجہ سے ختم ہونے میں نہیں آتا کہ مقامی غیر مسلم پولیس کا رویہ جانبدارانہ اور مسلم دشمن ہے۔''

نہرو کی مرکزی حکومت کا پٹ سن کے نرخوں کو زمانۂ جنگ کے نرخوں پر منجمد رکھنے کا فیصلہ، بنگال کے مسلمان اور اچھوت کسانوں کی جانب سے انگریز ایکسپورٹروں اور ہندو آڑھتیوں کو پٹ سن فروخت کرنے سے انکار

بنگال کے دیہاتی علاقوں میں فساد پھیلانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نئی دہلی میں جواہر لال نہرو کی مرکزی حکومت نے کلکتہ میں حسین شہید سہروردی کی صوبائی حکومت سے مشورہ کئے بغیر ستمبر کے اواخر میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ 30 ستمبر کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کی معیاد ختم ہو جانے کے بعد بھی پٹ سن کے برآمدی نرخوں پر کنٹرول نافذ رہے گا۔ یہ فیصلہ مارواڑی اور انگریز برآمدی تاجروں کے مفاد میں کیا گیا تھا اور اس کی زد براہ راست مسلمان غریب کسانوں پر پڑی تھی۔ صوبائی حکومت نے مرکز کی عبوری حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور 25 ستمبر کو وزیر اعلیٰ سہروردی کا اسمبلی میں اعلان یہ تھا کہ اس کی حکومت مرکزی حکومت سے کوئی کانفرنس نہیں کرے گی اور 7 اکتوبر کو بنگال پراونشل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن ایم۔ آر۔ عمرانی کا مسلم کاشتکاروں کو مشورہ یہ تھا کہ وہ مارواڑی آڑھتیوں کے پاس اپنی فصل فروخت کرنے سے انکار کر دیں کیونکہ

مرکز میں اینگلو۔ ہندوراج نے مسلم انڈیا کے خلاف جنگ کی ابتدا کر دی ہے۔اس نے حکومت بنگال کومشورہ دیا کہ کلکتہ میں رائل سٹاک ایکسچینج کو بند کر دیا جائے کیونکہ یہ ادارہ ایسے سماج دشمن اور بنگال دشمن مارواڑی جواریوں اور سٹہ بازوں کا اڈہ ہے جو ہماری سنہری ریشے کی فصل کے کاروبار میں سٹہ بازی کر کے بنگال کو ٹھگ لیتے ہیں اور اس کا مسلم چیمبر آف کامرس کومشورہ یہ تھا کہ وہ پٹ سن کی خریداری کے لئے بنگال جیوٹ سنڈیکیٹ قائم کرے۔''

وزیراعلیٰ حسین شہید سہروردی نے 12 /اکتوبر کو نئی دہلی میں بنگالی کسانوں کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی حکومت کے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ پٹ سن کی قیمتوں کے بارے میں حکومت ہند کے اس فیصلے کے خلاف جدوجہد کرے گی۔سہروردی ان دنوں مرکز کی عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کی تجویز کے بارے میں لیگ ہائی کمان کے مشوروں میں شریک ہونے کے لئے نئی دہلی پہنچا ہوا تھا اور جب اس نے یہ انٹرویو دیا تھا اس وقت مسلم لیگ اپنے 29 /جولائی کے موقف سے انحراف کر کے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔تاہم سہروردی نے کہا کہ اگر مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہوگئی اور اس کے بعد بھی پٹ سن کے بارے میں اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا تو اس کی صوبائی حکومت کاشتکاروں کے مفاد کی خاطر اس کی مزاحمت کرتی رہے گی۔اس نے کہا کہ کاشتکاروں کو ہرگز نہیں کچلنا چاہیے اور انہیں ان کی محنت کے پھل سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے میں انہیں یہ مشورہ دینے میں کوئی تامل نہیں کروں گا کہ جب تک حکومت ہند اس پالیسی پر نظر ثانی نہ کرے اس وقت تک وہ کسی کے پاس اپنی پٹ سن فروخت نہ کریں۔ اس نے کہا کہ 7 /اکتوبر کو حکومت ہند نے پٹ سن اور اس کی مصنوعات کی برآمد پر کنٹرول کے بارے میں جو آرڈیننس جاری کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں پٹ سن کے جو نرخ مقرر کئے گئے ہیں انہیں اسی سطح پر برقرار رکھ کر کاشتکاروں کو جن کی اکثریت مسلمانوں اور اچھوتوں پر مشتمل ہے، ان کی محنت کے پھل سے محروم کیا جائے۔حکومت ہند کی اس پالیسی سے چور بازاری، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

سہروردی اور بنگال کے دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کا پٹ سن کی قیمتوں کے بارے میں یہ موقف بالکل صحیح تھا۔نہرو کی حکومت نے یہ آرڈیننس واقعی مارواڑیوں اور انگریز برآمدی تاجروں کے مفاد میں نافذ کیا تھا اور اس سے مشرقی بنگال کے غریب مسلمان اور اچھوت کسانوں پر کاری

ضرب لگی تھی۔ جنگ کے دوران بے پناہ افراط زر کے باعث ساری ضروریات زندگی میں بہت ہی اضافہ ہو گیا تھا لیکن کاشتکار کی فصل کی قیمت ایک ہی سطح پر رہی تھی۔ جنگ کے بعد پٹ سن کی قیمتوں کو اسی سطح پر رکھنے کی پالیسی ظالمانہ تھی اور اس بنا پر مسلمان غریب کسانوں اور ہندو آڑھتیوں کے درمیان تضاد کی تلخی میں ناگزیر طور پر اضافہ ہوا۔ ڈھاکہ کے گردونواح کے دیہات میں فرقہ وارانہ فساد پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نارائن گنج میں مارواڑی اور انگریز فرموں کے بہت سے گودام تھے جہاں کاشتکاروں کو ان کی فصل کی مناسب قیمت نہیں ملتی تھی اور بدقسمتی سے اس طبقاتی مسئلہ نے طویل تاریخی پس منظر کے باعث ہندو۔ مسلم مسئلہ کی صورت اختیار کر لی تھی اور کلکتہ کے قتل عظیم نے اس مسئلہ کی آگ پر بہت سارا تیل ڈال دیا تھا۔

نواکھلی اور تپرہ کے ہندو۔ مسلم فسادات۔ ہندو پریس نے ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں کے جانی و مالی نقصان کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا

جب 13 / اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے دو گھنٹے کی بحث کے بعد عبوری حکومت میں شامل ہونے کے فیصلے کا اعلان کیا تو اس کے ساتھ ہی اخبارات کے دفاتر میں یہ خبر پہنچی کہ مشرقی بنگال کے ضلع نواکھلی میں 9 / اکتوبر 1946ء کو جو فسادات شروع ہوئے تھے ان میں بہت شدت پیدا ہو گئی ہے۔ فینی سب ڈویژن کے تقریباً 200 مربع میل کے علاقے میں لاقانونیت کا دور دورہ ہے اور مقامی حکام نے اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے فوج طلب کر لی ہے مگر فوج بھی فوری طور پر امن وامان بحال نہ کر سکی کیونکہ ذرائع آمدورفت کی عدم موجودگی کے باعث وہ فسادزدہ دیہاتی علاقوں میں بروقت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ فسادیوں نے سرکاری مشینری کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے مزید دس بارہ دن تک نہ صرف ضلع نواکھلی میں بلکہ ضلع تپرہ کے دیہاتی علاقوں میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس فساد میں ہندو آڑھتیوں اور ساہوکاروں کا بہت مالی اور جانی نقصان ہوا۔ سینکڑوں بے گناہ افراد ہلاک وزخمی ہوئے۔ لاکھوں روپے کا مال واسباب لوٹ لیا گیا اور بہت سے ہندو خاندانوں نے ملاؤں کے ہاتھوں اسلام قبول کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ کانگرس، ہندو مہا سبھا اور پورے برصغیر کے ہندو اخبارات نے نواکھلی اور تپرہ کے ان واقعات پر بہت واویلا کیا۔ بنگال

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 19 را کتوبر کو اس واویلا کا نوٹس لیا جبکہ اس نے ایک قرارداد میں نواکھلی اور تپرہ میں تشدد اور لاقانونیت کے واقعات کی مذمت کرنے کے ساتھ ہندو ذرائع ابلاغ کی مبالغہ آمیزی و اشتعال انگیزی کی بھی مذمت کی۔

20 را کتوبر کو وزیر اعلیٰ سہروردی گورنر کے ہمراہ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے انٹرویو کے دوران یہ تسلیم کیا کہ ''نواکھلی اور تپرہ میں واقعی لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔'' مارننگ نیوز کی اطلاع یہ تھی کہ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے اس دورہ کے موقع پر فینی میں جس مسلم وفد نے ان سے ملاقات کی اس کے قائد حبیب اللہ بہار نے انہیں بتایا کہ فینی کے علاقے میں محض معاشی وجہ سے گڑبڑ ہوئی ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کو جنگ کے زمانے میں یہاں سے زبردستی بیدخل کر دیا گیا تھا اس طرح جو نقصان ہوا تھا اس کا معاوضہ آج تک نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان افلاس زدہ لوگوں نے مجبوراً لوٹ مار شروع کر رکھی ہے۔ مارننگ نیوز کی مزید رپورٹ یہ تھی کہ ''10 را کتوبر کو لکشمی پور اور رائے پور میں بدامنی کے دوران تقریباً ایک سو افراد ہلاک ہوئے جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ زیادہ تر اموات ہندو مہاجنوں اور زمینداروں کی فائرنگ سے ہوئیں جبکہ ایک ہجوم نے مقامی غنڈوں کی سربراہی میں ان کے گھروں کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔''

24 را کتوبر کو مارننگ نیوز نے ضلع نواکھلی کے فسادات کی ساری ذمہ داری ایک مقامی زمیندار رائے صاحب راجندر لال رائے پر عائد کی۔ اس الزام کا خلاصہ یہ تھا کہ راجندر لال رائے نے کالی ماتا کی پوجا کے تہوار کے موقع پر ایک بڑی مورتی بنوا کر ایک مسجد کے سامنے نصب کر دی تھی۔ جب اس کے مسلمان مزارعین نے اس حرکت پر اعتراض کیا تو رائے کے ہندو ملازمین نے حملہ کر کے ایک مسلمان مزارع کو ہلاک اور ایک کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد یہ ملازمین زخمی مزارع کو گھسیٹ کر مورتی کے پاس لے گئے اور انہوں نے خنجر سے اس کا گلا کاٹ کر اس کا خون مورتی کے چرنوں پر چھڑک دیا۔ اس پر مسلمان مزارعین بے قابو ہو گئے اور انہوں نے زمیندار کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ زمیندار نے اپنے بچاؤ کے لئے فائرنگ کی تو مزید مسلمان مزارعین مارے گئے لیکن آخر کار مسلمانوں کے ہجوم نے اس پر غلبہ حاصل کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح اس فساد کی ابتدا ہوئی جو تین چار دن میں ضلع نواکھلی کے دیہاتی علاقوں میں پھیل گیا۔''

مارننگ نیوز اور دوسرے مسلم لیگی اخبارات کی اس قسم کی رپورٹوں کے برعکس ہندو اخبارات کی خبریں یہ تھیں کہ صوبائی مسلم لیگ نے ایک منصوبہ کے تحت نواکھلی اور تپرہ میں ہندوؤں کا قتل عام کروایا ہے۔ان فسادات میں بے شمار ہندوؤں کو تہہ تیغ کیا گیا ہے۔لاتعداد ہندو عورتوں کی آبروریزی کی گئی ہے اور بہت سے ہندو خاندانوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ بظاہر ان دونوں قسم کی خبروں میں بہت غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 25 راکتوبر کو کلکتہ میں پھر فسادات شروع ہو گئے جن میں 11 افراد ہلاک ہوئے۔اسی دن نئی دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے پانچ مسلم لیگی ارکان نے حلف وفاداری اٹھایا تھا۔ 26 راکتوبر کو کلکتہ کی صورت حال مزید بگڑ گئی اور چھرا گھونپنے کی وارداتوں میں 20 افراد ہلاک اور 73 زخمی ہوئے۔

27 راکتوبر کو ایسٹرن کمانڈ کے آرمی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل بچر (Butcher) کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ”نواکھلی کی صورت حال کے بارے میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں ان میں بے انتہا مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔اس ضلع کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف عام شورش نہیں کی ہے۔اب وہاں صورت حال کنٹرول میں ہے اور شرنارتھیوں کو ان کے گھروں میں بھجوانے کے لئے مناسب انتظامات کئے جا رہے ہیں۔“[10] چند دن قبل صوبائی گورنر سر فریڈرک بروز بھی فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد اس قسم کا بیان دے چکا تھا۔اس کا کہنا یہ تھا کہ ”یہ شورش بدامن غنڈوں کے ایک گروہ نے موجودہ فرقہ وارانہ جذبات سے فائدہ اٹھا کر شروع کی ہے اور ہر علاقہ میں بعض آوارہ مسلمان فسادی بھی عارضی طور پر ان سے مل گئے ہیں۔“ لیکن انڈین نیشنل کانگرس کا نیا صدر جے۔ پی۔ کرپلانی صوبائی گورنر اور آرمی کمانڈر کے ان بیانات سے مطمئن نہیں تھا۔وہ اس موقف پر مصر تھا کہ نواکھلی اور تپرہ میں ہندوؤں کا منظم طریقے سے قتل عام کیا گیا ہے۔ بنگال کے کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس کا 31 رمارچ کو کلکتہ کے ممتاز ہندو شہریوں کے اجتماع میں الزام یہ تھا کہ ”سہروردی کی حکومت نواکھلی اور تپرہ میں قتل و غارت، لوٹ مار، آتش زنی، اغوا اور بالجبر تبدیلی مذہب کی وارداتیں روکنے میں اس لئے ناکام رہی ہے کہ یہ مسلمان فرقہ کی جانبداری کرتی ہے۔“ یکم نومبر کو گاندھی نواکھلی جانے کے پروگرام کے تحت کلکتہ پہنچا تو وزیراعلیٰ سہروردی نے اس سے دو تین مرتبہ ملاقات کی۔

2رنومبر کو وائسرائے ویول اپنی ایگزیکٹو کونسل کے چار ارکان جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، نوابزادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کے ہمراہ کلکتہ پہنچا۔ 3رنومبر کو ان چاروں لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان میں کلکتہ کے فسادات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہلاک شدگان کے لواحقین سے اظہار ہمدردی کیا۔

بہار میں وسیع پیمانے پر مسلم کش فسادات

ان لیڈروں نے اپنے اس بیان میں صوبہ بہار کا کوئی ذکر نہ کیا جہاں گزشتہ 24راکتوبر سے مسلم اقلیت کا وسیع پیمانے پر قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ البتہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں شرکت کی جس میں صوبہ بہار سے آمدہ خبروں پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت بہار سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلم اقلیت کے تحفظ کے لئے فوری طور پر مؤثر اقدام کرے۔ مجلس عاملہ نے ایک اور قرارداد میں فیصلہ کیا کہ مولوی فضل الحق، فضل الرحمان، اے۔ ایم۔ مالک اور ابوالہاشم پر مشتمل ایک وفد صوبہ بہار بھیجا جائے گا جو وہاں کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ تاہم نہرو اور پٹیل کے علاوہ گاندھی نے بھی بہار کے ہولناک واقعات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور وہ اسی شام سپیشل ٹرین کے ذریعے مشرقی بنگال کے دورے پر روانہ ہو گیا حالانکہ اس وقت تک نواکھلی اور تپیرہ میں امن وامان بحال ہو چکا تھا۔

9رنومبر کو بنگال مسلم لیگ کا وفد بہار کا دورہ کر کے واپس آیا تو ابوالہاشم نے بتایا کہ اس صوبہ کے چھ اضلاع...... پٹنہ، گیا، مظفر پور، بھاگل پور، چھپرا اور مونگھیر کے تقریباً چار ہزار مربع میل کے علاقے میں مکمل لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ اس علاقے میں کتنے لوگ ہلاک وزخمی ہوئے ہیں اس کے بارے میں کچھ بتانا انتہائی مشکل ہے کیونکہ وہاں ہر جگہ بدامنی اور افراتفری کا عالم ہے۔ اس نے الزام لگایا کہ بہاری مسلمانوں کا قتل عام بڑے منظم طریقے سے ہوا ہے۔ ہزاروں مسلح افراد پر مشتمل ہندوؤں کے جتھے رات کی تاریکی میں مسلمانوں پر حملے کر کے انہیں تہ تیغ کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ 24راکتوبر کو شروع ہوا تھا لیکن حکومت بہار نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہتے مسلمانوں کی نسل کشی بلاروک ٹوک جاری رہی۔

جن دنوں بنگال مسلم لیگ کا یہ وفد بہار میں تھا انہی دنوں وائسرائے ویول اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے چاروں ارکان بھی کلکتہ سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان سب نے بہار میں جو کچھ دیکھا اس کی مذمت کی اور نہرو نے تو یہاں تک کہا کہ اگر اس صوبہ میں امن بحال کرنے کے لئے ضرورت محسوس ہوئی تو بمباری بھی کی جائے گی۔ وائسرائے ویول کا تاثر یہ تھا کہ پورا برصغیر فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہے جس میں ہندوستانی فوج کے پرخچے اڑ جائیں گے اور یہ بات برطانوی سامراج کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ لہٰذا وزارتی مشن کے منصوبے کی بنیاد پر دستور بنانے کے لئے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت ضروری ہے۔

کانگرس نے مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی سے باہر رکھ کر آئین سازی کا کام شروع کر دیا تو ہندوستان کے متحد رہنے کی آخری امیدیں بھی ختم ہو گئیں

ویول کو یہ احساس دراصل 25/26 اگست کو کلکتہ کے 24 گھنٹے کے دورے کے بعد ہی ہو گیا تھا اور اس بنا پر اس نے گزشتہ دو تین ماہ میں گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں پر بہت زور دیا تھا کہ وہ وزارتی مشن کے منصوبے کی من مانی تعبیر نہ کریں بلکہ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس کی تعبیر کو منظور کر کے مسلم لیگ کے تعاون کے ساتھ دستور سازی کا کام کریں مگر کانگرسی لیڈروں نے ویول کا یہ مشورہ قبول نہ کیا اور ایک دن جب ان کی ویول کے ساتھ اس مسئلہ پر تلخ کلامی ہوئی تو انہوں نے حکومت برطانیہ کے نام خفیہ خطوط میں یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ ویول کو برطرف کر کے اس کی جگہ کسی ''موزوں شخص'' کو وائسرائے مقرر کیا جائے۔ انہوں نے ویول پر بھی اپنے اس دباؤ میں اضافہ کر دیا کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس جلدی طلب کیا جائے اور اگر مسلم لیگ اس میں شریک نہ ہو تو اس کے ارکان کو ایگزیکٹو کونسل سے نکال دیا جائے۔

کلکتہ اور پٹنہ کے دورہ سے واپسی پر کانگرسی لیڈروں نے اپنے اس مطالبہ پر مزید اصرار کیا تو ویول نے 20 رنومبر کو یہ اعلان کر دیا کہ وزارتی مشن کے منصوبے کے تحت دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 9 ردسمبر کو ہوگا۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح نے ویول کے اس فیصلے پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ بہت ہی سنگین غلطی ہے۔ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی کے اس مجوزہ اجلاس میں شریک نہیں ہوگی۔''

جناح کے اس ردعمل کے پیش نظر برطانیہ نے 2/دسمبر کو وائسرائے ویول کے علاوہ نہرو، جناح، لیاقت اور بلدیو سنگھ کو لندن طلب کر کے ان سے اس متنازعہ مسئلہ پر بحث کی کہ وزارتی مشن کے منصوبے کے بعد صوبوں کی گروپنگ لازمی ہے یا نہیں؟ دو تین دن کی اس بحث کے بعد 6/دسمبر کو حکومت برطانیہ نے ایک بیان میں مسلم لیگ کے موقف کو صحیح تسلیم کیا مگر نہرو اپنی تعبیر پر مصر رہا۔ وہ کہتا رہا کہ کسی صوبہ کو کسی گروپنگ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ دستور ساز اسمبلی مکمل آزادی و خود مختاری کے ساتھ دستور سازی کا کام کرے گی۔

لندن کانفرنس کی ناکامی کے بعد بنگال اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور بھی بڑھ گئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ یہ آتش فشاں جب بھی پھٹے گا تو سارا برصغیر بھسم ہو جائے گا۔ پھر جب 6/جنوری 1947ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی ایک قرارداد میں کانگرس کی مجلس عاملہ کی 22/دسمبر 1946ء کی قرارداد کی توثیق کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ ''کسی بھی صوبہ کو کسی گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے کسی بھی قسم کا آئین بنا سکے گی اور اگر کسی صوبہ یا صوبہ کے کسی حصہ کو کسی گروپ میں شامل ہونے پر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی تو اس صوبہ اور اس صوبہ کے کسی حصہ کے عوام کو اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے مناسب کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا'' تو بنگال کے باشعور سیاسی حلقوں کو پورا یقین ہو گیا کہ برصغیر کے اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے وزارتی مشن کے گروپنگ منصوبہ کو جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکتا۔ اب ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے اور ایسی صورت میں کانگرس پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی اصرار کرے گی۔

باب: 13

لیگ اور بوس کی جانب سے متحدہ بنگال کو علیحدہ آزاد ملک بنانے کی کوشش اور قیام پاکستان

مسلم لیگ کی طرف سے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی مخالفت، متحدہ بنگال کو علیحدہ آزاد ملک بنانے کی سکیم، سرت چندر بوس کے ساتھ بات چیت

جب 20رجنوری 1937ء کو انڈین نیشنل کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کیا کہ دستور ساز اسمبلی مسلم لیگ کے نمائندوں کی عدم موجودگی میں آئین سازی کا کام جاری رکھے گی تو بنگالی قوم پرستوں کا یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ کانگرس نہ صرف ہندوستان بلکہ بنگال کی تقسیم کے لئے تیار ہو چکی ہے۔ چنانچہ بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے اسی یقین کے تحت جنوری 1947ء کے تیسرے ہفتے میں کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس کے ساتھ ملاقاتیں کر کے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بالعموم اور بنگال کے مستقبل کے بارے میں بالخصوص تبادلہ خیالات کیا۔ اگرچہ یہ ملاقاتیں بڑے خفیہ طریقے سے ہوئی تھیں لیکن جب ایک مقامی کمیونسٹ اخبار نے ان کا انکشاف کر دیا تو کلکتہ میں عام طور پر یہ تاثر پیدا ہوا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے بعض بنگالی عناصر اپنے صوبہ کو کسی نہ کسی صورت متحد رکھنے کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ پھر جب حکومت برطانیہ کی جانب سے 20رجنوری 1947ء کو یہ اعلان ہوا کہ برطانیہ جون 1948ء تک بہر صورت ہندوستان سے دستبردار ہو جائے گا اور اس دستبرداری کا انتظام کرنے کے لئے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا ہے اور پھر جب 3رمارچ 1947ء کو پنجاب کی خضر وزارت کے مستعفی ہونے کے چار پانچ دن بعد 8رمارچ کو انڈین نیشنل کانگرس کی مجلس عاملہ نے

ایک قرارداد میں مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں پنجاب کو بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے تو بنگال میں صوبہ کی ممکنہ تقسیم کے تصور سے سنسنی پھیل گئی۔ قبل ازیں سردار پٹیل نے 4 / مارچ 1947ء کو اپنے ایک دوست کانجی دوارکا داس کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پنجاب اور بنگال کو تقسیم کروانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ وہ پورا پنجاب اور پورا بنگال نہیں لے سکتے۔

سردار پٹیل کے اس خط اور پھر کانگرس کی مجلس عاملہ کی قرارداد کے پیش نظر بنگال میں اب کسی کو بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوا اور بنگال کے مسلم لیگی لیڈر جناح سے باغی نہ ہوئے تو کانگرس پنجاب کی طرح بنگال کو بھی مذہبی بنیاد پر تقسیم کروائے گی۔ غالباً اس صورت حال کے پیش نظر 9 / مارچ کو نئی دہلی میں لیگ ہائی کمان کے ایک ترجمان نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی بنیاد پر کانگرس سے کوئی تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب حکومت برطانیہ یہاں سے دستبردار ہو تو وہ موجودہ انتظامی یونٹوں کو اقتدار منتقل کرے۔ مسلم لیگ کوئی اور پوزیشن قبول نہیں کرے گی۔'' ترجمان نے کہا کہ ''بہت مدت ہوئی راج گوپال اچاریہ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی بنیاد پر برصغیر کے سیاسی تنازعہ کا حل پیش کیا تھا۔ اگر مسلم لیگ کی سیاسی تمنائیں اس فارمولے سے پوری ہوسکتیں تو وہ اسے اسی وقت قبول کر لیتی۔ مسلم لیگ ہندوستان کی تقسیم چاہتی ہے صوبوں کی تقسیم نہیں چاہتی۔''[1]

16 / مارچ 1947ء کو بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے ضلع تپرہ کے قصبہ کاشم پور (Kashimpur) میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے بنگال کو تقسیم کرنے کی دھمکیوں پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ''بنگال بنگالیوں کا ہے اور اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس صوبہ کی انتظامیہ میں انہیں حصہ لینے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں کے سارے عوامی حلقے بنگال کو ایک شاندار سرزمین بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔'' 18 / مارچ کو صوبائی حکومت کے وزیر خزانہ محمد علی بوگرا نے اسمبلی میں سالانہ بجٹ پر بحث کے دوران کہا کہ وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی صوبہ میں کل جماعتی حکومت کی تشکیل کے حق میں ہے۔ اس ایوان کے سارے ارکان کو اس تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ وزیر خزانہ نے بنگال کی تقسیم کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''جو لوگ بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں ان کا رویہ دوغلا ہے۔ وہ ایک طرف تو متحدہ

ہندوستان کے متمنی ہیں اور دوسری طرف بنگال کی تقسیم کے خواہاں ہیں۔ اس نے یاد دلایا کہ 1905ء میں جب بنگال کو تقسیم کیا گیا تھا تو ایسے ہی عناصر نے اس کے خلاف اتنی ایجی ٹیشن کی تھی کہ حکومت برطانیہ کو چھ سال بعد اس تقسیم کو منسوخ کرنا پڑا تھا۔ لیکن اب یہ قلابازی کھا کر صوبہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔''

19 رمارچ 1947ء کو کلکتہ کے 81 بیرسٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں بنگال کی تقسیم کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ مجوزہ تقسیم غیر قدرتی اور غیر ضروری سیاسی چال ہو گی جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔ اس بیان پر دستخط کنندگان میں بی۔ سی۔ گھوش، جے۔ سی۔ گپتا، ایس۔ این۔ رائے چودھری، ای۔ آر۔ میئر Meyer، جیوتی باسو، احمد علی، ایم۔ اے۔ لطیف، امبا ناتھ بوس، اے۔ کے۔ باسو اور اے۔ این۔ سین کے نام شامل تھے۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا تھا کہ جو لوگ اب بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ دراصل بالواسطہ طور پر اس تھیوری کو تسلیم کر رہے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی جسمانی ساخت ہی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور وہ مختلف قومی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ تھیوری ہماری تاریخ کے حقائق اور ہماری زندگی کی ضروریات کے منافی ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے بنگال کے مستقبل کے بارے میں راتوں رات اپنا موقف محض اس بنا پر تبدیل کر لیا ہے کہ وزیراعظم ایٹلی (Attlee) کے 20 رفروری کے اعلان میں بعض پیراگراف میں ابہام پایا جاتا ہے۔ ان پیراگراف میں اشارۃً یہ کہا گیا تھا کہ اقتدار صوبائی یونٹوں کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس برصغیر میں پہلی قومی تحریک بنگال کی تقسیم کے سوال پر شروع کی گئی تھی۔ اب جبکہ ہم اپنی آزادی کی تحریک کے آخری مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں تو سارے بنگالیوں کو فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر یہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ سودیشی تحریک کے ورثہ سے غداری نہیں کریں گے۔''[2] 23 رمارچ کو یوم پاکستان منایا گیا تو اس موقع پر وزیراعلیٰ سہروردی نے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے یقین ظاہر کیا کہ ''بنگال ہر مرکزی حکومت کے شکنجے سے آزاد ہوگا۔ پاکستان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاقے الگ الگ ہوں گے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خود کفیل اور ہم آہنگ ریاستوں کی تشکیل ہوگی۔''[3]

لیکن محمد علی بوگرا، حسین شہید سہروردی اور 81 بیرسٹروں کی اس قسم کی محبت و پیار اور

بھائی چارے کی باتوں کے باوجود بااثر ہندوعناصر کی جانب سے بنگال کی تقسیم کا مطالبہ زور پکڑتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ قتل وغارت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ 23/ مارچ کو کلکتہ کے مسلمانوں نے بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ہدایت کے مطابق دفعہ 144 کی خلاف ورزی نہیں کی تھی اور یوم پاکستان کا جلسہ ایک چھوٹے سے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ تاہم اسی دن شہر میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ پولیس نے کئی جگہ گولی چلائی جس سے 3 افراد ہلاک اور 60 زخمی ہو گئے اور پھر چھرا گھونپنے اور آتش زنی کی وارداتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وزیر اعلیٰ سہروردی کی اپیلوں کے باوجود ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ 27/ مارچ کو شہر میں 6 افراد ہلاک اور 6 زخمی ہو گئے۔ 28/ مارچ کو شہر کی صورت حال اتنی خراب ہو گئی کہ مانک تلہ اور بلیا گھاٹ کے علاقوں میں فوج طلب کرنا پڑی۔ جب اس کاروائی کے باوجود قتل وغارت، آتشزنی اور لوٹ مار کی وارداتیں جاری رہیں تو وزیر اعلیٰ سہروردی نے 31/ مارچ کو ہر فرقہ کی 13 بااثر سیاسی شخصیتوں پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل قائم کی جس میں امر کرشنا گھوش، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، خواجہ نورالدین اور ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک کے علاوہ دو تین انگریز ارکان اسمبلی بھی شامل تھے لیکن وزیر اعلیٰ کی یہ کاروائی بھی بے سود تھی کیونکہ ایک طرف تو ہندو مہا سبھا اور کانگرس کے بہت سے ہندو لیڈر بنگال کو بہر قیمت تقسیم کروانے کا تہیہ کر چکے تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں محض ہوس اقتدار کی بنا پر پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ چودھری خلیق الزماں کے مطابق نورالامین، حمیدالحق چودھری اور فضل الرحمان نے سہروردی کے خلاف محاذ بنایا ہوا تھا اور انہوں نے اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لئے تقریباً 70 مسلم ارکان اسمبلی کی حمایت بھی حاصل کر لی تھی۔

قائداعظم جناح کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے چودھری خلیق الزماں کو اس غرض سے کلکتہ بھیجا کہ وہ برصغیر کی تاریخ کے اس نازک ترین موقع پر صوبائی اسمبلی کے مسلم ارکان میں دھڑے بندی کا خاتمہ کرائے۔ چنانچہ وہ قائداعظم کی ہدایت کے مطابق اپریل کے اوائل میں کلکتہ پہنچا اور اس نے نورالامین کے گروپ کو سمجھایا کہ وہ ایسے موقع پر جبکہ ہندوستان میں بہت جلد عظیم تبدیلیاں رونما ہونے کا امکان ہے، سہروردی کے خلاف کوئی تحریک نہ کریں۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت انہیں اس قسم کی کاروائی کی اجازت نہیں دے گی۔ خلیق الزماں

لکھتا ہے کہ ''میں نے کلکتہ جانے سے پہلے یہ افواہ سنی تھی کہ سہروردی متحدہ بنگال کے لئے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی سے گفت وشنید کر رہا ہے۔ جب کلکتہ پہنچا تو اس افواہ کی تصدیق ہوگئی لیکن میں نے اس سلسلے میں شہید سہروردی سے کوئی بات نہ کی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سکیم لازمی طور پر ناکام ہو جائے گی...... مسٹر جناح کو بھی اس تحریک کا علم تھا لیکن انہوں نے مجھے اس سلسلے میں سہروردی سے کوئی بات کرنے کی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ ہی انہوں نے سہروردی سے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر شیاما پرشاد سے اس قسم کی کوئی بات کرے۔''[4] چودھری خلیق الزماں کی یہ اطلاع سو فیصدی صحیح نہیں تھی۔ اس وقت تک سہروردی نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی سے اس سلسلے میں کوئی گفت وشنید شروع نہیں کی تھی۔ البتہ صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے عظیم تر بنگال کے قیام کے لئے جنوری کے تیسرے ہفتے میں سرت چندر بوس سے ملاقاتیں کی تھیں۔ صوبائی کانگرس کا ایک طاقتور گروپ ابوالہاشم کی اس تجویز کے حق میں تھا۔ سہروردی بھی اس کے خلاف نہیں تھا۔ انگریزوں کے کاروباری عناصر کو بھی اس تجویز سے اتفاق تھا اور کمیونسٹ پارٹی بھی اس کی پرزور حمایت کرتی تھی۔

کمیونسٹ اخبارات کی اطلاع کے مطابق ابوالہاشم کی سکیم یہ تھی کہ مشرقی ہندوستان میں بنگالی بولنے والے سارے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔ یہ ریاست صوبہ بہار میں پورنیا ڈویژن سے لے کر صوبہ آسام تک کے علاقے پر محیط ہوگی۔ اس ریاست کا درمیانی علاقہ مرکزی بنگال سے موسوم ہوگا اور اس میں چٹا گانگ ڈویژن، ڈھاکہ ڈویژن، پریذیڈنسی ڈویژن، راجشاہی ڈویژن اور سلہٹ ڈویژن کے سارے مسلم اکثریتی اضلاع شامل ہوں گے۔ صوبہ آسام کے بقیہ علاقہ کو ایسٹرن زون کہا جائے گا اور بردوان ڈویژن اور پورنیا کے اضلاع کو مغربی ریجن کہا جائے گا۔ اسمبلی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی نمائندگی مساوی ہوگی۔ وزیر اعظم ہمیشہ مسلمان ہوگا البتہ سربراہ ریاست کا عہدہ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو باری باری ملے گا۔ اس ریاست کا تجربہ دس سال تک ہوگا اور اگر یہ کامیاب نہ ہوا تو عظیم تر بنگال کے تینوں علاقوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ الگ ہو کر ریاست یا ریاستوں کی صورت اختیار کر لیں یا پاکستان اور ہندوستان میں سے کسی ایک ریاست سے منسلک ہو جائیں۔[5]

ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے ساتھ سہروردی یا کسی اور مسلم لیگی لیڈر نے بنگال کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی بھی کوئی بات چیت نہیں کی تھی کیونکہ بنگال کے جن ہندو عناصر نے

وزارتی مشن کے منصوبہ کی ناکامی کے بعد مذہبی بنیادوں پر بنگال کی تقسیم کا مطالبہ شروع کیا تھا ان کی عنان قیادت ڈاکٹر مکرجی کے ہی ہاتھ میں تھی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی بنگال کی ہندومہا سبھا کا ممتاز ترین لیڈر تھا اور اس کا شمار برصغیر کے متعصب ترین ہندوؤں میں ہوتا تھا۔ وہ کھلم کھلا ہندو راج کا علمبردار تھا اور اس بنا پر وہ بنگال میں مسلمانوں کی بالا دستی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کی 4/اپریل کی قرارداد بھی یہ تھی کہ ''اگر ہز مجسٹیز گورنمنٹ، بنگال کی موجودہ حکومت کو اقتدار منتقل کرتی ہے جو بنگال کو ایک خودمختار ریاست بنانے کا عزم رکھتی ہے تو بنگال کے جو علاقے یونین آف انڈیا کے ساتھ منسلک رہنا چاہتے ہیں، انہیں ہندوستان کے اندر ایک الگ صوبہ بنانے کی اجازت دی جائے۔''[6]

ہندومہا سبھا کی جانب سے بنگال کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لئے بھرپور تحریک

چودھری خلیق الزماں 5/اپریل کو کلکتہ سے واپس لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا تھا اور اسی دن مغربی بنگال کے قصبہ تاراکیشور میں بنگال پراونشل ہندو کانفرنس ختم ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بنگالی ہندوؤں کے لئے ایک الگ وطن کے قیام کے لئے بھی مجلس عمل کی تشکیل کرے۔ کانفرنس میں یہ ایک فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس مقصد کے لئے 30/جون تک ایک لاکھ رضا کاروں کی ایک تنظیم قائم کرنے کے علاوہ یونین اور ضلع کی سطح پر کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ کانفرنس نے اس سلسلے میں جو مزید قراردادیں منظور کی تھیں وہ بڑی اشتعال انگیز تھیں ان میں سے ایک قرارداد یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں رہنے والے ہر ہندو کو مغربی بنگال کے نئے صوبے کا شہری تصور کیا جائے گا۔ اگر مشرقی بنگال کے ہندوؤں کے خلاف کوئی جابرانہ کاروائی ہوئی تو اسے نئے صوبہ مغربی بنگال اور انڈین یونین کے خلاف معاندانہ کاروائی تصور کیا جائے گا اور اس کے سدباب کے لئے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔ ایک اور قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ بنگال کی مسلم لیگی وزارت ہندوؤں کے اعتماد سے کلی طور پر محروم ہو چکی ہے لہٰذا اسے بلا تاخیر برطرف کر دیا جائے۔ اگر یہ وزارت کچھ دیر اور قائم رہی تو اس کے نتائج نہایت تباہ کن ہوں گے۔ پورے صوبہ میں افراتفری اور لاقانونیت پھیل جائے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقلیت

کے جان و مال کے تحفظ کی خاطر صوبہ میں دو وزارتیں قائم کی جائیں۔ ایک مسلم اکثریتی علاقے کے لئے اور دوسری ہندو اکثریتی علاقے کے لئے۔ کانفرنس میں آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر کا ایک پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اکھنڈ بھارت کی چیر پھاڑ کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ ہندو پہلے پاکستان کی چیر پھاڑ کریں۔ اس مقصد کے لئے لازمی طور پر بلا تاخیر اقدامات کرنے چاہئیں۔ اول یہ کہ مغربی بنگال کے ہندو صوبے کی تشکیل کی جائے۔ دوئم یہ کہ آسام سے مسلمان مداخلت کاروں کو بہر قیمت بیدخل کیا جائے تا کہ مشرقی پاکستان کو دو ہندو صوبوں کے درمیان جکڑ کر کچلا جا سکے۔ سوئم یہ کہ مشرقی پنجاب میں ایک ہندو سکھ صوبے کی تشکیل کی جائے اور چہارم یہ کہ سندھ کے ہندو اضلاع کو دوبارہ بمبئی پریزیڈنسی کے ساتھ منسلک کیا جائے۔''[7]

قائداعظم سمیت بیشتر لیگی رہنماؤں نے بنگال کی وحدت کو برقرار رکھنے کی خاطر اسے پاکستان سے علیحدہ ایک آزاد ملک بنانے کا مطالبہ کیا

تاہم وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کو امید تھی کہ بنگال پراونشل کانگرس کی مجلس عاملہ کی متذکرہ قرارداد اور ہندو مہا سبھا کی اس آتش فشانی کے باوجود بنگال کے معقولیت پسند ہندو عناصر صوبہ کی تقسیم کی مخالفت کریں گے۔ چنانچہ اس نے 8/اپریل کو ایک بیان میں ابوالہاشم کی متحدہ اور عظیم تر بنگال کی سکیم کی حمایت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر بنگال کو تقسیم کیا گیا تو یہ اقدام ہندوؤں، مسلمانوں اور اچھوتوں کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔''[8] اس سے اگلے دن 9/اپریل کو سہروردی کے وزیر مال فضل الرحمان نے ایک بیان میں کہا کہ ''ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور این۔ سی۔ چیٹرجی وغیرہ کو ان مشکلات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو صوبہ کی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوں گی...... مرکزی حکومت نے بنگال سے ہمیشہ سوتیلی ماں کا سلوک کیا ہے۔ سابقہ تجربہ کے پیش نظر بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ مرکزی حکومت کا طوق اتار کر ایک آزاد صوبے کے شہری کی حیثیت سے ترقی کی جانب آگے بڑھیں۔'' مارننگ نیوز نے اپنے 10/اپریل کے اداریے میں سہروردی کے اس موقف کی نمائندگی کی اور کہا کہ ''اگر بلیک میل کے ذریعے وسیع علاقے پاکستان سے الگ کر لئے گئے تو ہمارے لئے پاکستان ایک دن کے لئے بھی

قابل قبول نہیں ہوگا۔ مفاد پرست ہندو عناصر اپنے آخری حربے کے طور پر بنگال کی تقسیم کا شور مچا رہے ہیں کیونکہ انہیں متحدہ بنگال میں اپنی اجارہ دارانہ مراعات خطرے میں نظر آتی ہیں۔''

11/اپریل کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں ان مفاد پرست ہندو حلقوں کے گیارہ نمائندوں نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو ایک میمورنڈم دیا جس میں بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا اور یہ تجویز پیش کی گئی کہ ''شمال مغربی بنگال میں ایک نئے صوبے کی تشکیل کر کے ایک مشترکہ گورنر کے ماتحت فوری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے انتظامی ادارے قائم کئے جائیں تاکہ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں خونریزی اور بدامنی کا سدباب ہو سکے۔'' اس میمورنڈم کی نقول گاندھی اور مرکزی عبوری حکومت کے کانگرسی ارکان کو بھی بھیجی گئیں۔ 15/اپریل کو بنگال اسمبلی کے سپیکر نورالامین نے صوبائی اسمبلی کے متعدد ارکان کے ہمراہ نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور پھر اس نے 17/اپریل کو کلکتہ پہنچ کر ایک انٹرویو میں بتایا کہ ''مسلم لیگ کی ہائی کمان بنگال کی تقسیم کے خلاف ہے۔'' جب نورالامین وغیرہ دہلی میں تھے، ان دنوں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت صوبائی گورنروں کی دو روزہ (14 اور 15/اپریل کو) کانفرنس ہوئی تھی۔ ہوڈسن (Hodson) کے بیان کے مطابق ''اس کانفرس میں بنگال کا گورنر سر فریڈرک بروز (Fredric Burrows) اپنی علالت کے باعث شریک نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ اس کا سیکرٹری کانفرنس میں آیا تھا اور اس کی زوردار رائے یہ تھی کہ مسلم اکثریتی بنگال بقیہ کرم خوردہ پاکستان کے ساتھ منسلک رہ کر بھی معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ''وزیر اعلیٰ سہروردی اور اس کے مسلمان ساتھی اپنے صوبہ کی بلحاظ آبادی تقسیم پر ہندوستان کی شمولیت کو ترجیح دیں گے۔''[9] 19/اپریل کو مارننگ نیوز کا اداریہ یہ تھا کہ ''اب مسلم لیگ ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں کی موجودہ صوبائی حکومتوں کو مکمل اقتدار منتقل کرنے کے حق میں ہے'' اور 22/اپریل کو مرکزی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر خواجہ سر ناظم الدین کا بیان یہ تھا کہ ''میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ آزاد و خودمختار بنگال کے قیام سے بنگالی عوام کا بہت فائدہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ بنگال کی تقسیم مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں ہی کے لئے مہلک ہوگی۔''[10]

24/اپریل کو گورنر فریڈرک بروز نے تقسیم بنگال کے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ

ماؤنٹ بیٹن کو ارسال کی۔ اس نے تجویز کیا کہ کلکتہ کو مشرقی اور مغربی بنگال کے دونوں صوبوں کے مابین مشترکہ شہر رہنے دیا جائے تاکہ دونوں قومیں کلکتہ کی معیشت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس طرح مسلم لیگ تقسیم بنگال قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گی ورنہ تو کلکتہ کے بغیر مسلم لیگ کو معلوم ہے کہ مشرقی بنگال کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔[11] ماؤنٹ بیٹن نے 28/اپریل کو گورنر کے نام ایک مراسلے کے ذریعے اس کی مشترکہ شہر والی تجویز کو رد کر دیا اور لکھا کہ ''یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں پاکستان کی سکیم کو معقول بناتا پھروں۔ میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ہے کیا؟ تاہم مسلمانوں کو ان کا حق دیا جائے گا اور اپنی نجات کا انہیں ہر موقع فراہم کیا جائے گا۔''[12] چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے ہر حالت میں پاکستان کو ''نامعقول'' ثابت کرنے کے لئے کلکتہ کو مغربی بنگال کا حصہ بنائے جانے پر زور دیا۔ 28/اپریل کو لارڈ اسمے (Ismay) نے بھی گورنر بنگال بروز کو اس سلسلے میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس نے اپنی اور ماؤنٹ بیٹن کی جناح کے ساتھ ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ''جب وائسرائے نے جناح سے کہا کہ تقسیم کی صورت میں کلکتہ یقیناً پاکستان میں شامل نہیں ہوگا تو حیرت انگیز طور پر جناح نے کم احتجاج کیا جس سے ہم نے یہ قوی تاثر قائم کیا ہے کہ جناح اس وقت پاکستان کے اصول کو طے کرانے کے لئے اس قدر زیادہ آرزومند ہے کہ وہ کلکتہ کے بغیر کٹے پھٹے پاکستان کو بھی قبول کرے گا۔'' مزید یہ کہ ''اگر ہم نے جناح کو ذرا سا بھی یہ عندیہ دے دیا کہ اسے کلکتہ مل سکتا ہے تو پھر ہم اس موڈ میں اسے دوبارہ نہیں لا سکیں گے کہ جس میں وہ بنگال کے لئے ایسا منصوبہ منظور کرے جو ہندوؤں کو بھی منظور ہو۔''[13]

29/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن کے ایک معاون کرسٹی (Christie) نے بنگال کے بارے میں مفصل نوٹ تحریر کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ''کلکتہ کو مشترکہ شہر بنانے کا سب سے بڑا فائدہ اس امکان میں ہے کہ بنگال کے دونوں حصے بالآخر باہم یکجا ہو جائیں گے''...... اس نے لکھا کہ ''ہمارے منصوبے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لیگ کو کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے کے لئے مائل کیا جائے...... ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم بٹوارے کو کسی شکل میں بھی منظور نہیں کرتے لیکن اگر عوامی نمائندوں کا اس پر بہت اصرار ہے تو پھر انہیں ایک کام چلاؤ قسم کی عارضی تقسیم منظور کر لینی چاہیے۔ اس نے اس اعتراض کے جواب میں کہ مشرقی بنگال والوں کو کلکتہ تک راہ داری حاصل ہوگی، لکھا کہ ضلع چوبیس پرگنہ کی مسلم اکثریت کی سب ڈویژنیں کلکتہ کے گردونواح تک پہنچ جاتی ہیں۔''[14]

26/اپریل کو بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس نے کہا کہ "جہاں تک بنگال کا تعلق ہے اس کی تقسیم برصغیر کی تقسیم کا لازمی نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مجھے منصوبہ بتایا گیا ہے کہ اس کے تحت اس سوال پر رائے شماری ہوگی کہ کسی صوبہ کو تقسیم کیا جائے یا نہیں اور اگر تقسیم نہ کیا جائے تو اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے یا ہندوستان سے منسلک ہونا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ اس لئے میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے مطلوبہ مہلت دی جائے تو میں بنگال کو متحدہ رہنے کی ترغیب دے سکتا ہوں اور اگر بنگال نے متحدہ رہنے کا فیصلہ کیا تو میں مسٹر جناح کو اس بات پر آمادہ کر سکتا ہوں کہ بنگال کے پاکستان میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔[15] اسی دن ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے ملاقات کی اور اسے اس بات چیت سے مطلع کیا جو بنگال کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ ہوئی تھی اور پھر "ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے استفسار کیا کہ اگر بنگال پاکستان سے الگ رہنے کی قیمت ادا کر کے متحد رہے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس پر جناح نے بلا تامل یہ جواب دیا کہ مجھے خوشی ہوگی۔ کلکتہ کے بغیر بنگال کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ متحد اور آزاد رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ ہوں گے۔"[16]

بنگال صوبائی کانگرس اور صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے مخلوط طریقہ انتخاب کی بنیاد پر بنگال کو آزاد سوشلسٹ ملک بنانے کی کوششیں

27/اپریل کو سہروردی نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تجویز پیش کی اور کہا کہ "بنگالی ہندو میری یہ تجویز اصولی طور پر مان لیں تو میں ان کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے بہت کچھ کرنے پر آمادہ ہوں گا۔"[17] جب "سہروردی سے پوچھا گیا کہ آیا اسے اس سلسلے میں جناح اور مسلم لیگ ہائی کمان کے دیگر ارکان کی تائید حاصل ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں اپنی طرف سے بات کر رہا ہوں۔ میں بنگال کی طرف سے بات کر رہا ہوں۔ میرے سامنے منقسم ہندوستان میں ایک آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تجویز ہے۔"[18] ☆

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ: جلد 1۔ پاکستان کیسے بنا؟
ایڈیشن سوم 2012ء ، ص ص 325 - 332 ادارہ مطالعہ تاریخ

28/اپریل کو بنگال اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد کرن شنکر رائے نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ اگر سہروردی مخلوط طریقۂ انتخاب کا اصول مان لے تو بنگالی ہندو مطمئن ہو جائیں گے اور وہ صوبہ کی تقسیم پر اصرار نہیں کریں گے۔

29/اپریل کو بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے کلکتہ میں ایک طویل بیان میں کرن شنکر رائے کے اس مطالبہ کو تسلیم کرلیا اور بنگال کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ آج کل مغربی بنگال میں سو فیصدی سرمایہ داری غیر بنگالیوں نے کر رکھی ہے ان اجنبی سرمایہ داروں میں ہندوستانی بھی ہیں اور انگریز اور امریکی بھی۔ یہ سب کے سب اپنے استحصال کو جاری رکھنے کے لئے ہمارے صوبے کو تقسیم کرنے کے درپے ہیں۔ انہیں ہمارے سوشلسٹ رجحانات سے بڑا خطرہ لاحق ہے۔ ابوالہاشم نے کہا کہ ''جو لوگ بنگال کی تقسیم کا مطالبہ محض پاکستان کے مطالبہ کے توڑ کے طور پر کر رہے ہیں وہ قرارداد لاہور کے نفس مضمون سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس قرارداد میں ایک اکھنڈ مسلم ریاست کا تصور پیش نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس میں یہ تصور ہے کہ اجنبی عناصر کی جبری درآمد یا تبادلۂ آبادی سے مصنوعی مسلم اکثریت پیدا کی جائے گی۔ اس قرارداد میں بنگال اور ہندوستان کے دوسرے ثقافتی یونٹوں کو مکمل خود مختاری دی گئی ہے اور اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ یہ یونٹس رضا کارانہ طور پر ایک انڈین انٹرنیشنل کی تشکیل کریں گے۔ پاکستان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بنگال یا پنجاب کے مسلمان، حکمران نسل کے ہوں گے اور دوسرے سب لوگوں کا درجہ رعایا کا ہوگا۔ قائداعظم نے بمبئی میں جناح۔ گاندھی گفت وشنید کی ناکامی کے بعد غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی آزاد ریاستوں کا انتظام بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر سارے لوگوں کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ میں قائداعظم کے اس بیان میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ طریقۂ انتخاب مخلوط ہوگا۔ بنگال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی تقریباً برابر ہے اس لئے یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ آزاد بنگال کی انتظامیہ میں ہندوؤں کو ان کے جائز حصہ سے محروم کر دیا جائے گا۔ البتہ اگر بنگال کو تقسیم کر دیا گیا تو مغربی بنگال کی حیثیت انڈین امپیریلزم کی ایک نوآبادی کی سی ہو جائے گی اور یہاں کے ہندوؤں کی حیثیت غیر بنگالی سرمایہ داروں کے اجرتی مزدوروں کی ہوگی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بنگالی ہندوؤں کو سی۔ آر۔ داس کے نقش قدم پر چل کر مسلمانوں سے اس بنا پر تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آزاد بنگال میں مسلمانوں اور

ہندوؤں کو ہر شعبۂ زندگی میں مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔''[19]

ابوالہاشم کی یہ تجویز ان دنوں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی لائن کے عین مطابق تھی اور اسے حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق کہ 1942ء میں سر سٹیفورڈ کرپس نے اور دسمبر 1946ء میں وائسرائے ویول نے بھی حکومت برطانیہ کو یہی تجویز پیش کی تھی۔ وزیر اعظم ایٹلی کی 20رفروری 1947ء کی تقریر میں بھی اس تجویز پر عملدرآمد کی گنجائش موجود تھی۔ مگر انڈین نیشنل کانگرس کی ہائی کمان مغربی ہندوستان کے ہندو بورژوا طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے اس تجویز کے خلاف تھی۔ سردار پٹیل نے 4رمارچ کو ہی کانجی دوارکا داس کو یقین دلایا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پنجاب اور بنگال کی لازمی طور پر تقسیم ہوگی اور دوسری طرف ہندوؤں میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور مسلمانوں میں بھی مولانا اکرم خان جیسے انتہا پسند عناصر اس تجویز کے حق میں نہیں تھے کیونکہ انہیں آزاد خودمختار متحدہ بنگال میں اپنا کوئی سیاسی مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ شیاما پرشاد مکرجی وغیرہ کا خیال تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا اور اکرم خان وغیرہ کا خیال تھا کہ اپریل 1946ء میں مسلم ارکان اسمبلی کے کنونشن کی قرارداد کے مطابق قائم شدہ اکھنڈ مسلم ریاست میں بنگالی مسلمانوں کا مستقبل روشن ہوگا۔ [20] تاہم سرت چندر بوس، کرن شنکر رائے، بدھان چندر رائے، فضل الرحمان، ناظم الدین اور محمد علی بوگرا وغیرہ سہروردی اور ابوالہاشم کی تجویز سے متفق تھے۔

سرت چندر بوس نے اس سلسلے میں گاندھی کو ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اس نے بڑی دردمندی کے ساتھ ''باپو'' سے اپیل کی تھی کہ وہ بنگال کی تقسیم کے مطالبہ کی مخالفت نہ کرے لیکن ''باپو'' کا خیال کچھ اور ہی تھا۔ وہ سردار پٹیل کی طرح مذہبی بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم کے خلاف تھا لیکن مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان پر اصرار کی صورت میں وہ مذہبی بنیادوں پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے حق میں تھا۔

تاہم آزاد خودمختار بنگال کی تجویز کے حامیوں نے ہمت نہ ہاری۔ 5رمئی کو بنگال مسلم لیگ کی ایک سب کمیٹی کی کانگرسی لیڈروں سے ملاقات ہوئی جس میں بنگال کی ایک آزاد خودمختار سوشلسٹ ری پبلک کے قیام کی تجویز زیر غور آئی۔ پھر تین چار دن تک وزیر اعلیٰ سہروردی کے مکان پر اس سکیم پر گفت وشنید ہوتی رہی۔ صوبہ مسلم لیگ نے حسین شہید سہروردی، ناظم الدین،

نورالامین، حبیب اللہ بہار اور فضل الرحمان پر مشتمل یہ کمیٹی یکم مئی 1947ء کو مقرر کی تھی اور 8 رمئی کو مولوی تمیز الدین کو بھی اس سب کمیٹی میں شامل کرلیا گیا تھا۔ 10 رمئی کو مرزا ابوالحسن اصفہانی کے اخبار مارننگ نیوز میں ایک شخص نورالدین احمد نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں بنگال کی آزادی وخودمختاری کے حق میں بہت سے دلائل دینے کے بعد بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنی آزاد مملکت کے قیام کے لئے متحد ہو جائیں۔

بوس، ابوالہاشم اور سہروردی کی گاندھی سے متحدہ آزاد بنگال کے قیام کی حمایت کی درخواست مگر گاندھی نے اس کی مخالفت کی

گاندھی اس دن سودے پور میں تھا چنانچہ اسی دن بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم اور سرت چندر بوس نے مشترکہ طور پر اس سے ملاقات کر کے استدعا کی وہ متحدہ بنگال کی آزادی وخودمختاری کے راستے میں حائل نہ ہو۔ مگر ''باپو'' نہ مانا اور اس نے ابوالہاشم کی جانب سے مشترکہ بنگالی تہذیب وثقافت کی دلیل کو کوئی وزن نہ دیا اور اس کی وحدت کی صورت میں اس خدشہ کا اظہار کیا کہ آزاد متحدہ بنگال اسلامی ثقافت و مذہب کی تبلیغ کے لئے رضا کارانہ طور پر پاکستان کے وفاق میں شامل ہو جائے گا اور وہ رضا کارانہ طور پر ہندوستان سے منسلک نہیں ہوگا حالانکہ بنگالی ثقافت کی جڑیں اپنیشدوں کے فلسفہ میں ہیں۔[21] اور پھر اسی شام گاندھی نے اپنی ''پرارتھنا سبھا'' کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''اگرچہ جو ہندو رائے عامہ بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کرتی ہے وہ بڑی زوردار ہے لیکن میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس صوبہ کی تقسیم ہوئی تو اس کی ذمہ داری مسلم اکثریت پر عائد ہوگی۔''[22] اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر بنگال کی مسلم اکثریت مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی تائید نہ کرتی تو بنگال کی تقسیم کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا۔

جب گاندھی نے ابوالہاشم سے ملاقات کے دوران اور پھر اپنی پرارتھنا سبھا میں یہ باتیں کی تھیں اس سے ایک دن قبل 9 رمئی کو شملہ میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان برصغیر کی تقسیم کے بارے میں خفیہ سودے بازی ہو چکی تھی۔ اس سودا بازی کا ایک حصہ یہ تھا کہ بنگال کو تقسیم کیا جائے گا اور کلکتہ کا شہر ہندوستان میں شامل ہوگا۔ بظاہر بنگال کا وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی اس

ابلیسی سودا بازی سے بے خبر تھا۔ چنانچہ اس نے 11 رمئی کو اپنے وزیر مال فضل الرحمان، وزیر خزانہ محمد علی بوگرا اور ابوالہاشم کے ہمراہ کلکتہ کے سودے پور آشرم میں گاندھی سے ملاقات کر کے اسے آزاد وخود مختار بنگال کی سکیم کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مگر گاندھی نہ مانا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ کلکتہ اور نواکھلی میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ہندوؤں کا سہروردی پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ اس پر سہروردی اور گاندھی میں تلخ کلامی ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو ان فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ تاہم 12 رمئی کو وزیر اعلیٰ سہروردی نے اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ گاندھی سے ایک اور ملاقات کی جو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ 13 رمئی کو ہندو مہاسبھا کا لیڈر شیاما پرشاد مکر جی گاندھی سے ملا اور اس نے ''بھائی'' کو بتایا کہ اگر آزاد وخود مختار بنگال کی ریاست وجود میں آ گئی تو سہروردی کچھ عرصہ بعد اپنی مسلم اکثریت کے زور پر اس کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر دے گا۔ اس پر مہاتما نے بتایا کہ سہروردی نے دونوں قوتوں کی باہمی رضامندی کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے اور اس (گاندھی) کی تجویز کے مطابق کوئی فیصلہ ہندوؤں کی دوتہائی اکثریت کی تائید کے بغیر نہیں ہوگا۔ مگر مکر جی مطمئن نہ ہوا اور اسے بدستور یہ خطرہ لاحق رہا کہ بنگال کی مسلم اکثریت مقامی ہندوؤں کی ثقافت کو تباہ و برباد کر دے گی۔

مسلم لیگ کے نور الامین گروپ کی جانب سے سہروردی کے خلاف اقتدار کی رسہ کشی اور متحدہ بنگال کے لئے کوششوں کو نقصان

جب صوبہ مسلم لیگی لیڈروں کو گاندھی کے ساتھ سہروردی کی بات چیت کی تفصیل کا علم ہوا اور یہ پتہ چلا کہ گاندھی محض مذہبی بنیاد پر بنگال کی آزادی وخود مختاری کی سکیم کی مخالفت کر رہا ہے تو ان میں سے نور الامین گروپ نے اس مسئلہ پر کھلم کھلا سہروردی کی مخالفت شروع کر دی۔ نور الامین کا بیان یہ تھا کہ مسلم لیگ نے ہندو لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لئے یکم مئی کو جو سب کمیٹی مقرر کی تھی وہ از خود کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں۔ وہ اپنی رپورٹ مسلم لیگ ہائی کمان کے روبرو پیش کرے گی۔ آج کل جو مسلم لیگی لیڈر ہندو لیڈروں سے بات چیت کر رہے ہیں وہ محض اپنی ذاتی حیثیت میں ایسا کر رہے ہیں۔ صوبہ لیگ نے انہیں اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیا۔[23]

نورالامین بنگال اسمبلی میں مسلم لیگیوں کے اس دھڑے کا قائد تھا جس نے مارچ 1947ء کے اواخر میں لیگ ہائی کمان سے مطالبہ کیا تھا کہ سہروردی کو وزارت اعلیٰ سے الگ کر دیا جائے مگر قائداعظم جناح نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا تھا اور اس طرح سہروردی کو اشارۃً یہ اجازت دی تھی کہ وہ بنگال کے مستقبل کے بارے میں ہندو لیڈروں سے بات چیت کرے۔ ہوڈسن کے بیان کے مطابق سہروردی نے 26 اپریل کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے دوران اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اسے صوبائی لیگ سے مخلوط طریقۂ انتخاب کا اصول تسلیم کروانے میں مشکل پیش آئے گی۔ نورالامین کا یہ بیان اسی مشکل کی عکاسی کرتا تھا۔

اس سے قبل مولانا اکرم خان بھی اس قسم کا بیان دے چکا تھا اور 12 مئی کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن نورالہدیٰ نے بھی ایک بیان میں اس تجویز کی مخالفت کی تھی اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”ابوالہاشم کو مسلم لیگ کی جانب سے سرت چندر بوس اور دوسرے ہندو لیڈروں سے خفیہ بات چیت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسے کسی نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ ہندوؤں کو مساوی نمائندگی اور مخلوط طریقۂ انتخاب کی مراعات پیش کرے۔ اس نے ایسا کر کے بنگال کے مسلمانوں کو سخت ترین نقصان پہنچایا ہے...... جو لوگ سودے پور آشرم میں حاضری دے رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دو ڈوبتے ہوئے جہازوں سے جو سامان اتارا جائے گا اس کے لئے بنگال میں کوئی مارکیٹ نہیں ہے اور ”مہاتما“ کی آشیرباد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“[24] 13 مئی کو صوبہ لیگ کے قائم مقام سیکرٹری حبیب اللہ بہار نے بھی ایک بیان میں نورالامین کے اس موقف کی تائید کی کہ سہروردی، ابوالہاشم یا کسی اور مسلم لیگی لیڈر کو اپنی ذاتی حیثیت میں ہندو لیڈروں سے بات چیت کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور پھر 15 مئی کو صوبہ لیگ کے صدر مولانا اکرم خان نے مارننگ نیوز کے ساتھ ایک انٹرویو میں آزاد و خود مختار بنگال کے بارے میں سرت چندر بوس کے فارمولے کی مخالفت کی اور کہا کہ ”اگر اس فارمولے پر عمل ہوا تو پاکستان کی سکیم پر مہلک ضرب لگے گی اور بنگال کے ساڑھے تین کروڑ مسلمان اونچی ذات کے ہندوؤں کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔“

سہروردی کی جناح اور ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ملاقاتیں، ماؤنٹ بیٹن کی یقین دہانی کہ اگر صوبہ میں مخلوط حکومت قائم ہو جائے تو وہ کانگرس کو متحدہ بنگال کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا

چونکہ سہروردی کو اپنی ان سرگرمیوں میں قائداعظم جناح کی تائید وحمایت حاصل تھی اس لئے اس نے نورالامین گروپ کی اس بیان بازی کا کوئی نوٹس نہ لیا اور وہ اسی دن (13 رمئی) کو وزیر مال فضل الرحمان کے ہمراہ کلکتہ سے نئی دہلی پہنچا۔ اس کے اس دورے کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ قائداعظم جناح اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کے اس فارمولے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا جو اس نے سرت چندر بوس اور کرن شنکر رائے سے مل کر تیار کیا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ ان دونوں کو بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح سیکولر سیاست کا علمبردار نیشنل کانگرس کا ''باپو'' محض مذہبی بنیاد پر اس فارمولے کی مخالفت کر رہا تھا۔ سہروردی کو اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ شملہ میں ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے درمیان خفیہ سودا بازی ہو چکی ہے جس کے تحت بنگال کو لازمی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے اس بے خبری میں اپنے ان دونوں مقاصد کے تحت 14 اور 15 رمئی کو قائداعظم جناح اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے 15 رمئی کو جناح کے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی کھایا تھا جس میں لیاقت علی خان نے بھی شرکت کی تھی۔

ہوڈسن کے بیان کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے سہروردی اور اس کے وزیر مال فضل الرحمان کے ساتھ ملاقات میں انہیں بتایا کہ اس نے شملہ میں جواہر لال نہرو سے مشورہ کرنے کے بعد انتقال اقتدار کا جو ترمیم شدہ منصوبہ تیار کیا ہے اس میں کسی صوبہ کو اپنی آزادی کا اعلان کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ اس کے تحت بعض صوبوں یا ان صوبوں کے حصوں کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہو جائیں۔ وائسرائے نے مزید بتایا کہ اگر بنگال اسمبلی آزادی کے حق میں قرارداد منظور کر دے تو گورنر کی سفارش کی روشنی میں اس قرارداد پر غور کیا جا سکتا ہے۔ وائسرائے نے سہروردی سے یہ بات اس کی اس رپورٹ کے پیش نظر کہی تھی کہ اس نے (سہروردی نے) کرن شنکر رائے اور سرت چندر بوس کے ساتھ بنگال کو متحدہ رکھنے کے بارے میں

بات چیت کی ہے جس کے بعد اس سلسلے میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور اس بنا پر وہ مجموعی طور پر پرامید ہے۔ چونکہ سہروردی کی اس ملاقات سے پہلے بنگال کو سوشلسٹ ری پبلک بنانے کی باتیں ہو رہی تھیں اس لئے ماؤنٹ بیٹن نے اسے بتایا کہ اس طرح کامن ویلتھ کی رکنیت کے لئے پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے سہروردی کو یہ بھی بتایا کہ پنڈت نہرو بنگال کی آزادی کے حق میں نہیں ماسوا اس کے کہ تقسیم کے بعد اس کا ہندوستان کے ساتھ گہرا رابطہ ہو۔ نہرو کا خیال ہے کہ تقسیم کے بعد مشرقی بنگال کو جو مشکلات درپیش ہوں گی ان کی بنا پر اسے چند سال کے اندر پھر ہندوستان میں شامل ہونا ہی پڑے گا۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن نے سہروردی سے وعدہ کیا کہ بنگال میں مخلوط وزارت کے قیام کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے تو وہ گاندھی کی امداد سے پوری کوشش کرے گا کہ قومی قائدین اس انتظام کو تسلیم کر لیں اور اس امر سے اتفاق کر لیں کہ انتقال اقتدار کے قطعی اعلان میں بنگال کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ ہو۔[25]

سہروردی نے قائد اعظم جناح اور ماؤنٹ بیٹن سے ملاقاتوں کی بعد 15 رمئی کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں اس نے پنڈت نہرو کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ جو اہم امور انڈین یونین اور بنگال پر اثر انداز ہوں گے ان کے بارے میں کسی بندوبست یا مفاہمت کا امکان ہو سکتا ہے۔ اسے معاہدہ کہا جا سکتا ہے یا اور کچھ، جو بھی کہنا چاہیں کہہ لیں۔[26] سہروردی کے وزیر مال فضل الرحمان نے بھی اس سلسلے میں اسی دن ایک انٹرویو دیا جس میں اس نے یقین ظاہر کیا کہ بنگال متحد رہے گا اور اگر صوبہ کی تقسیم ہوئی بھی تو یہ چند دن سے زیادہ نہیں رہے گی۔ کیونکہ دونوں دستور ساز اسمبلیاں اس سلسلے میں گفت وشنید کر کے کوئی سمجھوتہ کر سکتی ہیں۔[27]

اگرچہ سہروردی اور فضل الرحمان کے یہ بیانات مسلم لیگ کے نکتۂ نگاہ سے بہت قابل اعتراض تھے اور اگرچہ مسلم لیگ کی ہائی کمان اب بنگال کے متحد رہنے کے بارے میں پرامید نہیں رہی تھی کیونکہ جب 15 رمئی کو قائد اعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تھی تو مؤخر الذکر نے انہیں انتقال اقتدار کے اس منصوبے کی تفصیلات بتا دی تھیں جو اس نے شملہ میں نہرو کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا اور اس منصوبہ کو دیکھ کر جناح ذہنی طور پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ تاہم قائد اعظم جناح نے سہروردی اور فضل الرحمان کے ان بیانات پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس کی وجہ غالباً مدراس کے اخبار ''ہندو'' کی 9 رمئی کی اس رپورٹ میں مضمر تھی کہ جناح کو بنگال کی

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت یا اس کے پاکستان کے ساتھ منسلک نہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ پاکستان کا مغربی علاقہ اسے دے دیا جائے۔ جناح نے ماؤنٹ بیٹن سے بھی یہ کہا تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی پاکستان کے حصول سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بنگال کو نہ تو انگریز تقسیم کرنا چاہتے تھے، نہ مسلم لیگ اور نہ ہی صوبائی کانگرس اور سرت بوس، اس کی تقسیم گاندھی، نہرو اور پٹیل کے اصرار پر ہوئی

حسین شہید سہروردی اور فضل الرحمان 16 مئی کو واپس کلکتہ پہنچے تو اسی دن صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری مولوی ابوالہاشم نے ایک بیان میں بتایا کہ ''اگرچہ میں نے اب تک متحدہ بنگال کی آزاد و خودمختار ریاست کے قیام کے سلسلے میں محض ذاتی حیثیت سے بعض تجاویز پیش کی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس مقصد کے لئے مسلم لیگ کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حسین شہید سہروردی بنگال کی سیاسی صورت حال کے بارے میں قائداعظم کو پوری طرح باخبر رکھتا رہا ہے......آزاد و خودمختار متحدہ بنگال کی تجویز اسلامی اصولوں اور قرارداد لاہور کے عین مطابق ہے۔ اگر مصر اور ایران میں مختلف مذہبی، نسلی، لسانی اور ثقافتی عناصر کے درمیان سیاسی مفاہمت ہوسکتی ہے تو بنگال میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔''

اسی دن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سیکرٹری پی۔سی۔ جوشی اور پارٹی کی بنگال پراونشل کمیٹی کے سیکرٹری بھوانی سین نے ایک مشترکہ بیان میں متحدہ بنگال کی تجویز کی حمایت کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''اس تجویز پر عمل کرنے سے سامراجی سازش کو ناکام کیا جاسکتا ہے۔ لندن میں ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ بنایا جارہا ہے اگر یہ منصوبہ آ گیا تو سارے لوگوں اور سارے فرقوں پر آفت آجائے گی۔ اگر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی بنیاد پر بنگال کو متحد رکھا جائے تو برطانیہ کا یہ منصوبہ درہم برہم ہوجائے گا۔''[28] کمیونسٹ لیڈروں کے اس بیان سے ظاہر تھا کہ یا تو وہ ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر تھے اور انہوں نے اپنی ایک الگ خواب و خیال کی دنیا بنائی ہوئی تھی جو بے شمار تضادات و تناقضات سے بھرپور تھی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے تقریباً ایک ماہ تک کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کے بعد اپریل 1947ء کے اواخر میں جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں

ہندوستان کے مختلف سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی یونٹوں کو اقتدار منتقل کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن جب اس نے مئی کے دوسرے ہفتے میں شملہ میں جواہر لال نہرو کو اپنا یہ منصوبہ دکھایا تھا تو اس نے اسے از سرتا پا مسترد کر دیا تھا اور پھر اس کی خواہش کے مطابق وی۔ پی۔ مینن نے برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ تیار کیا تھا اور اس منصوبہ میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ گویا برصغیر کی تقسیم کا ہولناک منصوبہ انگریزوں نے نہیں بنایا تھا بلکہ اس کا سہرا جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے کانگرسی ہندو لیڈروں کے سر پر تھا۔ انگریز بنگال کی تقسیم کے خلاف تھے لیکن گاندھی، نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ مذہبی بنیادوں پر اس صوبہ کی تقسیم پر اصرار کرتے تھے۔ قائداعظم جناح نے کبھی بھی بنگال کی تقسیم کے حق میں اظہار خیال نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی سہروردی کی ان کوششوں کی مذمت کی تھی جو وہ متحدہ بنگال کی آزاد و خود مختار ریاست کے قیام کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ سہروردی اور سرت چندر بوس کی یہ سکیم نہ صرف مسلم لیگ کی 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق تھی بلکہ یہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ستمبر 1942ء کی قرارداد کے بھی عین مطابق تھی۔ برطانوی سامراج اس سکیم کے خلاف نہیں تھا بلکہ گاندھی کے بقول جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل اس سکیم کے سخت دشمن تھے۔

18 رمئی کو صوبائی وزیر مال فضل الرحمان نے ایک بیان میں متحدہ بنگال کی آزاد و خود مختار ریاست کی تجویز کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ اس نے بتایا کہ ''وزیر اعلیٰ سہروردی جب وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کرنے کے بعد 28 راپریل کو واپس کلکتہ آیا تھا تو اس نے اس مقصد کے لئے سرت چندر بوس سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس بات چیت میں میرے علاوہ خواجہ ناظم الدین اور ابوالہاشم بھی شامل تھے۔ اس موقع پر سرت چندر بوس نے بعض تجاویز پیش کیں جن پر صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے غور کیا اور پھر ایک سب کمیٹی مقرر کی جسے اختیار دیا گیا کہ وہ بوس سے اس سلسلے میں مزید بات چیت کرے۔ اگلے دن اس سب کمیٹی نے بوس سے ملاقات کی لیکن یہ بات چیت نامکمل رہی۔ چند دن بعد جب اس مسئلہ کے بارے میں پھر سلسلہ جنبانی ہوا تو مسلم لیگ کی سب کمیٹی کے ارکان میں سے صرف میں اور سہروردی موجود تھے اور دوسرے فریق کی نمائندگی سرت چندر بوس اور کرن شنکر رائے نے کی تھی۔ تاہم اس موقع پر بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا کیونکہ سہروردی کی رائے یہ تھی کہ اس سلسلے میں پہلے قائداعظم سے مشورہ کر لینا

چاہیے۔''[29] فضل الرحمان کے اس بیان میں وہ تجاویز بھی شامل تھیں جو 24/اپریل کے بعد سہروردی اور بوس کے درمیان بات چیت کے دوران زیر غور آئی تھیں لیکن بنگال کے بہت سے کانگرسی، مسلم لیگی اور ہندو مہا سبھائی عناصر نے اس پر سخت مخالفانہ ردعمل کا اظہار کیا۔

صوبہ لیگ اور صوبائی کانگرس کے بعض عناصر کی مخالفت کے باوجود مسلم لیگ، فارورڈ بلاک اور کانگرس کے صوبائی رہنماؤں کے مابین متحدہ بنگال کو خودمختار سوشلسٹ ری پبلک بنانے کا معاہدہ طے پا گیا

بنگال اسمبلی کے ایک کانگرسی رکن این۔ڈی۔دت۔مزمدار نے 16/مئی کو نئی دہلی میں سردار پٹیل سے ملاقات کرنے کے بعد بنگال کے مستقبل کے بارے میں سہروردی۔بوس سکیم کی سخت مخالفت کی۔اس نے کہا کہ ''متحدہ بنگال کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ صرف اسی شرط پر بات چیت کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے کہ یہ صوبہ یونین آف انڈیا کا جزو لاینفک رہے گا۔اس شرط کے بغیر ہر قسم کی بات چیت سخت غلط اور نقصان دہ ہو گی۔جب تک مسلم لیگی لیڈر دوقومی نظریے سے دستبردار نہیں ہوتے اس وقت تک ان سے کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی......خودمختار بنگال کی سکیم ان لوگوں نے پیش کی ہے جنہوں نے 16/اگست 1946ء کو کلکتہ میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا تھا۔میں سرت چندر بوس سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایسے لوگوں سے اشتراک عمل کی غلطی نہ کریں۔بنگالی ہندوؤں کی تقدیر کے مسئلہ کو خودمختار بنگال یا سوشلسٹ بنگال کے پر فریب نعروں سے پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔''[30]

اس سے اگلے دن نور الامین اپنے دو ساتھیوں......حبیب اللہ بہار اور یوسف علی چودھری......کے ساتھ نئی دہلی میں قائداعظم سے ملاقات کرنے کے بعد واپس کلکتہ پہنچا تو اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''قائداعظم'' نے ہمیں غیر مبہم الفاظ میں بتایا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کسی کو مسلم لیگ کی طرف سے بات چیت کرنے کا اختیار نہیں دیا تھا'' لیکن نور الامین نے اس انٹرویو میں یہ نہ بتایا کہ اگر ایسی ہی بات تھی تو خود قائداعظم اس مسئلہ پر اتنی دیر تک خاموش کیوں رہے تھے۔آزاد و خودمختار بنگال کی سکیم کا چرچا دراصل برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی 20/فروری کی تقریر کے فوراً ہی بعد شروع ہو گیا تھا لیکن جناح نے کبھی ابوالہاشم، سہروردی اور فضل الرحمان

وغیرہ کی مذمت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ لیاقت علی خان بھی اس سلسلے میں منقار زیر پر ہی رہا تھا۔ اسی دن صوبہ مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان نے بنگال کی تقسیم کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ ایسا بنگالی مسلمانوں کی لاشوں پر ہی ہوسکتا ہے۔ اکرم خان چاہتا تھا کہ متحدہ بنگال قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کے منصوبہ میں شامل رہے۔[31] گویا اس کا موقف این۔ ڈی۔ دت۔ مزمدار کے موقف کے بالکل برعکس تھا اور اس بنا پر اس سے بنگال میں اس وقت کے ہندو۔ مسلم تضاد کی بالکل صحیح عکاسی ہوتی تھی۔

ان ساری مخالفتوں کے باوجود 20 رمئی کو سرت چندر بوس کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی جس میں حسین شہید سہروردی، فضل الرحمان، محمد علی بوگرا، ابوالہاشم، عبدالمالک، کرن شنکر رائے اور ستیہ رنجن بخشی نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں خاصی بحث وتمحیص کے بعد بنگال کے مستقبل کے بارے میں ایک عارضی سمجھوتہ ہوا جس میں سرت چندر بوس اور ابوالہاشم نے دستخط کئے اور طے پایا کہ اس سمجھوتے پر عملدرآمد کانگرس اور مسلم لیگ کی منظوری کے بعد ہوگا۔ اس پانچ نکاتی سمجھوتے کی تفصیل یہ تھی:

1۔ بنگال ایک خودمختار سوشلسٹ ری پبلک ہوگا اور بنگال کی یہ سوشلسٹ ری پبلک بقیہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔

2۔ بنگال کی آزاد ریاست کے آئین کے تحت قانون ساز اسمبلی کا انتخاب بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر مخلوط طریقۂ انتخاب کے ذریعہ ہو گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نشستیں ان کی آبادی کے لحاظ سے مخصوص کی جائیں گی۔ ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان نشستوں کی تقسیم ان کی آبادی کے لحاظ سے ہوگی یا اس طریقے سے ہوگی جس پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہوگا۔ حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں گے اور ہر حلقہ سے اس امیدوار کو منتخب قرار دیا جائے گا جسے اپنے فرقے کی اکثریت کی اور دوسرے فرقوں کے 25 فیصد رائے دہندگان کی حمایت حاصل ہوگی۔ اگر کوئی بھی امیدوار ان شرائط کو پوری نہیں کرے گا تو اس امیدوار کو منتخب قرار دیا جائے گا جس کو اپنے فرقے کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں گے۔

3۔ اگر دونوں فریق متذکرہ دونوں نکات کو مان لیں گے اور حکومت برطانیہ بنگال کو ایک

آزاد ریاست قرار دے گی تو صوبہ کی موجودہ وزارت کو توڑ دیا جائے گا اور اس کی جگہ ایک نئی عبوری حکومت قائم ہوگی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں (اچھوتوں سمیت) کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی لیکن اس گنتی میں وزیر اعلیٰ کا شمار نہیں ہوگا جو مسلمان ہوگا اور وزیر داخلہ (Home Minister) ہندو ہوگا۔

4۔ جب تک نئے آئین کے تحت قانون ساز اسمبلی اور وزارت کی تشکیل نہیں ہوگی اس وقت تک فوج اور پولیس سمیت ساری سروسز میں مسلمانوں اور ہندوؤں (بشمول اچھوت) کو مساوی حصہ ملے گا۔ سروسز بنگالیوں پر مشتمل ہوں گی۔

5۔ حکومت برطانیہ بنگال کی عبوری حکومت کو جون 1948ء کو یا اس سے پہلے اقتدار منتقل کردے گی۔[32]

آزاد و خود مختار بنگال کے مجوزہ فارمولا کو گاندھی کی طرف سے جناح کے دو قومی نظریہ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش

سرت چندر بوس نے آزاد و خود مختار بنگال کے قیام کا یہ فارمولا 23 رمئی کو برائے اطلاع گاندھی کو بھیج دیا جو ان دنوں کلکتہ میں ہی تھا اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن لندن میں انتقال اقتدار کے اس منصوبے کی منظوری حاصل کر رہا تھا جو شملہ میں اس کے اور نہرو کے درمیان طے پایا تھا۔ اس منصوبہ میں بنگال کی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور یہ واضح طور پر قرار دیا گیا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کی صورت میں صرف پنجاب اور بنگال کو ہی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا جائے گا اور انتقال اقتدار جون 1948ء سے بہت پہلے ہو جائے گا۔ گاندھی نے 24 رمئی کو کلکتہ سے پٹنہ کے لئے روانگی سے قبل سرت چندر بوس کے اس خط کا جواب دیا جس میں اس نے اپنے ہندووانہ تعصب کو پوری طرح بے نقاب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ برصغیر میں اتنی بڑی سیکولر تحریک آزادی کا لیڈر دراصل ایک انتہائی متعصب تنگ نظر اور تنگ دل ہندو تھا۔ اس کا بوس کو جواب یہ تھا کہ ''تم نے جو مجھے فارمولا بھیجا ہے اس میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ کوئی فیصلہ محض اکثریت کی بنیاد پر نہیں ہوگا اور یہ کہ حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقننہ میں ہندو اقلیت کے کم از کم دو تہائی حصے کا تعاون ہونا چاہیے۔ اس فارمولے میں یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ بنگال کی ثقافت اور مادری زبان

(بنگالی) مشترکہ ہے۔ اس امر کی یقین دہانی کروالو کہ مرکزی مسلم لیگ بعض مخالفانہ رپورٹوں کے باوجود اس تجویز کی تائید کرے گی۔ اگر دہلی میں مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں ٹیلیفون کروں گا یا تار بھیج دوں گا۔ میں تمہارے اس منصوبے کے بارے میں کانگرس کی مجلس عاملہ سے تبادلۂ خیالات کروں گا۔''[33]

بوس نے گاندھی کے اس خط کے بارے میں صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری ابوالہاشم سے بات کی اور پھر عارضی سمجھوتے کے پہلے دو نکات میں کچھ ترمیم کر کے اسے دوبارہ گاندھی کے پاس بھیجا۔ اس نے اپنے اس خط میں لکھا کہ جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے کہ حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقنّنہ میں ہندو اقلیت کے کم از کم دو تہائی حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے'' میں اس سلسلے میں ابھی تک شہید سے کوئی بات نہیں کر سکا۔ وہ آج بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جا رہا ہے اگر میں دہلی آیا تو اس کے بارے میں اس سے بات کروں گا لیکن اگر اس اثنا میں وہ تم سے ملے تو تم اس معاملے کے بارے میں اس کا ردعمل معلوم کر سکتے ہو۔ جہاں تک تمہاری اس تجویز کا تعلق ہے کہ فارمولے میں یہ بات بھی تسلیم کروانی چاہیے کہ بنگال کی ثقافت اور مادری زبان (بنگالی) مشترکہ ہے...... میں نے گزشتہ جنوری میں جس بات چیت کی ابتدا کی تھی اور جسے بعد میں بھی میں نے جاری رکھا اس کی بنیاد یہی رہی ہے کہ بنگال کی ثقافت اور مادری زبان مشترکہ ہے۔ اس بنیاد پر سارے فریقوں کو اتفاق تھا۔ گزشتہ ماہ شہید نے ایک بیان میں اس بات کو تسلیم کیا تھا۔ اس لئے فارمولے کی شرائط میں اس بات کو تسلیم کروانے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیے...... شہید اور فضل الرحمان ان شرائط کے بارے میں جناح اور اس کی مجلس عاملہ سے تبادلۂ خیالات کریں گے۔ میں نے ان سے جو بات چیت کی ہے اس سے یہ تاثر لیا ہے کہ اگر بنگال میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس امر کا امکان ہے کہ جناح اس میں حائل نہیں ہوگا۔''[34]

پیارے لال کے بیان کے مطابق گاندھی مسلم لیگ سے یہ بات، کہ بنگال کی ثقافت اور مادری زبان مشترکہ ہے، تسلیم کروانے پر اس لئے اصرار کرتا تھا کہ ''چونکہ بنگال کے لوگوں کی (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) بنیادی وحدت ہی سہروردی کی تجویز کی اساس تھی اور چونکہ بنگال کے مسلمان آبادی کے لحاظ سے پاکستان میں، جس کا تصور مسلم لیگ نے پیش کیا تھا، غالب حیثیت کے مالک تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی طرف سے جناح کی رضامندی کے ساتھ دو قومی نظریے کو عملاً

مسترد کرنے کا مطلب یہ نکلتا کہ اس نظریے پر مبنی پاکستان کی تجویز کا کچھ بھی باقی نہ رہتا‘‘35
لیکن گاندھی اپنی ’’مہاتمائیت‘‘ کے باوجود ان قوانین سے ناواقف تھا جن کی تاریخی عمل میں کارفرمائی ہوتی ہے۔ وہ محض اپنی مکاری وعیاری سے، جس پر وہ خیر سگالی اور سچائی کا خوشنما پردہ ڈالتا تھا، بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بے شمار تضادات کو ہندوؤں کے حق میں حل کرنا چاہتا تھا مگر ایسا نہ ہوسکتا تھا اور نہ ہوا۔

مئی 1947ء کے تیسرے ہفتے میں جبکہ گاندھی کلکتہ میں تھا، انڈین نیشنل کانگرس کی مجلس عاملہ برصغیر کی تقسیم کا وہ منصوبہ منظور کر چکی تھی جو 9رمئی کو شملہ میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے تیار کیا تھا اور جس میں کسی بھی صوبہ کو اپنی آزادی کا اعلان کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کی ہائی کمان کو بھی اس وقت تک یقین ہو چکا تھا کہ سرت چندر بوس اور حسین شہید سہروردی بنگال کی آزادی وخودمختاری کا جو خواب دیکھ رہے ہیں اس کی تعبیر نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا روزنامہ ڈان اور بعض مسلم لیگی لیڈروں نے بھی اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ 22رمئی کو قائداعظم جناح نے بھی بالواسطہ طور پر متحدہ بنگال کی آزادی کی تجویز کو مسترد کر دیا جبکہ انہوں نے رائٹر کے نامہ نگار کے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا کہ آیا مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملانے کے لئے ایک لمبے تنگ قطع (Corridore) کی ضرورت ہے جو ہندوستان سے گزرتا ہو؟

بنگال مسلم لیگ مجلس عاملہ نے اپنی تقدیر کا فیصلہ قائداعظم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جبکہ بوس گاندھی کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا

28رمئی کو بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں پانچ گھنٹے کے غور وخوض کے بعد یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ’’مجلس عاملہ اور اس کی مقرر کردہ سب کمیٹی کا ان تجاویز سے کوئی تعلق نہیں ہے جو بنگال کے آئین کے تصفیہ کے بارے میں بعض اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ مجلس عاملہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان پر ثابت قدمی سے قائم ہے۔ مجلس عاملہ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر اعتماد کا اعادہ کرتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ صرف انہی کو ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے آئندہ کے آئین کے بارے میں گفت وشنید کرنے اور تصفیہ کرانے کا اختیار حاصل ہے۔ بنگال کے مسلمان ان کے فیصلے کے پابند ہوں گے۔‘‘ مجلس عاملہ کے 27

ارکان میں سے 24 ارکان اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ ان شرکا میں ناظم الدین اور فضل الرحمان بھی شامل تھے جو قبل ازیں کھلم کھلا متحدہ بنگال کی آزادی وخود مختاری کی تجویز کی تائید وحمایت کرتے رہے تھے۔[36]

بنگال مسلم لیگ کی اس قرارداد کے تین دن کے بعد 31 رمئی کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن لندن سے برصغیر کی تقسیم کے متذکرہ منصوبے کی منظوری حاصل کرنے کے بعد واپس نئی دہلی پہنچا تو سرت چندر بوس نے اسی دن نئی دہلی میں گاندھی سے ایک اور ملاقات کر کے اس سے متحدہ بنگال کی آزادی کی تجویز کے بارے میں بحث وتمحیص کی۔ بعد میں اس نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''اگر کانگرس ہائی کمان میرے منصوبے کو منظور کر لے تو مجھے یقین ہے کہ سہروردی کو اس سکیم کے بارے میں مسلم لیگ ہائی کمان کی منظوری یقیناً آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اس نے بتایا کہ میرے منصوبے اور سہروردی کی سکیم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنی متحدہ بنگال کی تجویز کی صحت پر پورا یقین ہے اور میں اس پر آخر دم تک ثابت قدمی سے قائم رہوں گا۔ میں دوسرے کانگرسی لیڈروں سے بھی ملوں گا اور بنگال کی تقسیم کے سدباب کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا''[37] لیکن گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو بنگال کے اتحاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہرو اور پٹیل مئی میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی شرط پر برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ منظور کر چکے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح جناح کا کرم خوردہ پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گا۔ بظاہر اس وقت تک گاندھی کو ان کے فیصلے کا کوئی علم نہیں تھا۔ پیارے لال کے بیان کے مطابق اس نے متحدہ بنگال کی تجویز میں محض اس لئے دلچسپی لی تھی کہ اگر مسلم لیگ ہائی کمان بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ثقافت کو تسلیم کر لے گی تو جناح کا دوقومی نظریہ مسترد ہو جاتا تھا اور اس نظریے پر مبنی پاکستان کی تجویز کا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ گاندھی 31 رمئی 1947ء تک بھارت ماتا کی چیر پھاڑ کی تجویز کے سخت خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن سرت چندر بوس نے متذکرہ بیان دیا اسی دن شام کو مہاتما نے اپنی ''پرارتھنا سبھا'' کے دوران یہ اعلان کیا کہ ''خواہ سارے کا سارا ہندوستان نذر آتش ہو جائے ہم پاکستان کو منظور نہیں کریں گے۔''[38] اس نے یہ اعلان جنگ اس حقیقت کے باوجود کیا کہ اپریل کے اوائل میں وہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے دو تین ملاقاتیں کرنے کے بعد یکا یک برصغیر کی تقسیم کے حق میں باتیں کرنے لگا

تھا اور بیچارا ابوالکلام ''گاندھی'' کی یہ باتیں سن کر ششدر رہ گیا تھا، اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا ''باپو' اتنی آسانی سے اتنی بڑی قلابازی کھالے گا۔

ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے 3 رجون کے پارٹیشن ایوارڈ کے اعلان کے باوجود سرت بوس آزاد ومتحدہ بنگال کے لئے کوشش کرتا رہا جسے گاندھی کی منافقانہ سیاست نے آگے نہ بڑھنے دیا

3 رجون کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا جسے کانگرس کی مجلس عاملہ نے اسی دن باقاعدہ طور پر منظور کرلیا۔ سرت چندر بوس کو گاندھی اور کانگرس کے دوسرے سرکردہ لیڈروں کے اس رویے پر سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے 6 رجون کو گاندھی سے پھر ملاقات کر کے استدعا کی کہ صوبہ بنگال کو متحد، آزاد اور خود مختار رہنے دیا جائے۔ گاندھی نے 8 رجون کو بذریعہ خط بوس کی اس استدعا کا یہ جواب دیا کہ ''پنڈت نہرو اور سردار پٹیل تمہاری تجویز کے سخت خلاف ہیں کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈلوانے کی ایک چال ہے۔ اس کی اس رائے کی بنیاد محض شک پر نہیں ہے بلکہ انہیں اس سلسلے میں تقریباً یقین ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اچھوتوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر سرمایہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تمہیں اپنی جدوجہد کم از کم وقتی طور پر ترک کر دینی چاہیے کیونکہ بدعنوانیوں کے ذریعے جو اتحاد قرار پائے گا وہ کھلم کھلا تقسیم سے بدتر ہوگا۔ اس تقسیم کا مطلب یہ ہوگا کہ دلوں کی مسلّم تقسیم اور ہندوؤں کے تلخ تجربات کو تسلیم کیا جائے گا۔ مزید برآں ہندوستان کے دونوں حصوں سے باہر انتقال اقتدار کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہونا ہے اس کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان پیشگی مفاہمت ضروری ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہم یہ شرط پوری نہیں کروا سکتے۔ تاہم میں تمہارے عقیدے کو متزلزل نہ کرتا اگر اس کی بنیاد متذکرہ بدعنوانیوں اور چالبازیوں پر نہ ہوتی۔ اگر تمہیں قطعی طور پر یقین ہے کہ یہ شبہ بے جواز ہے اور اگر تم مقامی مسلم لیگ اور مرکزی مسلم لیگ سے تحریری یقین دہانی حاصل نہیں کر سکتے تو تمہیں متحدہ بنگال کی جدوجہد ترک کر دینی چاہیے اور بنگال کی تقسیم کے لئے جو ماحول پیدا ہوا ہے اسے خراب نہیں کرنا چاہیے۔''[39]

گاندھی نے اسی شام اپنی پرارتھنا سبھا میں بھی بنگال کے ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے رشوت ستانی کے الزام کا اعادہ کیا۔ اس پر سرت چندر بوس بہت برہم ہوا اور اس نے کلکتہ سے بذریعہ تار اس جھوٹے الزام کی پرزور تردید کی اور مطالبہ کیا کہ اس سلسلے میں کھلی انکوائری کرائی جائے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جن دنوں یہ مہاتما سرت چندر بوس کو متحدہ بنگال کی سکیم کو ترک کر کے صوبہ کی تقسیم کو تسلیم کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ انہی دنوں وہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن پر زور دے رہا تھا کہ شمال مغربی صوبہ سرحد کو آزاد و خود مختار رہنے کا حق دیا جائے اور مزید ستم ظریفی یہ تھی کہ اس بے مثال منافقت، مکاری اور عیاری کے باوجود یہ مہاتما، پنڈت جواہر لال نہرو اور بہت سے ایسے ہی دوسرے ''سیکولرسٹ'' کانگرسی لیڈروں کا ''باپو جی'' تھا اور ان کے لئے اس کا ہر لفظ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔

سرت چندر بوس نے 8 رجون کو احتجاجی تار بھیجنے کے بعد کلکتہ سے ایک طویل بیان بھی جاری کیا جس میں برصغیر کی تقسیم کے بارے میں 3 رجون کے منصوبے پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ اس منصوبے پر عمل کرنے سے ہندو اور مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ تصادم ہوتے رہیں گے۔ بوس کا دعویٰ یہ تھا کہ ''بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیشتر سیاسی حلقے اپنے صوبہ کے لئے ایک الگ دستور ساز اسمبلی کے قیام کے حق میں ہیں لیکن 3 رجون کے منصوبے میں بنگال اسمبلی کو اس سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ اسے جو حق دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یا تو وہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہو یا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں۔ اس نے مزید کہا کہ اگر بنگال کو تقسیم کر دیا گیا تو گورے اور گندمی استحصالی ان دونوں بنگالی صوبوں کا اور بھی زیادہ استحصال کریں گے اور بنگالی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کی حیثیت ان استحصالیوں کے جولاہوں کی ہوگی۔''[40]

بوس نے غالباً اپنی ایک آخری کوشش کے طور پر 9 رجون کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کو بھی ایک خط لکھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''بنگال اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے گزر رہا ہے لیکن اسے ابھی بھی بچایا جا سکتا ہے...... میری گزارش تمہارے ان نظریات کے مطابق ہے جن کا اظہار آپ نے مجھ سے ملاقات کے دوران کیا تھا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اپنے ارکان کے سامنے اپنے نظریات کا محض اظہار کیا

اور انہیں ووٹ دینے کے بارے میں کوئی واضح ہدایت نہ کی تو صورت حال کو نہیں بچایا جا سکے گا...... اگر بنگال اسمبلی کے مسلم ارکان میری تجویز کے مطابق متحدہ طور پر ووٹ دیں...... میرا خیال ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اسمبلی کے سارے ارکان (یورپی ارکان سے سوا) کا ایک علیحدہ اجلاس بلانے پر مجبور ہو جائے گا جس میں یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ صوبہ بنگال بحیثیت مجموعی اپنی ایک الگ دستور ساز اسمبلی کا خواہاں ہے یا نہیں۔[41]

9 رجون کو سرت چندر بوس کی یہ کوشش بہت بعد از وقت اور بالکل بے سود تھی کیونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی 3 رجون کے منصوبے کو منظور کر چکی تھیں اور اس منصوبے میں بنگال کی تقسیم کا پروگرام شامل تھا۔ تاہم وہ بنگال کی آزادی کے مطالبہ پر مصر رہا۔ اس نے 14 رجون کو گاندھی کے نام ایک خط میں اسے بتایا کہ ''بنگال کے اتحاد کے بارے میں میرا عقیدہ متزلزل نہیں ہوا ہے۔ میں اس مقصد کے لئے بدستور کوشش کرتا رہوں گا۔ بنگال کی تقسیم کے حق میں جوز ور دار مہم چلائی جا رہی ہے اس کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ اگر استصواب رائے کرایا جائے تو بنگال کے ہندوؤں کی بڑی اکثریت تقسیم کے خلاف ووٹ دے گی۔ بنگال کی آواز کو وقتی طور پر بند کر دیا گیا ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ یہ پھر اٹھے گی''[42] لیکن گاندھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

بنگال اسمبلی کے مسلم اکثریتی اضلاع کے ارکان کے اجلاس میں ارکان کی اکثریت نے پہلی ترجیح کے طور پر آزاد متحدہ بنگال کے حق میں ووٹ دیا بصورت دیگر پاکستان میں شمولیت کے حق میں فیصلہ دیا

20 رجون کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے طے کردہ طریقۂ کار کے مطابق بنگال کے مسلم اکثریتی اضلاع کے ارکان اسمبلی اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے ارکان اسمبلی کے الگ الگ اجلاس ہوئے۔ ایک اجلاس میں تو مسلم اکثریتی اضلاع کے 106 مسلم ارکان اسمبلی نے بنگال کے اتحاد کے حق میں اور 35 غیر مسلم ارکان اسمبلی نے بنگال کے اتحاد کے خلاف ووٹ دیئے اور دوسرے اجلاس میں غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے 58 غیر مسلم ارکان اسمبلی نے 21 مسلم ارکان اسمبلی کے مقابلے میں صوبہ کی تقسیم کے حق میں ووٹ دیئے پھر ان فیصلوں کی روشنی میں مسلم

اکثریتی اضلاع کے مسلم ارکان نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے غیر مسلم ارکان اسمبلی نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کے فیصلے کر دیئے اور اس طرح انڈین نیشنل کانگرس نے بنگال کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا وہ رسمی طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

بنگال کی پراونشل کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ نے 6/اپریل 1947ء کو اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ''اگر ملک معظم کی حکومت بنگال کی موجودہ حکومت (سہروردی کی حکومت) کو، جو بنگال کو ایک علیحدہ اور آزاد خود مختار مملکت بنانے پر تلی ہوئی ہے، اقتدار تفویض کرنے پر غور کر رہی ہے...... تو کیا بنگال کے ان حصوں کو جو انڈین یونین میں شمولیت چاہتے ہیں اس بات کی اجازت ملنی چاہیے کہ انڈین یونین کے اندر ہی ان حصوں پر مشتمل ایک علیحدہ صوبہ بنا دینا چاہیے۔''[43]

بنگال اسمبلی کی اس کاروائی کے بعد یعنی 21/جون کو گاندھی نے سرت چندر بوس کے 14/جون کے خط کا جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ ''اب جبکہ بنگال جغرافیائی لحاظ سے تقسیم ہو چکا ہے تو اس کے اتحاد کے لئے کام کرنے کا طریقہ وہی ہے جو میں بتا چکا ہوں۔''[44] یعنی یہ کہ جناح اور مسلم لیگ ہائی کمان اپنے دو قومی نظریے سے دستبردار ہو کر یہ تسلیم کرے کہ بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ثقافت مشترکہ ہے اور یہ بھی تحریری طور پر وعدہ کرے کہ متحدہ بنگال میں 45 فیصد ہندو آبادی کے نمائندہ ارکان اسمبلی کی اکثریت کے اتفاق رائے کے بغیر کوئی قانون منظور نہیں ہو سکے گا اور یہ کہ مسلم ارکان اسمبلی اچھوت ارکان اسمبلی کو رشوت دے کر اپنے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ بالفاظ دیگر اس کا اصلی موقف یہ تھا کہ اگر مسلم لیگ بنگال کی تقسیم نہیں چاہتی تو وہ مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہو جائے لیکن وہ یہ بات صاف و غیر مبہم الفاظ میں کہنے کی بجائے اپنے ''مہاتمائی'' مکارانہ طریقے سے کہتا تھا۔

حسین شہید سہروردی گاندھی کی اس منافقانہ سیاست سے بہت برہم تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو کلکتہ میں جون کے وسط میں گاندھی کے اس الزام کی پرزور تردید کی کہ مسلم لیگ بنگال کے اچھوت ارکان اسمبلی کو رشوت دے کر ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کر رہی ہے اور پھر اس نے 6/جولائی کو سلہٹ میں اس معاندانہ پروپیگنڈے کی مذمت کی جو آسام

اور دوسرے صوبوں کے کانگرسیوں نے بنگال کی مسلم لیگی حکومت کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔
5 رجولائی کو مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی اضلاع کے ارکان اسمبلی نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے 29 مسلم ارکان اور 12 غیر مسلم ارکان کا انتخاب کیا۔ مسلم ارکان اسمبلی میں لیاقت علی خان، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بھی شامل تھے۔ 6 رجولائی کو آسام کے ضلع سلہٹ میں استصواب رائے ہوا اور کثرت رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ یہ ضلع پاکستان میں شامل ہوگا۔ گویا اس طرح نہ صرف صوبہ بنگال بلکہ صوبہ آسام بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہوگیا۔

گاندھی اور انڈین نیشنل کانگرس کے دوسرے سرکردہ لیڈروں کی طرف سے متحدہ بنگال کی آزادی و خودمختاری کی سکیم کی مخالفت اور اس صوبہ کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی حمایت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ بنگال کی آزادی کو تسلیم کر لیتے تو ہندوستان بہت سی آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جاتا اور یہ بات ان کے لئے کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ وہ بنگال کی آزادی کو تسلیم کر کے ہندوستان کی سالمیت و یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کی راہ ہموار نہیں کرنا چاہتے تھے اور سیسر گپتا کے بیان کے مطابق حکومت برطانیہ کو ان کے اس موقف سے پورا اتفاق تھا۔ ان کے برعکس قائداعظم جناح کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ برصغیر زیادہ سے زیادہ آزاد مملکتوں میں منقسم ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آزاد و خودمختار بنگال کی سکیم کی کبھی کھل کر مخالفت نہیں کی تھی۔ کانگرسیوں اور انگریزوں نے برصغیر کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بہ امر مجبوری اس امید کے تحت منظور کیا تھا کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی، پاکستان زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

گاندھی اور کانگرسی رہنماؤں نے آزاد متحدہ بنگال کے قیام کی اس لئے مخالفت کی کہ اس طرح برصغیر کو مزید کئی ٹکڑوں میں بٹنے سے پھر کوئی نہیں روک سکتا تھا

اگر بنگال آزاد ہو جاتا تو پھر آسام، مدراس، ریاست ہائے حیدر آباد (دکن)، میسور، ٹراونکور، بھوپال اور جموں و کشمیر وغیرہ کو اپنی آزادی کا اعلان کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

جون 1947ء میں نہ صرف حیدر آباد (دکن)، میسور اور ٹراونکور کے والیان ریاست اپنی آزادی کے عزم کا برملا اظہار کر چکے تھے بلکہ ناگا نیشنل کونسل کی مجلس عاملہ بھی صوبہ آسام کی آزادی کا مطالبہ کر چکی تھی۔ اس سلسلے میں مجلس عاملہ نے 20 رجون کو شیلانگ میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ''ناگا قبائلی اپنے آپ کو منقسم اور فساد زدہ ہندوستان میں ملوث نہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کا اعلان کرنے پر آمادہ ہیں اور وہ آزاد آسام کے ساتھ ایک دس سالہ معاہدہ کرنے کے سوا کچھ اور نہیں سوچ سکتے ہیں۔ ناگاؤں کا مطالبہ ہے کہ ناگاؤں کے لئے عرصہ 10 سال کے لئے ایک عبوری حکومت قائم کی جائے۔ اس عرصے میں حکومت ہندوستان ان کی ترقی کے لئے مالی امداد دے اور دس سال کے بعد ان سے استصواب کیا جائے کہ وہ اپنے لئے کس قسم کی حکومت کے متمنی ہیں یعنی کہ وہ ہندوستان میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا اپنی آزاد و خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ قرارداد میں مزید مطالبہ کیا گیا تھا کہ ناگا عوام کی یہ عبوری حکومت ناگالینڈ کے سارے ناگا عوام کی حکومت ہوگی اور اس حکومت کو قانون سازی، عاملہ اور عدلیہ کے پورے اختیارات حاصل ہوں گے۔ ناگالینڈ ناگا عوام کی ملکیت ہے اور اس کی اس حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ناگاؤں کی عبوری حکومت ٹیکس لگا سکے گی اور سرکاری آمدنی کو اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کر سکے گی۔ گارڈین پاور (Guardian Power) سے اس عبوری حکومت کو خسارہ پورا کرنے کے لئے جو سالانہ امداد ملے گی وہ اسے بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے گی۔ ہنگامی حالات کی صورت میں گارڈین پاور دفاع اور سول انتظامیہ کی امداد کے لئے ناگالینڈ میں اتنی فوج رکھ سکے گی جتنی کہ ناگا نیشنل کونسل مناسب سمجھے گی۔ یہ فوج ناگا نیشنل کونسل کے سامنے جوابدہ ہوگی اور ناگا نیشنل کونسل گارڈین پاور کے روبرو جوابدہ نہ ہوگی۔''[45]

ناگا نیشنل کونسل کی یہ قرارداد کانگرسی سرمایہ داروں اور انگریز سامراجیوں دونوں ہی کے لئے بے شمار خطرات سے بھرپور تھی۔ ناگالینڈ اور آسام کی سرحدیں برما سے ملتی تھیں جہاں کمیونسٹ پارٹی کی بغاوت روز بروز زور پکڑ رہی تھی۔ اگر سرت چندر بوس کی سکیم کے مطابق متحدہ بنگال میں ایک آزاد و خود مختار سوشلسٹ ری پبلک کا قیام عمل میں آجاتا تو ناگالینڈ اور آسام کے علاوہ برصغیر کے پورے شمال مشرقی علاقے کو اشتراکیت کا حقیقی خطرہ لاحق ہو جاتا۔ سرت چندر

بوس نہ صرف خود سوشلسٹ نظریات کا علمبردار تھا بلکہ وہ اس سوبھاش چندر بوس کا بھائی تھا جس نے جنگ عظیم کے دوران جاپانیوں کی زیر سرپرستی سنگاپور میں انگریزوں کے خلاف ایک آزاد ہند فوج منظم کی تھی۔ جب اپریل 1947ء میں بنگال کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی تھی تو اس وقت بنگال کے گورنر سر فریڈرک بروز نے بھی اس کی حمایت کی تھی کیونکہ کلکتہ میں کاروباری انگریزوں کا مفاد اسی میں تھا کہ بنگال کی سالمیت و یکجہتی قائم رہے لیکن بعد میں جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی اور آزاد بنگال کی ایک سوشلسٹ ری پبلک کے قیام کا پرچار ہونے لگا تو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ تحریک نہ صرف برصغیر میں بلکہ پورے جنوب مشرقی ایشیا میں برطانیہ کے سامراجی مفادات کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے پہلے تو نئی دہلی میں سہروردی کو 26/اپریل 1947ء کو بتایا کہ بنگال میں سوشلسٹ ری پبلک کے قیام سے اس ریاست کی برطانوی کامن ویلتھ میں شمولیت کے راستے میں مشکلات پیش آسکیں گی اور پھر اس نے 9/مئی کو شملہ میں نہرو کے اس منصوبہ سے اتفاق کر لیا کہ برصغیر کو دو سے زیادہ مملکتوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا اور پنجاب کی طرح بنگال کی بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی جائے گی۔ اس سلسلے میں خواجہ ناظم الدین جیسے برطانوی پٹھوؤں کی قلابازی کی بنیاد بھی یہی تھی۔

بنگال اسمبلی نے 20/جون کو اس مجوزہ تقسیم کی منظوری دے دی جبکہ اسمبلی کے یورپی ارکان نے اس کاروائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ جب کلکتہ میں یہ کاروائی مکمل ہوئی تو آسام پراونشل کانگرس کے ہندو لیڈروں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ اگر بنگال کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا تو ان کا صوبہ انڈین یونین سے کٹ جائے گا اور اس پر مشرق اور مغرب دونوں جانب سے حملے ہو جائیں گے۔[46] گویا انہیں سرت چندر بوس جیسے بنگالی سوشلسٹوں سے بھی خطرہ محسوس ہوتا تھا اور برما کے کمیونسٹوں سے بھی ڈر لگتا تھا جبکہ ناگا نیشنل کونسل کے عزائم بھی ان کے بارے میں تشویشناک دکھائی دیتے تھے۔ بنگال کی تقسیم اور ضلع سلہٹ کی علیحدگی سے ان کا یہ خطرہ بھی ٹل گیا کہ بنگال کے بے زمین مسلمان کاشتکار رفتہ رفتہ ان کے صوبہ کی وسیع و عریض غیر مزروعہ سرکاری اراضی پر قبضہ کر لیں گے۔

گاندھی بظاہر سیکولرزم کا علمبردار تھا لیکن درحقیقت وہ انتہائی منافق اور قدامت پسند سناتنی ہندو تھا جبکہ جناح حقیقتاً وسیع المشرب لبرل بورژوا سیاسی رہنما تھے

متحدہ بنگال کی آزادی کی تحریک کے اس مختصر ڈرامے کے اس طرح ڈراپ سین سے سرت چندر بوس اور ابوالہاشم جیسے عناصر کو بہت دکھ ہوا۔ اگرچہ ان کا یہ دکھ ان کی اپنی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی پیداوار تھا۔ 1947ء میں پورے برصغیر میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر معاندانہ ہو چکا تھا کہ اس کے پرامن سیاسی حل کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس تضاد کی معاندانہ نوعیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں سیکولر سیاست کی عظیم ترین دعویدار انڈین نیشنل کانگرس کے لنگوٹی پوش ''مہاتما'' گاندھی کے روبرو جب بنگال کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا مسئلہ پیش کیا گیا تو اس نے اس کی کچھ اس طرح مخالفت کی کہ اس کی ''غیر فرقہ واریت اور عالمگیر انسان دوستی'' کے ڈھول کا پول کھل گیا۔ وہ سرت چندر بوس کو اس سکیم کی منظوری دینے سے پہلے مسلم لیگ سے تحریری طور پر شرط منوانا چاہتا تھا کہ متحدہ بنگال میں ''حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقنّنہ میں ہندو اقلیت کے کم از کم دو تہائی حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔'' چودھری محمد علی نے گاندھی کے اس بدترین فرقہ پرستانہ رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹھیک لکھا ہے کہ گاندھی کا یہ مطالبہ قائداعظم کے دوقومی نظریے کے خلاف مسلسل پروپیگنڈے کا قطعی اور مسکت جواب تھا۔ اس نے اپنے اس مطالبہ سے بالواسطہ طور پر خود ہی تسلیم کر لیا تھا کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تضاد غیر حقیقی نہیں تھا۔ اس کا واضح تاریخی پس منظر تھا اور اس کی نمود گزشتہ دس بارہ سو سال میں ٹھوس وجوہ کی بنا پر ہوئی تھی۔ ''بنگال میں مسلمانوں کی آبادی صرف 55 فیصد تھی۔ ہندو ان کے مقابلے میں تعلیمی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے کہیں آگے تھے لیکن اس بہت ہی طاقتور اقلیت کی طرف سے جو تقریباً 45 فیصد تھی گاندھی ایسی نوعیت کے سیاسی تحفظات کا خواہاں تھا جو وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے منظور کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں کے اس سے کہیں زیادہ نرم

مطالبات ہندو لیڈر بشمول گاندھی مسترد کرتے رہے تھے۔ جو شرط گاندھی نے پیش کی تھی اس کے ساتھ بنگال میں حکومت کا سارا اختیار ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا اور اس کے لئے جو واحد جواز پیش کیا جا سکتا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مختلف الاصل تھے لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ گاندھی مسلم لیگ سے یہ اعتراف بھی کرانا چاہتا تھا کہ بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ثقافت مشترکہ ہے۔''[47]

قائداعظم جناح نے احمد آباد (گجرات) کے اس مکار بنیے موہن داس کرم چند گاندھی کی اس قسم کی منافقانہ سیاست کو پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی بھانپ لیا تھا جبکہ اس شخص نے جنوبی افریقہ سے واپس آ کر پہلے تو برطانوی سامراج کے لئے زیادہ سے زیادہ بھرتی دینے کا پرچار کیا اور پھر جب ہندوؤں کے احیائی مرہٹہ لیڈر بال گنگا دھر تلک کی صحت خراب رہنے لگی تو اس نے موقع بہ موقع عدم تشدد، مہاتمائیت، عالمگیر انسان دوستی، ہندو مسلم بھائی بھائی اور رام راج کے حربے استعمال کر کے 20-1919ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب اس ''مہاتما'' نے اگست 1920ء میں تحفظ خلافت کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ عناصر کو عدم تعاون کی اندھیری غار میں دھکیل کر رجعت پسند سیاسی مولویوں کی ایک منظم کھیپ پیدا کر دی تو جناح اس سے بالکل ہی بیزار ہو گئے۔

محمد علی جناح ایک وسیع المشرب بورژوا سیاسی لیڈر تھے۔ وہ کلکتہ کے سی۔ آر۔ داس اور بمبئی کے، بی۔ جی۔ کے گوکھلے کو اپنے سیاسی گورو تصور کرتے تھے اور ان کی طرح ان کی بھی خواہش و کوشش یہ تھی کہ ہندوستان کے لئے آئینی جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کی جائے اور پھر یہاں مغربی طرز کا ایک ایسا پارلیمانی نظام حکومت قائم کیا جائے جس میں پسماندہ فرقوں اور قومیتوں کو تحفظات دے کر ان کی ہمہ جہت ترقی کے لئے راستہ کھولا جائے۔ جناح مذہب کو سیاست میں ملوث کرنے کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ جب گاندھی نے 1914ء سے لے کر 1920ء تک کے پانچ چھ سال کے عرصے میں برصغیر کی سیاست پر کلکتہ کے بپن چندر پال اور بمبئی کے بال گنگا دھر تلک سے بھی زیادہ مذہبی رنگ چڑھا دیا تو جناح کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ نہ صرف کانگرس سے بلکہ برصغیر کی عملی سیاست سے اپنا رشتہ منقطع کر لیں۔

جناح کے اس فیصلے سے پہلے گاندھی تحریک خلافت کے بارے میں اپنے اس نقطۂ نگاہ کا اظہار کر چکا تھا کہ ''میرے اور مولانا محمد علی کے لئے مرکزی حقیقت خلافت ہے۔ مولانا محمد علی کے لئے اس وجہ سے کہ اس کا مذہب ہے اور میرے لئے اس وجہ سے کہ میں خلافت کے لئے جان دے کر یعنی اپنے مذہب کو مسلمانوں کی چھری سے بچاتا ہوں۔''[48] گویا گاندھی نے تحریک خلافت اس لئے شروع نہیں کی تھی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کو مدغم کر کے برصغیر کے عوام میں اتحاد و یک جہتی کی پائیدار فضا پیدا کرنا چاہتا تھا بلکہ اس نے یہ ڈھونگ محض ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے رچایا تھا کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ مذہبی فرقوں کی حیثیت سے بحفاظت اور سلامتی کے ساتھ رہ سکیں۔ چنانچہ جب اس سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شادیاں ہونی چاہئیں یا انہیں کھانا مل جل کر کھانا چاہیے تو وہ کہتا تھا کہ ''میری رائے میں یہ خیال کہ مل جل کر کھانا اور باہمی شادیاں کرنا قومی نشوونما کے لئے ضروری نہیں ہے، مغرب سے حاصل کردہ ایک واہمہ ہے۔''[49]

گاندھی کے اس نقطۂ نظر کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ وہ مذہبی لحاظ سے انتہائی قدامت پسند ہندو تھا۔ وہ برصغیر کے پورے معاشرے کو تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کے افسانوی رام راج میں واپس لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا اعتراف اس نے 12/اکتوبر 1921ء کو اپنے اخبار ینگ انڈیا میں اس تحریر کی صورت میں کیا تھا کہ ''میں خود کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ (1) میں ویدوں، اپنیشدوں، پورانوں اور ہندوؤں کی دوسرے سارے پوتر اشلوکوں کے علاوہ اوتاروں اور آواگون کو مانتا ہوں۔ (2) میں صرف اس ورن آشرم دھرم کو مانتا ہوں جو خالصتاً ویدی ہے۔ میں اس دھرم کو نہیں مانتا جو عام لوگوں کی خام خیالی کی پیداوار ہے۔ (3) میں گئور کھشا پر اس سے کہیں زیادہ وسیع تر معنوں میں اعتقاد رکھتا ہوں جتنا کہ عام لوگوں میں پایا جاتا ہے (4) میں بت پرستی سے منکر نہیں ہوں''[50] ...... بہت سے مذہبی لوگ جن سے میں ملا ہوں وہ در پردہ سیاسی لیڈر ہوتے ہیں لیکن میں نے سیاست کا محض لبادہ اوڑھا ہے۔ میں دلی طور پر ایک مذہبی آدمی ہوں[51] ...... میری سیاست کبھی بھی میرے کسی فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آج کل سیاست نے سانپ کی طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ خواہ کوئی کتنی ہی کوشش کرے وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سانپ سے زور آزمائی کے لئے

میں مذہب کو سیاست میں شامل کرنے کا تجربہ خود بھی کرتا رہا ہوں اور اپنے سیاسی دوستوں کو بھی کراتا رہا ہوں[52] ...... ہندوستان کی نجات اس میں ہے۔ اس نے گزشتہ پچاس سال میں جو کچھ سیکھا ہے اسے بھول جائے، ریلوے، ٹیلیگراف، ہسپتالوں، وکیلوں، ڈاکٹروں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کا خاتمہ ضروری ہے اور نام نہاد بالائی طبقے کو شعور اور غور وفکر کے ساتھ اور مذہبی طور پر دیہات کی سادہ زندگی کا طریقہ یہ سمجھ کر سیکھنا ہوگا کہ اسی زندگی سے حقیقی خوشی ملتی ہے۔''[53]

اگرچہ گاندھی کی اس قسم کی فرقہ پرستی، مذہبی عصبیت، دقیانوسیت اور رجعت پسندیت نے سرت چندر بوس، ابوالہاشم اور حسین شہید سہروردی کے آزاد وخودمختار بنگال کے خواب کی پریشانی میں اہم کردار ادا کیا تھا تاہم سرت چندر بوس اور ابوالہاشم نے ہمت نہ ہاری اور وہ 14راگست 1947ء کو بنگال کی تقسیم مکمل ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کے تصور کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تھی اور نہ ہوئی کیونکہ فرقہ وارانہ تضاد کی بنیاد پر کی گئی اس جغرافیائی تقسیم کا ایک طویل تاریخی پس منظر تھا۔

حوالہ جات

باب 1 بنگال کی خودمختاری اور ہندو۔ مسلم تضاد کا تاریخی پس منظر

1۔ منہاج الدین منہاج سراج۔ طبقات ناصری۔ جلد اول۔ ترجمہ غلام رسول مہر۔ لاہور۔ 1975۔ ص 756

2۔ ایضاً۔ ص 769

3۔ ایضاً۔ ص 772

4۔ ایضاً۔ جلد دوم ص 36

5۔ ایضاً

6- Yu.V.Gankovsky, *The Peoples of Pakistan,* Lahore, Second Ed. 1973, p.53.It refers to *Mahabharata*, chapter Sabhaparva, II 47,1-14, II, 23, 12-13.

7- W.W Hunter, *The Indian Musalmans*, Lahore, 1974 p.129.

8- Tara Chand (Dr.) *Influence of Islam on Indian Culture*, Lahore, 1979 pp. 213-14

9- Abdul Karim, *Social History of Muslims in Bengal*, Dacca, 1959 p. 19

10- Abdul Karim, *op,cit.*, p. 127.

11- Quoted in Jadu Nath Sircar, *History of Bengal*, Dacca, 1948 Vol.II, p.102

12۔ خواجہ نعمت اللہ ہروی۔ تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد بشر حسین۔ لاہور۔ 1978۔ ص 305

13- Abdul Karim, *op.cit.*, p.20

14- Quoted in Abdul Karim, *op.cit.*, pp. 142-43, Refer *Somia Purana*, Chapter: Narinjin Sushma.

15- Abdul Karim, *op.cit.*, p.87

16-i) H.Beveridge, *Antiquities of Bengal*, Journal of Royal Asiatic society of Bengal, 1878

ii) Quoted in Abdul Karim, *op.cit.*, p.89.

17- Quoted in Abdul Karim, *op.cit.*, p.145. Vijay Gupt Padma Purana.

18-i) Jadu Nath Sircar, *op.cit.*, p.80

ii) Abdul Karim, *op.cit.*, p.125

19- Jadu Nath Sircar, *op.cit.*, p.79

20- Abdul Karim, *op.cit.*, p.100

21- *Ibid.*, p.115

22- *Ibid.*, p.127

23- *Ibid.*, p.110

24-i) Abdul Karim, *op.cit.*, pp.105-6

ii) Jadu Nath Sircar, *op-cit.*, pp.123-24

-25 خواجہ نعمت اللہ ہروی۔ محولہ بالہ۔ ص ص 6۔305

26-i) Jadu Nath Sircar, *Mughal Administration*, Bombay, 1970. pp.227-28

ii) Ram Gopal, *Indian Muslims*, London 1959 p.14

27- Jadu Nath Sircar, *Mughal Administration*, p.93

28- *Ibid.*, pp.95-105

29- Quoted in Jadu Nath Sircar,*op.cit.*, p.496

30۔ خافی خان۔ منتخب اللباب، حصہ سوم۔ مترجم محمود احمد فاروقی۔ نفیس اکیڈمی۔ کراچی۔ 1976 ص 160

31- Jadu Nath Sircar, *op.cit*; Dacca, 1948. pp.373-74

32- *Ibid.*, p.374

33- *Ibid.*, p.402

34- Quoted in Jadu Nath Sircar, *op.cit*, p.409.refering Salim Ullah, *Tarikh Bangala*, 1763.

35- Abdul Karim, *Murshid Quli And his Times*, Dacca, 1963. p.98

36- *Ibid.*, p.145

37- *Ibid.*, p.235

38- Jadu-Nath Sircar, *op.cit.*, p.433

39- Jadu Nath Sircar, *op.cit.*, p.435

40- Kali-Kankar-Dutt, *Ali Vardi Khan And His Times*, Calcutta, 1939. p.57

41- *Ibid.*, p.58

42- *Ibid.*, p.103

43- *Ibid.*, p.178

44- J.H. Tull Walsh, *History of Murshidabad District*, London, 1902 p.256

45- Ram Gopal, *How British Occupied Bengal*, New York, 1963. pp.201-2,226

46- Jadu Nath Sircar, *Mughal Administration*, pp.250-51

47- Jadu Nath Sircar, *op-cit*; vol II.p.497

48- W.W. Hunter, *op.cit.*, p.137

49- Romesh Dutt, *Economic History of India*, London. n.d., Vol.I p.41

50- A.R. Mallick, *British Policy and Muslims in Bengal*, Dacca, 1961. p.42

51- *Ibid.*, pp.36-38

52- *Ibid.*, p.51

53- Mueen-ud-din Ahmad, *Muslim Struggle for Freedom,* Dacca,1961. p.11

54- A.R. Mallick, *op.cit.* p.79

55- Romesh Dutt, *op.cit.*,p. 35

56۔ باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت۔ لاہور1969ء

57- A.R. Mallick, *op.cit.*, pp. 53-54

58- *Ibid.*, p.58

59- *Ibid.*, p.78-84

60- W.W. Hunter, *op.cit.*, p.164

61- A.R. Mallick, *op. cit.,* p.146

62- *Ibid.*, p.164

63- *Ibid.*, pp. 277-81

64- W.W. Hunter, *op.cit.*, pp.179-80

65- *Ibid.*, p.144

66- *Ibid.*, p.176-84

67- Surrinder Nath Bannerjee. *A Nation in Making*, London, 1925. P. 38

68- M.N.Das, *India Under Minto and Morley, Politics Behind Revolution, Repression and Reform,* London, 1964 p.176

69- E.A. Horne, *The Political System of British India*, Oxford, 1922 p.58

70- i) M.R. Jayakar, *Story of My Life*, vol II, Bombay, 1959, p.177
ii) Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom,* Calcutta, 1964 p.21

71- Sharif-ud-din Pirzada, *Foundation of Pakistan-All India Muslim League, Documents Vol. II,*Karachi, 1970, pp. 173-76

72- K.K. Aziz, *Dr. Rahmat Ali -A Biography*, Lahore, 1987, p. 89pp 156-59

73- Famine Inquiry Comission, *Report on Bengal*, Delhi, 1945 p.371

74- Leonard A. Gordon, *Bengal: The Nationalist Movement 1876-1940*, New York, 1974, p. 302

75- A.S.M Abdur Rab, *A.K Fazal-ul-Haq*, npp; n.d. p. 84

76- Leonard A. Gordon, *op.cit.*, p.196

77- *Ibid.*, p.282

78- *Ibid.*, p.251

79- Sharif-ud-din Pirzada, *op.cit.*, p.192

80- *Ibid.*, pp. 195-96

81- *Ibid.*, p. 204

82- *Ibid.*, p. 229

باب2: 1935ءکا ایکٹ، پہلے عام انتخابات، پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت

1- *Government of India Act, 1935*, Government of India Publication. 1935

2۔ الجمیعت دہلی۔ 9/فروری 1936ء

3۔ ایضاً۔ 28/اپریل 1936ء

4۔ انقلاب، لاہور۔ 6/جنوری 1937ء

5۔ ایضاً۔ 13/جنوری 1937ء

6۔ ایضاً۔ 9/جنوری 1937ء

7۔ ایضاً۔10/جنوری 1937ء

8۔ ایضاً۔13/جنوری 1937ء

9۔ ایضاً۔3/فروری 1937ء

10۔ ایضاً۔6/فروری 1937ء

11۔ ایضاً۔5/فروری 1937ء

12۔ ایضاً۔27/فروری 1937ء

13۔ ایضاً۔3/اپریل 1937ء

14۔ ایضاً۔28/جولائی 1937ء

15۔ ایضاً۔31/جولائی 1937ء

16۔ ایضاً۔یکم اگست 1937ء

17۔ ایضاً۔5/اگست 1937ء

18۔ ایضاً۔7/مئی 1937ء

19۔ ایضاً۔26/اگست 1937ء

20۔ ایضاً۔25/اگست 1937ء

21۔ عاشق حسین بٹالوی۔اقبال کے آخری دو سال۔کراچی۔1961۔صفحہ 470-469

22۔ انقلاب لاہور۔18/اگست 1937ء

23۔ ایضاً۔21/اگست 1937ء

24۔ ایضاً۔22/اگست 1937ء

25۔ ایضاً۔21/اگست 1937ء

26۔ عصرجدید،کلکتہ۔6/اکتوبر1937ء

باب3: مسلم لیگ کوسب سے پہلے بنگال میں عوامی مقبولیت ملی

1۔ عصرجدید،کلکتہ۔11/اکتوبر1937ء

2۔ ایضاً۔18/اکتوبر1937ء

3۔ ایضاً۔24و25/اکتوبر1937ء

4۔ ایضاً۔یکم نومبر1937ء

5۔ ایضاً۔3/نومبر1937ء

6۔ ایضاً۔17/نومبر1937ء

7۔ ایضاً۔2/دسمبر1937ء

8۔ ایضاً۔16/فروری1938ء

9۔ ایضاً۔23/مارچ1938ء

10- Ch. Khaliq-uz-zaman. *Pathway to Paksitan*, Lahore, 1961. p.171

11۔ انقلاب لاہور۔15/اپریل1938ء

12۔ ایضاً۔22/اپریل1938ء

13۔ ایضاً۔11/مئی1938ء

14۔ ایضاً۔25/مئی1938ء

15۔ ایضاً۔20/اپریل1938ء

16- Leonard A. Gordon, *op.cit.* pp 184-185.

17۔ انقلاب، لاہور۔ 13/اپریل 1938ء

18۔ ایضاً۔ 29/اپریل 1938ء

19۔ ایضاً۔ 29/اپریل 1938ء

20۔ ایضاً۔ یکم مئی 1938ء

21۔ ایضاً۔ 7/مئی 1938ء

22۔ ایضاً۔ 16/جون 1938ء

23۔ ایضاً۔ 18/جون 1938ء

باب 4: مسلمانوں کے لئے رعائتوں کا مسئلہ اور ہندوؤں کی مخالفانہ مہم، حق وزارت زبردست مسلم عوامی حمایت کی بدولت محفوظ رہی

1۔ عصر جدید، کلکتہ۔ 5/جولائی 1938ء

2۔ ایضاً۔ 7/جولائی 1938ء

3۔ ایضاً۔ 25/جولائی 1938ء

4۔ ایضاً۔ 3/اگست 1938ء

5۔ ایضاً۔ 3/اکتوبر 1938ء

6۔ ایضاً۔ 12/اکتوبر 1938ء

7۔ ایضاً۔ 13/اکتوبر 1938ء

8۔ ایضاً۔ 16/دسمبر 1938ء

9۔ ایضاً۔ 18/فروری 1939ء

10۔ ایضاً۔ 2/جنوری 1939ء

11۔ ایضاً۔21رفروری1939ء

12۔ ایضاً۔8رمارچ1939ء

13۔ ایضاً۔16رمارچ1939ء

14۔ ایضاً۔24رمارچ1939ء

15۔ ایضاً۔11راپریل1939ء

16۔ ایضاً۔15رمارچ1939ء

17۔ ایضاً۔11رجنوری1939ء

18۔ ایضاً۔18رفروری1939ء

19۔ ایضاً۔2رجنوری1939ء

20۔ ایضاً۔19راپریل1939ء

21۔ ایضاً۔22رفروری1939ء

22۔ ایضاً۔29راپریل1939ء

23۔ ایضاً۔6رمئی1939ء

24۔ ایضاً۔16رمئی1939ء

25۔ ایضاً۔17رمئی1939ء

26۔ ایضاً۔27رمئی1939ء

27۔ ایضاً۔27رمئی1939ء

28۔ ایضاً۔29رمئی1939ء

29۔ ایضاً۔29رمئی1939ء

30۔ ایضاً۔29رمئی1939ء

31۔ ایضاً۔5رجون1939ء

32۔ ایضاً۔12رجون1939ء

33۔ ایضاً۔5رجولائی1939ء

34۔ ایضاً۔18رجولائی1939ء

35۔ ایضاً۔22راگست1939ء

36۔ ایضاً۔16رستمبر1939ء

باب5: بنگالی مسلمانوں کی طرف سے قرارداد پاکستان کی بھرپور حمایت اور بنگال میں ہندو۔مسلم تضاد کی شدید صورت حال

1۔ عصر جدید، کلکتہ۔23ردسمبر1939ء

2- Leonard A. Gordon, *op.cit*, p.186

3۔ عصر جدید، کلکتہ۔یکم جنوری1940ء

4۔ ایضاً۔2رجنوری1940ء

5۔ ایضاً۔2رجنوری1940ء

6۔ ایضاً۔16راپریل1940ء

7۔ ایضاً۔20راپریل1940ء

8۔ ایضاً۔23راپریل1940ء

9۔ ایضاً۔6رمئی1940ء

10۔ ایضاً۔28رمئی1940ء

11۔ ایضاً۔5/جون1940ء

12۔ ایضاً۔5/جون1940ء

13۔ ایضاً۔8/جون1940ء

14۔ ایضاً۔10/جون1940ء

15۔ ایضاً۔13/جون1940ء

16۔ ایضاً۔17/جون1940ء

17۔ ایضاً۔5/اگست1940ء

18۔ ایضاً۔7/اگست1940ء

19۔ ایضاً۔18/اگست1940ء

20۔ ایضاً۔21/اگست1940ء

21۔ ایضاً۔23و29/اگست1940ء

22۔ ایضاً۔13/ستمبر1940ء

23۔ ایضاً۔13/ستمبر1940ء

24۔ ایضاً۔20/نومبر1940ء

باب6: فضل الحق کی جناح سے بغاوت اور لیگ۔ پرجا مخلوط حکومت کے چار سالہ دور کا خاتمہ

1۔ عصر جدید، کلکتہ۔ 9/دسمبر1940ء

2- *The Civil & Military Gazette.*, Lahore, Feb; 1941

3- *Ibid.*, Feb; 13, 1941

4- *Ibid.*, March 8, 1941

5- *Ibid.*, April 8, 1941

6- *Ibid.*, May 16, 1941

7- *Ibid.*, May 23, 1941

8- *Ibid.*, June 24, 1941

9- *Ibid.*, August 15, 1941

10- *Ibid.*, August 20, 1941

11- *Ibid.*, August 20, 1941

12- *Ibid.*, September 11, 1941

13- *Ibid.*, September 13, 1941

14- Ram Gopal, *op.cit.,* London, 1959. p. 246

15- *The Civil & Military Gazette*, Lahore, September 16, 1941

16- *Ibid.*, September 27, 1941

17- *Ibid.*, October 19, 1941

18- *Ibid.*, October 28, 1941

19- *Ibid.*, October 31, 1941

20- *Ibid.*, November 6, 1941

21- *Ibid.*, November 18, 1941

22- *Ibid.*, December 3, 1941

23- *Ibid.*, December 4, 1941

24- *Ibid.*, December 5, 1941

25- *Ibid.*, December 6, 1941

باب:7 بوس برادران، کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے تعاون سے فضل الحق کی دوسری حکومت (1941ء تا 1943ء)

1- *The Civil and Military Gazette*, Lahore. December 13, 1941

2- *Ibid.*, December 13, 1941

3- *Ibid.*, December 14, 1941

4۔ انقلاب، لاہور۔4/جنوری1942ء

5۔ ایضاً۔10/فروری1942ء

6۔ ایضاً۔25/جنوری1942ء

7۔ ایضاً۔5/فروری1942ء

8۔ ایضاً۔18و20/فروری1942ء

9۔ ایضاً۔21/مارچ1942ء

10- *The Civil & Military Gazette*, Lahore. August 13, 1942

11- *Ibid.*, March 30, 1943

12- *Ibid.*, April 1, 1943

13- *Ibid.*, April 2, 1943

باب8: ناظم الدین کی مسلم لیگ مخلوط حکومت اور بنگال کے ہولناک قحط کا چیلنج

1- *The Civil & Military Gazette*, Lahore May 18, 1943

2- *Ibid.*, May 28, 1943

3- Haridas Mazumdar, *Shadow of Famine*, npp; nd; pp. 30, 31&37

4- Kamar-ud-din Ahmad, *A Social History of Bengal*, Dacca, 1967. pp. 59-60

5- *The Civil and Military Gazette*, Lahore. July 28, 1943

6- *Ibid.*, August 10, 1943

7- *Ibid.*, September 17, 1943

8- Haridas Mozamdar, *op.cit.*, p.11

9- *The Civil & Military Gazette*, Lahore. September 24, 1943

10- *Ibid.*, September 26, 1943

11- Haridas Mozamdar. *op.cit.*, p.13

12- *The Civil & Military Gazette*, Lahore November 6, 1943

13- *Ibid.*, November 19, 1973

14- Haridas Mozamdar, *op.cit.*, pp.12-14

15- *The Eastern Times*, Lahore, January, 12, 1944

16- *Ibid.*, January 16, 1944

17- *Ibid.*, January 22, 1944

18- *Ibid.*, January 22, 1944

19- *Ibid.*, January 25, 1944

20- *Ibid.*, July 2, 1944

21- *Ibid.*, January 23, 1944

22- Haridas Mozamdar, *op.cit.*, p. 54

باب:9 آسام کے لائن سسٹم اور کپڑے کی تجارت کے اجارہ پر ہندو مسلم تضاد میں اضافہ اور ناظم الدین وزارت کا خاتمہ

1- *The Eastern Times*, Lahore. August 3, 1944

2- *Ibid.*, August 4, 1944

3- *Ibid.*, August 5, 1944

4- *Ibid.*, August 29, 1944

5- *Ibid.*, October 13, 1944

6- *Ibid.*, September 5, 1944

7- *Ibid.*, October 29, 1944

8- *Ibid.*, December 29, 1944

9- *Ibid.*, Feb. 3 and March 6, 1945

10- *Ibid.*, Feb 24, 1945

11- *Ibid.*, March 3, 1945

12۔ عصر جدید، کلکتہ۔ 21/اکتوبر 1940ء

13- *The Eastern Times*, Lahore. April 3, 1945

14- *Ibid.*, April 5, 1945

باب 10: 45-1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی

1- *The Eastern Times*, Lahore. April 19, 1945

2- *Ibid.*, April 26, 1945

3- *Ibid.*, April 29, 1945

4۔ ماہانہ طلوع اسلام۔ لاہور۔ جنوری 1978ء

5- *The Eastern Times*, Lahore. October 29, 1945

6- *Ibid.*, November 23, 1945

7۔ عصر جدید۔ 15/جنوری 1946ء

8۔ ایضاً۔ 31/جنوری 1946ء

9۔ ایضاً۔ 12/فروری 1946ء

10۔ ایضاً۔ 14/فروری 1946ء

11۔ ایضاً۔ 18/فروری 1946ء

12۔ ایضاً۔ یکم مارچ 1946ء

13- Chaudhry Khaliq-uz-Zaman. *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961, p. 341

14- Rounaq Jehan, *Pakistan : Failure in National Integration*, New York, 1971. p. 21.

15- *The Eastern Times*, Lahore. April 24, 1946

باب 11: سہروردی کی مسلم لیگ مخلوط وزارت اور برصغیر کی ہندو مسلم کشیدگی کا سب سے بدترین صوبہ،...... بنگال

1- *The Eastern Times*, Lahore. April 29-30, 1946

2- *The Morning News*, Calcutta. August 6, 1946

3- *Ibid.*, August 12, 1946

4- *Ibid.*, August 15, 1946

5- Ian Stephens, *Pakistan : Old Country New Nation,* Harmondsworth, 1964. pp 128,129.

6- *The Morning News*, Calcutta. August 21, 1946

7۔ سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، لاہور 1966ء صفحہ 264

8- *The Morning News*, Calcutta. September 6, 1946

9- *Ibid.*, September 17, 1946

10- *Ibid.*, October 27, 1946

باب 12: لیگ اور بوس کی جانب سے متحدہ بنگال کو علیحدہ آزاد ملک بنانے کی کوشش اور قیام پاکستان

1- *The Civil & Military Gazette*, Lahore. March 10, 1947

2- *The Morning News*, Calcutta. March 21, 1947

3- *Ibid.*, March 24, 1947

4- Chaudhry Khaliq-uz-Zaman, *op.cit.*, pp. 379, 380

5- Kamar-ud-din Ahmad, *op.cit.*, p. 81

6- *Ibid.*, p.81

7- *The Morning News*, Calcutta. April 7, 1947

8- *Ibid.*, April 9, 1947

9- H.V. Hodson, *The Great Divide*, Karachi 1969, p. 246

10- *The Morning News*, Calcutta. April 23, 1947

11- *Transfer of Power 1942-1947*, London, 1981.Vol.10, pp.391-93

12- *Ibid.*, p. 471

13- *Ibid.*, p. 472-73

14- *Ibid.*, p. 482-83

15- *Ibid.*, p. 448-49

16- i) *Ibid.*, p. 452

ii) H.V Hodson, *op.cit.*, p 426

17- *The Morning News*, Calcutta. April 28, 1947

18- *The Pakistan Times*, Lahore. April 29, 1947

19- *The Morning News*, Calcutta. April 30, 1947

20- *Ibid.*, May 5, 1947

21- Pyarelal, *Mahatma Gandhi: The Last Phase*, Ahmadabad 1965 Vol. II, p. 81

22- *The Morning News*, Calcutta. May 11, 1947

23- *Ibid.*, May 12, 1947

24- *Ibid.*, May 13, 1947

25- H.V. Hodson, *op.cit.*, p.276

26- Pyarelal, *op.cit.*, p.180

27- *The Morning News*, Calcutta. May. 16, 1947

28- *Ibid.*, May 17, 1947

29- *Ibid.*, May 19, 1947

30- *Ibid.*, May 20, 1947

31- *Ibid.*, May 20, 1947

32- *Ibid.*, May 23, 1947

33- Pyarelal, *op.cit.*, p.185

34- *Ibid.*, pp. 183 & 186

35- *Ibid.*, p. 184

36- *The Morning News*, Calcutta. May 30, 1947

37- *Ibid.*, June 2, 1947

38- E.W.R Lumbey, *The Transfer of Power in India 1945-47*, London, 1954. p.161

39- Pyarelal, *op.cit.*, pp. 187-88

40- *The Morning News*, Calcutta. June 9, 1947

41- Pyarelal, *op.cit.*, p. 190

42- *Ibid.*, p.188

43- *Ibid.*, p.84

44- *Ibid.*, p.189

45- *The Pakistan Times*, Lahore. June 22, 1947

46- Pyarelal, *op.cit.*, p.186

47- Chaudhry Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, 1973. p.147

48- S.M. Burke, *Mainspring of Indian and Pakistani Foreign Policies*, London, 1975. p.18

49- *Ibid.*, p.17

50- Sasadhar Sinha, *Indian Independence in Perspective*, Bombay 1964, p.7

51- *Ibid.*, p.7

52- Khalid bin Sayeed, *Pakistan: The Formative Phase*, London, 1968. p.1

53- Sasadhar Sinha, *op.cit.*, p.8


کتابیات



Ahmad, Kamar-ud-din, *A Social History of Bengal*, Progoti Publishers, Dacca, First Pub.1967, Revised and Enlarged, 1970.

Ali, Chaudhary Mohammad, *The Emergence of Pakistan*, Originally published by Columbia University Press, New York and London, 1967. Reprinted by the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973.

Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom, An Autobiographical Narrative,* Orient Longmans, Calcutta, 1st printed 1959, reprinted 1964.

Bannerjee, Surrinder Nath (Sir), *A Nation in Making : Being the Reminiscences of Fifty years of Public Life*, Oxford University Press, London, 1925.

Beveridge H., *The Antiquities of Bengal*, Journal of Royal Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1878.

Burke, S.M., *Mainsprings of Indian and Pakistan Foreign Policies*, Oxford University Press, Karachi, 1975. First published by University of Minnesota Press, Minneapolis, 1974.

Chand, Tara (Dr), *Influence of Islam on Indian Culture*, Book Traders, Lahore, 1979.

Chaudhry, G.W, *Pakistan's Relations with India*, Pall Mall Press, London, 1968.

Das, M.N. *India Under Minto and Morely, Politics Behind Revolution, Repression and Reform*, George Allen and Unwin, London, 1964.

Dutt, Romesh : *Economic History of India*, Kegan Paul,
London n.d. 6th edition

Dutta, Kali-Kankar *Ali Vardi Khan And his Times*, University of Calcutta, 1939.

Gankovsky, Yu.V., *The Peoples of Pakistan*, people's Publishing House, Lahore.Second Ed. 1973.

Gopal, Ram, (i) *Indian Muslims : Political History (1858-1947).*, Asia Publishing House, London, 1959.

(ii) *How British Occupied Bengal*, Asia Publishing House, New York, 1963.

Gordon, Leonard A., *Bengal : The Nationalist Movement 1876-1940*, Columbia University Press, New York, 1974.

Hodson, H.V., *The Great Divide*, Hutchinson & Co., London., Oxford University Press, Karachi., 1969.

Horne, E.A., *The Political System of British India*, Clarendon Press, Oxford, 1922.

Hunter, William Wilson (Sir), *The Indian Musalmans*, Trubner and Co., London, First pub. 1871, The Premier Book House, Lahore. Reprinted in 1974 from 1871 Ed.

Jayakar, M.R., *Story of My life*, Asia Publishing House, Bombay 1959, Vol II

Jehan, Rounaq, *Pakistan: Failure in National Integration,* Columbia University Press, New York 1972.

Karim, Abdul, (i) *Social History of Muslims in Bengal*, The Asiatic Society of Pakistan, Dacca 1959.

(ii)*Murshid Quli and his Times*, The Asiatic Society of Pakistan, Dacca, 1963.

Khaliq-uz-Zaman, Chaudhry, *Pathway To Pakistan*, Longmans, Lahore, 1961.

Khan, Mueen-ud-din Ahmad, *Muslim Struggle For Freedeom in Bengal*, Bureau of National Reconstruction, East Pakistan, Dacca, 1960.

Lumby, E.W.R., *The Transfor of Power in India 1945-47,* George Allen & Unwin Ltd., London. 1954.

Mallick A. R., *British Policy and Muslims in Bengal 1756-1856* Zeco Press, Dacca 1961.

Mozamdar, Haridas, *Shadow of Famine*, The Author, n.p. p; n.d

Pirzada, Sharif-ud-din, *Foundations of Pakistan* - All India Muslim League Documents, Vol II, National Publishing House, Karachi, 1970.

Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase*, Navajivan Publishing House, Ahmadabad 1965- First pub. 1956.

Rab, A. S. M., *A. K. Fazlul Haq : Life and Achievements*, n.p., n.d.

Sayeed, Khalid Bin, *The Pakistan : Formative Phase 1857-1948,* Oxford University Press, London 1968. First published by Pakistan Publishing House, Karachi 1960.

Sircar, Jadu Nath (Sir), (i) *History of Bengal Muslim Period 1200-1757*, Dacca University Press, Dacca 1948.

(ii) *Mughal Administration*, Orient Longman, Bombay 1970.

Stephens, Ian, *Pakistan : Old country New Nation*, Penguin Books, Harmondsworth 1964, First pub. as *Pakistan*, 1963.

Sinha, Sasadhar, *Indian Independence in Perspective*, Asia Publishing House, Bombay, 1964.

Walsh, J.H Tull (Maj.), *History of Murshidabad District*, Jarrold & Sons, London, 1902.

کتب (اردو)

باری علیگ۔کمپنی کی حکومت۔نیا ادارہ۔لاہور طبع اول 1937ء طبع چہارم 1949ء

بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین۔اقبال کے آخری دو سال۔کراچی 1961ء

خافی خان۔منتخب الباب۔مترجم محمود احمد فاروقی۔نفیس اکیڈمی۔کراچی 1976ء

منہاج الدین منہاج سراج۔طبقات ناصری۔جلد اول۔ترجمہ غلام رسول مہر۔مرکزی اردو بورڈ لاہور1975ء

نور احمد،سید،مارشل لا سے مارشل لا تک،لاہور1966ء

ہروی،خواجہ نعمت اللہ۔تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی۔ترجمہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین۔مرکزی اردو بورڈ۔لاہور۔1978ء

دستاویزات وسرکاری مطبوعات

Famine Inquiry Commission : *Report on Bengal*, Govt. of India - New Delhi, 1945.

The Transfer of Power 1942-47, Ed-in-Chief, Nicholas Mansergh Ed. Penderal Moon, Her Majesty's Stationary Office, 1981 Vol. 10.

اخبارات وجرائد

The Eastern Times, Lahore, files for 1944,1945,1946.

The Morning News, Calcutta. files of 1946, 1947.

The Civil & Military Gazette, Lahore Files of 1941, 1943, 1947.

The Pakistan Times, Lahore. Files from March 1947 on ward.

الجمیعت۔دہلی فائلیں1936ء

انقلاب،لاہور فائلیں1937ء،1938ء،1939ء،1940ء،1942ء

عصر جدید،کلکتہ۔فائلیں1937ء،1938ء،1940ء،1946ء

طلوع اسلام،لاہور(ماہنامہ)۔جنوری1978ء

اشاریہ

آ

ت

ٹ

ث

ج

چ

ز

ش

غ

ق

ک

و

ی